سنائپر
(حصہ دوئم)
ریاض عاقب کوہلر
soheni digest.com

ناول

ریاض عاقب کوہلر

سنائپر

اس وقت بے ہوشی کے عالم میں مجھے بہت گہری کھائی دکھائی دے رہی تھی۔ تیز بارش ہو رہی تھی اور میں لمحہ بہ لمحہ کھائی کی طرف پھسلتا جا رہا تھا۔ اپنے ہاتھوں کے ناخن چکنی زمین میں گھسیڑنے کے باوجود میں خود کو پھسلنے سے روک نہیں پا رہا تھا۔ اور پھر میں ایک دم کھائی میں لڑھک گیا خوش قسمتی سے آخری کوشش میں پتھر کا ایک ابھرا ہوا کنارہ میری انگلیوں کی گرفت میں آ گیا تھا۔ اسے پکڑ کر میں ہوا میں لٹکنے لگا۔ نیچے دیکھنے پر حد نگاہ تک کھائی کی تہہ نظر نہ آئی۔ میرے ہاتھ سے پتھر کا کنارہ چھوٹنے کی دیر تھی اس کے بعد یقیناً کھائی کی تہہ تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے رب کو پیارا ہو جانا تھا۔ میں نے اوپر اٹھنے کی کوشش کی مگر میرے بازوں میں جان ہی ختم ہو گئی تھی ۔موت لمحہ بہ لمحہ مجھے نگلنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔ پتھر کا کنارہ میرے ہاتھ سے چھوٹنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ایک جانب سے پلوشہ بھاگتی ہوئی نمودار ہوئی، اگلے ہی لمحے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے میرے دائیں ہاتھ کو اپنے ملائم ہاتھ میں جکڑ لیا۔ دونوں ایڑیاں چکنی زمین میں گاڑ کر اس نے پورا زور لگایا اور میں آہستہ آہستہ اوپر آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں ہانپتا ہوا اس کے پہلو میں لیٹا تھا۔

”راجو!...... مجھے آواز نہیں دے سکتے تھے۔“ وہ شکوہ کناں ہوئی۔ ”اگر مجھے آنے میں تھوڑی دیر ہو گئی ہوتی تو آپ تو گئے تھے نیچے۔“

”چندا میرا حلق ہی خشک ہو گیا تھا۔ منھ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔“

”ضروری تو نہیں کہ آپ منھ ہی سے پکارتے، مجھے کسی اور طرح سے بھی تو متوجہ کر سکتے تھے نا۔“ اس کا گلہ جاری رہا۔ ”اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو پلوشہ کیسے زندہ رہ پاتی۔“

میں مسکرایا۔ ”گویا مجھ سے زیادہ اپنی موت کی فکر ہے۔“

وہ بپھرتے ہوئے بولی۔ ”ہاں...... ہاں...... ہاں اپنی موت کی فکر ہے، کیونکہ میرے راجو کے لیے میری زندگی بہت اہمیت کی حامل ہے۔“

”چندا!...... خفا تو نہیں ہوتے، اب بتاؤ نہ ایسی حالت میں تمھیں کیسے متوجہ کرتا۔“

وہ منھ بناتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے پاس پستول بھی موجود تھا، اس سے ہوائی فائر کر لیتے۔“

''اوہ......اس کا تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔'' میں نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔

''خیال ہی نہیں رہا تھا۔'' وہ مجھے چڑاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ اسے یہ بھول گیا تھا کہ زمین کتنی چکنی اور پھسلن زدہ ہے۔ کھڑے ہوتے ہی اس کا پاؤں پھسلا اور وہ کھائی میں گرتی چلی گئی۔ میں نے ایک دم اسے گرفت میں لینا چاہا مگر کھائی کے اندھیرے اسے نگل گئے تھے۔ میری سماعتوں میں بس اس کی آخری چیخ ہی گونجتی رہ گئی تھی جو وہ میرا نام پکارتے ہوئے چیخی تھی۔

''راجو..........''اس کے ساتھ ہی مجھے ہوش آ گیا۔ اس حالت میں بھی اس بھیانک سپنے سے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میرے ہونٹوں اور زبان پر فوراً برے خواب کے شر سے بچنے کی دعا مچل گئی اور اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں پلوشہ کی تجویز گونجی۔

''آپ کے پاس پستول بھی تو موجود تھا۔ آپ ہوائی فائر بھی تو کر سکتے تھے۔'' گویا وہ میرے خواب میں مجھے اس صورت حال سے نمٹنے کی تجویز ہی تو بتانے آئی تھی۔ میں کوشش کر کے اپنا بازو کمر کی طرف لے گیا جہاں میں نے نیفے میں گلاک نائینٹین اڑسا ہوا تھا۔ پستول کو پکڑنے کے لیے مجھے دستانہ اتارنا پڑا تھا۔ میری انگلیاں بس تھوڑی تھوڑی حرکت ہی کر پا رہی تھیں، بہ مشکل پستول کا دستہ پکڑ کر میں نے پستول کو باہر کھینچا۔ اب پستول کو کاک کرنے کا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے دستانے والے ہاتھ کو پستول کے اوپر ٹیک کر اس کی سلائیڈ کو پیچھے کی جانب کھینچنا چاہا مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دو تین منٹ کی کوشش کے بعد اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے کلاشن کوف کاک کر کے کندھے سے لٹکائی تھی۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ کلاشن کوف تو میں چند گز پیچھے پھینک آیا تھا اور وہاں تک پہنچنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میں دوبارہ پستول کے ساتھ مغز ماری کرنے لگا ۔ چند لمحوں کی کوشش کے بعد سلائیڈ ہلکا سا پیچھے کو کھسکی میں نے ہاتھ پر مکمل زور دے دیا تھا اور پھر وہ مشکل مرحلہ بھی طے ہو گیا۔ سلائیڈ مکمل پیچھے دھکیل کر میں نے اس پر سے ہاتھ ہٹایا۔ سلائیڈ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور پستول کاک ہو گیا۔

میں نے ٹریگر گارڈ میں شہادت کی انگلی ڈال کر پستول کی بیرل کا رخ سامنے کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر کھینچ لیا۔ دھماکے کے ساتھ میرے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ گولی فائر ہونے کی آواز سے ماحول گونج اٹھا تھا۔ میں نے ایک گولی

پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ دوسری، تیسری اور چوتھی بار بھی میں ٹریگر دباتا گیا۔ ہر بار مجھے اتنا ہی زور لگانا پڑا جتنا کہ ایک گہرے کنویں سے پانی کا بڑا ڈول کھینچنے والے شخص کو لگانا پڑتا ہے۔ چوتھی بار ٹریگر دبا کر میں نے بے دم ہو کر اپنی کہنیوں پر سر ٹیک دیا۔ اس کے بعد میری ہمت جواب دے گئی تھی۔ کئی لمحے بیت گئے یا شاید مجھے ہی لگ رہا تھا کہ وقت تھم گیا ہے۔ دروازے پر آہٹ ہوئی کسی نے کچھ پکارا تھا مگر شاید میری سماعتوں نے بھی کام چھوڑ دیا تھا ۔پھر میری آنکھوں نے روشنی کی جھلک دیکھی۔ اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

دو ہاتھوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑا ......اور میرے کانوں کے قریب ہی ایک نسوانی آواز آئی ......''ہوش میں......آؤ اٹھو......'' شاید وہ اکیلی عورت مجھے اٹھا نہیں پا رہی تھی۔

''مم......میں حرکت نہیں کر سکتا۔'' میں زیرلب بڑبڑا کر رہ گیا تھا۔ مجھے مدد بھی ملی تھی تو ایک کمزور عورت کی جو مجھے اٹھا بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ دروازے کی طرف منہ کر کے زور سے چلائی۔ ''رنڑا......رنڑا، بھائی کو ساتھ لے کر یہاں آؤ۔''

چند لمحوں بعد مجھے قریب سے ایک لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ''جی باجی!......'' شاید وہ اس کی چھوٹی بہن تھی۔

''تم دونوں اس کی ٹانگوں سے پکڑو، میں بازو تھامتی ہوں، یہ بے ہوش ہے، اگر کچھ دیر ایسے پڑا رہا تو زندہ نہیں بچے گا۔''

''ٹھیک ہے باجی۔'' اس مرتبہ ایک لڑکے کی آواز آئی تھی۔ اور پھر میرا جسم ذرا سا زمین سے بلند ہوا اور وہ مجھے اندر لے جانے لگے۔ طویل صحن عبور کر کے وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے میں انگیٹھی روشن تھی ۔ایک دم مجھے لگا میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔

''رنڑا جلدی سے خالی چارپائی پر بستر بچھاؤ۔ اور پیٹی سے موٹے والا لحاف بھی نکال لاؤ۔''

''جی باجی!'' رنڑا سعادت مندی سے بڑی بہن کے حکم پر عمل کرنے لگی۔

وہ چھوٹے بھائی کو مخاطب ہوئی۔ ''ثمر خان!...... بھاگ کر باورچی خانے سے چھری اٹھا لاؤ اس کا گیلا اور اکڑا ہوا لباس کاٹ ہی کر جسم سے اتارنا پڑے گا۔''

''کون ہے گلگارے بیٹی!'' کسی مرد کی تکلیف میں ڈوبی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

’’بابا جان !......کوئی اجنبی ہے۔فائر کی آواز سن کر میں باہر نکلی تو یہ دروازے پر بے سدھ پڑا تھا۔شاید ہمیں متوجہ کرنے کے لیے ہی اس نے فائر کیے تھے۔‘‘ باپ کو تفصیلی جواب دیتے ہوئے بھی وہ مسلسل میرا کوٹ اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔مگر کوٹ بالکل اکڑ گیا تھا۔اسی وقت اس کا بھائی ثمر خان بھاگتا ہوا وہاں پہنچا۔

’’یہ لیں باجی !‘‘ اس نے یقیناً بہن کی طرف چھری بڑھائی تھی۔چھوٹے بھائی کے ہاتھ سے چھری لے کر اس نے جلدی سے میرا کوٹ کاٹنا شروع کر دیا،کوٹ کے بعد اس نے قمیص اور بنیان بھی کاٹ کر میرے جسم سے علیحدہ کر دی اور پھر اپنا دوپٹا میرے درمیانی جسم پر ڈال کر اس نے میرا زیریں لباس بھی کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دیا تھا۔میں نیم وا آنکھوں سے اس دوشیزہ کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔مگر میرا جسم حرکت سے معذور تھا۔میری جان بچانے کے لیے وہ جس حوصلے کا مظاہرہ کر رہی تھی اتنی جرّات کم ہی لڑکیوں کا خاصا ہوتی ہے۔جب تک وہ لباس کاٹ کر میرے جسم سے علیحدہ کرتی اتنی دیر میں اس کی چھوٹی بہن رنڑا ایک موٹا لحاف چارپائی پر بچھا کر دوسرا لحاف میرے اوپر ڈالنے کے لیے تیار کر چکی تھی۔

’’اسے اٹھانے میں میری مدد کرو۔‘‘ اس نے چھوٹی بہن کو آواز دی۔ایک مرتبہ پھر تینوں نے مل کر مجھے اٹھایا اور نرم بستر پر لٹا دیا۔اس کے ساتھ ہی گلگارے بی بی نے مجھے وہ موٹا لحاف اوڑھا دیا۔خوش گوار حدت میری رگوں میں اترنے لگی تھی۔

’’ثمر خان انگیٹھی میں اور لکڑیاں ڈالو۔‘‘ چھوٹے بھائی کو کہہ کر وہ بہن کو مخاطب ہوئی۔’’رنڑا!......دودھ میں ہلدی ڈال کر گرم کر کے لے آؤ۔‘‘

وہ دونوں۔’’جی باجی۔‘‘ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے تھے۔وہ خود لحاف کے کونوں کو موڑ کر میرے جسم کے نیچے دینے لگی تاکہ لحاف مکمل بند ہو جائے۔اور ہوا کا گزر بالکل ممکن نہ رہے۔

میرے جسم میں اٹھنے والا درد تا حال پہلے کی طرح ہی باقی تھا۔گو گلگارے بی بی نے بہت اچھے طریقے سے مجھے سنبھالا تھا۔میرا گیلا لباس اتار کر مجھے لحاف اوڑھانے کے بہ جائے اگر وہ براہ راست مجھے انگھیٹی کے قریب ڈال دیتی تو بلاشبہ میرے جسم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ٹھنڈ لگنے والے شخص کو یوں ایک دم آگ کے قریب لے جانا بالکل ہی غلط ہے۔البتہ مجھے لحاف اوڑھا کر انگھیٹی کی آگ کو زیادہ سے زیادہ دہکانا بہت

مناسب تھا۔ یقیناً ٹھنڈے علاقے سے تعلق رکھنے کے باعث اسے معلوم تھا کہ ٹھنڈ کا شکار ہونے والے شخص کو کیسے سنبھالا جاتا ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ ہاتھوں کی انگلیوں کو حرکت دینے شروع کر دی تھی۔ میرے پاؤں ابھی تک سن تھے ۔البتہ نچلے دھڑ میں شدید درد ہو رہا تھا۔ اور ایسا ہونا میرے لیے تسلی کا باعث تھا۔ درد کا احساس ہونے کا مطلب یہی تھا کہ میرا جسم ٹھیک تھا۔ میں پاؤں کی انگلیوں کو حرکت دینے کی کوشش کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ میرے پاؤں میں بھی درد کا احساس جاگنے لگا تھا۔ میرے کانوں میں اس مرد کے کراہنے کی آواز پہنچی غالباً وہ بھی کسی قسم کی تکلیف میں مبتلا تھا۔

اسی وقت رنڑا ہلدی ملا دودھ لے کر پہنچ گئی۔ میرے چہرے سے تھوڑی سی رضائی کھسکا کر گلگارے بی بی نے میرا منھ باہر نکالا اور میرے سر کے نیچے تکیہ رکھ کر ایک بڑے چمچ سے ہلدی ملا دودھ مجھے پلانے لگی۔ اس نے مجھے رضائی سے باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہلکا گرم دودھ میرے جسم میں جس جس جگہ تک جا رہا تھا مجھے اس کا بہاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ میں دودھ کا پورا کٹورا خالی کر گیا تھا۔ دودھ نے مجھے بہت تقویت پہنچائی تھی۔

دودھ پلا کر اس نے میرا چہرہ دوبارہ ڈھانپ دیا۔

''رنڑا!......ثمر خان کو ساتھ لے جا کر ڈربے سے وہ بڑا چوزہ پکڑ لاؤ۔'' وہ چھوٹی بہن کو مخاطب تھی۔

''کیوں باجی!'' یقیناً اس کی بات سن کر رنڑا حیران ہوئی تھی۔

''اسے ذبح کر کے یخنی بنانا ہے۔ جب تک اسے اندر سے گرمی نہیں پہنچے گی اس کی سردی دور نہیں ہو گی۔''

''اچھا باجی!'' کہہ کر وہ ثمر خان کو ساتھ چلنے کا کہنے لگی۔

میرا دل اس کے لیے شکر گزاری کے احساسات سے بھر گیا تھا۔ وزیرستان کے لوگ غریب ہونے کے باوجود بہت زیادہ مہمان نواز تھے۔ ایک اجنبی کی اتنی زیادہ خدمت اور دیکھ بھال یقیناً مہمان نوازی کا منھ بولتا ثبوت تھی۔

چوزہ اس نے خود ہی ذبح کیا تھا۔ میں بس سماعتوں ہی سے ان کی حرکات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اس دوران ان کے باپ کی کراہتی ہوئی آواز بھی میرے کانوں میں پڑ جاتی۔ وہ مسلسل نہیں کراہ رہا تھا۔ بلکہ مجھے یوں محسوس

ہو رہا تھا جیسے کروٹ تبدیل کرنے یا ہلتے جلتے وقت اسے تکلیف پہنچتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ میرے لیے یخنی بھی بنا کر لے آئی تھی۔ کالی مرچ اور نمک کے علاوہ اس نے اس میں کچھ نہیں ڈالا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے میرے چہرے سے لحاف ہٹا کر مجھے اپنے ہاتھوں سے یخنی پلائی۔ دیسی چوزے کی یخنی پیتے ہی آہستہ آہستہ میرے پاؤں کی انگلیوں میں بھی درد کا احساس ہونے لگا۔ جو اس بات کا مظہر تھا کہ میرے پاؤں پہلے سے بہتر ہو رہے تھے۔

ہاتھوں کا درد تو ختم ہو چکا تھا۔ میں بار بار مٹھیاں بھینچ کر ہاتھوں کی ورزش کرنے لگا۔ ٹانگوں کا درد بھی آہستہ آہستہ زائل ہو رہا تھا۔

میری سماعتوں میں لکڑیوں کی کھٹ پٹ آنے لگی۔ یقیناً وہ انگیٹھی میں مزید لکڑیاں ڈال رہی تھی۔

''تم دونوں اب اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔'' انگیٹھی میں لکڑیاں ڈال کر وہ چھوٹے بہن بھائی کو مخاطب ہوئی تھی۔

''جی باجی!'' انھوں بیک زبان ہی کہا تھا۔ لگتا تھا دونوں بہن بھائی کے نزدیک باجی کا حکم حرف آخر کی حیثیت رکھتا تھا۔

''بابا جان!...... قہوہ پییں گے۔'' اس مرتبہ وہ باپ کو مخاطب ہوئی تھی۔

''نہیں بیٹی!...... اب بس آرام کرو۔''

اس نے جلدی سے کہا۔ ''تھوڑا سا پی لینا بابا جان!...... یوں بھی مہمان کے لیے بنانے لگی ہوں۔''

پہلے ہلدی ملا دودھ، پھر یخنی اور اب گرم قہوہ وہ مسلسل گرم مشروبات میرے معدے میں انڈیل کر سردی کے خلاف میری قوت مدافعت کو بڑھا رہی تھی۔ ہمیں بھی سردی سے نمٹنے کے لیے جو طریقے پڑھائے گئے تھے ان میں متاثرہ شخص کے جسم کو گرم کرنے کے لیے گرم ماحول اور لباس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ گرم مشروبات پلانے کے بارے بھی ہدایات کی گئی تھیں۔

اس کے باپ نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بیٹی!'' اور اس کے قدموں کی آواز کمرے سے باہر جانے لگی۔

اب میرے بازوؤں میں جان پڑ گئی تھی۔ ٹانگوں کا درد بھی مدہم ہونے لگا تھا اور پاؤں بھی حرکت کرنے

لگے تھے۔البتہ دونوں پاؤں اور پنڈلیوں میں ہلکا ہلکا درد ضرور محسوس ہو رہا تھا۔

''یہ لیں بابا جان!'' وہ شاید قہوے کی پیالی اپنے باپ کے حوالے کر رہی تھی۔کراہتی ہوئی آواز میں میں نے شکریہ کے الفاظ سنے اور پھر اس کے قدموں کی آواز میری چارپائی کی طرف بڑھ گئی۔

پہلے کی طرح ہی اس نے مجھے قہوہ بھی پلایا اور اس کے ساتھ ہی اس کی نرم آواز میری سماعتوں میں گونجی......

''اب کیسا محسوس ہو رہا ہے؟''

''پہلے سے بہت بہتر لگ رہا ہے۔اللہ پاک آپ کو اور آپ کے گھرانے کو دنیا اور آخرت کی عزت اور کامیابی دے۔'' میرے دل سے خلوص بھری دعا نکلی تھی۔

''آمین۔'' کہتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھرا شاید اسے میرے دعائیہ انداز پر ہنسی آئی تھی۔وہ تیکھے نقوش اور گہری نیلی آنکھوں والی خوب صورت دوشیزہ تھی۔اس قدر نیلی آنکھیں میں زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔میری ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر وہ میرے اتنے قریب ہوئی تھی ورنہ شاید میں اس کا چہرہ بھی نہ دیکھ پاتا۔اس کا اور میرا حساب بالکل ڈاکٹر اور مریض کا سا تھا۔

میرے چہرے کو ایک بار پھر ڈھانپ کر وہ کمرے باہر سے نکل گئی۔واپسی پر اس نے میرے چہرے پر سے لحاف اتارے بغیر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سرھانے کے ساتھ کپڑوں کا جوڑا رکھ دیا ہے۔جونہی خود کو اس قابل سمجھو کہ کپڑے پہن سکو یہ پہن لینا۔اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا میں ساتھ والے کمرے میں ہوں اور جاگ رہی ہوں۔''

میں نے لحاف منہ سے اتارے بغیر دھیمے لہجے میں کہا۔''ٹھیک ہے بہن، شکریہ۔''

اس کے جانے کے بھی میں اسی طرح لیٹا رہا۔قریباً گھنٹے بھر بعد ایک بار پھر میری سماعتوں میں قدموں کی چاپ گونجی، جو انگھیٹی کے ساتھ جا کر رک گئی تھی۔لازماً وہ انگھیٹی میں لکڑیاں ڈالنے آئی تھی۔لکڑیاں ڈال کر وہ واپس لوٹ گئی۔میں اب بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔لحاف کا کونہ الٹا کر میں نے باہر جھانکا۔وہ کافی بڑا کمرہ تھا۔کمرے کے ایک کونے میں درمیانی سی انگھیٹی لگی ہوئی تھی۔جس میں جلنے والی آگ کی تپش سے کمرے میں خوشگوار حدت پھیلی ہوئی تھی۔انگھیٹی کے مخالف کونے میں لالٹین لٹکی تھی جس کی زرد روشنی کمرے میں پھیلے

اندھیرے کے ساتھ برسرِ پیکار تھی۔لالٹین کے نیچے ایک چوڑی چارپائی پڑی تھی جس پر ایک ادھیڑ عمر شخص لیٹا نظر آیا۔سر کے علاوہ اس کا باقی جسم موٹے لحاف میں پوشیدہ تھا۔اس کے چہرے پر گھنی داڑھی نظر آ رہی تھی۔وہ آنکھیں کھولے جانے چھت کی کڑیوں میں کیا تلاش کر رہا تھا۔اس کی چارپائی کے علاوہ بھی کمرے میں تین چارپائیاں رکھی تھیں جن میں سے ایک پر تو میں لیٹا تھا اور دو چارپائیاں خالی پڑی تھیں۔ان پر بستر بھی نہیں بچھے تھے۔

ایک سرسری نظر کمرے میں دوڑا کر میں نے سرہانے کے ساتھ رکھے کپڑے اٹھائے اور لحاف کے اندر ہی زیریں لباس ڈالنے لگا۔شلوار پہن کر میں اٹھ بیٹھا اور قمیص ڈال کر دوبارہ لحاف میں غائب ہو گیا۔دودھ اور یخنی سے میری بھوک کافی حد تک مٹ گئی تھی مگر اب آہستہ آہستہ دوبارہ بھوک محسوس ہونے لگی تھی،سردی میں یوں بھی بھوک زیادہ لگتی ہے اور مجھے تو کھانا کھائے چوبیس گھنٹے ہونے کو تھے۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں گلگارے بی بی کو نیند سے اٹھا کر کیسے کہتا کہ مجھے بھوک لگی ہے کھانے کو کچھ لاؤ۔پہلے بھی اس نے اتنا کچھ کیا تھا اب وہ غریب سو رہی تھی تو مجھے بھوک لگ گئی تھی۔میں نے اسے آواز نہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر میرے اس فیصلے پر اس نے خود ہی پانی پھیر دیا۔وہ دوبارہ انگیٹھی میں لکڑیاں ڈالنے آئی تھی مجھے جاگتے پا کر وہ سر پر دوپٹا ٹھیک کرنے لگی۔میں نے بھی اس کے دلکش سراپے سے نگاہیں پھیر کر مخالف جانب دیکھنے لگا۔وہ میری محسن تھی۔اسے سبب بنا کر اللہ پاک نے مجھے دوبارہ زندہ رہنے کا موقع عطا فرمایا تھا۔میں اس کی جتنی عزت اور احترام کرتا کم تھا۔یوں بھی مجھے نظروں کی حفاظت کرنا آتا تھا۔آج اگر میں پرائی عزت پر ایسی ویسی نظریں گاڑتا تو یقیناً میری پلوشہ بھی کسی بدنیت کی گندی نظروں کا شکار بنتی۔

انگیٹھی میں لکڑیاں ڈال کر وہ لوٹی اور میرے قریب رکتے ہوئے پوچھنے لگی ’’کسی چیز کی ضرورت ہے۔‘‘

’’نہیں شکریہ۔‘‘

’’بھوک تو نہیں لگی؟‘‘ پتا نہیں اس نے میرے بھوکا ہونے کا اندازہ لگا لیا تھا یا روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

’کوئی خاص نہیں،آپ کو زحمت ہو گی۔‘‘ یہ کہتے ہوئے بھی میں اس کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

''ارے، زحمت کیسی ......ابھی لائی۔'' مجھے محسوس ہوا کہ ایسا کہتے ہوئے وہ متبسم ہوئی تھی۔اپنے انکار پر ثابت قدم رہ کر میں صبح تک پیٹ کا واویلا نہیں سن سکتا تھا۔اس لیے خاموش رہا اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ہمارے مکالمے سے اس کے والد کی آنکھ کھل گئی تھی۔یا شاید وہ پہلے ہی سے جاگ رہا تھا اور مجھے سوتا سمجھ کر بات نہیں کر رہا تھا۔☆

''جوان اب طبیعت کیسی ہے؟......اور کیا ہوا تھا؟''

''الحمد اللہ، ٹھیک ہوں چچا جان!......اور ہونا کیا تھا کل صبح برف باری میں پھنس گیا، بڑی تلاش کے بعد بھی کوئی جائے پناہ نہ ڈھونڈ سکا، یہاں تک کہ جان کے لالے پڑ گئے، بس اتفاق ہی تھا کہ آپ کے دروازے تک آ پہنچا اور کچھ سانس باقی تھے جو گلگارے بہن کی مدد مل گئی۔اللہ پاک اسے اجر دے، عزت اور سلامتی دے۔''

''آپ کا نام کیا ہے، آپ اس علاقے کے تو نہیں لگتے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''ذیشان نام ہے اور میں واقعی اس علاقے کا نہیں ہوں۔یہاں مجھے اپنے ساتھیوں کی تلاش کی جستجو لے آئی ہے۔''

''میرا نام شمریز خان ہے اور اگر آپ کے ساتھی گم ہو گئے ہیں تو شاید انھیں ڈھونڈنا اتنا آسان نہ ہو۔''اس نے بلا جھجک حقیقت کا اظہار کر دیا تھا۔

''مگر کوشش تو کرنا چاہیے نا......ناکامی کے خوف سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا بزدلی کہلاتا ہے۔''

اس نے متبسم ہوتے ہوئے پشتو کہاوت بولی۔''کہ غر سومرہ ہم لوڑ وی پہ سر پہ لاروی۔''(پہاڑ جتنا بھی اونچا ہو اس پر چڑھنے کا راستہ ضرور ہوتا ہے)مگر اس کی ہنسی میں بھی تکلیف کا عنصر واضح چھلک رہا تھا۔

''صحیح کہا۔''میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔''ویسے برا نہ منائیں تو پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو ہوا کیا ہے؟''

''بابا جان کو ٹانگ میں گولی لگی ہے۔''چھابے میں گرم روٹیاں اور سالن کا کٹورا رکھے گلگارے بی بی نے اندر داخل ہوتے ہی والد سے پہلے میری بات کا جواب دیا۔

''کب، کیسے؟''میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پرسوں......'' لکڑی کی چھوٹی سی میز پر چھابہ رکھ کر اس نے وہ میز اٹھا کر میری چارپائی کے ساتھ رکھ دی ۔''رنڑا اور ثمر خان گھر سے باہر خشک لکڑیاں چن رہے تھے اسی وقت دو آوارہ گرد وہاں سے گزرے۔ان بدبختوں نے رنڑا کو اکیلا سمجھ کر پکڑنا چاہا،رنڑا چیختی ہوئی گھر کی جانب بھاگی،رنڑا کی چیخیں سن کر بابا جان ہتھیار لے کر باہر نکلے،وہ تینوں میری چھوٹی بہن کا پیچھا کر رہے تھے۔ابو جان نے فوراً ہوائی فائر کیا،جسے سنتے ہی وہ جوابی فائر کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئے۔بابا جان بھی ان کے فائر کا جواب دیتے رہے،ان بزدل اچکوں کو تو معلوم نہ ہو سکا مگر اس دوران ابو جان کی ٹانگ میں ایک گولی لگ گئی تھی۔میں اس وقت باورچی خانے میں تھی ۔فائرنگ کی آواز سن کر میں بابا جان کی مدد کو پہنچی مگر وہ وہاں سے غائب ہو گئے تھے۔ہم بابا جان کو اٹھا کر اندر لے آئے۔سہ پہر ڈھلنے کو تھی۔ہم نے سوچا اگلی صبح بابا جان کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے کہ ایک تو تھوڑی دیر میں اندھیرا ہونے والا تھا دوسرا خان کلے یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔مگر آج صبح جب ہم آگے جانے کے لیے تیار ہوئے تو موسم خراب ہو گیا اور ہمارا ارادہ پھر دھرے کا دھرا رہ گیا۔''

''کیا گولی ٹانگ کے اندر ہی ہے؟'' میں نے کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''جی......'' گلگارے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہونہہ!'' کہہ کر میں روٹی کا گرم نوالہ توڑ کر منھ کی جانب لے جانے لگا۔سالن میں اس نے اسی یخنی کو تڑکا لگا کر میرے سامنے رکھ چھوڑا تھا۔نوالہ چباتے ہوئے میں نے پوچھا۔''اب موسم کی کیا صورت حال ہے؟''

''ہوا تو قریباً رک گئی ہے مگر برف باری جاری ہے۔'' اس نے والد کی چارپائی کے قریب پڑی ہوئی خالی چارپائی پر نشست سنبھال لی تھی۔

''میرا کچھ سامان باہر رہ گیا تھا۔کہیں وہ برف ہی میں نہ دب جائے۔''

''آپ کا پستول تو میں لے آئی تھی،اس کے علاوہ کیا ہے۔''

چند گز پیچھے ڈھلان کی جانب میرا سفری تھیلا اور کلاشن کوف پڑی تھی۔''

''ابھی لائی۔'' وہ اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

''صبح لے آنا......'' میں نے رسمی انداز میں اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے باہر نکل گئی

۔میرے روٹی کھانے سے پہلے ہی وہ ہاتھوں میں میرا تھیلا اور کلاشن کوف پکڑے واپس لوٹ آئی تھی۔ تھیلے کے اوپر پڑی نرم برف کو اس نے باہر ہی جھاڑ دیا تھا، لیکن خود تھیلے کا مضبوط کپڑا گیلا ہو کر اکڑ گیا تھا۔ تھیلے کو انگھیٹی کے سامنے رکھ کر اس نے کلاشن کوف کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ اور خود انگھیٹی کے سامنے ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی ۔اس نے موٹا اونی کوٹ پہنا ہوا تھا مگر گرم کمرے سے نکل کر باہر کا رخ کرنے والے سے سردی صحیح حال پوچھتی تھی۔

میں نے ممنونیت سے کہا۔''بہت شکریہ۔''

''ویسے آپ اس طوفان میں کیسے پھنسے؟''اس نے بھی وہی سوال پوچھا جو پہلے اس کا والد پوچھ چکا تھا ۔جواباً میں نے وہی باتیں دہرا دیں جو اس کے باپ کو بتائی تھیں ۔اپنی بات کے اختتام تک میں کھانے سے فارغ ہو گیا تھا۔

برتن سمیٹتے ہوئے وہ پوچھنے لگی۔''کچھ اور چاہیے؟''

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔''اگر دودھ والی چائے مل جاتی......''

''کیوں نہیں......''خوش دلی سے کہتے ہوئے وہ باپ کی جانب متوجہ ہوئی۔''بابا جان!......آپ چائے لیں گے۔''

اس نے کراہتے ہوئے کہا۔''بنا رہی ہو تو پی لوں گا۔''

''شمریز چچا!ایک بات کہوں خفا تو نہیں ہوں گے۔''

''کھل کر کہو ذیشان میاں۔''وہ بس مسکرانے کی کوشش ہی کر پایا تھا۔

''جب تک ٹانگ سے گولی نہیں نکلے گی آپ یونھی تکلیف محسوس کرتے رہیں گے۔ بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زخم مزید بگڑتا جائے گا۔زیادہ وقت گزرنے پر آپ کو نا قابل تلافی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔''

وہ افسردہ لہجے میں بولا۔''جانتا ہوں، مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔جب تک موسم ٹھیک نہیں ہو جاتا ہم خان کلے تک نہیں پہنچ سکتے۔اور گولی بھی نہیں نکل سکتی۔''

میں نے کہا۔''اگر تھوڑی تکلیف برداشت کر لو تو شاید میں بھی یہ گولی نکال لوں۔''

”تکلیف تو اب بھی برداشت کر رہا ہوں۔“

”اس سے تو کچھ زیادہ ہوگی ......لیکن ان شاء اللہ اس کے بعد آرام ضرور آجائے گا اور آپ کو خان کلے جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔“

”مگر آپ یوں بغیر کسی اوزار کے..........میرا مطلب ہے گولی ہے کوئی کانٹا تو نہیں ہے کہ سوئی کے ساتھ نکل آئے۔“اس کے لیے میری آفر حیرانی کا باعث بنی تھی۔

”یہ میرا درد سر ہے، آپ برداشت کرنے والے بنیں۔“

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔”سر پر پڑی مصیبت کو جھیلنا پڑتا ہے۔“

”ٹھیک ہے صبح روشن ہونے پر ان شاء اللہ آپ کی ٹانگ سے گولی نکالوں گا۔“یہ کہہ کر میں چارپائی سے اٹھ کر اپنے سفری تھیلے کی جانب بڑھ گیا۔ دیوار سے لٹکی جائے نماز اتار کر میں نے انگھیٹی کے سامنے بچھائی اور اپنا تھیلا کھول کر سارا سامان باہر نکال کر جائے نماز پر رکھنے لگا۔ وہ سفری تھیلا پیراشوٹ کے مضبوط کپڑے کا بنا ہوا تھا اس کے باوجود نمی کا اچھا خاصا اثر اندر پہنچا تھا۔ البتہ تھیلے کے اندر رکھی ہوئی ضروری اشیا چونکہ پلاسٹک کے لفافوں میں بند تھیں اس لیے انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ورنہ ابتدائی طبی امداد کے تو سارے سامان نے برباد ہو جانا تھا۔ سامان کو انگھیٹی کے سامنے پھیلا کر رکھنے کے بعد میں نے کلاشن کوف کو بھی مکمل کھول کر اس کے پرزے خشک ہونے کے لیے انگھیٹی کے سامنے رکھ دیے تھے۔ اسی اثناء میں گلگارے چائے کی پیالیوں کے ساتھ پہنچ گئی تھی۔ چائے کی کیتلی کے ساتھ وہ تین خالی پیالیاں لے آئی تھی۔ ہمیں ایک ایک پیالی پکڑا کر اس نے تیسری پیالی میں اپنے لیے چائے انڈیل لی۔

چائے بہت اچھی بنی تھی، بس میٹھا ذرا زیادہ ہو گیا تھا۔ چائے پی کر میں نے گلگارے سے کوئی پرانا خشک کپڑا اور اپنا پستول مانگا۔ اور وہ سر ہلاتے ہوئے چائے کے برتن سمیٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی آمد ایک پرانی زنانہ قمیص اور گلاک نائینٹین کے ساتھ ہوئی تھی۔

اس کے ہاتھ سے پرانا کپڑا لے کر میں نے کلاشن کوف اور پستول کے پرزوں کو اچھی طرح خشک کیا ۔ دونوں ہتھیاروں کی میگزینوں سے گولیاں نکال کر انھیں بھی خشک کیا اور تمام سامان کو انگھیٹی کے سامنے مزید

خشک ہونے کے لیے رکھ کر رضائی میں گھس گیا۔گلگارے کافی دیر کی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔شمریز خان بھی اونگھ رہا تھا۔میری بھی آنکھیں بند ہونے لگیں۔رات کے دو بج رہے تھے۔میرے پاس آرام کرنے کے لیے چار ساڑھے چار گھنٹے موجود تھے۔طلوع آفتاب کہیں پونے سات بجے ہوتا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن موسم کی صورت حال برقرار رہی۔نماز پڑھ کر میں دوبارہ لیٹ گیا تھا۔تھوڑی دیر بعد میرے لیے رنڑا ناشتا لے آئی۔وہ چودہ سال کی تھی مگر اچھی صحت کی وجہ سے دیکھنے میں کچھ بڑی ہی لگ رہی تھی۔اس کے معصوم چہرے پر کئی سوال مچل رہے تھے۔ناشتا میرے سامنے رکھ کر اس نے خالی چارپائی پر نشست سنبھال لی۔اسی وقت اس سے چھوٹا بھائی ثمر خان بھی وہاں پہنچ گیا۔شرماتے ہوئے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بہن کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

’’تو آپ کا نام ثمر خان ہے؟‘‘انھیں مانوس کرنے کے لیے میں نے خود ہی گفتگو کی ابتدا کی تھی۔

’’جی لالا۔‘‘اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

’’اسکول پڑھتے ہو؟‘‘

وہ معصومانہ انداز میں بولا۔’’یہاں پر اسکول ہے ہی نہیں، البتہ مولوی صاحب سے قرآن پڑھنے جاتا ہوں۔‘‘

میں نے پوچھا۔’’کہاں جاتے ہو؟‘‘

’’یہیں اپنے گاؤں میں۔‘‘

’’کیا یہاں اور گھر بھی ہیں؟‘‘

ثمر خان کے بجائے اس کا باپ شمریز جواب دیتے ہوئے بولا۔’’ہاں ذیشان صاحب!...... پہاڑی کے عقب میں ہمارا چھوٹا سا گاؤں ہے خواگاوبو۔قریباً بیس پچیس گھر ہوں گے۔ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جہاں مولوی صاحب بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے ہیں۔‘‘

’’اور میری چھوٹی سی بہن رنڑا بھی وہاں جاتی ہے۔‘‘

’’میں باجی سے پڑھتی ہوں۔‘‘ میرے مخاطب کرنے پر وہ کھل اٹھی تھی۔ میں تھوڑی دیر دونوں بچوں سے عام سے سوالات پوچھتا رہا، اس دوران ان کی بڑی بہن گلگارے بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ طلوعِ آفتاب کے باعث اچھی خاصی روشنی بھی ہوگئی تھی۔ میں گلگارے کو مخاطب ہوا......

’’گلگارے بہن!...... ایسا کرو ایک برتن میں پانی گرم کر کے لے آؤ، صاف نرم کپڑا، قینچی اور ایک لمبی رسی بھی لے آؤ۔‘‘

’’خیر تو ہے۔‘‘ میری فرمائش سن کر اسے حیرانی ہوئی تھی۔

میں مسکرایا۔’’آپ کے بابا جان کی خیر نہیں ہے۔‘‘

اسے ہنوز حیرانی میں مبتلا پا کر میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔’’شمریز چچا کی ٹانگ سے گولی نکالنا بہت ضروری ہے ورنہ دیر ہونے کے ساتھ زخم کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔‘‘

’’کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟‘‘

میں نے کہا۔’’ہاں، کچھ ایسا ہی سمجھو۔‘‘

ایک لمحہ مجھے گھورنے کے بعد وہ رنڑا اور ثمر خان کو رسی لانے کا بتا کر واپس مڑ گئی۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد مطلوبہ سامان پہنچ گیا تھا۔ ان تمام کے ساتھ مل کر میں نے شمریز خان کی چار پائی کو اٹھا کر انگھیٹی کے نزدیک کیا اور ثمر خان کو کمرے کا دروازہ مکمل کھولنے کو کہا تا کہ روشنی ہو جائے۔ سارے انتظامات مکمل ہونے کے بعد میں نے کہا......

’’گلگارے بہن!...... آپ ان دونوں کو ساتھ لے کر چلی جائیں۔‘‘

’’شش...... شاید آپ کو میری مدد کی ضرورت پڑے۔‘‘ اس نے ہکلاتے ہوئے آفر کی۔ یقیناً وہ والد کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ والد اور بیٹی کا بھی عجیب رشتہ ہے، کمزور اور نازک اندام بیٹی کے بس میں ہو تو والد کی تمام تکالیف اپنے ذمہ لے لے۔ حالانکہ بعض باپ اپنی بیٹی کے بہت سارے حقوق کی ادائی میں غفلت برت جاتے ہیں اس کے باوجود بیٹی کے دل سے اپنے باپ کی محبت کم نہیں ہوتی۔

''اچھا بچوں کو باہر بھیج دو۔'' میں اصرار کیے بغیر اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یوں بھی آپریشن کے دوران مجھے اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ شمریز خان کے بدن سے لحاف اٹھا کر میں نے خالی چارپائی پر پھینک دیا۔ اسے گھٹنے سے ذرا اوپر گولی لگی تھی۔ گلگارے یا اس نے خود شلوار کے اوپر ہی سے ایک بڑی چادر زخم پر لپیٹ دی تھی ۔ جس کے لپیٹنے کا بس اتنا فائدہ ہوا تھا کہ خون کا بہاؤ رک گیا تھا۔ ان کا جانے انجانے میں کیا ہوا یہ کام شمریز خان کی زندگی کی ضمانت بن گیا تھا۔ میں نے زخم پر بندھی پٹی کھول کر قینچی سے اس کے زخم پر موجود شلوار کا بڑا سا ٹکڑا کاٹ دیا تا کہ زخم کے علاج میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ابتدائی طبی امداد کے سامان میں میں نے فورسپ بھی رکھا تھا۔ اس باریک منھ والا آلے سے جسم میں موجود گولی کو پکڑ کر نکالا جا سکتا ہے۔ آپریشن کرنے والے سرجن کے پاس تو کئی قسم کے فورسپ ہوتے ہیں لیکن ہم جیسوں کو تو بعض اوقات کسی باریک دھار کے خنجر سے بھی یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ البتہ خنجر اور فورسپ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ خنجر سے زخم کا منھ بھی چر جاتا ہے اور خنجر سے کام لینے والے کو اس کام میں زیادہ ماہر بھی ہونا چاہیے۔ کیونکہ خنجر کی نوک سے ٹٹول کر گولی کو محسوس کرنا اور پھر نوک ہی کی مدد سے گولی کو زخم سے باہر نکالنا نہایت دشوار اور مشکل ہوتا ہے۔ اس پر مستزاد تکلیف میں مبتلا شخص کی کراہنا اور سسکنا ہوتا ہے۔ گو طبی لحاظ سے خنجر سے گولی نکالنا شاید سراسر غلط ہو، اس طرح متاثر شخص کو اس طریقہ کار سے بھی بہت زیادہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر یہ وقتی تکلیف بعد میں ہونے والی معذوری یا زخم کے ناسور میں تبدیل ہونے کی اذیت سے بہت بہتر ہوتی ہے۔

زخم کو دھونے سے پہلے میں نے شمریز خان کو مخصوص طریقے سے باندھ دیا تا کہ وہ تکلیف کی وجہ سے ہل جل کر خود کو مزید زخمی نہ کرا بیٹھے۔ اسے باندھنے کے بعد میں نے گرم پانی سے اس کا زخم دھویا اور زخم پر تھوڑی سپرٹ بھی ڈال دی۔ دھونے اور سپرٹ سے خون کا بہاؤ پھر جاری ہو گیا تھا۔ کپڑے کا ایک گولا بنا کر میں نے شمریز خان کے حوالے کیا تا کہ وہ دانتوں میں دبا کر اپنی چیخ روکنے کی کوشش کر سکے۔ اس کے بعد فورسپ کو اسپرٹ سے تر کر کے میں آپریشن کے لیے تیار تھا۔

پہلی مرتبہ مجھے پلوشہ کے بدن سے گولی نکالنا پڑی تھی اور اسے تکلیف میں مبتلا دیکھ کر میرے ہاتھوں میں لرزش شروع ہو گئی تھی۔ لیکن آج مجھے کسی قسم کی جھجک یا پریشانی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں اطمینان سے اپنا کام

کرنے لگا۔

فورسپ کو زخم کے اندر ڈالتے ہی شمریز خان کی مٹھیاں اذیت کی زیادتی سے بھینچ گئی تھیں۔سختی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے اس کے منھ سے درد بھری سسکیاں نکل رہی تھیں۔گلگارے نے بے ساختہ اس کا سر سہلانا شروع کر دیا تھا۔وہ باپ کے زخم کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی۔کافی ہمت اور حوصلے والی ہونے کے باوجود اس میں اتنی ہمت مفقود تھی کہ براہ راست آپریشن ہوتا دیکھ سکتی۔ایسا منظر کم لوگ ہی دیکھ پاتے ہیں۔وہ پلوشہ ہی تھی جو گلگارے سے بھی عمر میں سال دو سال چھوٹی ہوگی اور دیکھنا تو چھوڑ وہ خود اپنے ہاتھوں یہ کام کر گزرتی تھی۔

فورسپ کی نوک کا گولی سے ٹکرانا مجھے محسوس ہو گیا تھا۔گولی کو احتیاط سے فورسپ کے منھ میں پکڑ کر میں نے آہستگی سے آلے کو باہر کھینچ لیا۔گولی کے باہر آتے ہی شمریز خان نے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔اس نے دانتوں میں پکڑا کپڑا زبان کی مدد سے باہر دھکیلا اور اس کے ساتھ ہی اس کے منھ سے گہرا سانس خارج ہوا۔

میں نے صاف کپڑا زخم کے منہ پر دبا کر بھل بھل بہتے خون کو روکا اور گلگارے کو کہا۔

’’والد کے جسم سے رسی کھول لو۔‘‘

میرے اچانک پکارنے پر وہ ہڑبڑا سی گئی تھی۔اس کے ساتھ ہی اس نے دھیمے لہجے میں۔’’جی۔‘‘ کہا اور رسی کی طرف متوجہ ہوگئی۔اس کے رسی کھولنے تک میں نے زخم کے منہ پر پٹی کو دبائے رکھا۔جونہی وہ رسی کھول کر فارغ ہوئی میں نے کہا......

’’اس پٹی کو یہاں دبا کر رکھو۔‘‘

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ میرے قریب ہوئی۔میں نے پیچھے ہو کر اسے زخم پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دی اور خود دوائیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔سب سے پہلے میں نے صاف کپڑے سے مناسب لمبائی میں دو تین پٹیاں پھاڑیں۔پھر پائیوڈین کی بوتل کھول کر میں نے گلگارے کو پیچھے ہٹنے کو کہا۔

زخم پر تھوڑی سی پائیوڈین ڈال کر ساتھ ہی درد کش اور خون کے بہاؤ کو روکنے والا سفوف زخم میں بھر دیا۔اس کے اوپر ایک پٹی تہہ کر کے رکھتے ہوئے میں نے دوسری پٹی زخم پر لپیٹ دی۔پٹی سے فارغ ہو کر میں نے درد کش ٹیکہ تیار کر کے شمریز خان کو پہلو کے بل لٹایا اور جسم کے پر گوشت حصے میں وہ ٹیکہ لگا دیا۔اس کے بعد اینٹی

بائیوٹک ٹیکہ بھی اس کی رگ میں لگا کر میں اس سے حال پوچھنے لگا۔

''کافی بہتر محسوس ہورہا ہے، درد بھی ختم ہونا شروع ہوگیا ہے۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' گلگارے نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔''آپ تو شاید ہماری مدد کرنے آئے تھے، میں سمجھ رہی تھی ہم آپ کی مدد کررہے ہیں۔''

''گلگارے بہن!......آپ نے تو مجھے نئی زندگی دی ہے۔میں نے جو کام کیا ہے یہ آج نہیں تو کل پرسوں تک ڈاکٹر صاحب نے کردینا تھا۔اور یقیناً وہ مجھ سے بہت بہتر انداز میں یہ کام سرانجام دیتا۔''

''پتا نہیں موسم نے کب ٹھیک ہونا ہے۔اور ڈاکٹر صاحب کوئی کلومیٹر بھر کے فاصلے پر تو نہیں بیٹھا کہ ہم آسانی سے وہاں پہنچ جائیں۔اس علاقے میں ڈاکٹر صاحب تک مریض کو لے جاتے ہوئے مریض کی جو حالت ہوتی ہے وہ میں بیان نہیں کرسکتی۔اور بابا جان کی طرح زخمی آدمی کا تو ستیاناس ہوجاتا ہے۔گولی نکالنے کے لیے بھی ڈاکٹر صاحب کم از کم پندرہ بیس ہزار روپے طلب کرتا ہے۔دوائیوں کا خرچ ایک علیحدہ مسئلہ ہوتا ہے۔آپ نہیں جانتے آپ نے ہمیں کتنی پریشانیوں سے چھٹکارا دلایا ہے۔''

میں نے مزید تکرار سے بچتے ہوئے کہا۔''مجھے خوشی ہوئی کہ میں اپنی چھوٹی بہن کے کسی کام آیا۔'' یہ کہہ کر میں گرم پانی سے اپنے ہاتھ اور فورسپ کو دھونے لگا۔وہ اپنے والد کے سرہانے کے ساتھ بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی تھی۔تمام سامان سنبھال کر میں نے شمریز خان کو کھلانے کے لیے درد کش اور اینٹی بائیوٹک گولیاں گلگارے کی طرف بڑھا دیں۔اور ساتھ ہی اسے گولیاں کھلانے کی ترتیب بھی بتا دی۔

رنڑا اور ثمر خان ساتھ والے کمرے کے دروازے سے بار بار متجسس ہوکر جھانک رہے تھے۔

''آپ دونوں بھی آجاؤ۔'' میں نے انھیں آواز دی اور وہ بھاگ کر اندر آگئے۔رنڑا تو آتے ساتھ باپ سے لپٹ گئی تھی۔

''اب میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹی!'' وہ اس کا سر تھپتھپانے لگا۔اللہ پاک کی قدرت بھی عجیب ہے۔یقیناً ان معصوم لڑکیوں نے اپنے باپ کی تکلیف دور ہونے کے لیے خلوص دل سے دعا کی ہوگی اور وہ عظیم رب مجھ جیسے گناہ گار کو ان کی مدد کے لیے اس انداز میں گھسیٹ کر وہاں تک لے آیا تھا۔ورنہ اس سے پہلے میں کبھی بھی کسی

غار وغیرہ کی تلاش میں اتنا سرگرداں نہیں رہا تھا۔ان پہاڑوں میں گھنٹے ادھ گھنٹے کی تلاش کے بعد ہی کوئی نہ کوئی پناہ گاہ مل جایا کرتی تھی۔گزشتہ دن میں شام تک پاگلوں کی طرح پھرنے کے بعد بھی کوئی ٹھکانہ ڈھونڈ نہیں سکا تھا۔انھیں باتیں کرتا چھوڑ کر میں اپنی کلاشن کوف اور پستول کے ساتھ مصروف ہو گیا۔شاید گلگارے میری ہی جانب متوجہ تھی کہ جونہی میں نے کلاشن کوف کے پرزوں کو ہاتھ لگایا وہ فوراً بولی۔

''اگر چاہیے ہو تو گھر میں رائفل کا تیل پڑا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہو گا۔''میں خوش ہو گیا۔

''ابھی لائی۔''وہ سر ہلاتے ہوئے ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔اس کی واپسی ایک درمیانے حجم کی پلاسٹک کی بوتل کے ساتھ ہوئی جس میں ہتھیاروں پر لگانے والا تیل بھرا تھا۔یہ تیل ہتھیار کے پرزوں کو زنگ وغیرہ لگنے سے بھی محفوظ رکھتا ہے اور چال والے پرزوں کی حرکت میں بھی آسانی پیدا کرتا ہے۔

''شکریہ۔''کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ سے تیل کی بوتل پکڑ لی۔

☆......☆......☆

سہ پہر تک برف باری رک گئی تھی۔لیکن بادل اب تک ویسے ہی موجود تھے۔میں اس وقت انگیٹھی کے سامنے نمک ملے گرم پانی کی ادھ بھری بالٹی میں پاؤں ڈبوئے بیٹھا تھا۔گزشتہ کل میرے پیروں کو جس سردی کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کا اثر اب تک ہلکے ہلکے درد کی صورت میں موجود تھا۔اور اس درد کا بہترین حل نمک ملا گرم پانی ہی تھا۔

گلگارے اپنے والد کا سر دبا رہی تھی۔اسے اچھا خاصا بخار ہو گیا تھا۔میں نے سر درد اور بخار والی گولی بھی اسے کھلا دی تھی۔رنڑا اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ خشک لکڑیاں اکٹھی کرنے گھر سے باہر نکل گئی تھی۔اچانک وہ بھاگتے ہوئے گھر میں داخل ہوئی۔

''بب......باجی،اس دن والے آدمی اس طرف آ رہے ہیں۔ان کے ساتھ تین آدمی اور بھی ہیں۔''یہ بتاتے ہوئے اس کے معصوم چہرے پر خوف کے مارے ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

لڑکیوں کی جنس ایسی ہے کہ انھیں مردوں کے گندے ارادے کے بارے فوراً ہی اندازہ ہو جاتا ہے۔ دو روز پہلے ان ظالموں نے اس معصوم کو غلط نیت ہی سے پکڑنا چاہا تھا اور آج ان کی آمد پر وہ ایک دم سہم گئی تھی۔ اس نے فوراً اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اسی کے لیے لوٹے ہوں گے۔ حالانکہ اس سے بڑی بہن بھی موجود تھی، مگر ان موذیوں کی نظر ابھی تک گلگارے پر نہیں پڑی تھی۔

''دروازہ بند کر دیا ہے نا، ثمر خان کہاں ہے؟'' گلگارے نے اطمینان بھرے انداز میں پوچھا۔ مجھے اس کے چہرے پر ذرا بھر بھی خوف نظر نہیں آیا تھا۔

''میں یہیں ہوں باجی۔'' دروازے کی طرف سے ثمر خان کی آواز آئی۔

میں نے اپنے پاؤں بالٹی سے نکالے اور تولیے سے صاف کر کے جرابیں ڈالنے لگا۔ جونہی میں نے بوٹوں میں پاؤں ڈالے وہ حیرانی سے پوچھنے لگی۔ ''آپ کیوں تیار ہونے لگے۔''

''شاید آنے والے مہمانوں سے کوئی بات چیت کرنا پڑ جائے۔''

''آپ ان کی فکر نہ کریں، برساتی مینڈکوں کی طرح یہ اچکے بھی برف باری کے دنوں میں نمودار ہو جاتے ہیں...... اس سے پہلے بھی دو تین بار ان جیسوں سے واسطہ پڑ چکا ہے، حد درجہ کے بزدل ہوتے ہیں۔ ہوائی فائر سن کر بھی بھاگنے میں دیر نہیں لگاتے۔''

''تو اب کیا کریں، یونھی دروازہ بند کر کے بیٹھے رہیں۔''

''نہیں، دو تین گولیاں تو ضائع کرنا پڑیں گی۔ میں مورچے پر چڑھتی ہوں۔'' والد کا سر دبانا چھوڑ کر وہ دیوار میں کیل کے سہارے ٹنگی کلاشن کوف اتارنے لگی۔

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ میں نے اپنی طرف دیکھتی گلگارے کو آنکھوں سے استفہامیہ اشارہ کیا۔

وہ فوراً بولی۔ ''کوئی ضرورت نہیں ہے دروازہ کھولنے کی، میں مورچے پر چڑھ رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے آپ مورچے پر پہنچیں، میں دروازے پر جا کر ان سے وجہ پوچھتا ہوں، ہو سکتا ہے مسئلہ بات چیت سے حل ہو جائے۔''

''یہ لاتوں کے بھوت ہیں۔''

''پھر بھی پوچھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اپنی گولیاں اور توانائی خواہ مخواہ ضائع نہ کرو۔'' گلگارے کو کہہ کر میں نے گلاک نائینٹین کا کک کر کے ہاتھ میں تھاما اور گرم چادر اوڑھتے ہوئے رنڑا کو کہنے لگا۔ ''تم کمرے کا دروازہ اندر سے بند کردو۔''

''جی لالا۔'' وہ اثبات میں سرہلانے لگی۔ گلگارے بھی مزید تکرار کیے دوسرے کمرے میں لگی سیڑھی کی جانب بڑھ گئی جس کے ذریعے وہ چھت پر بنے مورچے میں پہنچ سکتی تھی۔

وقفے وقفے سے ان کا دستک دینا جاری تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے رسمی انداز میں پوچھا ۔''کون؟''

''دروازہ کھولو۔'' میری نرم آواز نے اسے لہجہ سخت کرنے کی شہہ دی تھی۔

دروازے میں بنی ذیلی کھڑکی کی کنڈی کھول کر میں باہر نکلا، ان میں سے دو دروازے کے قریب جبکہ تین چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑے تھے۔ دستک دینے والوں میں ایک کے ہاتھ میں ایٹ ایم ایم اور دوسرے کے ہاتھ میں کلوز بٹ کلاشن کوف تھی، جبکہ تھوڑی دور کھڑے افراد میں دو کے ہاتھ میں تیس بور پستول اور ایک نے سنگل بیرل بارہ بور اٹھائی ہوئی تھی۔

''جی۔'' سلام ودعا اور مصافحے کے بغیر میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''میں طالبان کمانڈر ہوں اور پرسوں اس گھر سے میرے آدمیوں پر فائر کیا گیا ہے۔'' گھنے گھنگریالے بال ،لمبی مونچھوں اور ہلکی داڑھی والے ایک آدمی نے دھمکی آمیز لہجے میں گفتگو کی ابتدا کی تھی۔

''تو جن پر گولیاں چلائی گئیں انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس وقت وہ کس عبادت کی بجا آوری کی کوشش میں تھے۔'' میں نے بہ ظاہر عام سے انداز میں کہا۔ میرے لہجے سے غصے یا خوف کا کوئی اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

''ایسی کوئی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے راستے پر جا رہے تھے کہ ایک نوجوان لڑکی نے انھیں دیکھا اور ڈر کر گھر کی طرف بھاگ پڑی۔ حالانکہ کہ انھوں نے لڑکی کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔''جانتے ہو جھوٹ بولنے کے لیے بھی اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے۔''

اس کے ساتھ کھڑا دوسرا آدمی بپھر کر بولا۔ ''جھوٹ نہیں بول رہے، تم ذرا اس لڑکی کو باہر بلاؤ۔''

''وہ میری چھوٹی بہن ہے اور اس نے ان بزدلوں کا جو حلیہ بتایا ہے وہ بالکل تم دونوں جیسا ہے۔ تمھاری خوش قسمتی کہ اس دن تم بچ نکلے، مگر یقین مانو خوش قسمتی ہمیشہ ساتھ نہیں دیا کرتی۔''

''دھمکی دے رہے ہو؟'' خود کو کمانڈر بتانے والے کا غصہ دیدنی تھا۔

''نہیں۔'' میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ''جان بچانے کا موقع دے رہا ہوں۔''

''یقیناً تم ہم سے واقف نہیں ہو ورنہ بڑھکیں مارنے کے بجائے اپنی جان بچانے کا سوچتے۔''

میں متبسم ہوا۔ ''جانتا نہ ہوتا تو شاید کچھ اہمیت دے بھی دیتا۔''

''چلو تعارف کرا دیتے ہیں۔'' اس نے کندھے سے لٹکی کلاشن کوف اتاری۔ اس کے ساتھی نے بھی ایٹ ایم ایم رائفل ہاتھ میں تھام لی تھی۔ اچانک ہی ماحول دھماکوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ مسلسل تین گولیاں چلائی گئی تھیں اور ساری گولیاں خود کو کمانڈر کہنے والے کلاشن کوف بردار کے سامنے زمین میں لگی تھیں۔

دھماکے کی آواز سنتے ہی وہ حیرت اور خوف سے اچھل پڑے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی نظریں مکان کے سامنے والی دیوار کے دائیں کونے میں بنے مورچے کی طرف اٹھیں جہاں سے کلاشن کوف کی بیرل جھانک رہی تھی۔ گلگارے نے اپنا کالا دوپٹا پگڑی کے انداز میں سر پر باندھ کر اس کا ایک پلو چہرے سے بھی لپیٹ لیا تھا۔ مورچے کے ہول سے کلاشن کوف کی بیرل کے ساتھ اس کے چہرے کی بھی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں سے وہ ایک مرد ہی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باعتماد فائر نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کلاشن کوف کا استعمال جانتی تھی۔ میں نے بھی چادر کے نیچے چھپایا پستول باہر نکال لیا تھا۔

ایک دو لمحے مورچے کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھنے کے بعد نام نہاد کمانڈر اپنے ساتھیوں کو بولا۔

''چلو پھر کبھی سہی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پیچھے مڑا۔

''بات سنو۔'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر دوبارہ اس گھر کی طرف آنا ہو تو اپنے دوسرے ساتھیوں کو بتا کر آنا، کیونکہ واپسی کے لیے تمھیں ان کے کندھوں کی ضرورت پڑے گی۔''

''دیکھ لوں گا تمھیں۔'' گیدڑ بھبکی دیتے ہوئے وہ دوبارہ چل پڑا تھا۔

''اگر میرے پانچ گننے تک یہ غائب نہ ہو جائیں تو سب سے آخر والے کو گولی مار دینا۔'' گلگارے کی جانب رخ کر کے میں نے اس کا نام لیے بغیر کہا۔اس کے ساتھ ہی میں نے زور سے۔''ایک'' پکارا تھا۔

ان سورماؤں کی ٹانگوں میں ایک دم جان پڑ گئی تھی۔میرے تین کہنے تک وہ ڈھلان سے اتر کر میری نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔

میں مسکراتے ہوئے واپس مڑ گیا۔میرے کمرے میں داخل ہونے تک گلگارے بھی نیچے آ گئی تھی۔اس کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھل رہی تھی۔کلاشن کوف کو دیوار کے سہارے کھڑا کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''دیکھ لی ان کی بہادری۔''

''یقیناً آپ کی نشانہ بازی سے ڈر کر بھاگنے پر مجبور ہوئے ہیں۔''

رنڑا نے فوراً کہا۔''ہاں لالا جی!......باجی کا نشانہ بہت اچھا ہے۔بابا جان سے بھی اچھا ہے۔''

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔''خاک اچھا ہے،اتنے قریب سے بھی تین گولیاں چلا کر ان لٹیروں کو نشانہ نہیں بنا پائی۔''

''مرد کبھی بھی یہ بات تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتا کہ کوئی عورت اس سے بہتر انداز میں ہتھیار کو استعمال کر سکتی ہے۔''میرے مذاق کو جانے کیوں اس نے سنجیدگی سے لے لیا تھا۔

''گلگارے بہن!......میں مذاق کر رہا تھا۔''میں نے فوراً ندامت ظاہر کی۔

''میں نے بھی آپ کی بات نہیں کی،ایک تلخ حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔''وہ میری ندامت کو خاطر میں نہیں لائی تھی۔

''ضروری تو نہیں کہ اپنے والد سے اچھی نشانہ باز لڑکی،ہر مرد سے بہتر ہو......یقیناً آپ سے بہتر کئی مرد نشانہ باز دنیا میں موجود ہوں گے۔''نہ جانے کیوں مجھے اس کا انداز اچھا نہیں لگا تھا۔

''آ جائیں،آپ بھی تو مرد ہی ہیں نا۔''اس نے مجھے للکارنے میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کیا۔

''میں نے اپنے بارے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔''میں نے پسپا ہونے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''جس دن خود سے بہتر نشانے باز نظر آ گیا مجھے ضد پر جری نہیں پاؤ گے۔''

اسی وقت خاموش لیٹے شمریز خان نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''گلگارے تو میرا بیٹا ہے بیٹا ہے۔''

''نہیں بابا جان!......میں آپ کی بیٹی ہوں اور مجھے عورت ذات ہونے پر فخر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھا اور باپ کے سرہانے کے ساتھ بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگی۔

''شمریز چچا!......آپ کو یقین ہے کہ یہ دوبارہ نہیں آئیں گے۔''

''ذیشان صاحب، ہمارے علاقے میں مختلف پارٹیاں سرگرداں رہتی ہیں، ان میں مجاہدین، اسمگلر، شکاری، چور اچکے، دہشت گرد، ناقابل معافی جرم کر کے چھپنے کی غرض سے یہاں آنے والے وغیرہ۔ان سب کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں۔ان میں سب سے بڑی مصیبت ازبک اور تاجک دہشت گرد ہوتے ہیں جو پورے پورے گاؤں پر قابض ہو جاتے ہیں۔چونکہ ہمارا گاؤں کچھ زیادہ اچھی جگہ پر واقع نہیں ہے اس لیے کوئی ایسا گروپ اس طرف متوجہ نہیں ہوا۔البتہ چھوٹے موٹے چور اچکے جو تین تین چار چار کی تعداد میں پھر رہے ہوتے ہیں آئے روز تنگ کرتے رہتے ہیں۔یہ بھی عموماً اس جگہ ہاتھ ڈالتے ہیں جہاں انھیں مزاحمت نہ ہونے کا یقین ہو۔البتہ کسی خاص چیز کے لالچ میں یہ دو تین بار کوشش ضرور کرتے ہیں اور ایسی حالت میں کبھی جان سے جاتے ہیں کبھی وہ چیز حاصل کر لیتے ہیں۔اور ہمارے پاس ایسی کون سی خاص چیز ہے جس کے پیچھے انھیں بار بار آنے کی زحمت کرنا پڑے۔''

میرے دماغ میں فوراً رنڑا کا نام گونجا۔وہ چودہ پندرہ سال کی ایسی کھلتی ہوئی کلی تھی جس کے پیچھے ہوس کے پجاری، بھیڑیوں کی طرح دانت نکوسے ہوئے وہاں پہنچے تھے۔مجھے ان کی گفتگو بھولی نہیں تھی۔ گفتگو کی ابتداء ہی میں انھوں نے رنڑا کو بلانے کی بات کی تھی۔اور کسی بھی جنسی مریض کے لیے سب سے اہمیت کی حامل ایسی لڑکی ہوتی ہے جس پر اس کا دل آ جائے۔مجھے بھی ان درندوں سے یہی خدشہ تھا کہ ان میں کسی کا ایک دل رنڑا پر آ گیا تھا اور اب وہ اتنی جلدی پیچھا چھوڑنے پر راضی نہ ہوتے۔گندگی بھرے ذہن کی سوچوں کو کلاشن کوف کی گولی ہی صاف کر سکتی ہے۔میں انھیں واپس جانے دینے کے فیصلے پر پچھتانے لگا۔اپنے خیالات میں میں شمریز خان یا گلگارے کو حصہ دار نہیں بنا سکتا تھا۔نہ یہ ایسے اندیشے تھے جن پر کسی لڑکی کے باپ سے تبادلہ خیال کیا جا سکتا۔اس لیے میں نے ان کی خوش فہمی برقرار رکھتے ہوئے چپ سادھ لی تھی۔

مجھے خاموش پا کر شمریز خان پوچھنے لگا۔ ’’کن خیالوں میں کھو گئے ہو۔‘‘

’’بس یہ سوچ رہا تھا کہ وہ خبیث دوبارہ کس لیے لوٹے تھے۔‘‘ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے کچھ نہ کچھ اندیشے ان کے دماغ میں ابھارنے چاہے۔

خاموش بیٹھی گلگارے بولی۔ ’’کیونکہ پہلے انھیں خاطر خواہ طریقے سے خوش آمدید نہیں کہا گیا تھا۔‘‘

’’بہرحال کچھ بھی ہو میرے جانے کے بعد آپ لوگ محتاط رہنا۔‘‘

’’میرا خیال ہے ہم اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ باقی دو دنوں میں ہمیں آپ کی عادت نہیں پڑ گئی کہ آپ کے جانے کا دکھ یا کمی محسوس ہو۔‘‘

گلگارے نے کافی تلخ مگر مبنی بر حقیقت بات کہی تھی۔ اور ایسی سچی بات کو ہضم کرنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ مگر وہ میری محسن تھی اور میں اسے سخت جواب دے کر اس کا دل نہیں دکھا سکتا تھا۔

میں نے۔ ’’آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔‘‘ کہہ کر چپ سادھ لی تھی۔

☆......☆......☆

رات کو کھانے کے خالی برتن میرے سامنے سے اٹھاتے ہوئے گلگارے دھیمے لہجے میں بولی۔ ’’میں اپنی سہ پہر کی گفتگو پر معذرت خواہ ہوں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’بہنوں کا بھائیوں سے معذرت کرنا عجیب سا لگتا ہے۔‘‘

’’صحیح کہا۔ میرا نقطہ نظر بھی یہی ہے۔‘‘ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ’’بہرحال میں نادم ہوں۔‘‘ نجانے کیوں مجھے اس کا انداز معنی خیز لگا تھا۔

برتن سمیٹ کر وہ باہر نکل گئی جبکہ میں شمریز خان سے طبیعت کا پوچھنے لگا۔ وہ پہلے سے کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔

آسمان بالکل صاف ہو گیا تھا اس لیے سردی تھوڑی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ گلگارے باورچی خانے میں برتن رکھ کر واپس لوٹ آئی۔ باپ کو گولیاں کھلا کر وہ اس کا سر دبانے لگی۔ میں لحاف میں چھپ گیا۔ ایک لڑکی کی موجودی میں مجھے تھوڑا عجیب سا محسوس ہوتا تھا۔ ان لوگوں کا رواج مہمان کو بیٹھک میں سلانے کا تھا، لیکن وہاں

میں جس حال میں پہنچا تھا اس کی وجہ سے مجھے گھر کے اندر جگہ مل گئی تھی اور پھر گھر کے سربراہ کا علاج کرنے کی وجہ سے انھوں نے مجھے بیٹھک کی راہ نہیں دکھلائی تو میرا ابھی کچھ حق بنتا تھا۔ سیانے کہتے ہیں کسی کے گھر مہمان بنو تو اپنی نظروں کی حفاظت کرو۔ گو میں گلگارے کو بہن ہی کہتا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے تھوڑا سا خود میں سمٹنے کی ضرورت تھی۔ یوں بھی موسم کو صاف دیکھ کر میں نے صبح آگے جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں کوئی سیر سپاٹے کے لیے نہیں آیا تھا کہ وہاں کچھ دن گزارنے کی کوشش کرتا۔ مجھے بہت اہم کام درپیش سے تھے۔ سب سے بڑھ کر اپنی پلوشہ کو تلاش کرنا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری شریک حیات آگ و خون کی جنگ کا مزید حصہ بنے۔

پلوشہ کا نام ذہن میں آتے ہی میری سوچیں اسی کی ذات پر مرتکز ہو گئیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس سے بچھڑے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اس کے ساتھ گزرے پل کسی سہانے سپنے کا حصہ لگ رہے تھے۔ اس کا روٹھنا، منانا، اس شوخیاں، شرارتیں اور چنچل پن، اس کی محبت بھری گفتگو۔ میری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھنے کا جنون۔ اس کی ہر ادا، ناز نخرا اور دلربانہ انداز میرے دماغ کے پردہ سکرین پر فلم کی طرح چلنے لگا۔ اور اسی کو سوچتے سوچتے میں نیند کی گہری وادیوں میں ڈوب گیا۔ جہاں ہر رات کی طرح اپنی آغوشِ محبت وا کیے وہ مجھے بے صبری سے اپنی منتظر نظر آئی۔

”راجو!......بھول تو نہیں گئے ہو اپنی لاڈلی کو۔“ اس نے شکوہ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

میں نے چاہت بھرے لہجے میں کہا۔ ”چندا، سانس لینا بھی کوئی بھول سکتا ہے۔“

”چل جھوٹے۔“ وہ ناز بھرے انداز میں مسکرا دی تھی۔

☆......☆......☆

اگلی صبح بستر سے نکلنے سے پہلے ہی ہوا کی سائیں سائیں مجھے وہاں مزید رکنے کا مژدہ سنا رہی تھی۔ بے وقت کی برف باری میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی تھی۔ وزیرستان میں برف باری عموماً دسمبر کے دوسرے ہفتے میں شروع ہوتی ہے۔ اور اب نومبر کے وسط میں ہونے والی برف باری نے اچھا خاصا مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے شمریز خان کی پٹی تبدیل کی۔ اب اس کے زخم میں پہلے جتنا درد نہیں تھا۔ گولیاں وغیرہ گلگارے نے اسے کھلا دی تھیں۔

ظہر کے بعد برف باری تو جاری رہی البتہ ہوا رک گئی تھی۔ میں رنڑا اور ثمر خان کو لے کر خشک لکڑیاں اکٹھی کرنے کے لیے گھر سے باہر نکل آیا۔ گلگارے نے مجھے منع کرنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اس کی بات کو درخور اعتناء نہ جانا۔ یونھی بے کار بیٹھا رہنا مجھے پسند نہیں تھا۔

برف ڈیڑھ دو فٹ کے قریب پڑ چکی تھی۔ سپورٹس شوز پہن کر اس برف میں چلنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے شمریز خان کے بوٹ ڈال لیے تھے۔ لکڑیاں اکٹھی کرنے کے لیے ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا۔ واپسی پر ہم تینوں کے سر پر لکڑیوں کے گٹھے تھے۔ آتے جاتے ہوئے راستے میں اور لکڑیاں اکٹھی کرنے کے دوران رنڑا کی زبان مسلسل چلتی رہی تھی۔ اپنے گھر، گاؤں، والد بہن، سہیلیوں وغیرہ کے بارے اس نے کوئی پہلو تشنہ نہیں رہنے دیا تھا۔ اپنی گلگارے باجی سے وہ بہت متاثر تھی اور اسی کی طرح بننا چاہتی تھی۔

خشک لکڑیاں رکھنے کے لیے انھوں نے ایک بڑا کمرہ مختص رکھ چھوڑا تھا۔ وہ کمرہ آدھے سے زیادہ لکڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لکڑیاں وہاں رکھ کر رنڑا اور ثمر خان تو چھت پر چڑھ گئے۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی کے بنے ہوئے مخصوص پھاوڑے تھے جن کی مدد سے وہ چھت پر پڑی برف اتارنے لگے۔ کہ چھت پر پڑی برف چھتوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ مجھے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ گلگارے باورچی خانے میں مصروف نظر آئی۔ دروازے پر رک کر میں نے پوچھا......

’’چائے مل جائے گی۔‘‘

اس نے خوش دلی سے کہا۔’’ضرور ملے گی۔ آئیں، یہیں بیٹھ کر پی لیں۔‘‘

مجھے وہاں بیٹھنا مناسب معلوم نہیں ہو رہا تھا مگر اس نے دعوت اس خلوص سے دی تھی کہ میں ٹھکرا نہ سکا۔ لکڑی کی چوکی پر میں چولھے کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ غالباً شام کے لیے سالن تیار کر رہی تھی۔ ہانڈی چولھے سے اتار کر اس نے چھوٹی سی دیگچی چڑھا دی۔ ایک دوسرے پتیلے میں گائے کا تازہ دودھ رکھا تھا۔ ان کی اپنی دو گائیں اور دس پندرہ بکریاں تھیں۔

میں نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔’’ویسے آپ لوگ اگر گاؤں ہی میں رہتے تو زیادہ بہتر نہ ہوتا۔ ان لچے لفنگے آوارہ گردوں سے بھی جان چھوٹ جاتی اور لوگوں کے ساتھ مل کر رہنے میں اور کئی مسائل بھی حل ہو

جاتے۔''

''ہم پہلے گاؤں ہی میں رہتے تھے۔ابھی دوسال ہوئے ہیں یہاں گھر بنائے ہوئے۔گاؤں والا گھر بھی اب تک موجود ہے۔اور گاؤں اتنی دور بھی نہیں ہے کلومیٹر ڈیڑھ کا تو فاصلہ ہے،صبح موسم میں تو دن میں دو تین بار چکر لگ جاتا ہے۔''

''پھر بھی یہاں گھر بنانے کی وجہ میری سمجھ سے باہر ہے۔''

''ایک تو یہاں پانی کا چشمہ بالکل ہی ساتھ ہے،دوسرا یہ ہماری اپنی زمین ہے یہاں اخروٹ کے پندرہ بیس درخت ہیں جن کی نگرانی ہم یہاں رہتے ہوئے آسانی سے کر سکتے ہیں،خشک لکڑی بھی وافر موجود ہے ،گاؤں میں رہتے ہوئے تو ہمیں لکڑی لینے کے لیے یہیں آنا پڑتا تھا۔اب ہماری دیکھا دیکھی ماموں جان بھی یہیں گھر بنانے کی سوچ رہے ہیں۔شاید آنے والی گرمیوں میں وہ کام کی ابتدا کر دیں۔''اس نے وہاں گھر بنانے کی وجوہات پر مفصل روشنی ڈالی۔

''ہونہہ!......مطلب میرا مشورہ ٹھیک نہیں تھا۔''

چائے کی پیالی میری جانب بڑھاتے ہوئے وہ مسکرائی۔''خیر اتنا بھی برا نہیں تھا کہ آپ پریشان ہو جائیں۔''

''اور کوئی نئی تازی۔''میں نے بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی تھام لی۔

ہانڈی دوبارہ چولھے پر چڑھا کر اس نے اپنی پیالی اٹھائی اور دھیمے لہجے میں کہنے لگی۔''ہمارے گاؤں کے ایک آدمی نصیر خان نے مجھ سے اپنے بیٹے کا رشتہ کرنے کے لیے بابا جان کو دس لاکھ کی آفر کی ہے،جبکہ بابا جان پندرہ لاکھ مانگ رہے ہیں۔''

اس کی بات سن کر میں ششدر رہ گیا تھا۔وہ کوئی ایسی معلومات نہیں تھی جو ایک جوان لڑکی کسی اجنبی لڑکے کو بتا پاتی۔مجھے اس کی بات کا کوئی مناسب جواب بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔

''شاید میری بات آپ کو بری لگی ہے۔''مجھے خاموش پا کر اس نے نظریں جھکاتے ہوئے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے؟''میں نے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر چپکائی۔''اور یوں بھی بہنوں کی کوئی بات بھائیوں کو بری نہیں لگا کرتی۔''

''اوہ......چائے میں چینی ڈالنا تو بھول ہی گئی تھی۔''صفائی سے موضوع تبدیل کرتے ہوئے وہ چینی کا ڈبہ کھولنے لگی۔''آپ نے بھی ذکر نہیں کیا۔''

''میں کم چینی پیتا ہوں محسوس ہی نہ ہوا کہ چینی بالکل نہیں ہے۔''

''کیا آپ مجاہدین کے ساتھی ہیں۔''چمچ سے چینی حل کرتے ہوئے اس نے اچانک پوچھا۔

''نہیں۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر یہاں آپ کی آمد کا مقصد؟''

''بتایا تو تھا کہ اپنے ساتھیوں کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔''

''ہاں بتایا تو تھا، مگر اس روکھے پھیکے اور جان چھڑانے کے انداز میں کہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا۔''

''کیسا اندازہ؟''میں نے حیرانی ظاہر کی۔

''یہی کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں آئے کیوں، پھر وہ آپ سے بچھڑے کیسے اور اب افغانستان جیسے دشوار گزار ملک میں انھیں ڈھونڈیں گے کیسے، آپ کا تعلق کس علاقے سے ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔''

''شاید یہ سب جاننا آپ کے لیے ضروری نہ ہو۔''میں نے جان چھڑانا چاہی۔

اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔''کسی بھی آدمی کی ضروریات اور ترجیحات کو وہ خود ہی اچھی طرح جانتا ہے۔''ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی وہ بہت نپی تلی اور بامعنی گفتگو کرتی تھی۔

''میری کہانی بہت لمبی ہے۔''

''جب دادی جان زندہ تھیں، میں روزانہ سونے سے پہلے ان سے کہانی سنا کرتی تھی۔اور ہمیشہ اس بات پر شاکی رہتی کہ ان کی کہانی اتنی جلدی ختم کیوں ہو جاتی ہے۔آپ بھی اپنی کہانی مختصر کر کے سنانے کی کوشش نہ کرنا۔''

اس کے انداز پر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔اس کے ہونٹوں پر بھی تبسم کھلنے لگا۔

''اچھا رات کو سب کچھ بتا دوں گا فی الحال میں رنڑا اور ثمر خان کا ہاتھ بٹا دوں۔'' وہ چھتیں صاف کر کے صحن میں اتر آئے تھے۔

''وہ صفائی کر لیں گے۔'' گلگارے نے مجھے منع کیا۔

''اگر میں بھی ان کی تھوڑی سی مدد کر لوں تو یقیناً میری شان میں فرق نہیں پڑے گا۔''

''اچھا وعدہ کریں رات کو اپنے متعلق سب کچھ بتائیں گے۔''

''ان شاء اللہ۔'' کہہ کر میں باورچی خانے سے باہر آ گیا۔

بہن بھائی بڑے زور و شور سے صفائی میں مشغول تھے، میں بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا شمریز خان اور میں نے اکٹھے بیٹھ کر کھایا تھا۔ رنڑا نے خالی برتن سمیٹے اور ثمر خان کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں سونے چلی گئی۔ جبکہ گلگارے، والد کو گولیاں کھلانے لگی۔ گولیاں کھلا کر وہ اس کا سر دبانے بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی ٹانگیں لحاف میں کر لیں تھیں۔ اس دوران مجھے محسوس ہوا کہ گلگارے مجھے مسلسل گھور رہی ہے۔ میں نے بادل نخواستہ اس کی طرف دیکھا، وہ فوراً آنکھوں سے اشارہ کر کے مجھے وعدہ یاد دلانے لگی۔ باپ کی موجودی میں وہ کھل کر نہیں کہہ پا رہی تھی کہ میں اپنی کہانی سناؤں۔

اب میں بغیر کسی وجہ کے اپنی کہانی کیسے شروع کرتا۔ لحہ بھر سوچنے کے بعد میں اس کے والد کو مخاطب ہوا۔

''شمریز چچا!......کیا آپ میری کچھ رہنمائی کر سکتے ہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کو کیسے تلاش کروں۔''

''میں اس بارے کیا کہہ سکتا ہوں، یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس مقصد سے افغانستان کی سرحد پار کی اور انھیں افغانستان کے کس شہر یا علاقے میں جانا تھا۔''

''شہر یا علاقے کے بارے تو مجھے بھی واضح نہیں البتہ ان کا مطمح نظر امریکن ایجنسی کے خلاف کام کرنا تھا۔''

''تو صاف کہو نا کہ مجاہد ہیں......اور مجاہدین کی تلاش بہت آسان ہے۔ ان کے کسی بھی کمانڈر کو مل کر آپ اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔''

گلگارے نے اپنی گہری نیلی آنکھوں سے خفگی بھرے انداز میں مجھے گھورا۔ اس نے باورچی خانے میں، مجھ

سے دریافت کیا تھا کہ آیا میں مجاہدین کا ساتھی ہوں اس وقت میں نے صاف انکار کر دیا اور اب امریکنوں کے خلاف کام کرنے کی بات پر وہ بھی والد کی طرح مجھے مجاہد سمجھ بیٹھی تھی۔

''مجاہد نہیں ہیں شمریز چچا۔''میں نے انکار میں سر ہلایا۔

''ذیشان میاں!......آپ کی باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آرہیں۔نہ آپ نے اپنے بارے کوئی تفصیل بتائی ہے۔اب میں کیا اندازے لگاتا پھروں اور کیسے مشورہ دوں۔''

میں کافی دیر سے ایسے ہی کسی سوال کا منتظر تھا تاکہ گلگارے سے کیے گئے وعدے کے مطابق اپنی کہانی سنا سکوں۔اس کے لہجے میں اپنے بارے جاننے کا اشتیاق محسوس کرنے کے باوجود میں نے کہا۔

''شمریز چچا، میری کہانی کافی طویل ہے، میں نہیں چاہتا کہ آپ کا وقت ضائع ہو یا آپ بیزاری محسوس کریں۔''

''چارپائی پر پڑے معذور آدمی کے پاس وقت کی کمی نہیں ہوتی۔''

میں نے جلدی سے کہا۔''اللہ نہ کرے آپ معذور ہوں۔''

''میں عارضی معذوری کی بات کر رہا تھا۔بہر حال آپ اپنی کہانی شروع کریں، اگر میں نے بیزاری محسوس کی بھی تو آپ پر اپنی بیزاری ظاہر نہیں ہونے دوں گا۔''

اس کی بات پر میرے ساتھ گلگارے بھی ہنس پڑی تھی۔

''میرا خیال ہے تم آرام کرو۔''شمریز نے اسے جانے کی اجازت دی۔

''بابا جان! آپ جانتے تو ہیں میں کہانیاں سننے کی کتنی شوقین ہوں۔''اس نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا تھا۔

''جیسے تمھاری مرضی۔''بیٹی کو کہہ کر اس نے استفہامیہ نظروں سے مجھے گھورا۔گویا بہ زبان خاموشی کہہ رہے ہوں کہ میں نے اب تک کہانی شروع کیوں نہیں کی۔

''میرا تعلق پاک آرمی سے ہے۔''گلا کھنکارتے ہوئے میں نے بات شروع کی۔میری بات سنتے ہی گلگارے کا چہرہ ٹیوب لائیٹ کی طرح چمکنے لگا تھا۔میری بات جاری رہی۔

''وزیرستان میں دہشت گردوں کے خلاف کام کرتے ہوئے میرا ٹکراؤ ایک بہت بڑے دہشت گرد قبیل

خان سے ہوا۔اسی اثناء میں میری ملاقات ایک لڑکی پلوشہ خان وزیر سے ہوئی ، جو اپنی بہن کی بے حرمتی اور قتل کا بدلہ لینے کے لیے قبیل خان کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی ۔ ہمارا دشمن ایک ہی تھا اور اسی بات نے ہمیں قریب کر دیا ...."میں ترتیب سے تمام ضروری باتیں ان کے گوشِ گزار کرتا گیا۔قبیل خان اور جہانداد خان کی موت ،کس طرح پلوشہ کی وجہ سے میں امریکنوں کے ہاتھ چڑھا،کس طرح انھوں نے میری وڈیوز بنائیں ، پلوشہ کا دوبارہ ملنا،شادی،صنوبر خان کی موت ، اپنی گرفتاری ،فرار اور پلوشہ کا سردار کے ساتھ میری بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈ نے نکلنے تک میں نے تمام اہم باتیں ان کے گوش گزار کر دیں۔ پلوشہ کے ذکر پر گلگارے کا چہرہ بجھ سا گیا تھا۔یا شاید مجھے ہی کچھ ایسا لگ رہا تھا۔میری بات ختم ہوتے ہی شمریز خان تحسین آمیز لہجے میں بولا......

"تو آپ ہیں وہ ایس ایس جو اڑتی مکھی کو بھی نشانہ بنا سکتا ہے۔"میں نے اسے اپنی نشانہ بازی اور ایس ایس نام کے بارے کچھ نہیں بتایا۔اب اس کا یوں کہنا مجھے ششدر کر گیا تھا۔

"آپ کو میرے نام کا کیسے پتا؟"

وہ مسکرایا۔"دیکھ لیں اتنی جادوگری تو ہمیں بھی آتی ہے۔"

"پھر بھی۔"میں جاننے پر مصر ہوا۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔"ہمارے گھر میں صرف اچکے اور آوارہ گرد ہی نہیں آتے ، یہاں مجاہدین کا گزر بھی رہتا ہے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔"

"بھائی، قبیل خان جیسے بڑے سردار کا قتل جس کی جڑیں افغانستان تک پھیلی ہوئی تھیں،اتنی چھوٹی بات نہیں ہے کہ علاقے میں اس کی شہرت نہ ہوتی۔اور پھر اس کے قتل میں اس کی اپنی قوم و قبیلے کی لڑکی شامل تھی......اس کے ساتھ دو قبیلوں کی لڑائی میں ایک سردار کا قتل اور وہ بھی اس انوکھے انداز سے،آج تک اڑھائی تین کلومیٹر کے فاصلے سے ہم نے کسی کو نشانہ بنتے نہیں دیکھا۔اور اسے نشانہ بنایا پلوشہ خان وزیر کے محبوب ایس ایس نے۔اسی طرح قبیل خان کے روشن خان نامی کمانڈر کو ایس ایس نے کلومیٹر بھر کی دوری سے ایک آڑ میں پھنسا لیا، یہاں تک کہ اسے معافی مانگ کر اپنی جان بچانا پڑی...... یہ اور اس جیسی اور بہت سی باتیں ہمیں مجاہدین اور یہاں سے

گزرنے والے دوسرے لوگوں سے پتا چلتی رہیں۔آپ کی باتوں میں بس صنوبر خان کی موت اور آپ کی پلوشہ سے شادی میرے لیئے نئی بات ہے۔باقی آپ نے جونہی اپنی کہانی شروع کی میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا تھا۔''

''میں نے بھی۔''گلگارے بھی پیچھے نہیں رہی تھی۔''کیونکہ جو لوگ بابا جان کے ساتھ بیٹھک میں مصروفِ گفتگو ہوتے ہیں میں ان کی ساری باتیں سنا کرتی ہوں۔''

میں انکساری سے بولا۔''خیر میری نشانہ بازی کے متعلق تو لوگوں نے کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے ورنہ اتنا اچھا نشانے باز ہوتا تو اس دن گلگارے بہن کا چیلنج قبول نہ کر لیتا۔''

وہ سرعت سے بولی۔''مجھے کیا پتا تھا کہ آپ ایس ایس ہیں۔''

میں نے کہا۔''اچھا آپ نے ساری کہانی سن لی ہے نا،اب جائیں اور آرام کریں۔''

''جب نیند آئے گی تو چلی جاؤں گی۔''وہ بے پروائی سے والد کا سر دباتی رہی۔

ایک لمحہ اسے گھورنے کے بعد میں شمریز خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔اس دوران اس نے بھی نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''شمریز چچا!......اب تو آپ مشورہ دے سکتے ہیں نا۔''

''ویسے آپ کی بیوی نے کی تو بے وقوفی ہے لیکن اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ آپ کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں،لیکن اس کی اس بے وقوفی سے مجھے کتنی تکلیف ہو گی اس کا وہ اندازہ نہ کر سکی۔''

''اس کے لیے سب سے اہم آپ کی جان بچانا تھا۔اور جن حالات میں اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کیا ایسے حالات میں اس سے بہتر کچھ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔''گلگارے ہماری گفتگو میں مخل ہوئی۔

میں نے فوراً کہا۔''ہاں،آپ بھی عورت ہو۔اپنی ہم ذات ہی کی طرف داری کرو گی۔''

''تو کیا کرتی......آپ کو بے گناہ تشدد کا نشانہ بنتے دیکھتے رہتی،جبکہ نہ تو وہ ایک گھریلو خاتون ہے۔اور نہ لڑائی جھگڑا اس کے لیے کوئی نئی چیز ہے۔''گلگارے اپنے موقف پر ڈٹ گئی تھی۔

''اگر اسے کچھ ہو گیا پھر؟''میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

''اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی اور آپ کو کچھ ہو جاتا پھر؟''

"اسے کچھ تو انتظار کرنا چاہیے تھا۔" میں نے یوں جھلاتے ہوئے کہا گویا پلوشہ کو گلگارے ہی نے افغانستان بھیجا ہو۔

"انتظار کرنے والے عموماً گھاٹے میں رہتے ہیں۔اور معاف کرنا آپ کی باتوں سے لگ رہا ہے گویا چاہت کے اظہار کا حق صرف آپ ہی کو حاصل ہے۔ اگر آپ اس کے افغانستان جانے پر اتنے پریشان ہیں تو خود سوچیں آپ کے ایجنسیوں کے ہاتھوں گرفتاری پر اس پر کیا بیتی ہوگی۔جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ آپ ایک منظّم سازش کا شکار ہو چکے ہیں اور آپ کے خلاف بہت سارے ثبوت ایجنسیوں تک پہنچا دیے گئے ہیں۔"

"آپ،اس کی بڑی طرف داری کر رہی ہیں۔"

"ہاں، کیونکہ میں اسے حق پر سمجھتی ہوں۔آپ بے جا ہی اس سے خفا ہو رہے ہیں۔"

"میں خفا نہیں، پریشان ہوں۔اور اس کی وجہ سے مجھے اپنی صلاحیتیں دو محاذوں پر لگانا پڑ رہی ہیں۔"

"آپ پلوشہ کی تلاش کو چھوڑیں اور اصل کام پر توجہ دیں۔" وہ با قاعدہ بحث پر اتر آئی تھی۔شمریز خان متبسم ہو کر ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔میرے لیے ہر کام سے اہم پلوشہ کی خیریت ہے۔"

گلگارے کے چہرے پر عجیب سا تاثر ابھرا جس کی توجیہ سے میں قاصر تھا۔ایک لمحہ مجھے گھورنے کے بعد وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔"آپ کی باتوں سے ذرا بھی نہیں لگ رہا کہ آپ وہی ایس ایس ہیں، جس کے واقعات سن کر ہم باپ بیٹی اتنے زیادہ متاثر ہو گئے تھے۔"

"کہا تو ہے اس بارے لوگ کچھ زیادہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیتے رہے ہیں۔"

"اچھا مجھے یہ بتائیں، پلوشہ خان نے افغانستان میں جا کر کس کو تلاش کرنا ہے؟"

"البرٹ بروک کو۔"

"اور پلوشہ کی تلاش کے علاوہ آپ کا مطمح نظر کیا ہے؟" اس نے دوسرا سوال پوچھا۔

میں نے فوراً کہا۔"البرٹ بروک کی تلاش۔"

"تو جب آپ دونوں کی منزل ایک ہی ہے تو دائیں بائیں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بجائے سیدھا اپنے

کام پر توجہ دیں۔امید ہے پلوشہ خان بھی آپ کو البرٹ بروک کے دائیں بائیں مل ہی جائے گی۔‘‘

اس کی بات نے مجھے حیران کر دیا تھا۔اس کا مشورہ رد کرنے کے قابل نہیں تھا۔میں نے تحسین آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔’’ویسے مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری چھوٹی بہن اتنی سمجھ دار ہو سکتی ہے۔‘‘

’’صحیح کہا۔‘‘اس نے منہ بناتے ہوئے اوپر نیچے سر ہلایا۔’’مردوں کے نزدیک عورت ہمیشہ فاترالعقل ہی رہی ہے۔اسی وجہ سے تو بابا جان بھی کہتے رہتے ہیں کہ میں ان کی بیٹی نہیں بیٹا ہوں۔گویا بیٹی سے تو بہادری اور عقل مندی کی توقع عبث ہے۔‘‘

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔’’خیر یہ تو آپ زیادتی کر رہی ہیں۔میں نے حیرانی آپ کے عورت ہونے پر نہیں کم عمر ہونے پر ظاہر کی ہے۔اسی طرح شمریز چچا اس وجہ سے آپ کو بیٹا نہیں کہتے کہ ان کی نظر میں بیٹی بہادر نہیں ہو سکتی۔بلکہ وہ اس لیے ایسا کہتے ہیں کہ کسی کی تعریف کرنے کے لیے عموماً تشبیہ کا سہارا لیا جاتا ہے۔جیسے کہا جاتا ہے فلاں تو شیر ہے شیر۔اگر میں پوچھوں،کیا ایک جانور انسان سے بہتر ہو سکتا ہے۔تو آپ کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔لیکن کبھی کسی نے خود کو شیر کہنے کا برا نہیں منایا ہوگا۔یونھی آپ کا اعتراض کرنا بھی نہیں جچتا۔‘‘

’’باتیں بنانا تو مردوں کا خاصا ہے۔‘‘میری بات سے اختلاف نہ کرنے کے باوجود وہ میری وضاحت قبول کرنے پر راضی نہیں تھی۔

’’اسے چھوڑیں چچا،آپ کوئی مشورہ دیں نا۔‘‘میں اس سے بحث کرنا ترک کرتے ہوئے شمریز خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ مستفسر ہوا۔’’ایک بات تو طے ہو گئی نا کہ آپ پلوشہ کے بجائے البرٹ بروک کی تلاش میں نکلیں گے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘میں نے اثبات میں سر ہلایا۔’’اس سے بہتر مشورہ تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔‘‘

’’اب رہ گئی البرٹ بروک کی بات تو اس کے متعلق آپ کو مجاہدین سے کوئی رہنمائی نہیں مل سکتی۔اس ضمن میں یا تو صنوبر خان کے قائم مقام سے مدد مل سکتی ہے کہ اب اسی سے امریکنوں نے کام لینا ہے یا آپ کسی امریکی کو اغواء کر کے البرٹ بروک کے متعلق معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔‘‘

”ہونہہ۔“میں نے پرخیال انداز میں کہا۔”اس کا مطلب ہے مجھے ملک گلبدین، یا ملک فیروز خان پر ہاتھ ڈالنا چاہیے تھا۔“

”غالباً آپ تورے خار کے ملک فیروز خان کی بات کر رہے ہیں۔“

”جی ہاں۔“میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور یہ گلبدین کون ہے؟“

میں نے جواب دیا۔”یہ دیگان کا سردار ہے اور شمالی وزیرستان میں دہشت گردانہ کارروائیوں کا کرتا دھرتا ہے۔“

”بہرحال بہتر یہی ہے کہ اب پیچھے جانے کے بجائے آگے ہی کا رخ کرو۔ یوں بھی آپ کی پلوشہ بھی آگے جا چکی ہے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔”آپ نے تو ہر پچھتاوے کا خاتمہ کر دیا ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، اچانک چھت پر ہلکا سا دھماکا ہوا، یوں جیسے کوئی دیوار سے نیچے اترا ہو۔ کمروں کی چھت سے چار دیواری قریباً ساڑھے چار پانچ فٹ اونچی تھی۔ میں سوالیہ انداز میں شمریز خان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ویسی ہی آواز دوبارہ ابھری اور میرے دل میں تھوڑا سا شک تھا بھی تو وہ دور ہو گیا۔ یقیناً وہ موذی رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھانے پہنچ گئے تھے۔ گلگارے کے چہرے پر بھی گہری تشویش اور اندیشے ظاہر ہو گئے تھے۔ حالانکہ چھوٹی موٹی باتوں کو وہ خاطر میں نہیں لایا کرتی تھی۔

میں فوراً لحاف سے باہر نکلا۔ بوٹ ڈالنے کا وقت نہیں تھا۔ پاؤں ہوائی چپل میں ڈال کر میں نے سر پر گرم ٹوپی رکھی اور اپنی کلاشن کوف کاک کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑ لی۔

”شمریز چچا کی چارپائی کو دروازے کے سامنے سے ہٹا دو۔ ثمر خان اور رنڑا کو بھی دروازے کے سامنے نہ آنے دینا۔“گلگارے کو ضروری ہدایات دیتے ہی میں چھت پر چڑھنے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

گلگارے نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولنے چاہے مگر اس کی بات سننے کے لیے رکا نہیں تھا۔ دوسرے

کمرے کے شمال مغربی کونے میں لوہے کی سیڑھی لگی تھی جس کا اختتام چھت پر بنے ہوئے مورچے میں ہوتا تھا ۔ان کے گھر دو، مورچے بنے ہوئے تھے۔ایک گھر کی سامنے کی طرف شمال کی جانب اور دوسرا گھر کی عقبی جانب جنوب مغربی دیوار پر۔دونوں مورچوں پر جانے کے لیے علیحدہ علیحدہ سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔مورچوں پر لوہے کے مضبوط دروازے لگے تھے جو اندر کی جانب بند ہوتے تھے۔

میں سرعت سے سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا چھت کے سوراخ سے مورچے میں داخل ہوا۔مورچے کے دروازے پر مجھے کھسر پھسر سنائی دے رہی تھی۔مجھے لگا کوئی دروازے کو کھولنے کی کوشش میں ہے۔میں دروازے کے قریب ہوا اور ان کی سرگوشیوں کی آواز میرے کانوں میں پڑنے لگی۔

’’سنگین خانا، دروازہ اندر سے بند ہے۔اور ہول اتنے چھوٹے ہیں کہ ان سے اندر نہیں گھسا جائے گا۔‘‘

’’تو پھر دوسرے مورچے کا جائزہ لیں۔‘‘ شاید اس مرتبہ بولنے والا سنگین خان تھا۔

’’یقیناً وہ بھی اندر سے بند ہوگا۔‘‘ ایک تیسری آواز ابھری تھی۔ ’’ہمیں صحن ہی میں اترنا پڑے گا۔‘‘

’’لازماً انھوں کمروں کے دروازے بھی اندر سے بند کیے ہوں گے۔‘‘ یہ وہ پہلا آدمی تھا جس نے سنگین خان کو پکارا تھا۔

’’پھر کیا کریں؟‘‘ سنگین خان کی آواز میں بے چینی تھی۔

’’دیکھ لو...... تمھی اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لیے پاگل ہوئے جا رہے ہو۔اور اتنا تو ہمیں معلوم ہے کہ گھر میں کم از کم دو ہتھیار بردار مرد موجود ہیں۔‘‘ تیسرے مرد نے اندیشہ ظاہر کیا۔

’’الفت جان!...... کیا میں نے تمھارے لیے کبھی خطرہ مول نہیں لیا۔‘‘ سنگین خان کی آواز میں گہری خفگی پنہاں تھی۔

’’میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔‘‘ الفت جان جھلاتے ہوئے بولا۔ ’’فقط مشورہ ہی دیا ہے نا۔‘‘

’’لڑنے کی ضرورت نہیں اور کوئی ترکیب سوچو کہ ہمیں ناکام نہ لوٹنا پڑے۔‘‘ یہ وہی تھا جس نے سنگین خان کو دروازہ بند ہونے کی اطلاع دی تھی۔

سنگین خان بولا۔ ’’میرا خیال ہے نیچے اتر کر دیکھتے ہیں۔اگر دروازے بند ملیں گے تو صبح کا انتظار کر لیں

گے۔جیسے ہی وہ اٹھیں گے ہم انھیں چھاپ لیں گے۔''

الفت جان طنزیہ لہجے میں بولا۔''مطلب تم اس لڑکی کو حاصل کیے بغیر نہیں جانے والے۔''

''بالکل بھی نہیں۔''سنگین خان حتمی لہجے میں بولا۔''جب سے اسے دیکھا ہے میری راتوں کی نیند ہی اڑ گئی ہے۔اسے پائے بغیر مجھے سکون نہیں آئے گا۔''

الفت جان نے کہا۔''اسفند یار!......وزیر بادشاہ اور سلیم جان کو بھی اوپر ہی بلا لو۔وہ ساری رات باہر تو نہیں کھڑے رہیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''اسفند یار اس سے متفق ہوتا ہوا بولا۔وہ یقیناً ان آدمیوں کو اوپر لانے کے لیے چل پڑا تھا ،مگر اس کے قدموں کی آواز مجھے سنائی نہ دی کہ وہ نہایت احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔میں نے مورچے کے ہول سے احتیاط سے باہر جھانکا۔مورچے کے اندر اندھیرا تھا اور میرا نظر آنا ممکن نہیں تھا۔برف باری کب کی رک چکی تھی ،آسمان بھی صاف تھا۔اٹھارہ انیس کے چاند کی روشنی سفید برف پر منعکس ہو کر ماحول کو خوب روشن کیے ہوئے تھی۔مورچے کے دروازے پر کھڑے آدمی تو مجھے نظر نہ آسکے البتہ اسفند یار دیوار کی جڑ میں قدم رکھتا ہوا دروازے سے دور جاتا نظر آیا گیا۔

مجھے ان کی بے وقوفی پر حیرانی ہو رہی تھی کیونکہ کچی چھتوں پر جتنی بھی احتیاط سے قدم رکھا جائے نیچے موجود آدمیوں کو لازماً پتا چل جاتا ہے کہ کوئی چھت پر چل رہا ہے۔البتہ کوئی گہری نیند میں ہو تو علیحدہ بات ہے۔اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔شاید انھیں یہ لگا ہو کہ تمام سو رہے ہیں اور یہی بات ان کی اس حماقت کی وجہ بنی ہو۔واقعی جب انسان کے دماغ پر کسی عورت کے حصول کا بھوت سوار ہو تو اسے اس کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا ۔سنگین خان کے غلاظت بھرے بھیجے میں بھی معصوم رنڑا کا نوخیز اور پر کشش جسم سمایا ہوا تھا ،جس کی وجہ سے وہ بار بار شمریز خان کے گھر کے چکر کاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔اور اس کا ایک ہی علاج تھا کہ ،گندے خیالات سے بھری کھوپڑی ہی اس کے سر پر باقی نہ رہنے دی جاتی ۔اس کے علاوہ تو رنڑا کا خیال اس کے ذہن سے محو نہیں ہو سکتا تھا

اچانک ہلکی آہٹ کے ساتھ کسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا ،یقیناً وہ گلگارے تھی جو محتاط انداز میں چلتی ہوئی وہاں پہنچی تھی ۔مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ کچھ بول نہ دے ۔میں نے فوراً مڑ کر اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر

جما دیا، وہ ایک دم ساکت ہوگئی تھی۔
اسی وقت سنگین خان نے بے صبری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”نیچے اتریں۔“ اور اس کے بولنے کے بعد مجھے گلگارے کو کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ اسے ساری صورت حال واضح ہو جانی چاہیے تھی۔ اس کے ہونٹوں سے ہاتھ ہٹا کر میں دوبارہ دروازے کی جانب متوجہ ہوگیا۔
”ٹھہرو انھیں اوپر تو آنے دو۔“ الفت خان نے میری دل لگتی بات کہی تھی۔ میں بھی ان کے اوپر ہی آنے کا منتظر تھا۔
”تو وہ آجائیں گے نا؟“ سنگین خان نیچے جا کر جلد از جلد دروازوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ شاید اس کے دل کے کسی کونے میں دروازہ کھلا ہونے کی امید روشن تھی۔ اور نفسانی خواہشات اسے کسی پل چین نہیں لینے دے رہی تھیں۔
”رسی کے بغیر چھت سے کودو گے تو کتنا دھماکا ہوگا یہ بھی سوچا ہے۔“ الفت جان نے اس کی بے صبری پر ڈانٹا۔ ”اور ہوش سے کام لو، وہ کہیں سج سنور کر اپنے دولھے سنگین خان کی منتظر نہیں کہ تم مرے جا رہے ہو۔“
”ہائے الفت جان!...... تم نے اسے دیکھا نہیں ورنہ یہ بکواس نہ کرتے۔ یقین کرو دودھ کی طرح سفید مکھن کے پیڑے کی طرح ملائم اور چاند کی طرح روشن چہرہ ہے اس کا۔ اگر چہرے کی یہ حالت ہے تو باقی بدن کیسا ہوگا۔ افف...... ایک تو یہ بھی چیونٹی کی رفتار سے اوپر چڑھ رہے ہیں۔“ سنگین خان رنڑا کی تعریف کرتے کرتے اپنے ساتھیوں کی سستی پر شکوہ کناں ہوگیا۔ اسے بالکل ہی قرار نہیں آرہا تھا۔ نہ جانے گزشتہ رات اس نے کیسے صبر لیا تھا۔
”شاید موسم کی خرابی آڑے آگئی تھی۔“ میں نے سوچا مگر اس کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ خراب موسم تو ایسے کاموں کے لیے مفید رہتا ہے۔
اس کی گھٹیا گفتگو گلگارے نے بھی سن لی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ گئی ہو۔ اپنی چھوٹی بہن کے متعلق ایسی باتیں سن کر یقیناً وہ غصے کے ساتھ خفت بھی محسوس کر رہی ہوگی۔
میں مورچے کے ہول سے باہر جھانکنے لگا۔ چھت کی اس جانب کوئی دوسرا ہول موجود نہیں تھا اس وجہ سے

گلگارے بھی میرے قریب آ کر باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ایسا کرتے ہوئے وہ بالکل میرے ساتھ جڑ گئی تھی۔وہ خوش نما، بھرپور اور گداز جسم کی مالک ایک نوخیز دوشیزہ تھی۔جبکہ میں عام خواہشات سے مغلوب ہونے والا ایک گناہ گار جوان اس کی قربت مجھے مہنگی پڑ سکتی تھی۔اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک قابل احترام اور پاکیزہ خیالات کی حامل لڑکی کے بارے میرے ذہن میں کوئی گندہ خیال پرورش پا کر ہمیشہ کی شرمندگی میرا نصیب کر دے۔یوں بھی شیطان خون کی طرح انسان کی رگوں میں دوڑتا ہے۔

حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے فوراً اسے بازو سے تھام کر نرمی سے دور دھکیل دیا۔گو ایسی حرکت نرمی سے کی جائے یا سختی سے۔مخالف کو نہایت ناگوار گزرتی ہے، بلکہ صنف نازک کو تو شرمسار کر دیتی ہے۔لیکن ایسا کرنا میری مجبوری تھی۔

وہ کچھ کہے بنا دور ہو گئی۔البتہ اندھیرے کی وجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے کہ میں اس کے غصے یا شرمندگی کا اندازہ کر پاتا۔

میں دوبارہ ہول سے باہر جھانکنے لگا۔چھت کا دوسرا کنارہ اتنی دور نہیں تھا کہ مجھے ان کے واضح ہیولے دکھائی نہ دیتے۔یوں بھی برف پڑ جانے کے بعد چاندنی رات میں ماحول کچھ زیادہ ہی روشن ہو جاتا ہے۔پہلے وہاں صرف اسفندیار موجود تھا، اس کے بعد ایک ہیولے کا اضافہ ہو گیا۔اور دیوار سے ایک تیسرا ہیولہ بھی چھت پر اتر رہا تھا۔ان کے نیچے موجود دونوں ساتھی، اوپر پہنچ گئے تھے۔

میں ان کے ارادوں کو بھی جان گیا تھا اور ان میں سے کسی کی زندگی بھی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔نہ میں نے کسی سے کوئی پوچھ گچھ ہی کرنا تھی۔کلاشن کوف کو نیچے ہی سے کاک کر کے آیا تھا کہ، کلاشن کوف کاک کرنے سے اچھی خاصی آواز ابھرتی ہے۔ہاتھ سے ٹٹول کر میں نے سیفٹی لیور کو برسٹ پر سیٹ کیا اور باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

دروازے کے بولٹ کو اگر میں احتیاط سے کھولتا تو ذرا سی بھی آواز نکلنے پر سنگین خان اور الفت جان چوکنا ہو کر سنبھل سکتے تھے۔اس کے برعکس بولٹ کو ایک جھٹکے سے کھولنے پر آواز تو ضرور اٹھتی مگر ان کے سنبھلنے سے پہلے میں دروازہ کھول چکا ہوتا۔میں نے دوسری تجویز پر عمل کا سوچا اور دوراز ے کے بولٹ پر مضبوطی سے ہاتھ جما کر

ایک دم بولٹ کھول کر دروازے کے اکیلے پٹ کو اندر کی طرف کھینچ لیا۔ وہ دونوں اپنے ساتھیوں کی طرف رخ کر کھڑے تھے جو انھی کی طرف چل پڑے تھے۔ بولٹ کھلنے کی آواز پر وہ اچھل کر سنبھلے...... سنگین خان کے منھ سے بے ساختہ ...... ''کک...... کیا...... ہے۔'' نکلا تھا۔ لیکن یہ وہ آخری الفاظ تھے جو اس کے لبوں سے ادا ہوئے تھے۔

انسان بھی کتنا انجان اور لاعلم ہے۔ نفسانی خواہشات سے مغلوب، رنڑا کے نوخیز بدن کو روندنے کا منصوبہ بنانے والے سنگین خان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ موت اس کے کتنا قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کے، رنڑا کی چیخیں اور آہیں سننے کے متمنی کانوں میں کلاشن کوف کی بھیانک تڑتڑاہٹ موت کا نغمہ بن کر گونجی۔ اس نے لذت کے عروج کے حصول کا منصوبہ بنایا ہوا تھا اور ربّ نے اذیت کی انتہا اس کے مقدر میں لکھ دی تھی۔

کلاشن کوف کے فائر کی آواز اور اپنے دونوں ساتھیوں کے نیچے گرنے پر ایک لمحے کے لیے وہ بدحواس ہو کر ساکت ہو گئے تھے۔ میں نے ٹریگر سے انگلی ہٹائے بغیر بیرل کا رخ ان کی جانب موڑا۔ ان میں سے ایک آدمی نے زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی اور فوراً دیوار پر چڑھ کر دوسری جانب کودنے کی کوشش کی۔ مگر چھت کے ساتھ متصل دیوار پر چڑھنے تک اس کی اپنی کوشش کا عمل دخل تھا، جبکہ اسے دوسری جانب گرانے میں سراسر کلاشن کوف کی گولیوں کا کمال تھا۔

سنگین اور الفت جان کے تڑپنے کی رفتار میں ٹھہراؤ آتا جا رہا تھا۔ جبکہ دوسرے دو ابھی تک اپنے ہاتھ پاؤں جھٹک رہے تھے۔ وہ ایک معصوم کلی کو تڑپانے آئے تھے، انھیں خود تڑپنا پڑ گیا تھا، اسی کو مقدر کہتے ہیں، یہی موت کی گھات ہوتی ہے، یہی فرق انسان اور اللہ پاک کے بنائے ہوئے منصوبے میں ہوتا ہے۔ ایک طرف انسان تجویز بنا رہا ہوتا ہے اور دوسری جانب اللہ پاک ایک فیصلہ فرما چکا ہوتا ہے۔ اور ہوتا وہی ہے جو اللہ پاک نے مقرر کر دیا ہو۔ وہ ظالم تھے اور ظالموں پر اللہ پاک لعنت فرما چکا ہے، جبکہ لعنت کا مطلب اللہ پاک کی رحمت سے دور ہونا ہے۔ وہ بھی اپنے گندے منصوبوں اور غلیظ خیالات کے ساتھ توبہ کی توفیق پائے بغیر مردار ہو گئے تھے۔

گو مجھے یقین تھا کہ دیوار سے کودنے والا میری گولی کھا کر ہی دوسری جانب گرا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے ایک بار نیچے جھانک کر دیکھنا ضروری سمجھا۔ اس کی مڑی تڑی لاش دیوار کے ساتھ ہی پڑی تھی۔

اسی وقت گلگارے بھی مورچے سے نکل آئی۔ مجھے مخاطب کیے بغیر وہ ہاتھ میں موجود ٹارچ جلا کر ان کے چہرے دیکھنے لگی۔ ان کے چہروں پر اذیت ثبت ہونے کے باوجود مجھے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ وہ وہی پانچوں تھے جو اس دن دھمکانے آئے تھے۔ مورچے کے دروازے کے ساتھ گرنے والے الفت جان اور سنگین خان میں ایک کے پاس تیس بور پستول اور دوسرے کے پاس کلاشن کوف تھی۔ جبکہ دوسرے کونے پر پڑی لاشوں کے پاس بارہ بور بندوق، ایٹ ایم ایم اور ایک پستول پڑا نظر آ رہا تھا۔ دیوار سے کودنے والا اپنی رائفل وہیں پھینک گیا تھا۔

''ان کی لاشوں کا کیا کریں؟'' میں جانتا تھا کہ وہ خفا ہے اس کے باوجود میں اسے مخاطب ہوا۔

میری بات کا جواب دیے بغیر وہ وہاں پڑے ہتھیار سمیٹنے لگی۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے۔'' میں اسے دوبارہ مخاطب ہوا۔ مگر بے پروائی سے تمام ہتھیار اٹھا کر وہ واپس مورچے کی جانب چل دی۔ مجھے اچھی خاصی سبکی کا احساس ہوا تھا۔ گو میں نے بھی اس کی توہین کی تھی، مگر میرا مقصد ہرگز ہرگز اس کی توہین یا سبکی کا نہ تھا۔ میں نے فقط حفاظتی تدبیر پر عمل کیا تھا، مگر وہ جان بوجھ کر میری ہتک کرنے پر تل گئی تھی۔

سر جھٹک کر میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ کمرے میں رنڑا اپنے باپ کی بغل میں گھسی تھی۔ وہ گلگارے کی طرح بننا چاہتی تھی مگر اس کی طبیعت مجھے گلگارے سے یکسر مختلف نظر آئی تھی۔ گلگارے بہادر، دلیر اور حوصلے والی تھی۔ جبکہ رنڑا روایتی لڑکیوں کی طرح ڈرپوک، سہمی ہوئی اور جلدی گھبرا جانے والی تھی۔ ثمر خان البتہ مجھے کافی حوصلے والا لگا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا اس وقت گلگارے باپ کو تمام موذیوں کے مرنے کی اطلاع دے چکی تھی۔

میں نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔ ''چچا شمریز!......ان لاشوں کا کیا کریں۔''

''لازمی بات ہے زمین میں دبانا پڑیں گی۔''

''اتنا بڑا گڑھا کھودنے میں تو صبح ہو جائے گی۔''

''گڑھا کھودنے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارے گھر کے شمالی جانب جو اخروٹ کے دو بڑے درخت ہیں ان

کی غربی جانب تھوڑی سی ڈھلان اتر کر ایک کافی بڑا گڑھا موجود ہے۔گلگارے بیٹی آپ کو وہ جگہ دکھا دے گی۔وہاں پھینک کر اوپر پتھر پھینک دو۔ایسوں کے لیے ایسی ہی قبر دستیاب ہوا کرتی ہے۔''

''ثمر خان چلا جائے گا، مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔''وہ اتنی خفا تھی کہ میرے ساتھ جانے پر بھی راضی نہیں تھی۔

میں نے فوراً کہا''ثمر خان، میں چھت پر پڑی لاشوں کو شمالی جانب پھینک کر آتا ہوں، تم کوئی ٹارچ اور بیلچہ وغیرہ ڈھونڈ لو۔''

''جی لالا۔'' کہہ کر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔میں دوبارہ مورچے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ایک ایک کر کے میں نے چاروں لاشوں کو شمالی جانب سے دیوار سے باہر پھینک دیا۔میرے کپڑے تو ان کے گندے خون سے ناپاک ہو گئے تھے۔لیکن یہ کپڑے شمریز خان کے تھے۔اس لیے مجھے زیادہ پروا نہیں تھی۔مورچے کا دروازہ اندر سے بند کر کے میں نیچے اتر آیا۔گلگارے اپنے لحاف میں گم ہو چکی تھی۔رنڑا بھی بہن کی موجودی سے حوصلہ پا کر اپنی چارپائی پر پہنچ چکی تھی۔میں سرسری نظر ان پر ڈالتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچ گیا جہاں ثمر خان چوڑے منہ والے بیلچے اور ٹارچ کے ساتھ میرا منتظر تھا۔

''ذیشان صاحب!......یقیناً آپ کو زحمت ہو رہی ہو گی، مگر میں مجبور ہوں اور..........''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں شمریز چچا۔''میں قطع کلامی کرتا ہوا بولا۔''اس میں زحمت کیسی۔اب عورتیں تو یہ کام نہیں کر سکتی نا۔اور گھر میں موجود صحت مند مرد اس کام کے لیے جا رہے ہیں۔کیوں ثمر خان۔''میں آخری فقرہ مسکرا کر کہا تھا۔

ثمر خان فوراً چھاتی چوڑی کرتے ہوئے بولا۔''جی لالا۔''اس کے انداز پر شمریز خان بھی مسکرا پڑا تھا۔

میں ثمر خان کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔سب سے پہلے میں نے غربی جانب اکیلی پڑی لاش اٹھائی اور ثمر خان کی معیت میں چل پڑا۔اخروٹ کے دونوں درخت پچاس ساٹھ گز سے زیادہ دور نہیں تھے۔اور مذکورہ گڑھا ان درختوں سے مزید پچیس تیس گز ڈھلان میں بنا تھا۔وہ گڑھا اتنا بڑا تھا کہ پانچوں لاشیں آسانی سے اس میں سما جاتیں۔

میں نے ایک ایک کر کے تمام کی لاشیں گڑھے میں پھینک دیں۔ ہر لاش کو اٹھانے سے پہلے میں اس کی تلاشی ضرور لے لیتا تھا۔ ان کی جیبوں سے نکلنے والی تھوڑی بہت نقدی میں اپنے پاس سنبھالتا رہا، کیونکہ اب وہ ان کے کسی کام کی نہیں تھی۔ صرف ایک آدمی کی جیب سے توقع سے زیادہ رقم برآمد ہوئی تھی جس پر میں حیرانی کا اظہار ہی کر سکتا تھا۔ گڑھے کو پتھروں سے پاٹنے کے لیے ثمر خان نے بھی میرا ہاتھ بٹایا تھا۔ وہاں جا بجا اتنے پتھر بکھرے تھے کہ ہمیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا تھا۔ آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد ان کی لاشیں مکمل۔ طور پر پتھروں سے ڈھک گئی تھیں۔ پتھر پھینکنے کے بعد میں نے بیلچے کی مدد سے گڑھے کی دیواریں بھی گرا کر کنکر بھری مٹی، گڑھا پاٹنے والے پتھروں پر بکھیر دی تھی۔ اب ان پتھروں کو کوئی مردار خور جانور بھی ہٹا کر لاشوں تک رسائی نہیں پا سکتا تھا۔ البتہ مردہ خور کیڑوں کی چند روزہ ضیافت کا انتظام ہو گیا تھا۔

لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ ثمر خان کو اس کی چارپائی پر بھیج کر میں خود غسل خانے میں گھس گیا۔ خون آلود کپڑے اتار کر میں نے کپڑا گیلا کر کے جسم پر لگے خون کے اثرات کو صاف کیا اور پھر صاف ستھرے کپڑے پہن کر باہر آ گیا۔ شمریز خان میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

ایک بار پھر تہہ دل سے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد ہی اس نے لحاف اپنے اوپر لے لیا تھا۔

☆......☆......☆

رات کو دیر تک سونے کی وجہ سے صبح کی نماز پر میں بہ مشکل ہی جاگ پایا تھا۔ نماز پڑھ کر دوبارہ سویا تو دیر سے جاگا۔ سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ وہ دن خوب روشن اور صاف تھا۔ سفر کرنے کے لیے ایک بہترین دن، اگر میں کھانا کھا کر نکل جاتا تو اچھا خاصا سفر طے کر لیتا امید تھی کہ خان کلے تک پہنچ جاتا۔ لیکن میں جانے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ میری نگاہوں میں گلگارے کا خفگی بھرا چہرہ گھوم رہا تھا۔ میں نے واقعی اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ جہاں میں چار پانچ دن گزار چکا تھا وہاں ایک دن مزید رکنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

چارپائی چھوڑ کر میں حوائج ضروریہ سے فارغ ہوا۔ اور ہاتھ منہ دھو کر غسل خانے سے باہر آ گیا۔ رنڑا نے مجھے بستر چھوڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میرے غسل خانے سے باہر آنے تک وہ ناشتا لے آئی تھی۔ وہاں دودھ والی چائے کا صرف میں ہی شوقین تھا، باقی قہوے کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ چائے پی کر میں شمریز خان سے گپ شپ

کرنے لگا۔راستے کے بارے ضروری معلومات لینے کے علاوہ میں نے اس سے گرم کوٹ، پانی پلہ(رین کوٹ) اور لانگ بوٹ بھی مانگ لیے تھے۔یہ تمام سامان اس کے پاس موجود تھا۔اور مجھے آگے سفر کے لیے ان چیزوں کی اشد ضرورت تھی۔

اس نے خوش دلی سے جواب دیا۔’’اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔‘‘

میں نے ممنونیت سے کہا۔’’شکریہ شمریز چچا!‘‘

اس نے پوچھا۔’’رات کو جو ہتھیار ہاتھ آئے ہیں ان کا کیا کرو گے؟‘‘

میں نے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔’’بارہ بور، رنڑا کے لیے بہتر رہے گی، کلاشن کوف ثمر خان کی ہو جائے گی، ایٹ ایم ایم آپ رکھ لینا کہ آپ کی کلاشن کوف پر گلگارے قابض ہے۔باقی بچے دو پستول تو ان کے بدلے میں میں نے گرم کوٹ، پانی پلہ اور بوٹ لے لیے ہیں نا۔‘‘

اس نے نفی میں سر ہلایا۔’’یہ تو خیر زیادتی ہے، اتنے قیمتی ہتھیار آپ کو یونھی نہیں چھوڑ دینے چاہئیں۔‘‘

’’پہلی بات کہ میں یونھی نہیں چھوڑ رہا اور دوسرا، کیا یہ سارا وزن ساتھ پھراتا رہوں گا۔‘‘

’’نہیں۔‘‘اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مشورہ دیا۔’’ساتھ پھرانے کی کیا ضرورت ہے بیچ دو۔خواگا او بو میں ان کے کئی خریدار مل جائیں گے۔‘‘

’’شمریز چچا!...... چند ٹکے، رنڑا اور ثمر خان کی خوشی سے اہم نہیں ہیں۔باقی یہاں رہتے ہوئے آپ کو ان ہتھیاروں کی بہت ضرورت پڑے گی۔‘‘

’’شکریہ ذیشان صاحب۔‘‘

’’اچھا میں ذرا دیکھ لوں یہ بچے کیا کر رہے ہیں۔‘‘میں باہر آ گیا۔گلگارے دن کا کھانا بنانے باورچی خانے میں گھسی تھی۔میں اس سے معذرت کرنے کے لیے ہی رکا تھا اور اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا ۔دروازے پر کھڑے ہو کر میں پوچھنے لگا۔

’’چائے مل سکتی ہے۔‘‘

آٹے کے پیڑے بنا کر اس نے سامنے رکھے ہوئے تھے اور اب روٹیاں ڈالنے والی تھی۔میری آواز سنتے

ہی وہ کوئی جواب دیے بغیر کھڑی ہوئی اور باورچی خانے سے باہر نکل کر رنڑا کو آوازیں دینے لگی۔ وہ بھائی کے ساتھ مل کر مویشیوں کے باڑے کی صفائی میں لگی تھی۔ بہن کی آواز سنتے ہی باہر نکل کر پوچھنے لگی۔

''جی باجی!''

''مہمان کے لیے چائے بنادو۔'' اس کے لہجے سے ٹپکتی اجنبیت مجھے شرمسار کر گئی تھی۔

''ٹھیک ہے باجی۔'' سعادت مندی سے کہتے ہوئے اس نے ہاتھ دھوئے اور باورچی خانے میں آ گئی۔

''لالا!......دودھ والی چائے یا قہوہ۔''

''تمھیں نہیں پتا، بڑا بھائی کون سی چائے پیتا ہے۔''

وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ''پتا تو ہے۔''

''تو پھر بناؤ۔''

''ٹھیک ہے لالا جان!'' اس نے چائے کا پتیلا چولھے پر چڑھا دیا۔

''ویسے باجی آپ سے خفا تو نہیں ہیں۔''

''کیا پتا۔'' میں نے منھ بنایا۔ ''اور مجھے اس کی خفگی کی پروا بھی کب ہے۔ جب میری ننھی سی رنڑا بہن موجود ہے تو کسی دوسرے کے نخرے کیوں اٹھاؤں۔''

''دیکھ لیں لالا جی!......آپ نے چلے جانا ہے اور باجی نے میری درگت بنا دینی ہے۔''

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''درگت کیوں، کل میں نے آوارہ گردوں سے جو بارہ بور بندوق چھینی ہے وہ تمھاری ہوئی۔ گلگارے جونہی رعب جمانے کی کوشش کرے بندوق نکال لینا۔''

وہ معصومیت سے بولی۔ ''مجھے بندوق چلانا ہی نہیں آتا۔''

''چائے پی کر میں تمھیں سکھا دیتا ہوں۔''

''پتا ہے رات کو جس وقت آپ دشمنوں سے لڑ رہے تھے اس وقت بابا جان نے مجھے آپ کے بارے سب کچھ بتا دیا تھا۔''

''کیا سب کچھ؟'' میں نے حیرانی ظاہر کی۔

''یہی کہ آپ فوجی ہیں، بہت اچھے نشانہ باز ہیں، دلیر اور بہادر ہیں اور ان تمام بدمعاشوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سچ میں میں اس وقت اتنی ڈری ہوئی تھی، بابا جان کی باتیں سن کر مجھے بہت تسلی ہوئی۔ بعد بابا جان کا کہنا سچ ثابت ہوا اور میرے بہادر لالا نے سب کو قتل کر دیا۔''

یقیناً رات کو اس کا خوف دور کرنے کے لیے ہی شمریز خان نے میری بہادری کے بارے کچھ مبالغہ آرائی کی تھی۔

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔''ان بدمعاشوں کو تمھاری باجی گلگارے نے مارا ہے۔''

''لالا جی، بابا جان کہتے ہیں جھوٹ مذاق میں بھی نہیں بولنا چاہیے۔ ایسا ہی ہے نا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی میرے سامنے رکھی اور اپنے لیے چائے ڈالنے لگی۔

''تم اپنے لالا کو جھوٹا کہہ رہی ہو۔'' میں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا۔

وہ شوخی سے مسکرائی۔ ''نہیں لالا جی!......میں نے تو بس تصدیق چاہی ہے۔''

میں اس کی ہنسی میں شامل ہوتا ہوا بولا۔ ''ویسے تمھارے بابا جان نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔''

چائے پینے کے دوران وہ مجھ سے رات والی ساری بات اگلوا چکی تھی۔ چائے کی پیالی خالی کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''اچھا چھت پر چڑھتے ہیں، آپ مجھے بارہ بور رائفل چلانا بھی سکھا دینا اور وہاں آپ کو ایک خاص بات بھی بتاؤں گی۔''

میں نے اس کی تجویز میں ہلکی سی ترمیم کرتے ہوئے کہا ''تو گھر سے باہر جاتے ہیں نا۔''

وہ مصر ہوئی۔ ''نہیں چھت پر جانا ضروری ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں اوپر جا رہا ہوں، تم رائفل لے آؤ۔''

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ گلگارے کو آوازیں دینے لگی۔ ''باجی!......ہم نے چائے پی لی ہے آ جائیں۔''

رنڑا کی آواز سن کر وہ مویشیوں کے باڑے سے باہر نکل آئی۔ رنڑا کو چائے بنانے بھیج کر وہ خود صفائی میں

مشغول ہوگئی تھی۔وہ نہ صرف ناراض تھی بلکہ اپنی ناراضی کا واضح اظہار بھی کر رہی تھی۔

میں نے اسے گھور کر دیکھا مگر وہ مجھ سے نظریں ملائے بغیر سر جھکائے باورچی خانے میں گھس گئی۔ایک لمحے کے لیے میرا ارادہ ہوا کہ میں بھی باورچی خانے میں گھس کر اس سے ناراضی کی وجہ دریافت کروں،مگر پھر مجھے ہمت نہ ہوسکی۔نہ جانے میرے زبردستی پوچھنے پر وہ کیا ردعمل ظاہر کرتی۔آخر وہ ایک جوان لڑکی تھی اور اس کا کوئی سخت ردعمل،شمریز خان کے دل میں غلط فہمی کا بیج بھی بو سکتا تھا۔مجھے اپنا دن ضائع کرنے پر افسوس ہوا ۔مجھے آج صبح ہی آگے چلے جانا چاہیے تھا۔یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میں چھت پر جانے کے لیے سیڑھی والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

چھت بالکل صاف پڑی تھی۔ان موذیوں کے خون کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا گندہ خون برف پر گرا تھا۔جو صبح ہی صبح رنڑا اور ثمر خان نے اٹھا کر چھت سے نیچے پھینک دی تھی۔

اسی وقت رنڑا نے چھت پر چڑھ کر مجھے آواز دی۔”لالا جی!......اس طرف۔“اس نے مکان کے سامنے شمال کی جانب موجود مورچے کی طرف اشارہ کیا۔ہم چھت پر چلتے ہوئے اس مورچے کے قریب پہنچے۔مکان کی بناوٹ ایسی تھی کہ اس کے تین اطراف میں کمرے تعمیر کیے گئے تھے جبکہ سامنے والی دیوار کے ساتھ کوئی کمرہ نہیں بنا تھا۔شمال مشرقی دیوار کے ساتھ جو آخری کمرہ تھا اس کی چھت پر سامنے کے رخ کی دیکھ بھال کے لیے مورچہ بنایا گیا تھا۔تمام کمروں کو ملانے کے لیے دروازے لگائے گئے تھے۔یوں کہ آدمی صحن میں نکلے بغیر پورے کمروں میں گھوم سکتا تھا۔سامنے والا مورچہ جس کمرے پر بنا تھا اس کی چھت باقی کمروں سے بلند تھی۔اتنی کہ چھت اور سامنے والی مشرقی دیوار کی بلندی برابر ہو جاتی تھی۔یوں کہ اس جانب سے آدمی چھت پر لیٹ کر بھی فائر کر سکتا تھا۔

وہاں پہنچتے ہی میں نے دیکھا کہ رنڑا نے میری کلاشن کوف بھی کندھے سے لٹکائی ہوئی ہے۔

میں نے حیرانی سے پوچھا۔”ارے بھئی میری کلاشن کوف کیوں لے آئی ہو،کیا کلاشن کوف سے بھی فائر کرنا ہے؟“

”نہیں لالا جی!......کلاشن کوف سے تو آپ نے فائر کرنا ہے۔“

"میں نے کیوں؟"

"بتاتی ہوں۔" معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اس نے ایک جانب انگلی اٹھائی۔ "وہ درخت کا تنا نظر آ رہا ہے۔"

میں نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا قریباً اڑھائی تین سو میٹر کے فاصلے پر درخت کا ایک ٹنڈ منڈ تنا نظر آ رہا تھا، جو زمین سے سات، آٹھ فٹ بلند تھا۔ "ہاں مگر اس میں کیا خاص بات ہے۔"

"تنے کے درمیان میں کوئی چیز نظر آ رہی ہے۔" میری بات کا جواب دیے بغیر اس نے اگلا سوال داغا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، لگتا ہے کوئی شیشہ چمک رہا ہے۔"

وہ میری کلاشن کوف لانے کا مقصد پھوٹتے ہوئے بولی۔ "بس لالا جی!...... اسی شیشے کو آپ نے دس گولیوں سے نشانہ بنانا ہے۔"

میں ہنسا۔ "تو یہ کام اپنی باجی سے کروانا تھا نا۔"

"باجی ہی کا تو یہ ہدف ہے۔ اور یقین مانو درجنوں گولیاں ضائع کر چکی ہے ابھی تک اسے کامیابی نہیں ہوئی۔" یہ بات کہتے ہوئے اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی یوں جیسے گلگارے ہم سے دو قدم دور ہی تو کھڑی ہو۔

"اگر میں بھی اسے نشانہ نہ بنا سکا پھر؟"

"پھر مجھے معلوم ہو جائے گا کہ گلگارے باجی سچ کہتی ہیں۔"

میں نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا کہتی ہے وہ؟"

"کک...... کچھ نہیں۔" وہ ہکلا گئی تھی۔

"جانتی ہو شمریز چچا کہتے ہیں جھوٹ مذاق میں بھی نہیں بولنا چاہیے۔" میں نے اس کی باورچی خانے میں کہی گئی بات لٹائی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی......

"لالا جی!...... آپ نے ادھار لوٹانے میں ذرا دیر بھی نہیں لگائی۔"

"آئیں بائیں نہیں، اصل بات بتاؤ۔ تمھاری باجی کیا کہتی ہے۔"

"وہ......" کہہ کر وہ ایک دو لمحے کو خاموش ہوئی اور پھر اٹکتے ہوئے بات مکمل کرنے لگی۔ "کہتی ہیں کہ

............آپ ......بس ایسے ......مشہور ہو گئے ہیں ....اور...... آپ ......اتنے اچھے نشانہ باز بھی نہیں ہیں۔‘‘

’’اور تم اسی لیے مجھے آزمانے لے آئیں۔‘‘

’’نہیں لالا جی!...... یہ بات نہیں ہے۔‘‘

’’اچھا چھوڑو اس موضوع کو، تمھاری باجی صحیح کہتی ہے۔ مجھ سے یہ نشانہ نہیں لگے گا۔ اب چلو میں تمھیں بندوق چلانا سکھادوں۔‘‘

اس نے منھ پھلاتے ہوئے کہا۔’’یونھی فائر کیے بغیر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔‘‘

’’ہر آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔‘‘

وہ میرے سر ہو گئی۔’’نہیں بس آپ اس شیشے کو نشانہ بنائیں گے، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی میرے لالا جی کے خلاف بات کرے، چاہے وہ باجی ہی کیوں نہ ہوں۔‘‘

’’رنڑا، بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔‘‘

’’آپ نے نہیں نا کرنا فائر......؟‘‘ اس کے لہجے میں ناراضی شامل ہونے لگی تھی۔ گلگارے پہلے سے خفا تھی اب رنڑا کو خفا کرنا مجھے مناسب نہ لگا۔ یوں بھی وہ اتنی عقیدت اور خلوص سے مجھے لالا جی کہتی تھی۔ اور ہر لڑکی کی نظر میں اس کا بڑا بھائی ہیرو ہوتا ہے دنیا کے تمام مردوں سے انوکھا۔ ایک چھوٹی بہن کے سامنے میں اس کے بھائی کو زیرو نہیں کر سکتا تھا۔

’’اچھا ناراض نہ ہو، کرتا ہوں فائر۔ لیکن صرف ایک گولی فائر کروں گا۔ اگر شیشے کو نشانہ نہ بنا سکا تو سمجھ لینا تمھاری باجی ٹھیک کہتی ہے۔‘‘ یہ کہہ کر میں نیچے بیٹھ گیا۔ کلاشن کوف کی سائیٹ پر تین سو رینج لگا کر میں نے دونوں کہنیاں اپنے گھٹنوں پر ٹیک دیں۔ یہ سنائپر کی وہ خاص پوزیشن ہوتی ہے جب وہ درخت پر بنی مچان سے کسی ہدف کو نشانہ بناتا ہے۔ پوزیشن درست کر کے میں نے پچھلی سائیٹ کے وی نما کٹاؤ کو اگلی سائیٹ کی نوک سے ملایا اور شیشے پر نظر سادھ لی۔ اس کلاشن کوف کو میں پہلے سے آزما چکا تھا وہ میری نظر کے مطابق ہی صفر تھی اس لیے مجھے اس وقت کلاشن کوف کو جانچنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ شیشے کا دو انچ کا ٹکڑا صرف اپنی چمک کی وجہ سے

دکھائی دے رہا تھا۔اور سورج کی روشنی پڑنے کی وجہ سے وہ اپنے حجم سے کچھ بڑا دکھائی دیتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ گلگارے اسے نشانہ نہیں بنا پا رہی تھی۔یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی کلاشن کوف صحیح طریقے سے صفر ہی نہ ہوئی ہو۔اور اتنا باریک نشانہ لگانے کے لیے ہتھیار کا مکمل صفر ہونا ضروری ہوتا ہے، جبکہ ہتھیار کی ایسی صفر کاری کوئی منجھا ہوا سنائپر ہی کر سکتا ہے۔عام نشانہ بازی میں چونکہ اتنے فاصلے پر لگے ہدف کی لمبائی چوڑائی ایک انسان کے بالائی جسم کے بہ قدر ضرور ہوتی ہے اس لیے عموماً ہتھیاروں کو اس باریک بینی سے نہیں جانچا جاتا۔البتہ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا تو میں نے جس ہتھیار کو چند دن بھی پاس رکھنا ہوتا، اسے اپنے طریقے سے صفر ضرور کرتا تھا ۔اور اس وقت میرے ہاتھوں میری ذاتی کلاشن کوف ہی تھی۔وہ کلاشن کوف جو کمانڈر نصر اللہ نے مجھے بہ طور تحفہ عنایت کی تھی۔

شیشے کی چمک کی وجہ سے اس کا مرکز معلوم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔میں نے اپنی آنکھوں کو ساٹھ ستر فیصد میچ کر شیشے کی چمک کو دھندلایا اور مجھے شیشے کا مرکز معلوم ہو گیا۔اس کام میں مجھے دو تین سیکنڈ ہی لگے تھے۔شیشے کا مرکز معلوم ہوتے ہی میں نے بغیر کسی جھجک کے ٹریگر دبا دیا۔دھماکے کی گونج ختم ہونے سے پہلے شیشے کی چمک ختم ہو گئی تھی۔لازمی بات ہے ایک نازک شیشے کو کلاشن کوف کی طاقت ور گولی نے درجنوں ٹکڑوں میں تبدیل کر دیا تھا۔

”اوہ......نشانہ بن گیا لالا جی !زندہ باد۔“رنڑا وارفتگی سے چلائی اور اس کے ساتھ ہی منڈیر سے جھک کر گلگارے کو آوازیں دینے لگی۔”باجی......باجی......باجی......“

”ہاں کیا ہے۔“وہ باورچی خانے سے نکل کر سامنے ہوئی۔اس نے شاید یہ سوچا تھا کہ رنڑا نے پہلی مرتبہ گولی چلائی ہے اور یہی خوش خبری اسے دینا چاہتی ہے۔

”لالا جی......نے ایک ہی گولی سے شیشے کو نشانہ بنا دیا ہے۔میں کہتی تھی نا لوگ جھوٹ نہیں کہتے ،لالا جی بہت بہادر، دلیر اور اچھے نشانہ باز ہیں۔“وہ جوش بھرے انداز میں کہتی چلی گئی تھی۔

”تمھارا دماغ خراب ہوا ہے۔“سر جھٹکتے ہوئے وہ واپس مڑ گئی یقیناً اسے میری تعریف پسند نہیں آئی تھی۔

”کیا سچ مچ لالا نے اس شیشے کو نشانہ بنا لیا ہے۔“ثمر خان جو اس کے گلگارے کو مسلسل پکارنے پر صحن میں

آیا تھا حیران کن انداز میں پوچھنے لگا۔

رنڑا جلدی سے بولی۔ ''قسم سے سچ کہہ رہی ہوں، بے شک اوپر آکر دیکھ لو۔''

''ابھی آیا۔'' وہ خوش ہوتا ہوا سیڑھی کی طرف بھاگ پڑا۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ مورچے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔ آتے ساتھ اس کی نظروں مطلوبہ تنے کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ رنڑا پر جوش انداز میں اسے تفصیل بتا نے لگی۔ میں بس مسکراتے ہوئے ان دو معصوم بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ میری نظر میں وہ معمولی سا کام ان کی نظر میں ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ دو کلومیٹر دور سے ہدف کو نشانہ بنانے والے سنائپر کے لیے دو اڑھائی سو میٹر دور سے کسی ہدف پر گولی مارنا ایک مذاق ہی تو تھا۔

☆......☆......☆

رات کو سوتے وقت تک ثمر خان اور رنڑا اسی موضوع کو چھیڑے رہے۔ گلگارے نے اس بحث میں حصہ لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ شمریز خان خود اس شیشے کو نشانہ بنانے کے لیے چند گولیاں ضائع کر چکا تھا۔ رنڑا کی زبانی شیشہ ٹوٹنے کی بات سنتے ہی اس نے بس اتنا کہا تھا۔

''وہ ایس ایس ہے بیٹی، یہ نشانہ تو اس کے لیے نہایت معمولی بات تھی۔''

''باجی تو کہتی تھیں ان سے اچھا نشانہ باز کوئی ہو ہی نہیں سکتا اور یاد ہے انھوں نے لالا جی کو للکارا بھی تھا۔''

شمریز خان محبت سے بولا۔ ''وہ بھی تو تمھاری طرح بچی ہے۔''

رنڑا نے منھ بناتے ہوئے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ ''بچی کہاں ہیں ...... اتنی بڑی ہو گئی ہیں۔ اور دیکھ لیں ذرا بھی ان کی حکم عدولی کریں پٹائی کرنے سے بھی باز نہیں آتیں۔''

''تمھیں لالا جی کیا ملے، بڑی بہن ہی کے خلاف ہو گئی ہو۔''

رنڑا جلدی سے بولی۔ ''خلاف تو خیر نہیں ہوئی، وہ مجھے بہت پیاری ہیں۔ البتہ لالا جی سے ذرا کم۔''

شمریز خان نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''تمھارے لالا جی کل واپس جا رہے ہیں۔''

''کیوں ...... کس لیے۔'' وہ فوراً میری جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

میں ہنسا۔ ''تو کیا ساری زندگی یہیں پر گزاروں گا۔''

”کیا فرق پڑتا ہے، ہمارا اتنا بڑا گھر ہے۔“

میں اسے ڈراتے ہوئے بولا۔”میری بیوی پلوشہ نے یہ سنا، نا تو تمھیں جان سے مار دے گی۔“

رنڑا فخر سے بولی۔”میرے لالا جی کے ہوتے وہ مجھے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتی۔“

”بھول ہے تمھاری، وہ تمھارے لالا جی کے بھی کان کھینچتی ہے۔“

”لالا جی!...... بابا جان کہتے ہیں کہ جھوٹ......“ رنڑا کے منہ میں یہ الفاظ تھے کہ گلگارے اندر داخل ہوئی۔

”رنڑا، بڑوں سے تمیز سے بات کیا کرو۔اور جاؤ سو جاؤ۔“

”جی باجی۔“ وہ دھیمے لہجے میں کہہ کر اٹھ گئی۔

میں نے کہا۔”چچا شمریز!......ایک بات پوچھنا تھی۔“

”پوچھو جناب۔“ وہ میری طرف متوجہ ہوا۔جبکہ گلگارے میری طرف پیٹھ کر کے باپ کے پاؤں دبانے بیٹھ گئی تھی۔

”بڑوں سے تمیز سے بات کرنا، صرف چھوٹی بہنوں کے لیے ضروری ہوتا ہے یا یہی کلیہ بڑی بہن پر بھی لاگو ہوتا ہے۔“

شمریز خان نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔”گویا آپ میری گلگارے بیٹی پر الزام لگا رہے ہیں کہ وہ بڑوں کی عزت نہیں کرتی......اگر ایسا ہے تو بہت زیادتی کر رہے ہیں آپ۔“

”میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔“

”آپ کی بات سے تو مجھے یہی اندازہ ہوا ہے۔“

”اچھا اس موضوع کو چھوڑیں چچا شمریز!......آپ مجھے راستے کے بارے مزید تفصیل بتائیں۔“

”بہتر تو یہی ہے کہ چند دن اور یہیں قیام کر لو، جلد ہی مجاہدین کی کوئی پارٹی یہاں سے گزرے گی ان کے ساتھ آگے چلے جانا۔“

”میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ کسی کا انتظار کر سکوں۔“

اس نے پوچھا۔”اچھا صبح کس وقت نکلو گے؟“

''ناشتا کرتے ہی،قریباً سات آٹھ بجے تک۔''

''ہونہہ!......کہہ کر وہ چند لمحے سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر راستے کے بارے ضروری باتیں بتانے لگا۔گھنٹا ڈیڑھ بات چیت کرنے کے بعد ہم آرام کرنے لیٹ گئے کہ صبح مجھے سفر بھی کرنا تھا۔ہماری گفتگو کے دوران گلگارے مسلسل خاموش بیٹھی رہی تھی۔اور جونہی ہم سونے لگے وہ اپنے باپ کے جسم پر لحاف ٹھیک کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

صبح نماز کے بعد میں لحاف میں گھس کر ناشتے کا انتظار کرنے لگا۔ناشتا رنڑا لے کر آئی تھی۔شمریز خان اور میں نے اکٹھے بیٹھ کر ناشتا کیا۔میں دو تین پراٹھے کھا گیا تھا تا کہ دوپہر کے کھانے کی حاجت نہ رہے۔ناشتے کے بعد میں اپنا سفری تھیلا تیار کرنے لگا۔تھوڑی دیر میں میں جانے کے لیے تیار تھا۔شمریز سے الوداعی معانقہ کر کے میں نے رنڑا اور ثمر خان کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا۔وہ دونوں میرے جانے سے پریشان ہو گئے تھے۔

رنڑا نے پوچھا۔''لالا جی!......آپ واپس کب لوٹیں گے۔''

''اس بارے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

اس نے منھ بسورا۔''اچھا یہ وعدہ تو کر سکتے ہیں نا کہ اسی راستے سے لوٹیں گے۔''

''نہیں۔''میں نے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔''مجھے نہیں معلوم کہ میری واپسی کن حالات میں ہو گی، بلکہ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ میں واپس لوٹ بھی سکوں گا یا نہیں۔''

''لالا جی،ایسے تو نہیں کہتے۔''رنڑا کی آنکھیں نم ہونے لگیں تھیں۔

''اچھا تمھاری باجی کہاں ہے؟ کیا اس نے مجھے رخصت نہیں کرنا۔''میں نے جلدی سے موضوع تبدیل کیا

''وہ تو ناشتا بنا کر گھر سے نکل گئی تھیں۔''وہ انکشاف کرتے ہوئے بولی۔''شاید گاؤں کی طرف گئی ہوں۔میں نے انھیں کہا بھی تھا کہ لالا جی نے ناشتے کے بعد الوداع ہونا ہے،مگر مجھے انھوں نے یہ کہہ کر جھڑک دیا کہ یہ معلومات میں اپنے پاس ہی رکھوں۔''

''شاید کوئی ضروری کام ہو۔''میں نے کھسیانا ہو کر بات بنائی۔

''بچی ہے ذیشان صاحب، میں اس کی طرف سے معذرت خواہ ہوں۔'' شمریز خان نے جلدی سے صفائی دی۔

جیب سے چار پانچ ہزار کے بقدر رقم نکال کر میں نے ثمر خان اور رنڑا کے ہاتھ پر آدھے آدھے نوٹ رکھے اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ وہ انکار میں سر ہلاتے رہ گئے تھے۔

گلگارے واقعی مجھ سے سخت ناراض تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی حساس ہو گی۔ اور آخری وقت تک مجھے معاف کرنے پر تیار نہیں ہو گی۔ اسے منانے کے لیے میں نے اپنا ایک دن ضائع کر دیا تھا۔ گو اس کے ساتھ میرا کوئی ایسا جذباتی لگاؤ تو نہیں تھا کہ میں وہ واقعہ بھول نہ پاتا، البتہ اس نے میری جان بچا کر جو احسان کیا تھا اس قرض کے بوجھ نے میرے کندھے ضرور جھکا دیے تھے۔

گھر سے نکل کر میں جنوب کی طرف موجود ڈھلان پر چلنے لگا۔ ڈھلان پر ترچھا چلتے ہوئے میں نالے میں اتر سکتا تھا مگر نالے میں برف کچھ زیادہ ہی اکٹھی ہوتی ہے۔ جبکہ تازہ پڑی برف میں چلنا کافی دشوار ہوتا ہے ڈیڑھ دو فٹ پڑی ہوئی تازہ برف میں آدمی کا پاؤں گھٹنے تک دھنس جاتا ہے۔ پاؤں کو اوپر کھینچتے ہوئے ٹھیک ٹھاک طاقت استعمال کرنا پڑتی ہے۔ یوں منٹوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ اس پر مشقت چلنے سے اتنی تھکن ہوتی ہے کہ چند کلومیٹر چلنا بھی کارِ دار بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے نالے میں اترنے کے بجائے ڈھلان پر ترچھا چلنا پسند کیا تھا کہ ڈھلان پر زیادہ برف جمع نہیں ہو پاتی۔

کلومیٹر بھر چل کر مجھے نالے کی تہہ نظر آنے لگی۔ یہ دیکھ کر میں خوش ہو گیا تھا کہ تہہ میں بہتے پانی کی وجہ سے نالے کے درمیان میں برف مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی۔ میں نے ڈھلوان پر چلنے کا ارادہ ختم کر کے نالے میں اترنے لگا۔ اسی وقت میری نظر پندرہ بیس گز دور گزرنے والے قدموں کے نشانات پر پڑی۔ کوئی آدمی وہاں سے پہلے بھی گزرا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دماغ میں خیال گزرا کہ شاید وہ گلگارے کے پاؤں کے نشان ہوں، مگر پھر میں نے اپنے خیال کو جھٹلا دیا کہ ان کا گاؤں خواگا ابو مخالف جانب میں پڑتا تھا اسے اس طرف آنے کی کیا ضرورت تھی۔

نالے میں اتر کر میں پانی کے کنارے کنارے چلنے لگا۔قدموں کے بنے ہوئے دوسرے نشان بھی نالے کی تہہ میں بہتے ہوئے پانی کے پاس آ کر ختم ہو گئے تھے۔میں چلتے ہوئے چوکنے انداز میں دائیں بائیں کا جائزہ بھی لیتا گیا کہ قدموں کے نشان کسی ایسے اچکے کے بھی ہو سکتے تھے جو مجھے دھوکے سے نشانہ بنا لیتا۔نالے کا رخ مشرق سے مغرب کی جانب تھا، پانی کا بہاؤ بھی اسی جانب تھا۔مجھے گویا غیر محسوس اترائی میں اترنا پڑ رہا تھا اس وجہ سے مجھے چلنے میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آ رہی تھی۔

فرلانگ بھر کے فاصلے پر نالا جنوب کی طرف مڑا مزید پچاس میٹر چلتے ہی مجھے پاؤں کے نشان اوپر کی جانب بڑھتے نظر آئے۔اس طرف نظریں دوڑاتے ہی مجھے قریبی ٹیکری پر کوئی بیٹھا ہوا نظر آیا۔اسے پہچانتے ہی میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔وہ کوئی اور نہیں گلگارے تھی۔گود میں کلاشن کوف رکھے ایک پتھر پر تشریف ٹیکے وہ سامنے کی جانب دیکھ رہی تھی۔وہ مجھے دیکھ چکی تھی مگر اس نے نہ تو مجھے مخاطب کیا تھا اور نہ میری جانب متوجہ ہوئی تھی۔وہ چھوٹی سے ٹیکری نالے کی تہہ سے بیس پچیس گز ہی بلند تھی۔ایک لمحہ رک کر میں نے اس کی جانب گہری نظروں سے دیکھا اور پھر آگے گزرتا چلا گیا۔میرا خیال تھا کہ وہ مجھے آگے جاتا دیکھ کر ضرور آواز دے گی، مگر دس پندرہ قدم چلنے کے باوجود وہ اسی طرح بے پروائی سے بیٹھی ناک کی سیدھ میں دیکھتی رہی۔

اپنے قدم روک کر میں نے دوبارہ اس کی جانب دیکھا اور پھر ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس کے قدموں کے بنے ہوئے نشانات کی طرف بڑھ گیا۔نہ جانے وہ وہاں کیوں آئی تھی، مجھے معذرت کا موقع دینے، مجھ سے مزید شکوے کرنے یا کسی اور مقصد سے۔بہرحال اس کی سوچ جو بھی تھی اس کی وہاں آمد کی وجہ میں ہی تھا۔اور وہی وجہ جاننے کے لیے میں اس کی طرف بڑھنے لگا۔

تھوڑی سی چڑھائی طے کر کے میں اس کے قریب پہنچا۔مگر میری جانب توجہ دیے بغیر وہ سامنے دیکھتی رہی۔اس کا چہرہ بالکل سپاٹ نظر آ رہا تھا یوں جیسے کوئی آدمی تنہائی میں خالی الذہن ہو کر خلا میں گھور رہا ہو۔

قریب پہنچ کر میں نے گلا کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا، مگر اس کے انہماک میں کوئی فرق نہ پڑا، اس نے میری طرف دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔اس کے دائیں جانب پڑے پتھر پر سے برف ہٹا کر میں نے بھی نشست سنبھال لی۔سفری تھیلا اپنے کندھوں سے نکال کر میں نے نیچے رکھ دیا تھا۔

ایک دو لمحہ سوچنے کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں گفتگو کی ابتداء کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں شرمندہ ہوں اور معافی کا طلب گار ہوں۔“

اس کے انہماک میں دراڑ پڑی، میری جانب سر گھماتے ہوئے اس نے گہری نیلی آنکھیں میرے چہرے پر جمائیں جن کی تہہ میں جوار بھاٹا اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ ”اور آپ کے معذرت کرنے سے مجھے پہنچنے والی اذیت کا ازالہ ہو جائے گا۔“

”میں نے تو بس اپنی غلطی کو تسلیم کیا ہے اور یقیناً اعتراف جرم سے مجرم معافی کا حق دار تو ہو جاتا ہے۔“

”حق دار نہیں، طلب گار کہیں۔ یہ طے کرنا زیادتی کا شکار ہونے والے کا کام ہے کہ معاف کیا جائے یا بدلہ لیا جائے۔“

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ”شاید اتنا بڑا قصور تو نہیں تھا میرا۔“

”یہ چھوٹی بات نظر آ رہی ہے آپ کو، جانتے بھی ہیں مجھ پر کیا بیتی؟...... میں اپنی نظروں سے گر گئی، آپ کو آنکھ ملانے کے قابل نہ رہی، میرے کردار، پارسائی اور شخصیت کا بت پاتال میں جا گرا۔ میرے احساسات کے اتنے ٹکڑے ہوئے جنہیں سمیٹنے کے لیے شاید ساری زندگی بھی کم پڑ جائے۔“ اس کی نیلی آنکھیں جھیل کا منظر پیش کرنے لگی تھیں۔ ”میں ایسی لڑکی تو نہیں ہوں جیسی آپ سمجھ بیٹھے، اپنے رشتے کی اطلاع ہی دی تھی نا، یہی باور کرایا تھا کہ میں آپ کو بھائی نہیں سمجھتی وہ بھی اس وقت جب تک مجھے پلوشہ کے بارے معلوم نہیں ہوا تھا۔ اور میں کچھ بھی سمجھتی رہتی آپ نے تو مجھے چھوٹی بہن کہا تھا نا، اگر مجھ سے آپ کے ساتھ ٹکرانے کی غلطی ہو گئی تھی تو اسے اس انداز میں اجاگر کرنے کیا ضرورت تھی کہ میرے کردار پر انگلی اٹھنے کی نوبت آ جاتی۔ اور میں قسم کھا کر کہتی ہوں میں کسی ایسی نیت یا ارادے سے آپ کے قریب نہیں ہوئی تھی جیسا آپ سمجھ بیٹھے۔ اتنے اوچھے، سستے اور بے قیمت کردار کی مالک نہیں ہوں میں۔ وہ تو بس حالات ایسے تھے کہ مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی اور آپ نے مجھے بے توقیر کرنے، میری عزت خاک میں ملانے اور مجھے اپنی نظروں سے گرانے میں ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہ کی۔“

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی حساس ہو سکتی ہے۔ میں تو پلوشہ کا عادی تھا جسے شروع شروع

میں میں کتنی بار ایسی باتوں پر نہ صرف زبان سے متنبہ کرتا رہا تھا بلکہ ہاتھوں سے پکڑ کر بھی دور دھکیل دیا کرتا تھا اور اس نے میری کسی بات کو مچھر کے پر جتنی بھی اہمیت نہیں دی تھی۔ بلکہ الٹا وہ مجھے مطعون کر دیا کرتی۔ حالانکہ وہ اس وقت میرے لیے مکمل غیر تھی اور میں جو کچھ کہتا تھا وہ بناوٹی نہیں حقیقت ہوا کرتا تھا۔لیکن وہ الٹا مجھے ہی دھمکانے لگتی۔ یہاں میری ذراسی غلطی پر گلگارے نے جانے کتنی گہرائی میں اسے محسوس کر لیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی جگہ اگر پلوشہ ہوتی اور اسے میں نے یونھی دور دھکیلا ہوتا تو وہ ایک لحظہ ضائع کیے بغیر دوبارہ مجھ سے آلپٹی ہوتی۔ میرے اندر کہیں دور سے آواز اٹھی......

''ہاں، کیونکہ وہ تمھیں شروع دن سے چاہتی تھی اور اس کے قریب ہونے کا مقصد نزدیکیاں ختم کرنا ہی تھا ،گلگارے تو بے خیالی میں قریب ہوئی تھی۔''

''اچھا روؤ تو مت۔''میں نے اس کا سر دہاتھ اپنی دونوں ہتھیلیوں کے بیچ لیا اور خفت سے بولا۔''یہ خدا میرا نہ تو یہ ارادہ تھا اور نہ یہ خیال ہی جیسا آپ سمجھے بیٹھی ہیں۔ جو کچھ ہوا نادانستگی اور عجلت میں ہوا۔ یقیناً میں نے غلط بلکہ بہت ہی غلط کیا تھا اور میرے ذہن کے کسی گوشے میں دور دور تک بھی یہ گمان نہیں کہ میں آپ کے کردار پر رائی برابر بھی شک کر سکوں ...... حقیقت تو یہ ہے کہ مجھ سے حفظ ماتقدم کے طور پر وہ فعل سرزد ہوا تھا۔ بے شک میں نے آپ کو بہن کہہ کر پکارا، لیکن اتنا تو آپ بھی جانتی ہیں کہ کسی لڑکی کو بہن کہنے یا سمجھنے سے وہ آپ کی محرم نہیں بن جاتی۔ اس کی حیثیت تب بھی غیر عورت جیسی ہی ہوتی ہے۔اسی طرح یہ بات بھی آپ جانتی ہوں گی کہ شیطان مردود انسان کے جسم میں خون کی طرح متحرک رہتا ہے۔ وہ کسی کے دماغ میں گندے اور غلیظ خیالات پیدا کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاتا۔ آپ جیسی خوب صورت اور پیاری شکل اللہ پاک نے بہت کم لڑکیوں کو عنایت کی ہوگی، جبکہ میں ایک گناہ گار اور سستے خیالات کا مالک عام سا جوان ہوں۔ آپ کے بارے میرے دل میں نہایت پاکیزہ، مقدس اور عقیدت مندانہ خیالات بھرے ہیں۔ اتنے زیادہ قریب ہونے پر خدا نخواستہ میرے دل میں کوئی ایسا خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا جس پر میں ساری زندگی پشیمان رہتا۔ بس یہی سوچ کر میں عجلت میں کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکا۔ بجائے اس کے کہ میں خود پیچھے ہو جاتا اور آپ یہ سمجھتیں کہ میں آپ کو ہول میں جھانکنے کا موقع دے رہا ہوں، میں نے آپ کو بازو سے پکڑ دور دھکیل دیا۔ میرا طریقہ اور انداز غلط نہیں بے

ہودہ تھا، لیکن معاف کرنا اور نظر انداز کر دینا آپ کے بس میں ہے۔ مجھے اسی وقت احساس ہو گیا تھا۔ اب تک شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ میری محسن ہیں۔ مجھے نئی زندگی عطا کرنے میں اللہ پاک نے آپ کو سبب بنا کر بھیجا ہے...... براہ مہربانی درگزر کرو، مجھے معاف کر دو۔"

اپنے بائیں ہاتھ کی پشت کو اس نے آنکھوں پر پھیرا اور نیچے دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھنے لگی۔ "پلوشہ کو یہ بات بتاؤ گے؟"

"نہیں۔ مگر آپ کے بارے ضرور بتاؤں گا۔"

"چھوٹی بہنوں کو تو آپ کہہ کر نہیں پکارا جاتا۔" بہ ظاہر تو نہیں، مگر اس کے لہجے کی گہرائیوں میں ہلکے سے دکھ کی آمیزش شامل تھی۔

میں مسکرایا۔ "یہ تم نے بالکل صحیح کہا۔"

"میں بھی معذرت خواہ ہوں، کل آپ مجھے منانے کے لیے پورا دن رکے رہے مگر میں نے آپ کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔"

"تو تمھیں معلوم تھا کہ میں کیوں رکا ہوں۔"

"بچی تو نہیں ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"اتنی بڑی بھی نہیں ہو جتنا بننے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"آپ کی پلوشہ سے تو بڑی ہوں نا۔"

"ہونہہ!...... عمر میں کہہ سکتے ہیں، ورنہ جو کام وہ کرتی ہے اس کے مقابل آپ بالکل چھوٹی بچی نظر آئیں گی۔"

"ہاں، وہ میری آئیڈیل ہے۔ میں نے اس کی بہت ساری کہانیاں سنی ہیں اور اسے ملنے کا مجھے بہت شوق ہے۔"

"دعا کرو وہ مجھے جلدی مل جائے تاکہ میں اسے تمھارے گھر بھیج دوں، پھر خوب گپ شپ کرنا۔"

"اچھا دکھنے میں کیسی ہے؟" گلگارے کی آنکھوں میں گہرا تجسس تھا۔

میں نے پرس میں رکھی اس کی تصویر نکال کر گلگارے کی طرف بڑھا دی۔ ''لو خود دیکھ لو۔'' یہ تصویر میں نے اس کی ماں سے لی تھی۔ تصویر میں ہونٹوں پر ملکوتی تبسم سجائے وہ کیمرے کی طرف متوجہ تھی۔

گلگارے اس کی تصویر کو انہماک سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''واقعی اس کے بال تو بالکل چھوٹے ہیں اور بالکل لڑکا ہی لگ رہی ہے۔''

''شکل کیسی ہے۔''

''جتنی پیاری ہے اتنی ہی خوش قسمت بھی ہے کہ، جسے پیار کرتی ہے اسے بھی اس قدر محبوب ہے۔''

''جانتی ہو اس کے ملنے سے پہلے میری زندگی کتنی پھیکی بے رونق اور بے مزہ تھی۔ خاص کر عورت ذات تو میرے نزدیک بالکل اعتبار کے قابل نہیں تھی۔ اور اس دن میں نے تمھیں یہ نہیں بتایا تھا کہ پلوشہ شروع میں مجھ سے کیسے ٹکرائی تھی......'' میں اس کے سامنے پلوشہ ایسی بہت سی باتیں دہراتا گیا جو میں پہلے نہیں بتا سکا تھا۔

وہ انہماک، دلچسپی اور مسکراتے ہوئے پلوشہ کی شوخیوں، شرارتوں بھرے واقعات سنتی رہی۔ اس دوران وہ گاہے گاہے اس کی تصویر پر بھی نظریں دوڑا لیتی۔ میری بات ختم ہوتے ہی وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔

''اللہ پاک کا شکر ہے کہ آپ دونوں ایک ہوگئے ہو۔''

''صحیح کہا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پتا ہے میں نے دل میں ایک اور گلہ بھی چھپایا ہوا ہے۔'' پلوشہ کی تصویر میری جانب بڑھاتے ہوئے وہ شکوہ کناں ہوئی۔

میں دلچسپی سے مستفسر ہوا۔ ''بھلا وہ کون سا؟''

''ثمر خان کو آپ نے کلاشن کوف تحفے میں دی، رنڑا کو بارہ بور، ابو جان کو ایٹ ایم ایم، میرے لیے کچھ بھی نہیں......کم از کم اتنا ہی کہہ دیتے کہ یہ پستول گلگارے کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں۔''

''تمھیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟''

''میں دوسرے کمرے میں بابا جان اور آپ کی تمام باتیں سن رہی تھی، جونہی آپ نے باہر جانے کا ارادہ کیا میں بھاگ کر باورچی خانے میں گھس گئی۔''

میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ''چھپ کر باتیں سننا کوئی اچھی عادت تو نہیں ہے نا۔''

''آپ میرے شکوے کو باتوں میں نہ اڑائیں ...... بہر حال آپ کے بتائے بغیر میں نے ایک پستول آپ کی نشانی کے طور پر رکھ لیا ہے۔'' اس نے کندھے سے لٹکے ہوئے کپڑے کے تھیلے سے تیس بور پستول نکال کر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ وہ پشاور سے ملحق شہر درہ آدم خیل کا بنا ہوا مقامی ساخت کا پستول تھا۔ درے میں اچھا اسلحہ بھی بنتا ہے اور ناقص بھی۔ وہ دونوں پستول میں نے دیکھے تھے، بس گزارے لائق ہی تھے۔

''پاگل، یہ ہتھیار میرے نہیں ہیں ...... یہ تو ان اچکوں کی نشانی ہیں۔ تمھارے لیے میرے پاس کچھ اور موجود ہے......لیکن تم نے مجھے موقع ہی نہ دیا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے نیفے میں اڑسا ہوا گلاک نائینٹین نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، یہ میں نہیں لے سکتی......آپ کو آگے ضرورت پڑے گا۔''

''میرے لیے یہ کافی ہے۔'' میں نے گود میں رکھی کلاشن کوف کا بٹ تھپتھپایا۔

پستول میرے ہاتھ سے لے کر الٹ پلٹ کر کے دیکھتے ہوئے وہ شرارتی لہجے میں بولی۔ ''ویسے اتنا مہنگا تو نہیں لگ رہا، اگر کبھی رقم کی ضرورت پڑے تو کیا اسے دس پندرہ ہزار میں بیچ سکتی ہوں۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دو سو سے کم ایک روپیا بھی نہ لینا۔''

''مذاق تو نہ کریں......'' مجھے سنجیدہ دیکھ کر اس کے لہجے میں حقیقی حیرانی ابھر آئی تھی۔ ''دو سو میں تو آج کل اچھا چاقو بھی نہیں ملتا۔''

''سچ کہہ رہا ہوں......دو سو ہزار سے ایک روپیا بھی کم نہ لینا۔''

''دو سو ہزار......'' وہ اب تک میری بات نہیں سمجھی تھی۔

''میرا مطلب ہے دو لاکھ۔''

''کیا......؟ اتنا مہنگا، میں نے نہیں رکھنا۔'' اس نے ایک دم پستول میری جانب واپس بڑھایا۔

''پاگل۔'' میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنی پیاری بہن کے لیے تو اس سے کئی گنا قیمتی چیز بھی حقیر کہلائے گی۔''

''آپ جب واپس آئیں گے تو پھر لوں گی۔ فی الحال یہ آپ کو وہاں کام آئے گا۔'' پستول میرے حوالے کرنے کے بہانے اس نے میری واپسی کے راستے کا بھی تعین کر دیا تھا۔

''میرے لیے یہ بہتر رہے گا۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے تیس بور پستول لے کر نیفے میں اڑس لیا۔

''مگر......''

''خاموش۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بات کرنے سے روکا اور سفری تھیلے سے گلاک کی گولیاں نکالنے لگا۔ سو کے قریب فالتو گولیاں میرے پاس موجود تھیں وہ تمام میں نے گلگارے کی جانب بڑھا دیں۔

گولیاں میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔''ویسے لالاجی کی لاڈلی بہن رنڑابی بی نے آپ کو بتایا تو ضرور ہوگا کہ میں نے اس کے سامنے آپ کی کتنی برائیاں کی تھیں۔''

میں کھل کھلا کر ہنسا۔''ہاں کچھ ایسا کہہ تو رہی تھی۔''

''کل کا سارا دن اور گزشتہ رات، آپ کی تعریفیں کر کر اس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیں۔ کم از کم پانچ چھ دفعہ تو بے عزت ہوئی ہوگی مگر باز پھر بھی نہ آئی۔ آپ نے غلطی سے شیشے کو کیا نشانہ بنا لیا اسے آپ سے بہتر نشانے باز پوری دنیا میں دکھائی نہیں دے رہا۔ کل رات جب آپ کے سونے کے بعد میں اپنے کمرے میں گئی وہ جاگ رہی تھی اور اس کے پاس ایک ہی موضوع تھا، اس کا لالاجی۔''

''حاسد کہیں کی، میرے سامنے بھی اس نے اپنی باجی کی کافی تعریفیں کی تھیں، مگر میں نے تو اسے نہیں ڈانٹا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں بھی مسکرا دیا تھا۔

''اچھا وہ بڑی چٹان پر پڑا چھوٹا گول پتھر نظر آ رہا ہے۔'' اس نے نالے میں پڑے ہوئے ایک بڑے پتھر کی طرف اشارہ کیا جس پر چھوٹا سا گول پتھر رکھا تھا۔ فاصلہ اڑھائی سو میٹر سے زیادہ ہی ہوگا۔ لگ یہی رہا تھا کہ اس نے آتے وقت اس چٹان پر خود ہی وہ پتھر رکھا تھا۔

میں نے جواب دیے بغیر کلاشن کوف کو کندھے سے لگایا اور لبلبی دبا دی۔ چھوٹا پتھر نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے۔''اب نظر نہیں آ رہا۔''

وہ شوخی سے بولی۔''یہ بات میں رنڑا بی بی کو تو بالکل بھی نہیں بتاؤں گی۔''

میں نے مزاحیہ لہجے میں جواب دیا۔''سب جانتے ہیں کہ گلگارے بی بی کتنی حاسد ہے۔''

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔''اگر حاسد ہوتی تو کسی اور سے حسد کرتی۔''

''اور کس سے؟''میں نے بے خیالی میں پوچھ بیٹھا۔

''کسی سے بھی، ثمر خان، بابا جان یا پلوشہ وغیرہ سے۔''بات کو گول مول کر کے بھی اس نے واضح کر دیا تھا۔

''یقیناً اب مجھے چلنا چاہیے۔''میں اس لاینحل بحث کو مزید جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔

اس کے چہرے پر اداسی نمودار ہوئی مگر اس نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔بغل میں لٹکائے جھولے سے کپڑے کی پوٹلی نکال کر اس نے میری جانب بڑھائی۔

''آپ کے لیے دال کے پراٹھے بنائے ہیں۔''

''ہاں اس کی تو بہت ضرورت تھی۔''میں نے پوٹلی لے کر سفری تھیلے میں ڈال لی۔ان کے گھر سے چلتے وقت بھی میرے دماغ میں یہ بات موجود تھی کہ رنڑا کو کہہ کر راستے کے لیے کوئی پراٹھے وغیرہ پکوا لوں ،مگر گلگارے کے جانے کی خبر سن کر میں رنڑا کو نہیں کہہ پایا تھا۔

میں جانے کے ارادے سے کھڑا ہوا۔وہ بھی اداس چہرہ لیے اٹھی،ایک لمحہ مجھے گھورنے کے بعد وہ قدم بڑھا کر میرے نزدیک ہوئی اور میری چھاتی پر سر رکھ دیا۔اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے اداس لہجے میں کہا۔''بہنا دعاؤں میں یاد رکھنا۔''

''بھائیوں کو تب ایسا کہنا پڑتا ہے جب انھیں بہن کی محبت میں شبہ ہو۔''یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے آہستگی سے علیحدہ ہوگئی۔

''نہیں صرف یاد دہانی کرا رہا تھا۔''

''پھر بھی مجھے برا لگا۔''

''اچھا غلطی ہوگئی اور اب تم جاؤ۔''

''میں یا آپ؟''پھیکی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوگئی تھی۔

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔''تم......''

''اللہ پاک آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے لالا جی!'' یہ کہتے ہی وہ جھٹکے سے مڑی اور ٹیکری سے اترتی چلی گئی۔نالے میں اتر کر اس نے ایک بار مڑ کر دیکھا اور پھر واپسی کے راستے پر گامزن ہو گئی۔پلوشہ کی طرح اس کے قدموں میں بھی بہت تیزی تھی۔پہاڑی علاقے کے رہائشیوں کے لیے پہاڑوں پر چڑھنا اترنا معمول کی بات ہوتی ہے۔میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔یہاں تک کہ وہ نالے کے موڑ پر پہنچ گئی۔وہاں ایک بار پھر رک کر وہ چند لمحے میری جانب دیکھتی رہی، پھر الوداعی انداز میں ہاتھ لہرانے لگی۔

میں نے بھی ہاتھ اٹھا کر زیر لب ''خدا حافظ۔'' کہا۔یقیناً اس کی طرح میری آواز بھی اس تک نہیں پہنچی تھی مگر میری طرح اسے بھی یقین ہو گا کہ میں نے خدا حافظ کہا ہے۔

لمحہ بھر ہاتھ لہرانے کے بعد وہ موڑ مڑتے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ایک اور قابلِ احترام اور معزز ہستی مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔نہ جانے وہ زندگی میں دوبارہ مل بھی پاتی یا ہمیشہ انھی مختصر گھڑیوں کی یاد کی صورت میں میری یادداشت میں زندہ رہتی۔

میں نے سفری تھیلا اپنی پیٹھ پر لادا، کلاشن کوف کو دائیں کندھے سے لٹکایا اور بوجھل قدموں سے اپنے راستے ہو لیا۔میں نے کافی وقت گلگارے کے ساتھ گزار لیا تھا۔سورج کے سامنے چھوٹی چھوٹی بدلیاں آنے لگی تھیں۔ہاتھوں کو گرم کرنے کے لیے میں نے کوٹ کی جیب میں ڈالے، میرا داہنا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا اور میں ایک دم حیرانی بھرے انداز میں رک گیا کہ شمریز خان کے مکان سے رخصت ہوتے وقت میں نے جیب میں کوئی چیز بھی نہیں ڈالی تھی۔میں نے فوراً ہاتھ باہر نکالا، وہ ہزار ہزار کے نوٹ تھے جنھیں گول لپیٹ کر ان پر دھاگا پھیرا گیا تھا۔دھاگا کھولنے پر مجھے نوٹوں کے درمیان ایک چھوٹا سا رقعہ بھی نظر آ گیا تھا جو پشتو میں تحریر کیا گیا تھا۔ٹوٹی پھوٹے شکستہ الفاظ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لکھنے والا واجبی تعلیم رکھتا ہے۔بلاشبہ وہ رقعہ اور پیسے میری جیب میں گلگارے نے ڈالے تھے۔میری نظریں اس شکستہ تحریر پر پھسلنے لگیں۔

سلام کے بعد لکھا تھا۔بے ہوشی کے وقت آپ کے جسم سے میں نے ہی لباس علیحدہ کیا تھا۔لباس کی تلاشی لینے پر تین ہزار روپے کے بہ قدر رقم نظر آئی تھی۔اور جہاں آپ جا رہے ہیں وہاں آپ کو کافی رقم کی ضرورت

پڑے گی۔ یہ میرے اپنے پیسے ہیں، میں جانتی ہوں کہ اگر میں نے براہ راست آپ کے حوالے کیے تو بڑا ہونے کا فائدہ اٹھا کر آپ مجھے ڈانٹ کر یہ پیسے واپس دے دیں گے۔ اسی لیے مجھے چوری آپ کی جیب میں ڈالنے پڑ رہے ہیں۔ گو یہ تھوڑی سی رقم ہے، مگر یقین مانو میری ساری پونجی یہی ہے۔ اگر بہت زیادہ پیسے بھی میرے پاس ہوتے تو آپ کو دے دیے ہوتے۔ اپنا بہت بہت خیال رکھنا۔ میرے گزشتہ دو روز کے رویے پر لازماً آپ کا دل دکھا ہوگا۔ بہ خدا میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ بس اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ معذرت خواہ ہوں۔ اللہ پاک آپ کو اور میری بہن پلوشہ کو ہمیشہ خوش رکھے...... اللہ حافظ۔'' یہ ساری تحریر اس نے پہلے سے لکھ کر اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ صرف اپنا گلہ مجھ تک پہنچانے آئی تھی ورنہ ناراضی وہ پہلے سے ختم کر چکی تھی۔

اس کا خلوص دیکھتے ہوئے میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ میں نے رقم شمار کی ہزار ہزار کے پندرہ نوٹ تھے لیکن ان کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ شاید قارون کا خزانہ اٹھانے والے اونٹ بھی ان کے بوجھ تلے بیٹھنے پر مجبور ہو جاتے۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے عہد کر لیا کہ اگر زندگی نے وفا کی تو ایک بار گلگارے کو ملنے ضرور لوٹوں گا۔ یقیناً اس نے میری جیب میں نوٹ ڈالنے کے لیے ہی میری چھاتی پر سر رکھا تھا۔ میں پہلے ہی اس کا بہت زیادہ مقروض تھا اس نے مزید زیر بار کر دیا تھا۔ اس نیلی آنکھوں والی پاکیزہ خیالات لڑکی نے ہمیشہ میری یاد میں زندہ رہنا تھا۔

''اللہ پاک تمھارا نصیب اچھا کرے اور تمھیں ڈھیروں خوشیاں نصیب ہوں میری پیاری بہنا!......'' زیر لب بڑبڑاتے ہوئے میں نے آنکھوں میں پیدا ہونے والی نمی خشک کی اور آگے بڑھ گیا۔

ان اچکوں میں سے ایک کی جیب میں مجھے بیس پچیس ہزار کے قریب پاکستانی کرنسی ملی تھی مگر اس بارے میں اسے نہیں بتا سکا تھا۔ اسی وجہ سے اس مخلص لڑکی کو اپنی ساری پونجی میرے حوالے کرنا پڑ گئی تھی۔ میں مسلسل اترائی میں جا رہا تھا، لیکن زیادہ دیر اترائی کا یہ سفر جاری نہ رہا۔ وہ نالہ شمال کی جانب مڑا اور فرلانگ بھر کے بعد اس کا رخ مشرق کی طرف ہو گیا۔ وہ علاقہ یوں بھی پہاڑ در پہاڑ ہے۔ نہ نالوں کا رخ متعین ہے اور نہ پہاڑی سلسلے کسی ایک سیدھائی میں ہیں۔ انجان آدمی کے لیے تو وہ پہاڑ بھول بھلیوں کی طرح ہیں۔ جو ایک بار ان بھول

بھلیوں میں گھس جائے نکلنے کا راستہ نہیں ڈھونڈ پاتا۔

میں نے مغرب کی سمت اپنا سفر جاری رکھا اور ایسا کرنے کے لیے مجھے اب اوپر چڑھنا پڑ رہا تھا۔ بلندی کے سفر میں آدمی کی رفتار خود بہ خود دھیمی پڑ جاتی ہے۔ زیادہ تیزی کی کوشش میں تھکن کے ساتھ انسان کا سانس بھی پھولنے لگتا ہے۔ اور میدانی علاقے سے آئے ہوئے آدمیوں کا سانس، رہائشی لوگوں کی نسبت زیادہ پھولتا ہے۔ سورج کے گرد پھرنے والی آوارہ بدلیاں دھوپ کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ گو لگتا تو نہیں تھا کہ برف باری یا بارش ہو گی، مگر اس بارے وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہاں کا موسم تو ایسا ہے کہ تیز دھوپ کی حکمرانی کو بادل چند لمحوں میں زیر کر کے جل تھل کر دیتے ہیں اور زمین پر بارش کا پانی ابھی تک بہہ رہا ہوتا ہے کہ سورج ایک بار پھر پوری آب و تاب سے چمکنا شروع ہو جاتا ہے۔

چڑھائی شروع شروع میں تو نارمل تھی مگر آہستہ آہستہ سخت ہونا شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ میرے لیے سیدھا اوپر چڑھنا مشکل ہو گیا اور میں ترچھا آگے کا سفر طے کرنے لگا یوں کہ دس پندرہ قدموں کے بعد میں تین چار قدم بلند ہو پاتا۔

سورج اپنا آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا۔ میرے پاس موجود پانی کی دونوں بوتلیں خالی ہو گئی تھیں اور جس بلندی پر میں موجود تھا اتنی اونچائی پر عموماً چشمے نہیں ہوتے۔ چشمے زیادہ تر نالوں کی تہہ سے بیس پچیس گز اوپر ہی پھوٹتے ہیں۔ اس پہاڑی کی ڈھلان تو اتنی سیدھی تھی کہ وہاں برف بھی نہیں ٹھہر پائی تھی۔ اب دوسری جانب اتر کر ہی مجھے کوئی چشمہ مل سکتا تھا۔

اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر پانی کی غیر موجودی میں مجھے کھانا کھانا مناسب نہ لگا۔ یوں بھی بھوک پیاس برداشت کرنا ہم سنائپرز کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔ کئی کئی دن بھوکا پیاسا رہنے والوں کو چند گھنٹے کی بھوک کبھی نہیں ستاتی۔ گھنٹے بھر کی تگ و دو کے بعد میں بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ اتنی سردی کے باوجود اس سخت چڑھائی پر مجھے اچھا خاصا پسینہ آ گیا تھا۔ چوٹی پر بیٹھ کر میں سستانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میری نظریں سامنے کی جانب اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں رہیں۔ پیچھے راستے میں مجھے چند ویران گھر ملے تھے۔ ایک چھوٹی سی آبادی سے بھی میں گزرا تھا۔ اب سامنے کافی دور ایک وادی جیسی نظر آ رہی تھی جہاں کافی مکان دکھائی دے رہے

تھے۔شمریز خان کی معلومات کے مطابق جہاں تک میرا اندازہ تھا یہ خان کلے کی آبادی تھی۔اس اونچی پہاڑی اور خان کلے کی آبادی کے درمیان کوئی خاص بڑی پہاڑی تو نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس کے باوجود میں جانتا تھا کہ وہاں تک پہنچتے ہوئے شام کا اندھیرا چھا جانا تھا۔

چند لمحے سستا کر میں آگے بڑھ گیا۔دوسری جانب اترائی کافی آسان تھی۔نیچے اترتے ہوئے خود بہ خود میرے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔اس بلند پہاڑی پر چڑھتے ہوئے مجھے دو اڑھائی گھنٹے لگے تھے اور نیچے میں آدھے گھنٹے میں پہنچ گیا تھا۔نالے کی تہہ میں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے ایک چشمہ نظر آ گیا تھا۔وہیں پتھر کی ایک بڑی چٹان پر اپنا سفری تھیلا رکھ کر میں نے چشمے کے پانی سے وضو کیا،خوب سیر ہو کر پانی پیا اور دو رکعت عصر کے (سفر کی وجہ سے) پڑھ کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ظہر کی نماز میں تیمّم کر کے پیچھے ہی ادا کر چکا تھا۔

گلگارے نے دال کے پراٹھوں کے درمیان تازہ مکھن ڈال دیا تھا۔ٹھنڈے ہونے کے باوجود ان پراٹھوں سے اٹھنے والی دیسی مکھن اور خلوص کی مہک میرے رگ و پے میں اتر گئی تھی۔گلگارے نے چار پراٹھے باندھے تھے،مگر میں بہ مشکل دو ہی کھا سکا تھا۔باقی دو میں نے رات کے لیے رکھ چھوڑے۔کھانے کے بعد مجھے چائے کی طلب محسوس ہوئی،برف پڑنے کی وجہ سے زمین پر بکھری ہوئی لکڑیاں تو گیلی ہو گئی تھیں،مگر خشک درختوں کے ساتھ لگی ہوئی ٹہنیاں وغیرہ جلانے کے قابل تھیں۔

ضرورت کے بہ قدر لکڑیاں توڑ کر میں نے آگ جلائی اور چائے بنانے لگا۔ایک پیالی چائے بنانے میں اتنی دیر نہیں لگی تھی۔پہلا گھونٹ بھرتے ہی میرے منھ میں بدمزگی سی پھیل گئی تھی۔پچھلے چار پانچ دنوں سے میں مسلسل تازہ دودھ کی بنی ہوئی بہترین دودھ پتی پیتا رہا تھا اب ایک دم ملک پاؤڈر کی بنی چائے نے اس اعلا چائے کا ذائقہ یاد دلا دیا تھا۔ایک مخلص بہن کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے کا مقابلا بھلا وہ روکھی پھیکی اور بدمزہ چائے کہاں کر سکتی تھی۔

چائے پی کر میں نے بوتلیں چشمے کے تازہ پانی سے بھریں اور تیار ہو کر آگے بڑھ گیا۔ایک بار پھر نالے کا ہموار سفر شروع ہو گیا تھا۔تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ میرے کانوں میں گونجی۔کسی نے ٹریگر مکمل دبا کر ایک لمبا برسٹ فائر کیا تھا۔فائر کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہوائی فائر کیا گیا ہے۔اور ایسے

ہوا میں کلاشن کوف کا برسٹ فائر کرنا یا تو کسی خوشی کے موقع پر کیا جاتا ہے جیسے، عید وغیرہ کا چاند دیکھ کر فائر کرنا یا شادی وغیرہ میں شغل کرنا اور دوسری صورت میں کسی کو للکارنے کے لیے یوں ایک لمبا برسٹ ہوا میں پھونک دیا جاتا ہے۔ البتہ یہ بھی ممکن تھا کہ کسی احمق نے یونھی بہ طور شغل یہ حرکت کی ہوتی، مگر ایسا ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔

میں نے رفتار کم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی مجھے اپنا دوسرا اندازہ ٹھیک ہوتا دکھائی دیا کہ وہ برسٹ بہ طور اعلان جنگ تھا۔ پرانے زمانے میں جنگ کا اعلان نقارہ بجا کر یا سینگ پھونک کر کیا جاتا تھا، فی زمانہ کلاشن کوف کے برسٹ ہی نے اعلان جنگ کی جگہ سنبھال لی ہے۔ اچانک ہی ایک سے زیادہ ہتھیاروں کے دھانے کھل گئے تھے۔ وہ فائر دو تین کلو میٹر دور ہی ہو رہا تھا۔ اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں اسی طرح چلتا رہا تو ان مقابلہ کرنے والوں میں جا پھنسوں گا۔ اس سوچ نے مجھے قدم روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مجھے زیادہ دیر سوچ میں مبتلا نہیں رہنا پڑا تھا کہ دو آدمی مجھے نالے موڑ سے نمودار ہو کر اپنی جانب آتے دکھائی دیے۔ دونوں خالی ہاتھ ہی لگ رہے تھے۔ اس کے باوجود میں نے کلاشن کوف کندھے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر اور دوسرا جواں سال لڑکا ہی تھا۔ شکلوں کی شباہت سے دونوں مجھے باپ بیٹا ہی لگ رہے تھے۔ باپ نظر آنے والے نے۔ ''اسلام علیکم!......'' کہتے ہوئے پوچھا۔ ''ہلکا چرتہ زئے، دلے مہ زہ۔'' (او لڑکے کہاں جا رہے ہو، اس طرف مت جاؤ۔''

میں فوراً پوچھا۔ ''ولے سہ چل دے؟'' (کیوں کیا ہوا۔)

وہ میرے قریب رک کر اپنے چڑھے سانس درست کرتا ہوا بولا۔ ''غزنی خیل اور شلوبر قبیلہ برسر پیکار ہیں۔ جوانب کے آدمی تمھیں مخالف قبیلے کا سمجھ کر قتل ہی نہ کر دیں۔'' وہ شاید بھاگ کر نالہ موڑ تک پہنچے تھے اور اب وہاں سے تیز قدموں سے چلتے ہوئے مجھ تک پہنچے تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ سامنے کون سا گاؤں ہے؟''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''اگر آپ کو اتنا نہیں معلوم تو ادھر کیوں جا رہے ہو۔''

''میں نے تو خان کلے جانا تھا۔''

''خان کلے تو اس جگہ سے آٹھ دس کلومیٹر دور شمال کی جانب پڑتا ہے۔''اس نے شمال کی جانب ہاتھ کا بھی اشارہ کیا تھا۔

میں نے دوبارہ پوچھا۔''ویسے یہ گاؤں ہے کون سا۔''

''شلوبر......جن پر غزنی خیلوں نے چڑھائی کر دی ہے۔''

''کیوں؟''میں مستفسر ہوا۔

''کسی لڑکی کا چکر ہے، شلوبر قبیلے کا جوان، غزنی خیل قبیلے کی ایک ایسی لڑکی کو بھگا لایا ہے۔ جس کے باپ نے اپنی بیٹی کا رشتہ پشاور میں کسی دوست کے بیٹے سے طے کیا ہوا تھا۔ غزنی خیل والوں کو معلوم ہو گیا کہ لڑکی کس کے ساتھ بھاگی ہے۔ اب شلوبر والے اس لڑکی کے بدلے منہ مانگی رقم دینے کو تیار ہیں مگر وہ اپنی لڑکی اور اسے بھگانے والے جوان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔''

''مطلب دونوں کو قتل کرنے کے لیے؟''میں نے اندازہ لگایا۔

''جی جناب۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔''اب آپ بھی اس راستے کو نظر انداز کر دیں، یہ نہ ہو خواہ مخواہ کسی اندھی گولی کا شکار بننا پڑ جائے۔''

میں نے حیرانی ظاہر کی۔''ویسے کیا یہاں سے پاکستان میں بھی لڑکیوں کے رشتے کیے جاتے ہیں۔''

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔''اللہ کے بندے، آدھا افغانستان تو پاکستان میں موجود ہے۔ باقی اپنے ہاں تو لڑکی کا سودا کیا جاتا ہے جس نے زیادہ رقم پھینکی وہ لے گیا۔''

''تو شلوبر والے بھی تو رقم دے رہے ہیں۔''

''پہلی بات یہ کہ دشمن قبیلے سے رشتے نہیں کیے جاتے اور دوسرا شلوبر کے جوان نے لڑکی کو بھگا کر پورے غزنی خیل کی عزت اچھالی ہے اور اس کا حل تو ایک ہی ہے۔''

میں نے پوچھا۔''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''یہاں سے قریباً چار کلومیٹر جنوب کی جانب ہمارا گاؤں ہے شنہ وُنہ۔ ہمارے ساتھ چلنا ہے تو آ جاؤ۔''

میں نے پہاڑوں کے پیچھے چھپتے ہوئے سورج کو دیکھا، غروب آفتاب میں بیس پچیس منٹ ہی باقی تھے

،رات گزارنے کے لیے وہی جگہ مناسب تھی ،شنہ ونہ جا کر یونھی سفر کی طوالت میں اضافہ ہی ہونا تھا۔رات کے کھانے کے لیے میرے پاس پراٹھے موجود تھے،سونے کا بستر میں نے پیٹھ پر لادا ہوا تھا،تو خواہ مخواہ آنے جانے کا آٹھ دس کلومیٹر فاصلہ کیوں طے کرتا۔یوں بھی پہاڑی علاقوں میں ایک کلومیٹر فاصلہ طے کرتے ہوئے دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔

''آپ کا بہت شکریہ۔''میں نے انھیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔اور وہ کندھے اچکا کر بیٹے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔میں وہیں کھڑا انھیں دیکھتا رہا۔وہ اسی اونچی پہاڑی پر چڑھ رہے تھے جہاں سے میں اترا تھا۔

فائرنگ کی آواز میں دم بہ دم اضافہ ہو رہا تھا۔ایک ساتھ کئی کلاشن کوفیں گرج رہی تھیں۔اور پھر ان تمام آوازوں پر 12.7 ایم ایم کی آواز بھاری پڑ گئی۔جانے وہ تباہی پھیلانے والا ہتھیار کس کے پاس تھا۔تھوڑی دیر بعد دو 12.7 ایم ایم گرجنے لگیں۔معلوم یہی پڑتا تھا کہ دونوں جانب وہ ہیوی گن موجود تھی۔یا کسی ایک قبیلے کے پاس دو گنیں موجود تھیں۔اسی گن گرج میں راکٹ لانچر کے دھماکے بھی سنائی دینے لگے۔لگتا تھا دو قبیلوں کے بجائے دو ممالک کی فوجیں سرحد پر برسرِ پیکار ہوں۔میں وہیں دائیں بائیں گھوم کر شب بسری کے لیے کوئی مناسب جگہ ڈھونڈنے لگا۔جلد ہی ایک جھکی ہوئی چٹان کے نیچے مجھے مناسب جگہ نظر آگئی تھی۔اندھیرا چھانے سے پہلے میں جگہ صاف کر کے رات کو جلانے کے لیے ایندھن اکٹھا کر چکا تھا۔

کھانا میں نے عشاء کی نماز پڑھ کر ہی گرم کرنا شروع کیا۔دن کا کھانا دیر سے کھانے کی وجہ سے مجھے کوئی خاص بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی ،لیکن پراٹھوں کو گرم کرنے پر وہ مجھے اتنے لذیز لگے کہ میں دونوں ٹھونس گیا۔اس طرف برف باری نہ ہونے کے برابر ہوئی تھی۔پیچھے جو بڑی پہاڑی میں عبور کر کے آیا تھا برف باری کا زور وہاں تک ہی رہا تھا۔یقیناً اس طرف بلندی کم تھی اس وجہ سے برف نہیں ہوئی تھی۔سردی البتہ کافی زیادہ تھی۔دسمبر لگنے والا تھا اور سردی نے مزید بڑھنا تھا۔میدانی علاقوں میں لوگ سردی سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہاں سردی نہ صرف تکلیف و اذیت کا باعث بنتی ہے بلکہ کاروبار زندگی بھی معطل کر دیتی ہے۔یوں بھی جب یہاں کی گرمی میدانی علاقے کی سردی کے برابر ہوتی ہے تو سردی کا اندازہ خود کر لیں۔

آگ پر اچھی طرح لکڑیاں ڈال کر میں سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔وہ سلیپنگ اچھا خاصا گرم تھا مگر اس

سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے بیرونی امداد کی بھی ضرورت تھی، اس لیے سلیپنگ بیگ میں گھستے وقت میں نے گرم کوٹ پہنے رکھا تھا۔اس کے ساتھ آگ نے بھی اس چھوٹی سی پناہ گاہ کو اچھا خاصا گرم کر دیا تھا۔ مجھے نیند آتے دیر نہ لگی۔ حالانکہ کسی نئی جگہ پر نیند بہت مشکل سے آتی ہے۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ جب میں بھرتی ہو کر ٹریننگ سنٹر پہنچا تھا تو ساری رات جاگتا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ ایسا عادی ہوا کہ اب جنگل، بیابان، صحرا، پہاڑ، پرائے دیس اور بیگانے علاقوں میں مجھے سونے میں کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا تھا۔اس وقت بھی اس چٹان کے نیچے میں یوں سو گیا جیسے عام لوگ اپنی خواب گاہ میں بے فکر ہو کر سوتے ہیں۔ حالانکہ جن حالات اور جیسے علاقے میں میں محوِ سفر تھا وہاں کچھ ہوتے دیر نہیں لگتی اور ہوا بھی وہی۔

میں صبح تک کا ارادہ لے کر سویا تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ بعد ہی چھاپہ پڑ گیا۔

ان کی تعداد پانچ تھی۔ تمام مسلح تھے۔آنکھیں کھلتے ہی مجھے پانچ کلاشن کوفیں اپنی جانب تنی نظر آئی تھیں۔

”جی، آپ لوگ کون ہو اور کیا چاہیے؟“ گو میں گہری نیند سے جاگا تھا، مگر میری تربیت اس نہج پر کی گئی تھی کہ آنکھ کھلتے ہی مجھے ماحول کا ادراک ہو جاتا تھا۔ مجھے ایک سیکنڈ کے لیے بھی یہ یاد کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی کہ میں کہاں ہوں اور مجھ سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر موجود دو قبائل برسرِ پیکار ہیں۔

ان میں سے ایک طنزیہ لہجے میں بولا۔”ہم وہی ہیں جن کا شکار کرنے تم آئے تھے اور اب خود ہمارے شکنجے میں آ گئے ہو۔“

”میں مسافر ہوں جناب اور کسی کا شکار کرنے نہیں آیا ہوں۔“

”جھوٹ مت بولو۔“اس مرتبہ بھی وہی آدمی بولا تھا۔

”محترم مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے، میں خان کلے جا رہا تھا راستہ بھول کر اس طرف آ نکلا، سہ پہر ڈھلے یہاں پہنچا تو تیز فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ یہاں سے گزرنے والے ایک شریف آدمی نے بتا دیا کہ دو قبیلوں میں جنگ چھڑ گئی ہے اور یہ کہ خان کلے اس جانب واقع نہیں ہے، پس مجھے آگے جانا مناسب نہ لگا یوں بھی میں دن بھر کا تھکا ہوا تھا سو چا رات کو آرام کر لوں صبح خان کلے کی راہ ناپوں گا۔“

”کہانی اچھی ہے، مگر تمھارا فیصلہ مشر کرے گا۔“

’’بھائی جان، براہ مہربانی مجھے بے آرام نہ کرو، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کس قبیلے کے ہیں۔‘‘

’’بھولے بادشاہ، ہم اسی قبیلے کے ہیں جس کی تاک میں تم یہاں گھات لگا کر رات گہری ہونے کا انتظار کر رہے ہو......شلوبر قبیلے کے کسی حلیف کو یوں باتیں نہیں بنانا چاہئیں۔ پچھلی لڑائی میں تمھارے دو تین آدمیوں نے چھاپہ مار کر ہمارا کافی نقصان کیا تھا، اس مرتبہ ہم ایسا کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ کیونکہ ہم سارے رستوں کی نگرانی کر رہے ہیں۔‘‘ اس کی بات سنتے ہی مجھے ساری کہانی پتا چل گئی تھی۔ وہ غزنی خیل قبیلے کے لوگ تھے اور رات کے وقت پہاڑی نالوں اور ایسے رستوں پر گشت کر رہے تھے جہاں سے شلوبر قبیلے کے لوگ چھپ کر ان کے پڑاؤ تک رسائی حاصل کرتے ہوئے انھیں کوئی نقصان پہنچا سکتے تھے۔ اور ایسا غالباً ان کی پچھلی لڑائی میں بھی ہوا تھا ،جس کا حوالہ مجھ سے بات کرنے والا آدمی دے چکا تھا۔

’’ایسا کچھ نہیں ہے۔‘‘ میں نے نرمی سے انھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

’’ٹھیک ہے، ہمارے مشر کو مل لو پھر اس کی مرضی جو فیصلہ وہ کرے گا۔‘‘

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔’’وہ بھی تو آپ کا مشر ہے۔‘‘

’’زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں، تم ہمارے پڑاؤ سے کلومیٹر بھر کے فاصلے پر مسلح حالت میں موجود ہو میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔‘‘

میں نے زچ ہو کر کہا۔’’میرا لہجہ، زبان اور شکل یہ واضح نہیں کر رہے ہیں کہ میں یہاں پر بالکل اجنبی ہوں۔‘‘

’’تو......؟‘‘ اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

’’تو یہ کہ مجھے بے آرام نہ کرو جناب۔‘‘

’’کہہ دیا نا کہ اس کا فیصلہ مشر کرے گا اور بے آرمی کیسی تھوڑا سا تو فاصلہ ہے تم وہاں ہمارے پڑاؤ میں بقیہ رات گزار لینا صبح ناشتا کروا کر ہم خان کلے کی جانب تمھاری رہنمائی کر دیں گے۔‘‘

میں جھلاتے ہوئے سلیپنگ بیگ سے باہر نکلا اور اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ ان سے متھا مارنا، وقت کا ضیاع ہی تھا ۔یقیناً وہ سردار کو اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے مجھے اس کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ میرے سامان سمیٹنے کے

دوران وہ ٹارچ روشن کر کے میری کارروائی کا جائزہ لیتے رہے۔ میری کلاشن کوف البتہ انھوں نے اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ سفری تھیلا تیار کر کے میں نے پیٹھ پر لادا اور ان کی معیت میں چل پڑا۔ ایک آدمی میرے آگے اور باقی پیچھے چلنے لگے۔ گو میرے پاس تیس بور پستول موجود تھا اور جس بے پروائی سے وہ چل رہے تھے میں چاہتا تو ان پانچوں کو لاشوں میں تبدیل کر سکتا تھا، مگر کسی بے گناہ کو قتل کرنا مجھے گوارا نہیں تھا۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا تھے اور مجھے قوی امید تھی کہ ان کا سردار مجھ سے بات کرنے والے کی طرح احمق نہیں ہوگا۔

کچھ دیر نالے میں چلنے کے بعد وہ ترچھا ہو کر نالے کے دائیں جانب موجود ڈھلان پر چڑھنے لگے۔ پانچوں بے فکر ہو کر گپ شپ کرتے جا رہے تھے۔ ان کے انداز سے بھی یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ دل ہی دل میں وہ بھی مجھے غیر متعلق شخص سمجھ رہے ہیں۔ ہمارا سفر بتدریج اوپر کی جانب جاری رہا۔ ادھ پون گھنٹے میں ہم بلندی پر پہنچ کر نسبتاً ہموار راستے پر چلنے لگے۔ اس دوران ان کے مورچے شروع ہو گئے تھے۔ لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ چوکنا تھے۔ سردی سے مقابلے کے لیے انھوں نے جابجا چھوٹے چھوٹے آلاؤ روشن کیے ہوئے تھے۔ ایک دو آدمی نے قریب آ کر ان سے حال بھی پوچھا تھا۔ اور ان کی آپس کی بات چیت سے مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے وہاں لانے پر اصرار کرنے والے کا نام روشن خان ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک روشن خان مجھے ٹکرا چکا تھا جو قبیل خان کا کمانڈر تھا۔

جلد ہی ہم غزنی خیل کے مشر کے سامنے موجود تھے۔ وہ جس جگہ بیٹھا تھا اس کے تین اطرف میں پتھروں کی دواڑھائی فٹ دیواریں اٹھائی گئی تھیں، صرف شمال کی جانب آنے جانے کا راستہ رکھا گیا تھا۔ شلو بر قبیلہ اس جگہ سے جنوب مغرب کی طرف موجود تھا۔

غزنی خیل کے سردار کا نام سیلاب خان تھا۔ اس کی عمر چالیس سے پینتالیس سال کے درمیان دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے مورچے میں بھی آگ کا بڑا سا الاؤ روشن تھا اور اس کے ہمراہ پانچ چھ اور آدمی بھی موجود تھے۔ روشن خان کی بات سننے سے پہلے اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ایک آدمی کو قہوہ لانے کا کہا۔

میں نے الاؤ کے گرد پڑے ہوئے ایک پتھر پر نشست سنبھالتے ہوئے۔ ''شکریہ۔'' کہا اور خود ہی تفصیل بتلانا شروع کر دی۔ میری کہانی میں کوئی ایسا جھول نہیں تھا کہ مجھ پر شک کیا جا سکتا۔ سردار سیلاب خان نے میری

بات غور سے سنی اور اختتام پر معذرت کرتے ہوئے بولا۔

"اپنے آدمیوں کی طرف سے میں معافی چاہتا ہوں کہ غلط فہمی کی وجہ سے آپ کو اتنی زحمت اٹھانا پڑ گئی۔بہر حال جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا،اب آپ یہیں آرام کریں،صبح ہم خان کلے کی جانب آپ کی رہنمائی کر دیں گے۔" یہ کہہ کر وہ روشن خان کی طرف متوجہ ہوا۔

"روشن خان !......تم اتنے بچے تو نہیں ہو کہ دشمن کو نہ پہچان سکو۔ہم پر حملہ کرنے والا نہ تو اکیلا ہو گا اور نہ اپنے ساتھ بستر اور ضرورت کا سامان پھرا رہا ہو گا۔تمھاری اس حرکت سے ایک شریف آدمی کو اتنی زیادہ تکلیف اٹھانا پڑی۔اب جاؤ اور دوبارہ کسی ایسے آدمی پر ہاتھ نہ ڈالنا۔"

"جی سردار۔" وہ دھیمے لہجے میں کہتا ہوا مورچے سے باہر نکل گیا۔میرے بات کرنے کے دوران ہی ایک آدمی میرے لیے قہوہ لے آیا تھا اور انھی باتوں کے درمیان ہی قہوے کی پیالی خالی کر کے میں نے نیچے رکھ دی تھی۔روشن خان کے جانے کے بعد سردار نے مجھ سے کھانے کی بابت دریافت کیا اور میرے انکار کرنے پر مجھے اسی مورچے میں آرام کرنے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"باقی گپ شپ صبح کریں گے۔"

میں نے ممنونیت بھرے انداز میں سر ہلایا اور اپنے سفری تھیلے سے سلیپنگ بیگ نکالنے لگا۔آگ کی وجہ سے وہاں خوشگوار حدت پھیلی ہوئی تھی۔ایک آدمی ہر چند منٹ بعد آلاؤ پر اور لکڑیاں ڈال کر آگ کو بجھنے نہیں دے رہا تھا۔بستر میں گھس کر میں سونے کی کوشش کرنے لگا،مگر شاید سونا میری قسمت میں نہیں تھا۔مجھے لیٹے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک ایک آدمی مورچے میں داخل ہوا۔اس کے پھولے سانسوں سے مجھے سلیپنگ بیگ کے اندر پڑے ہوئے اندازہ ہو گیا کہ وہ وہاں تک دوڑتا ہوا پہنچا تھا۔

"خیر تو ہے ضمیر خان۔" اس کے سانسوں پر قابو پانے تک سردار سیلاب خان اس سے استفسار کر چکا تھا۔

"سردار!......ہمیں گھیر لیا گیا ہے۔میں نے ابھی مخابرے پر ان کی بات چیت سنی ہے۔"

"گھیر لیا گیا ہے۔" سیلاب خان نے حیرانی سے کہا۔"اکبر خان دماغ جگہ پر ہے،شلوبر گاؤں کی افرادی قوت اتنی تو نہیں ہے کہ وہ ہمیں چاروں طرف سے گھیر سکیں۔"

اکبر خان وثوق سے بولا۔ ”میام خیل قبیلے کے چنگیزی ان کے ساتھ ہیں سردار!......چنگیزیوں نے شمالی اور مشرقی جانب سے گھیرا ڈالا ہے، جنوب اور مغرب میں شلوبر قبیلہ ہے۔ان کے علاوہ چنگیزی سردار نے کچھ ازبک اور تاجک دوستوں کو بھی ساتھ ملا لیا ہے۔“

”جھوٹ بول رہے ہوں گے۔“ سردار سیلاب کے لہجے میں شامل اندیشے اس کے اعتماد کی عمارت کے زمین بوس ہونے کا مژدہ سنا رہے تھے۔

اسی وقت سیلاب خان کو کسی نے ریڈیو سیٹ پر آواز دی۔ ”سردار ہمیں شمال کی طرف کچھ حرکت نظر آ رہی ہے، کیا اپنے آدھے آدمیوں کو اس طرف بٹھا دیں۔“

”ہاں بٹھا دو۔“ سیلاب خان نے مزید استفسار کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”سردار، مشرقی جانب بھی حرکت دیکھی جا رہی ہے۔“ یہ کوئی دوسرا آدمی تھا۔

سیلاب خان کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک دم تیز فائر کھل گیا تھا۔گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز چاروں طرف سے آ رہی تھی، گویا اکبر خان کی بات مبنی بر حقیقت تھی۔ مجھے غزنی خیل قبیلے سے کوئی ہمدردی نہیں تھی مگر میں مفت میں گھیرے میں آ گیا تھا۔اب شلوبر یا چنگیزیوں کو یہ باور کرانا کہ میں ان کا ساتھی نہیں ہوں ناممکنات میں سے تھا۔ کیونکہ میں ان کے ساتھ ایسی جگہ موجود تھا جہاں وہ شلوبر قبیلے سے مقابلہ کرنے اکٹھے ہوئے تھے۔اور یوں بھی بات چیت کی نوبت آنے سے پہلے ہی کوئی گولی میرا اتا پوچھ سکتی تھی۔ جنگ کے دوران استفسار نہیں کیا جاتا اور نہ صفائیاں سنی جاتی ہیں۔ روشن خان میرے لیے نہایت منحوس ثابت ہوا تھا۔اس کی بے وقوفی مجھے اس حال تک لے آئی تھی کہ جان کے لالے پڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں سلیپنگ بیگ سے باہر نکل آیا کہ اب لیٹے رہنے کی کوئی ضرورت اور گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ اپنا سامان دوبارہ سفری تھیلے میں ٹھونس کر میں اس خطرناک صورت حال سے جان چھڑانے کی تجویز سوچنے لگا۔افغانستان کی زمین میرے لیے کچھ زیادہ ہی بھاری ثابت ہو رہی تھی۔

......❖......❖......

سردار سیلاب خان ریڈیو سیٹ پر اپنے آدمیوں سے رابطے کر رہا تھا۔ وہاں بیٹھے باقی آدمی فائرنگ کے شروع ہوتے ہی اپنے اپنے مورچے میں چلے گئے تھے۔

"سردار!...... فائرنگ ہو رہی ہے بیٹھ کر بات کر لو۔" وہ بات کرتے ہوئے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ میری بات سنتے ہی، اس نے بے دھیانی میں سر ہلایا اور آگ کے قریب بیٹھ گیا۔ مختلف اطراف سے اسے مسلسل خبریں مل رہی تھیں۔

"سردار! وہ قریب نہیں آرہے، بس دور دور سے فائر کر رہے ہیں۔"

سیلاب خان نے کہا۔ "ٹھیک ہے، جب تک قریب نہیں آتے، اپنی گولیاں ضائع نہ کرو بس اکا دکا گولی چلا کر ان کے قریب آنے کا انتظار کرو۔"

فائرنگ کا یہ سلسلہ گھنٹا بھر جاری رہا تھا، اس کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے شلو بر اور ان کے حلیفوں نے بس غزنی خیل قبیلے کو یہ یقین دلانے کے لیے فائرنگ شروع کی تھی کہ وہ گھیرے میں آگئے ہیں۔

فائرنگ کے رکتے ہی ماحول میں عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی، ایک ایسی خاموشی جس کی تہہ میں کئی قسم کے طوفان پوشیدہ تھے۔ رات کی تاریکی میں بغیر نشانہ لیے فائر کرنے والے دن کو انھیں چن چن کر نشانہ بنا سکتے تھے کہ وہ چاروں طرف سے گھیرے میں تھے۔ اور اس گھیرے سے ان کا کوئی بندہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ البتہ اس پہاڑی کی دفاعی صورت حال کا اندازہ میں روشنی ہونے پر ہی کر سکتا تھا۔

"جوان، میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں آپ کو روشن خان کی وجہ سے اتنی زحمت اٹھانا پڑی، بلکہ اب تو آپ بھی ہمارے ساتھ پھنس ہی گئے ہیں۔" مجھے سوچوں میں گم پا کر سیلاب خان معذرت کرنے لگا۔

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ "کسی کو کوسنے سے تو مسئلہ حل نہیں ہو سکتا نا۔"

"یہی تو دکھ ہے کہ اس کا ازالہ اب نہیں ہو سکتا، ہمارے دو دشمن قبیلے یکجا ہو گئے ہیں ان کے ساتھ کچھ ازبک اور تاجک دہشت گرد بھی مل گئے ہیں، یقیناً ہمیں بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔"

"سردار!...... اگر میں ابھی یہاں سے نکل جاؤں۔" میں نے مشورہ مانگا۔

”یقیناً ہمارے ساتھ رہنے میں آپ کی جان کو خطرہ ہے اور اس وقت یہاں سے جانے کا مطلب خودکشی کرنا ہی ہوگا۔“

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔”خودکشی ہو یا لڑائی، انجام دونوں کا موت ہی ہوتا ہے۔“

”جنگ میں تمام ہارنے والے مر نہیں جایا کرتے۔“

میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔”دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک کر جسم کو مردہ ہونے سے بچایا جا سکتا ہے روح کو نہیں۔“

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔”مہلت کے حصول کے لیے گھٹنے ٹیکنا مصلحت کہلاتا ہے روحانی موت نہیں۔“

”اگر میں پکڑا گیا تو یقیناً انھیں مطمئن کر لوں گا۔“ فلسفیانہ گفتگو کو چھوڑ کر میں اصل موضوع کی جانب پلٹا۔

”ہمارے ساتھ کچھ پشاور کے مہمان بھی موجود ہیں، جن کی بابت ہمارے دشمن اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس کا واضح جواب سن کر بھی میں جلدی میں پوچھ بیٹھا تھا۔

وہ اطمینان سے بولا۔”مطلب یہ کہ وہ آپ کو بھی ہمارا دوست سمجھیں گے، جبکہ آپ کا لہجہ اور زبان اس بات کی تصدیق کرے گا۔“

میں بے بسی سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

”اچھا اپنی جان بچانے کے لیے کوئی فائر وغیرہ کر لو گے۔“

میں صاف گوئی سے بولا۔”کسی بے گناہ کی جان لینا مجھے گوارا نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی بھی میرا دشمن نہیں ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو ان سے زیادہ میرے دشمن غزنی خیل کے وہ افراد ہیں جن کی وجہ سے مجھے اس جان لیوا صورت حال میں پھنسنا پڑا۔“

سیلاب نے مدافعانہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔”آپ کچھ زیادہ ہی غلط سوچنے لگے ہیں۔“

”آپ کا میری سوچ کو غلط قرار دینا ظاہر کر رہا ہے کہ آپ نہایت ہی سیدھے سادھے آدمی ہیں اور اتنے سیدھے آدمی کو سرداری نہیں جچتی۔“

وہ جھینپتے ہوئے بولا۔”طنز اچھا کر لیتے ہو۔“

”ایسی صورت حال میں طنز کے علاوہ کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔“

”میرا خیال میں ہم نے آپ کو جان بوجھ کر نہیں پھانسا۔ یہ صورت حال تو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔“

اس کے مسلسل معذرتی رویے نے میرے دل سے کدورت دور کر دی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جانتا ہوں، یہ خواری مقدر میں لکھی تھی، روشن خان غریب تو بہانہ ہی بن گیا۔“

”یہ روشن خان کی پارٹی اب تک واپس کیوں نہیں لوٹی......“ میرے منھ سے روشن خان کا نام سنتے ہی اسے اپنی گشت کرنے والی پارٹی کا خیال آیا۔ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے وہ ریڈیو سیٹ پر انھیں پکارنے لگا۔ مگر کافی دیر پکارنے کے بعد بھی اسے جواب موصول نہیں ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ”آپ نے دیر کر دی سردار!...... دشمنوں کے گھیراؤ کی خبر ملتے ہی انھیں بلا لینا چاہیے تھا۔“

وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔ ”میرے دھیان ہی میں نہیں رہا تھا۔“

”میدان جنگ میں سرداروں کو ایسی بے دھیانیاں راس نہیں آیا کرتیں۔“

”جوان آپ اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کر رہے ہیں۔“ اس کے لہجے میں طنز یا غصے کے بجائے حیرانی تھی

”حکمت عمر نہیں تجربے سے آتی ہے سردار۔“

”ہونہہ۔“ اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کافی تجربے کار دکھتے ہو۔“

اچانک ریڈیو سیٹ بول اٹھا کسی نے ہیجان خیز لہجے میں سردار کو پکارتے ہوئے انکشاف کیا۔ ”سردار!...... روشن خان اور صغیر واپس لوٹ آئے ہیں...... دونوں شدید زخمی ہیں۔ اور روشن خان نے بتایا ہے کہ ان کے تین ساتھی باقی نہیں رہے۔“

”دونوں کی مرہم پٹی کرو میں وہیں آرہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ محتاط انداز میں چلتا ہوا مورچے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ میں نے پاؤں پسارتے ہوئے اپنی کلاشن کوف گود میں لی اور سفری تھیلے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

غزنی خیل والے کافی گھمبیر صورت حال کا شکار ہو چکے تھے۔ ان کے مقابلے میں دو حلیف قبیلے اور خاصی تعداد میں ازبک تاجک دہشت گرد اکٹھے ہو چکے تھے۔ اور ان تمام کے ساتھ تنہا مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔

یقیناً اس گندم کے ساتھ میں نے بھی گھن کی شکل میں پس جانا تھا اور ان سوکھی لکڑیوں کے ساتھ میں نے گیلا ہو کر بھی جل جانا تھا۔ سیلاب خان کے لوٹنے تک میں ان حالات سے جان چھڑانے کی کوئی معقول تجویز سوچتا رہا۔ کوئی ایسا طریقہ جس سے سانپ مار کر بھی میں لاٹھی بچالیتا، کوئی ایسی ترکیب کہ آسمان سے چھلانگ لگاتے وقت میں کھجور میں نہ اٹکتا، کوئی ایسا حل کہ وہ زبردستی کی بلا میرے سر سے ٹل جاتی، کوئی ایسا ٹوٹکا کہ طویلے کی بلا، بندر کے سر نہ پڑتی۔

میری سوچوں میں سیلاب خان مخل ہوا تھا۔ اس کے ہمراہ چار آدمی اور بھی تھے۔ مورچے میں جلتا ہوا الاؤ بجھ چکا تھا بس تھوڑے بہت انگارے دمک رہے تھے۔ فائرنگ ہونے کے بعد کوئی اس پر مزید لکڑیاں نہیں ڈال سکا تھا۔ سردار کے ساتھ آنے والے آدمیوں میں سے ایک نے سردار کے کہے بغیر کافی ساری خشک لکڑیاں اٹھا کر بجھتے ہوئے انگاروں پر پھینکیں۔ اور آگ بھڑکانے لگا۔

سردار باقیوں کے ساتھ محو گفتگو ہو گیا۔ وہ تمام قبیلے کے مشر تھے۔ ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ روشن خان کے ساتھ گشت پر جانے والوں میں تین آدمی مارے گئے تھے۔ روشن خان اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مشکل سے جان بچا کر وہاں تک پہنچا تھا اور اب اس کی اپنی حالت کافی تشویش ناک تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور آدمی بھی معمولی سا زخمی ہوا تھا۔ بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اب ان کی رسد کی راہیں بند ہو گئی تھیں۔ نہ تو وہ مزید ایمونیشن منگوا سکتے تھے اور نہ کھانے پینے کا سامان ان تک پہنچ سکتا تھا۔ صلح کی گنجائش بھی ختم ہو گئی تھی ایسے حالات میں شلوبر قبیلے کے افراد ایسی کڑی اور شرمندہ کر دینے والی شرائط پیش کرتے جو، ان کے لیے کبھی بھی قابل قبول نہ ہوتیں۔

وہ اس صورت حال سے نمٹنے کے منصوبے بناتے رہے۔ میں خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سنتا رہا۔ نہ انھوں نے مجھے مخاطب کیا اور نہ میں نے بیچ میں مخل ہونے کی کوشش کی۔

مشرقی جانب قدرے فاصلے پر چند گولیاں فائر ہوئیں جن سے متصل مغربی جانب سے ایک لمبا برسٹ فائر ہوا، شمال و جنوب کی طرف سے بھی چند مرتبہ ”ٹخ ٹخ۔“ ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ وقفے وقفے سے پہلے بھی گولیاں چلتی رہی تھیں۔ غزنی خیل والوں پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے گھیراؤ کرنے والے انھیں چاروں

طرف اپنی موجودی کا احساس دلا رہے تھے۔
ایک آدمی قہوے کی بھری کیتلی کے ساتھ مورچے میں وارد ہوا اور تمام کو گرما گرم قہوے کی پیالی پکڑا دی۔ رات ڈھلنے کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔قہوہ پی کر میں ایک بار پھر اپنا سلیپنگ بیگ تھیلے سے باہر نکالنے لگا۔ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے پاس ان حالات سے نمٹنے کی بس یہی تجویز بچی تھی کہ فی الحال مورچوں میں بیٹھ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، بلکہ اسے مقابلے کے بجائے دفاع کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔اس طرح ایک دو دن گزار کر اندازہ ہو پائے گا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ان بے وقوفوں کو کافی دیر سے بیٹھا ہوا اونٹ ابھی تک کھڑا نظر آ رہا تھا۔
ایک سنائپر کی نیند پر ماحول اثر انداز نہیں ہو سکتا۔میں بھی گاہے گاہے اٹھنے والی فائرنگ کی ''ٹخ ٹخ۔'' سے بے نیاز سو گیا تھا۔صبح کے ناشتے کا انتظام ان لوگوں کے پاس نہیں تھا۔میرے پاس البتہ کچھ چنے اور بسکٹ پڑے تھے جو ظاہر ہے غزنی خیل کے پورے لشکر کی داڑھ بھی گیلی نہیں کر سکتے تھے۔ اور اکیلے کھانا مجھے بھی گوارا نہ تھا کہ میرے ہمراہ موجود لوگ بھوکے ہوتے اور میں کھانے کو جڑا ہوتا۔قہوہ بنانے کا سامان البتہ ان کے پاس موجود تھا اور میں نے بھی اسی قہوے ہی پر گزارا کیا تھا۔ دن کی روشنی میں فائرنگ کے سلسلے میں تیزی آ گئی تھی۔جوانب میں ایک دوسرے کے آدمی نظر آنے پر ہتھیار کی لبلبی دبانا مجبوری بن جاتی ہے۔
انھیں گھیرنے والے اگر چاروں جانب سے حملہ کر دیتے تو شاید کامیاب بھی ہو جاتے مگر ایسی صورت میں انھیں بھی کافی جانی نقصان اٹھانا پڑتا۔کیونکہ غزنی خیل والے جس بلندی پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے وہاں تک پہنچنے کے لیے مخالفین کو چڑھائی چڑھنا پڑتی۔اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ جگہ اردگرد کی پہاڑیوں سے زیادہ بلند تھی، بلکہ اس کی وجہ اس پہاڑی کے چاروں اطراف میں موجود نالہ تھا جو اسے تمام پہاڑیوں سے جدا کر رہا تھا۔
اطراف میں فائرنگ کا شور وغل زیادہ ہوا مجھ سے چپ نہ رہا گیا۔''سردار!......اپنے آدمیوں کو کھوحتی الوسع گولی چلانے سے پرہیز کریں،آپ لوگوں کے پاس ایک گولی بھی ضائع کرنے کی گنجائش نہیں۔ یوں ہوا میں ایمونیشن پھونک دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''
''صحیح کہہ رہے ہو۔''اثبات میں سر ہلا کر وہ ریڈیو سیٹ کی طرف متوجہ ہوا۔میں نے فوراً اسے ٹوکتے ہوئے

کہا۔

”دشمن بھی سن رہے ہیں، ایسی باتیں مخابرے پر نہیں کیا کرتے۔“

وہ حیرانی سے بولا۔”تو سنتے رہیں۔کیا فرق پڑے گا۔“

”بہت فرق پڑے گا۔آپ کی کمزوری دشمن کے ہاتھ آجائے گی وہ آپ کا ایمونیشن ختم کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کی پیش قدمی کرسکتا ہے۔اور یقیناً ان کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے آپ کے آدمیوں کو بے دریغ فائر کرنا پڑے گا۔“

”یہ بات انھیں یوں بھی معلوم ہے کہ ہم ان کے گھیرے میں ہیں۔“

”انھیں کیا پتا کہ آپ کے پاس ایمونیشن کا کتنا ذخیرہ ہے۔اور یاد رکھنا کسی کی کمزوری معلوم ہوجانے کے بعد ہی حکمت عملی کام میں لائی جاتی ہے۔“

”ہمارے مسلسل فائر نہ کرنے پر بھی تو وہ یہ بات سمجھ سکتے ہیں۔“

”آپ پر جو شمال کی جانب سے فائر ہوگا، وہ جنوب والوں کو آپ کا فائر بھی لگ سکتا ہے۔باقی یہ کس نے کہا کہ آپ کے آدمی بالکل بھی فائر نہ کریں۔جب کسی کو نشانہ بنانا ممکن ہو تو بے شک وہ فائر کرسکتے ہیں۔“

وہ مسکرایا۔”ویسے میں اتنی جلدی قائل نہیں ہوا کرتا۔“

”تو جلدی کہاں ہوئے ہیں، اتنی دیر سے تو تکرار کیے جارہے ہیں۔“

”پھر بھی ہو تو گیا۔“اس کا انداز شکست کا احساس لیے ہوئے تھا۔

”کم رتبہ سے اتفاق کرنا شکست نہیں عقل مندی کی دلیل ہوتی ہے۔باقی مسلمانوں کو ہر کام مشورے سے کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔اور اس بارے سرداروں اور عوام میں کوئی تخصیص نہیں رکھی گئی۔“

”آپ کی باتیں، آپ کے بارے جاننے کے تجسس کو ہوا دے رہی ہیں۔“

”کسی کو جاننے کا تجسس تعلق رکھنے کے فیصلے کے بعد ہی کیا جاتا ہے۔اور ہمارے درمیان ایسی کوئی گنجائش نہیں۔میں جس رستے کا مسافر ہوں وہ آپ کے پڑاؤ سے بہت دور گزرتا ہے۔“

وہ کھل کھلا کر ہنسا۔”گزرتا تھا جناب!......اب تو آپ کو مقدر کی آندھی نے میرے پڑاؤ کے قریب نہیں

اندر لا پھینکا ہے۔‘‘اس کی بات پر مجھے بھی ہنسی آ گئی تھی۔

وہ کسی ضامن خان کو آواز دینے لگا۔قریب کے مورچے سے ایک جوان وہاں آ گیا اور سیلاب خان اسے فائرنگ کے بارے ضروری ہدایات دینے لگا جو اسے چاروں اطراف میں موجود غزنی خیل لشکر کمانڈروں تک پہنچانا تھیں۔

سورج کے سامنے کافی دیر سے بدلیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ دھوپ کے غائب ہونے نے خوشگوار حدت کا خاتمہ کر دیا جبکہ دھیمی دھیمی ہوا بھی سردی میں اضافے کا باعث بن رہی تھی۔ مسلسل بیٹھنے کی وجہ سے گرم کوٹ نے سردی کے مقابلے میں ناکامی کا اعتراف کیا اور مجھے گرم چادر نکال کر لپیٹنا پڑی۔سردار سیلاب خان نے بجھی ہوئی راکھ کو کرید کر چند انگارے ڈھونڈے اور ان پر چھوٹی چھوٹی لکڑیاں رکھ کر آگ دہکانے لگا۔اپنی پھونکوں سے راکھ اڑانے کے ساتھ ساتھ اس نے انگاروں کی آنچ کو خشک لکڑیوں میں منتقل کر دیا تھا۔ہلکا سا دھواں اٹھا اور آگ نمودار ہو گئی۔سیلاب خان ان لکڑیوں کو مزید لکڑیوں سے ڈھانپنے لگا۔جلد ہی آگ بھڑک اٹھی میں بھی اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔سیلاب خان کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا میں نے بھی اس کے خیالات میں مخل ہونے کی کوشش نہ کی اور اسی شغل میں لگ گیا۔ایسی لڑائی سے ایک بار پہلے بھی میرا پالا پڑ چکا تھا،لیکن اس وقت پلوشہ میرے ساتھ تھی اور ہم اتنے برے حالات کا شکار بھی نہیں ہوئے تھے۔

اچانک فائرنگ کی رفتار تیز ہوئی۔اور یہ فائرنگ سیلاب خان کے آدمی کر رہے تھے۔اس کے ساتھ ہی کسی نے ریڈیو سیٹ پر سیلاب خان کو اطلاع دی کہ ضامن خان دشمن کی گولی کا شکار ہو گیا تھا۔

سیلاب خان کے آدمیوں کی تیز فائرنگ کے جواب میں دشمن کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آنے لگی۔ جنوب مغربی کونے سے 12.7 ایم ایم کی گرج سنائی دے رہی تھی۔

’’آپ کے پاس 12.7 ایم ایم موجود نہیں ہے۔‘‘میں نے خاموش بیٹھے سیلاب خان کو متوجہ کیا۔

’’اس کی گولیاں ختم ہو گئی ہیں۔‘‘

اسی وقت ریڈیو سیٹ پر ایک اور بری اطلاع ملنے لگی۔مغربی کونے میں دو آدمیوں کو چھاتی میں 12.7 ایم ایم کی گولی لگی تھی۔اور 12.7 ایم ایم کی چھاتی میں لگنے والی گولی سامنے سے گھس کر پشت سے نکلتے ہوئے

سانس کو ساتھ لیتی جاتی ہے۔

وہ تمام کو مورچوں کی آڑ میں رہنے کا حکم دینے لگا۔مشرقی جانب سے بھی ایک دم تیز فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ ریڈوسیٹ پر پاس ہوا کہ اس جانب سے کچھ لوگ آگے بڑھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ فائرنگ کی پرشور آواز گھنٹا بھر بعد ہی دھیمی ہو پائی تھی اور اس دوران تین چار آدمی اور زخمی ہو گئے تھے۔ دشمن کے بھی چار آدمی انھوں نے مار گرائے تھے۔سیلاب خان کے حکم کے بعد تمام لوگ گولی چلانے میں احتیاط سے کام لے رہے تھے اور اس احتیاط کے نتیجے میں دشمن کے حوصلوں کو بڑھاوا مل رہا تھا۔لیکن زیادہ گولیاں چلا کر غزنی خیل والوں نے جلد ہی بے دست و پا ہو جانا تھا اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ اپنی دفاعی قوت کو زیادہ سے زیادہ سنبھال کر رکھتے۔اور ساتھ ساتھ دشمن کا نقصان بھی کرتے رہتے۔ورنہ زمینی حقائق کے مطابق تو وہ جنگ ہار چکے تھے کہ چند دن کے گھیراؤ کے بعد انھوں نے بھوک سے گھبرا کر ہی ہتھیار ڈال دینے تھے۔

خاموشی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ پائی تھی اور اس دفعہ ہونے والی فائرنگ ایک نئی افتاد لے کے آئی تھی۔پانی کا چشمہ جنوب کی سمت میں اس پہاڑی کے تقریباً نصف بلندی سے بھی تھوڑا نیچے نالے کی طرف تھا۔وہاں پر غزنی خیل والوں نے اپنا ایک مورچہ بنایا ہوا تھا جس کی حفاظت کے لیے چار افراد بھی موجود تھے۔شلوبر والوں کو کسی طرح چشمے کی اس جگہ کا اندازہ ہو گیا تھا۔انھوں نے 12.7 ایم ایم کو جنوب مغربی کونے سے اٹھا کر جنوب کی سمت میں پانی کے چشمے پر لے کر دیا،اس طاقتور گن کے اتنی قریب سے مسلسل فائر نے مورچے کے عارضی رکھے ہوئے پتھروں کو بکھیر دیا تھا۔دو آدمی ہی جان بچا کر واپس لوٹ پائے تھے۔کھانے کے ساتھ پانی کی سہولت بھی چھن گئی تھی۔اکادکا آدمیوں کے پاس پلاسٹک کی بھری ہوئی بوتلیں موجود تھیں مگر وہ چند گھنٹوں سے زیادہ کام نہیں دے سکتی تھیں۔خود میرے پاس ڈیڑھ بوتل پانی موجود تھا،مگر یہ ڈیڑھ بوتل بھی جانے کب تک ساتھ دے پاتی۔

شام تک فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے شروع رہا۔غزنی خیل کے آٹھ آدمی زندگی کی جنگ ہار گئے تھے جبکہ چھے زخمی تھے۔اوران زخمیوں میں دو کی حالت تشویش ناک تھی۔سیلاب خان کو لگا رات کو دشمن کی طرف سے حملے کا خطرہ زیادہ ہے اس لیے سرِ شام ہی اس نے اپنے کمانڈروں کو اکٹھا کر لیا تھا۔گزشتہ رات اپنی حوصلوں سے

دشمن کو ناکوں چنے چبوانے والے کمانڈرز اس وقت کافی پریشان اور بجھے بجھے سے تھے۔ چوبیس گھنٹے سے انھیں کھانا بھی نہیں ملا تھا۔ کمانڈروں کی شکلیں دیکھ کر باقی جوانوں کی حالت کا اندازہ لگانا دشوار نہیں تھا۔
ساری صورت حال ان کے سامنے تھی سیلاب خان نے حالات پر روشنی ڈالے بغیر بس اتنا پوچھا تھا کہ ......''آج حملے کا خطرہ زیادہ ہے ایسی صورت حال میں کیا کرنا چاہیے؟''اور اس کا جواب اسے ایک طویل خاموشی کی صورت میں ملا تھا۔

چند لمحے انتظار کے بعد اس نے گہرا سانس لیا اور میری جانب رخ کرتا ہوا بولا۔
''سلیم شاہ!......آپ اس معاملے میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں''میرے پاس جو شناختی کارڈ موجود تھا اس پر میرا نام سلیم شاہ درج تھا اور عموماً مجھے یہی نام بتانا پڑتا۔ گلگارے وغیرہ کو البتہ میں نے اپنا اصل نام بتایا تھا۔
ایک لمحہ سوچ کر میں نے مناسب الفاظ کو ذہن میں ترتیب دیا اور پھر گلا کھنکار کر گفتگو کی ابتداء کی۔ ''محترم سرادر!......آپ، بلکہ ہم لوگ جس صورت حال میں پھنسے ہیں بہ ظاہر اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا لیکن اگر صحیح حکمت عملی اپنائی جائے تو ناممکن کو ممکن میں ڈھالنا مشکل نہیں ہوتا۔''میں نے ایک لحظہ خاموش ہو کر ان کے چہروں پر سرسری نظر دوڑائی جو آگ کی لپٹوں میں عجیب قسم کی تشویش، پریشانی اور بیزاری سے بھرے نظر آرہے تھے۔ انھیں میری بات کسی فضول فلسفے سے بڑھ کر اہم نہیں لگی تھی۔ لیکن اپنی بات پوری کیے بغیر میں چپ نہیں ہو سکتا تھا۔ آلاؤ پر اپنی نظریں گاڑ کر میں نے بات آگے بڑھائی۔ ''سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ دشمن آج کسی بھی صورت حملہ نہیں کرے گا، بلکہ اس وقت تک حملہ نہیں کرے گا جب تک اسے یقین نہیں ہو جاتا کہ آپ لوگ مزاحمت کے قابل نہیں رہے۔ ان کی جگہ اگر آپ ہوتے تو یقیناً یہی کرتے، کیونکہ خواہ مخواہ اپنے آدمیوں کی قیمتی جانیں گنوانے کے بہ جائے وہ ایک دو دن صبر کرنا پسند کریں گے۔ اب یہ طے کرنے کے بعد کہ دشمن فی الحال حملہ نہیں کرے گا ہم اپنی کمزوریوں پر نظر دوڑاتے ہیں......ہمارے پاس کھانے کے لیے روٹی اور پینے کے لیے پانی موجود نہیں ہے۔ جلانے کے لیے لکڑیاں بھی شاید کل تک ختم ہو جائیں تب بھوک پیاس کے ساتھ سردی کا عذاب جھیلنا بھی ہمارا نصیب ہو جائے گا۔ مسلسل استعمال کے بعد ایمونیشن نے بھی ختم ہو جانا ہے، تب ہماری حالت تر نوالے کی سی ہو جائے گی جسے نگلنے کے لیے دشمن کو ذرا سی بھی تگ و دو نہیں کرنا پڑے گی..........''

''ہمیں صورت حال کا ادراک ہے سلیم شاہ۔'' سیلاب خان نے نرم لہجے میں کہا۔'' آپ یہ مشورہ دیں کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں......کل کا دن ہمیں دشمن کو یہ احساس دلانا ہے کہ ہمارے پاس کھانا بھی موجود ہے اور ہم مقابلے سے دستبردار ہونے کو بھی تیار نہیں۔ کھانے کا جھانسا تو ہم مخابرے پر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہوئے دے سکتے ہیں اور مقابلے کی دھونس جمانے کے لیے ہمیں ایسے اچھے نشانہ بازوں کی ضرورت پڑے گی جو ان کی آزادنہ حرکت میں رکاوٹ بن سکیں۔''

''اچھے نشانہ باز تو پہلے بھی اپنی کوشش کر رہے تھے، کیا تیر مار لیا۔'' اس مرتبہ کمانڈر مشر خان بولا تھا۔

''اس کی وجہ ہے دشمن کا دور ہونا۔ کلاشن کوف کی کارگر رینج تین سو میٹر ہے اور دشمن زیادہ فاصلے پر موجود ہے۔ فاصلہ کم کرنے کے لیے ہمارے نشانہ بازوں کو دشمن سے اڑھائی تین سو میٹر دور درختوں پر مچان بنانا پڑے گی۔ اور دن کی روشنی میں وہاں سے فائر کرنا پڑے گا۔''

''پہلی گولی فائر کرتے ہی، دشمن انھیں بھون ڈالیں گے، فاصلہ نزدیک ہونے کی وجہ سے وہ بھی تو رینج میں ہوں گے۔'' کمانڈر رشید جان نے رائے دی۔ تمام کا بات چیت میں حصہ لینا یہ ثابت کر رہا تھا کہ وہ میری باتوں کو غور سے سن رہے تھے۔

''اچھا سوال ہے۔ اور جواب ہے کہ وہ چھپ کر بیٹھے ہوں گے اور اس وقت فائر کریں گے جب دونوں طرف سے مسلسل فائر ہو رہا ہوگا۔ اس پر شور آواز میں کون اندازہ کر سکے گا کہ ان کے قریب کے درختوں سے بھی فائر ہو رہا ہے۔''

''ہم دور مار رائفل سے بھی تو انھیں نشانہ بنا سکتے ہیں۔ کل نوشاد گل نے اپنی رائفل سے ان کے چار آدمیوں کو نشانہ بنایا تھا۔'' کمانڈر الفت بادشاہ نے زبان کھولی۔

''نوشاد گل کے پاس کون سی رائفل ہے؟'' میرے لہجے میں اشتیاق بھرا تھا۔

''نام کا تو پتا نہیں ہے۔'' الفت خان نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا وہ بعد میں دیکھ لیتے ہیں پہلے یہ بتائیں میری تجویز سے متفق ہو کہ نہیں۔''

مشر خان بولا۔ ”ہم اتفاق کر لیتے ہیں اور اس طریقے کو بروے کار لا کر ہم دشمن کے چند بندے زخمی یا ہلاک بھی کر دیتے ہیں تب کیا ہوگا۔ پندرہ بیس آدمیوں کے ہلاک ہونے سے پانچ چھے سو کے لشکر کا کیا نقصان ہوگا“

”شاید میں بتا چکا ہوں کہ ہمارا مقصد انھیں یہ یقین دلانا ہے کہ ہم لڑائی سے پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں۔“

”چلو یقین دلا دیا کہ ہم لڑائی سے بھی پیچھے نہیں ہٹ رہے اور ہمارے پاس خوراک بھی موجود ہے، اس کے بعد کیا ہوگا۔ ہمیں کتنا عرصہ بھوکا پیاسا رہ کر انھیں اپنے پیٹ کے بھرے ہونے کا یقین دلانا پڑے گا۔“ مشر خان اس انداز سے بولا تھا گویا قبیلے کا سردار میں ہی ہوں۔ لیکن میں اس کی باتوں کا برا منائے بغیر بولا۔

”بس کل کا دن، آنے والی رات کو ہم ان پر حملہ کریں گے۔“

کافی دیر سے خاموش بیٹھے کمانڈر امید علی خان نے منھ بناتے ہوئے کہا۔ ”پہلے جو مشورے آپ نے دیے ایسی صورت حال میں اس سے اچھا سوچا بھی نہیں جا سکتا، مگر اب آخر میں آ کر آپ نے جو پھلجڑی چھوڑی ہے اس سے پہلے والی باتوں کا مزہ بھی کر کرا ہو گیا ہے۔“

میں متبسم ہوا۔ ”میری بات مکمل نہیں ہوئی۔“

امید علی نے بیزاری سے کہا۔ ”اگر حملے کی بات کرنا ہے تو نامکمل ہی رہنے دیں۔“

”امید علی خان!...... اگر خود کچھ نہیں سوچ سکتے تو دوسرے کی سن لو، سلیم شاہ حکم نہیں دے رہا مشورہ دے رہا ہے۔“ یقیناً سیلاب خان کو امید علی کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

امید علی سرعت سے بولا۔ ”معذرت خواہ ہوں سردار، میرا مقصد سلیم شاہ کی دل آزاری کرنا نہیں تھا۔“

میں مخل ہوتے ہوئے بولا۔ ”نہیں اپنی سمجھ کے مطابق کمانڈر امید علی نے صحیح کہا ہے۔ البتہ میری بات مکمل ہونے کے بعد انھیں رائے دینا چاہیے تھی۔“

”آپ جاری رکھیں۔“ سیلاب خان نے مجھے بات مکمل کرنے کو کہا۔

میں سر ہلا کر مستفسر ہوا۔ ”ہماری تعداد کتنی ہوگی؟“

سیلاب نے جواب دیا۔ ”قریباً اڑھائی سو۔“

”ٹھیک ہے ان اڑھائی سو میں سے ستر آدمی کل رات بارہ بجے جنوب مغرب کی جانب زوردار حملہ کریں

گے اور............‘‘میں اپنا منصوبہ ان کے سامنے دہرانے لگا۔ ابتداء میں میری باتوں پر ان کے چہرے پر بیزاری کے آثار نمودار ہوئے لیکن جوں جوں میری بات مکمل ہوتی گئی ان کے چہروں پر دبا دبا جوش ابھر آیا تھا۔ میری بات کے اختتام پر تمام میرے ساتھ متفق ہو گئے تھے۔

’’ویسے مجھ لگ رہا ہے آپ مجاہدین کے کوئی بڑے کمانڈر رہو۔‘‘ سیلاب خان تحسین آمیز لہجے میں بولا۔’’ اتنا شاندار منصوبہ کوئی منجھا ہوا کمانڈر ہی بنا سکتا ہے۔‘‘

میں نے مسکراتے ہوئے اپنی چھوٹی چھوٹی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔’’میری داڑھی آپ کو مجاہدین جیسی لگ رہی ہے۔‘‘

’’شاید حلیہ تبدیل کیا ہوا ہو۔‘‘ وہ اپنا اندازہ منوانے پر مصر تھا۔

’’نہیں، میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔‘‘اس کے ساتھ ہی میں موضوع تبدیل کرتا ہوا بولا۔

’’آپ کسی نوشاد گل کے پاس دور مار رائفل کی موجودی کا ذکر کر رہے تھے۔‘‘

سیلاب نے حیرانی بھرے لہجے میں پوچھا۔’’ہاں......لیکن آپ نے رائفل کا کیا کرنا ہے۔‘‘

میں مصر ہوا۔’’آپ نوشاد گل کو تو بلوائیں۔‘‘

سیلاب خان نے ریڈیو سیٹ پر نوشاد گل کو مع ہتھیار وہاں آنے کا حکم دیا۔ اس کے آنے تک وہ میرے منصوبے پر بات کرتے رہے اور اس میں جو بہتری لائی جا سکتی تھی اس پر بھی گفتگو ہوتی رہی۔ نوشاد پندرہ بیس منٹ بعد ہی وہاں پہنچ پایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشن کوف دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی تھی۔

’’تمھاری اپنی رائفل کہاں ہے۔‘‘اس کے سلام کا جواب دیتے ہی سیلاب خان مستفسر ہوا۔

’’مورچے میں ہے۔‘‘ وہ سیلاب خان کے سوال پر پریشان نظر آنے لگا تھا۔

سیلاب خان نے کہا۔’’جاؤ لے آؤ۔‘‘

’’جی سردار!‘‘ کہہ کر وہ واپس مڑ گیا۔ باقی کمانڈر مشاورت میں مگن تھے۔

اس کے مورچے سے نکلتے ہی سیلاب خان نے کہا۔’’ہمارے ایک آدمی گل ریز کے پاس جی تھری رائفل بھی موجود ہے۔‘‘

''جی تھری......؟'' اب حیران ہونے کی میری باری تھی۔

''ہاں۔'' سیلاب خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اصل میں نوشاد گل اور گل ریز اس سے پہلے انگور اڈے میں ایک بڑے اسمگلر کے ساتھ کام کرتے تھے۔ اسمگلنگ کے ساتھ وہ سردار دہشت گردانہ کارروائیوں میں بھی ملوث تھا ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے کہ وہ سردار کسی دشمن کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کا لشکر قریباً بکھر گیا ہے۔ میرے قبیلے کے بھی چار پانچ آدمی اس کے پاس کام کرتے تھے۔ تین آدمی تو کسی دوسرے سردار کے پاس چلے گئے یہ دونوں گھر واپس آ گئے، شاید کچھ عرصہ آرام کرنا چاہتے تھے۔''

''کس سردار کے پاس کام کرتے تھے؟'' میرا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

''صنوبر خان۔'' سیلاب خان سے پہلے مشر خان نے جواب دیا۔ وہ تمام اپنی گفتگو ختم کر کے ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

صنوبر خان کے نام نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سیلاب خان کے دو آدمی مجھے پہچانتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ نوشاد گل نے ابھی مجھے دیکھ کر بھی کسی قسم کی شناسائی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ حالانکہ میں آلاؤ کے بالکل قریب بیٹھا تھا اور بھڑکتی آگ کی وجہ سے وہاں اچھی خاصی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے سوچوں میں گم دیکھ کر وہ آپس میں مصروفِ گفتگو ہو گئے تھے۔

نوشاد کی واپسی تک میں خیالات میں کھویا رہا۔ اس بار اس نے ہاتھ میں سٹائر سنائپر رائفل پکڑی ہوئی تھی۔ سٹائر ایک عمدہ اور بہترین رائفل ہے۔ آسٹریا کی بنی ہوئی یہ رائفل پاک آرمی کے سنائپرز میں سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی تربیت اسی رائفل سے مکمل کی تھی۔ اور اگر قارئین کو یاد ہو تو اپنے پہلے مشن کی تکمیل کے وقت بھی یہی رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ اور ناول کے ابتدائی صفحات میں میں نے اس رائفل کے متعلق ضروری معلومات لکھی تھیں۔

میں نے نوشاد گل کے ہاتھ سے رائفل لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس دوران میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا، مگر اس کے چہرے پر چھائے اجنبیت کے گہرے تاثرات مجھے مطمئن کر گئے تھے۔ اس نے بغیر کچھ کہے میری جانب رائفل بڑھا دی۔

''اس کی کتنی گولیاں ہیں آپ کے پاس؟''

''سو تھیں، تقریباً آدھی فائر کر بیٹھا ہوں۔'' بہ ظاہر اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا تھا مگر کہیں گہرائی میں ناگواری کی بو مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ شاید میرا استفسار کرنا اسے پسند نہیں آیا تھا۔

اس کی کیفیات کو نظر انداز کیے میرے سوالات جاری رہے۔ ''کمانڈر مشر خان بتا رہے تھے کہ اس کی مدد سے آپ نے دشمن کے چار آدمیوں کو بھی نشانہ بنایا ہے۔''

''بے شک۔'' اس نے تحسین آمیز انداز میں سر ہلایا۔

''پچاس گولیوں کے بدلے چار آدمی......'' میں نے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔

''برا سودا نہیں ہے۔'' کمانڈر رشید نے لقمہ دیا۔ میرا طنز تمام کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔ اگر استادِ محترم راؤ تصور صاحب کو معلوم ہو جاتا کہ ایک شخص نے سٹائر کی پچاس گولیاں چلا کر فقط چار آدمیوں کو نشانہ بنا پایا ہے تو انھیں اپنے ہوش و حواس کھو کر کومے میں چلے جانے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا اور اگر وہ کومے میں جانے سے بچ جاتے تو مذکورہ فائرر کا بچنا ناممکن تھا، یقیناً اسی سٹائر رائفل سے مذکورہ شخص پر ایک گولی ضائع کر کے وہ اکیاون گولیوں پر مرنے والوں کی تعداد پانچ کر دیتے۔

انھیں اپنے احساسات سے بے خبر رکھتے ہوئے میں نے اپنا ارادہ ان تک پہنچایا۔ ''ایسا ہے کل میں اس رائفل سے فائر کروں گا......لیکن ابھی سے بتا دوں، کسی آدمی کو ہلاک نہیں کروں گا، بس زخمی کروں گا۔''

نوشاد گل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں آپ ایس ایس ہونا کہ پچاس گولیوں پر پچاس آدمی مار گراؤ گے۔''

''نوشاد گل......'' سیلاب خان نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا۔

وہ منھ بنا کر کہنے لگا۔ ''سردار!......میں نے صرف مذاق کیا ہے۔''

میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے انجان بن کر پوچھا۔ ''ویسے یہ ایس ایس کس بلا کا نام ہے۔''

الفت بادشاہ نے قہقہہ لگا کر انکشاف کیا۔ ''ایس ایس، نوشاد گل کے سردار کو مارنے والی بلا کا نام ہے ......اسی کی وجہ سے نوشاد گل غریب کی نوکری چھوٹی۔''

''ہونہہ!......'' میں نے اثبات میں ہلاتے کہا۔ ''بہ ہر حال اس کی ساری گولیاں مجھے دے دو امید ہے چار

سے زیادہ آدمیوں کونشانہ بنالوں گا۔''

اس نے بغل سے لٹکی گولیوں والی تھیلی میرے سامنے پھینکی۔''اگر چار سے زیادہ آدمیوں کونشانہ بنالیا تو یہ رائفل واپس نہیں مانگوں گا۔''

میں متبسم ہوا۔''یہ نہ ہو بعد میں مکر جاؤ۔''

''اور نہ بنا پائے پھر؟''یقیناً یک طرفہ شرط میں سراسر اسی کا نقصان تھا۔اور یہ بات اسے فوراً یاد آ گئی تھی۔

''تو میرا خیال ہے اس سے بہتر کلاشن کوف،غزنی خیل میں کسی کے پاس نہیں ہوگی۔''میں نے گود میں رکھی کلاشن کوف کو تھپتھپایا۔

''نوشاد گل، یہ شرطیں وغیرہ رہنے دو، سلیم بھائی ہمارے مہمان ہیں۔''

''نہیں سردار!......منھ سے نکلی بات اور بندوق سے نکلی گولی واپس نہیں آسکتی۔ جو طے ہو گیا سو ہو گیا ......بس اس میں اتنی ترمیم کرلیں کہ اگر ہر دو گولیوں پر میں نے ایک آدمی کونشانہ نہ بنایا تب بھی نوشاد گل جیتا ہوا تصور کیا جائے گا۔''گو میں ہر چلنے والی گولی پر بھی یہ دعوا کرسکتا تھا لیکن اس طرح انھیں مجھ پر شک بھی ہوسکتا تھا۔

''یار سلیم!......کس بچپنے میں پڑ گئے ہو، چھوڑو ان شرطوں کو۔''سیلاب خان میری بات پر خوش نہیں تھا۔

''کبھی کبھی شغل میلہ بھی ہونا چاہیے سردار!۔''میں اس کی درخواست ہنسی میں اڑا گیا تھا۔

نوشاد گل کی آنکھیں البتہ چمکنے لگی تھیں۔اس بے وقوف کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ سٹائر رائفل کیا چیز تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ سٹائر کی ٹیلی سکوپ سائیٹ کو کیسے صفر کیا جاتا ہے۔ اور کسی سنائپر رائفل کو صفر کیے بغیر اس سے درست نشانہ لگا لینا، اندھے کے پاؤں تلے بٹیرا آنے کے مترادف ہے۔

''اچھا اب تمام اپنی اپنی جگہ لوٹ جاؤ اور احتیاط سے رات گزارنا ہے۔ ہر تین آدمیوں میں سے ایک آدمی آرام کرنے لیٹے،اس کے ساتھ اپنے سامنے کے علاقے میں ہر کمانڈر درختوں پر ایسی جگہ بنوالے جہاں سے کل صبح فائر کیا جائے گا۔''سیلاب خان نے مزید تکرار سے گریز کرتے ہوئے تمام کمانڈروں کو حتمی احکام بتا کر جانے کی اجازت دے دی۔اور نوشاد گل کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔''نوشاد گل تم وقتی طور ضامن خان کی کلاشن کوف استعمال کر لینا۔''ضامن خان کل دوپہر ہی کو دشمن کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ابھی تک اس جوان کی صورت میری

نگاہوں میں پھر رہی تھی۔ اسے میرے سامنے ہی سیلاب خان نے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا تھا۔ موت بھی عجیب بے حس اور بے نیاز ہوتی ہے کہ، نہ تو کسی کے بچپنے پر ترس کھاتی ہے اور نہ کسی کی جوانی پر رحم کرنے کو تیار ہوتی ہے۔

''جی سردار۔'' کہہ کر نوشاد گل نے اثبات میں سر ہلایا اور مورچے سے باہر نکل گیا۔ باقی لوگ اس سے پہلے روانہ ہو گئے تھے۔

☆......☆......☆

وہ رات بھی میں نے آرام کرتے گزاری تھی۔ میرے اندازے کے مطابق دشمن نے حملہ کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ جو فتح وہ بغیر کوئی نقصان اٹھائے حاصل کر سکتے تھے، اس کے لیے جانوں کی قربانی دینا بے وقوفی ہی تو تھی۔ البتہ دو تین مرتبہ پر شور فائرنگ سے انھوں نے غزنی خیل قبیلے کے سونے والوں کی نیند کو ضرور حرام کیا تھا۔ اور ان سونے والوں میں بد قسمتی سے میں بھی شامل تھا۔

صبح منھ اندھیرے اٹھتے ہی میں نے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے چبائے۔ اور دو تین گھونٹ پانی پی کر سارے دن کے لیے تیار ہو گیا۔ سردار سیلاب خان اونگھ رہا تھا۔ تیمّم کر کے میں نے نماز ادا کی اور آگ کو تازہ کرنے لگا۔ اتنی دیر میں سردار سیلاب خان بھی اٹھا بیٹھا تھا۔

روشنی ہوتے ہی اکا دکا فائر کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سٹائر کی میگزین میں گولیاں بھریں اور اندازے سے سو گز دور پڑے ہوئے چھوٹے سے پتھر پر نشانہ سادھنے لگا۔ وہ پتھر ایک چوڑے تنے کے درخت کی جڑ میں پڑا تھا۔ گولی پتھر تو کیا درخت کے تنے میں بھی نہیں لگی تھی۔ مجھے بس ذرا سا اندازہ ہوا تھا کہ گولی تنے کے دائیں جانب نکلی ہے۔

کسی بھی ہتھیار یا ٹیلی سکوپ سائیٹ کو صفر کرنے کے لیے دو ہی غلطیاں دور کرنا پڑتی ہیں۔ اوپر نیچے کی یا دائیں بائیں کی۔ اب پہلی گولی چلا کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ رائفل کافی دائیں مار رہی تھی۔ ٹیلی سکوپ سائیٹ میں مناسب تبدیلی کر کے میں نے اگلی گولی چلائی۔ گولی پتھر کے بائیں کنارے کے ساتھ ہی لگی تھی۔ میں دوبارہ سائیٹ میں تبدیلی کرنے لگا۔ اور اسی طرح پانچ گولیاں چلا کر میں نے سائیٹ کو اپنی مرضی کے

مطابق صفر کر لیا تھا۔

میری ساری کارروائی سیلاب خان بھی دلچسپی سے دیکھتا رہا تھا۔لیکن اس دوران اس نے مجھے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

رائفل کی صفرنگ سے مطمئن ہو کر میں نے کہا۔"سردار!میں کسی دوسرے مورچے کا رخ کرتا ہوں آپ کا مورچہ فائر کرنے کے مناسب نہیں ہے۔"

"میں بھی چلتا ہوں۔"اپنی کلاشن کوف تھامتے ہوئے وہ بھی میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔"میں نے اسے روکنے کی رسمی کوشش کی۔

"یہاں بھی کیا کروں گا......بس مخابرے پر بات چیت ہی کرنا ہے تو وہ وہاں سے بھی ہو جائے گی۔"

"چلیں۔"اپنا تھیلا اور کلاشن کوف میں نے وہیں چھوڑ دی تھی۔

باقی اطراف کی نسبت دشمن کے شمالی مورچے ہم سے زیادہ قریب تھے اور اس جانب چنگیزی قبیلے کے افراد ڈیرا جمائے ہوئے تھے۔

"اس طرف۔"مورچے سے باہر نکل کر اسے اپنی جانب سوالیہ نظروں سے گھورتے دیکھ کر میں نے شمال کی جانب اشارہ کیا۔وہ سر ہلاتے ہوئے میرے ساتھ چل پڑا۔وہ پہاڑی شمالاً جنوباً لمبائی میں پھیلی ہوئی تھی۔شرقاً غرباً اس کی چوڑائی تھی۔اس کے آدمیوں نے پتھر کی بڑی چٹانوں کے عقب میں مورچے بنائے ہوئے تھے کہیں پر گڑھا وغیرہ تھا تو اسے چھپنے کے لیے استعمال کیا تھا اور اگر کچھ بھی نہیں تھا تو انھوں نے پتھر کی دیواریں کھڑی کر کے مورچے کی شکل دے دی تھی۔رستے میں سیلاب خان نے جوش بھرے انداز میں مجھے یہ بتایا تھا کہ چاروں اطراف میں اس کا ایک ایک اچھا نشانے باز درختوں میں چھپا ہوا تیز فائرنگ کا منتظر تھا۔چاروں آدمی انھوں نے رات ہی کو مطلوبہ جگہ پہنچا دیے تھے۔

"ویسے لوگوں کو بھوک تو کافی لگی ہوگی۔"

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔"بھوک تو واقعی میں لگی ہوئی ہے،لیکن یہ بھی سنا ہے بھوکا بٹیرا زیادہ اچھا لڑتا ہے۔"

میں فراخ دلی سے آفر کرتے ہوئے کہا۔"ویسے میرے تھیلے میں کچھ چنے اور تھوڑے بہت بسکٹ موجود ہیں جو چند آدمیوں کی بھوک مٹا سکتے ہیں۔"

"باقی کیا کریں گے۔"اس نے ایک سردار کی طرح سوچا تھا۔جس کے جواب میں میں کندھے اچکانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

پہاڑی کے انتہائی شمالی کونے میں جا کر میں نے اپنے لیے ایک مورچہ پسند کیا اور اس میں موجود افراد کو دوسرے مورچوں میں بھیج دیا۔ابھی ہم پوری طرح مورچے میں بیٹھ نہیں پائے تھے کہ نوشاد گل وہاں پہنچ گیا۔آتے ساتھ اس نے رات والی بات چیت پر معذرت چاہی۔مجھے اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیلے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"کوئی بات نہیں نوشاد گل ہو جاتا ہے ایسا۔"مجھے لگ رہا تھا شاید کسی کمانڈر یا سیلاب خان نے اسے معذرت کرنے کا کہا ہے اسی لیے اس کا لہجہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔"سلیم بھائی!......میں نے شرط وغیرہ کی بھی بکواس کی تھی......"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔"چھوڑو شرط کو یار!......میں نے بھی یونھی شیخی بگھاری تھی۔"

اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اس نے سیلاب خان کو کہا۔"سردار!...... یقیناً آپ کو یہاں میری مدد کی ضرورت پڑے گی۔"

"شاید سلیم بھائی کو پڑے۔"سیلاب خان نے اس کے وہاں بیٹھنے پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

میں نے کہا۔"خالی بیٹھنے کے بجائے،دوربین لے لو اور دشمن کے وہ آدمی تلاش کرو جو مورچوں سے باہر ہوں۔"

"ٹھیک ہے باس۔"مزاحیہ انداز میں کہہ کر وہ سردار سیلاب خان کے ہاتھ سے دوربین لے کر جائزہ لینے لگا۔یہی کام میں سٹائر کی ٹیلی سکوپ سے کر رہا تھا۔اچانک مجھے چھ سو میٹر کے فاصلے پر دشمن کے ایک آدمی کی جھلک نظر آئی۔موچرے کی دیوار سے اس کا بالائی دھڑ جھلک رہا تھا۔اس کے فاصلے کے بارے میں نے اندازہ لگایا تھا اور یہ ایک سنائپر کا اندازہ تھا۔

ایلی ویشن ناب پر چھے سو میٹر رینج لگا کر میں نے مذکورہ شخص کے دائیں کندھے کا نشانہ لیا، کیونکہ میں اسے جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا۔ گو کسی کو زخمی کرنا بھی اسے نقصان پہنچانے کے زمرے میں آتا تھا مگر یہ جان جان جانے سے بہت کم تھا۔ اور پھر مجھے اپنی جان بچانے کے لیے کوئی نہ کوئی حرکت تو کرنا تھی۔ یونھی پادری بنے بیٹھے رہنے سے تو کام نہیں چلنے والا تھا۔

میرے لبلبی دباتے ہی وہ اچھل کر نیچے گرا۔

''وہ مارا......''نوشاد گل کے منہ سے نعرہ بلند ہوا۔

میں رائفل کو دوبارہ کاک کر کے اسی طرف متوجہ رہا تھا۔ میری گولی کا نشانہ بننے والا نیچے گر کر تڑپنے لگا تھا۔ اسے سنبھالنے کے لیے ساتھ والے مورچے سے دو جوان بھاگتے ہوئے نکلے اور جونھی اگلے والا اپنے ساتھی پاس رکتے ہوئے نیچے جھکا اور میں نے دوبارہ لبلبی دبا دی۔ زخمی کو سنبھالنے والا خود تڑپنا شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ تیسرا ہکا بکا کھڑا تھا اور اس کے کچھ سمجھنے سے پہلے میں رائفل کو تیسری مرتبہ کاک کر کے اس کی ٹانگ کو نشانہ بنا چکا تھا۔

''دوسرا بھی گیا۔'' یہ نعرہ نوشاد کے ہونٹوں پر تھا کہ تیسرا گر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے آس پاس موجود مورچوں سے تیز فائرنگ شروع ہو گئی۔

ان کی دیکھا دیکھی چاروں طرف سے بارش کی طرف گولیاں برسنا شروع ہو گئی تھیں۔ اور وہی موقع تھا جب غزنی خیل قبیلے کے چار چھپے ہوئے نشانہ بازوں نے درختوں کے اوپر سے دشمن کو تاک تاک کر نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ گو وہ تربیت یافتہ سنائپر تو نہیں تھے اور نہ ان کے پاس سنائپر رائفل ہی موجود تھی کہ دشمن کا زیادہ نقصان کر پاتے۔ لیکن اس کے باوجود ہر نشانہ باز نے دشمن کے ایک ادھ آدمی کو نشانہ بنا ہی لیا تھا۔ یوں زخمی ہونے والے آدمیوں نے انھیں مورچوں میں دبکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس دوران دشمن کے دو مزید آدمی میرا نشانہ بن کر زخمی ہو چکے تھے۔

کہتے ہیں جنگ کے دوران مرنے والوں سے زیادہ زخمی ہونے والے نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔ اور اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ زخمیوں کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ اس طرح اپنے ساتھ وہ صحت مند آدمیوں کو بھی پابند کر دیتے ہیں، دوسرا زخم میں ہونے والی تکلیف کی وجہ سے زخمی افراد جو آہ و بکا کرتے ہیں وہ بھی اپنے آدمیوں کا مورال کم

کرتی ہے۔
''سلیم بھائی!......شکر ہے میں نے اپنی شرط واپس لے لی تھی۔'' پانچویں آدمی کو شکار بنتے دیکھ کر نوشاد گل نے مجھے یہ یاد دلانے میں دیر نہیں کی تھی کہ ہمارے درمیان اب کوئی شرط وغیرہ باقی نہیں رہی ہے۔
سردار سیلاب خان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''شرط کس وقت ختم ہوئی تھی جناب، ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا۔''
نوشاد نے رونی صورت بنا کر کہا۔''سردار یہ ظلم نہ کریں۔'' اس کی رونی صورت دیکھ کر سیلاب خان اور میں ہنس پڑے تھے۔
شمالی جانب سے تو دشمن بالکل ہی مورچوں میں دبک گئے تھے۔ سردار سیلاب خان دشمن کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ پہلے جس چینل پر بات چیت کر رہے تھے وہ تبدیل کر دیا تھا۔ جلد ہی اس نے نیا چینل ڈھونڈ لیا تھا۔ دشمن کی باتوں سے یہی پتا چلا کہ زخمی ہونے والوں کے علاوہ ان کے سات آدمی ہلاک ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی تمام کو آڑ میں رہنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔
''کیا خیال ہے، کسی دوسری جانب کا رخ کریں۔'' ان کی نقل و حرکت کا خاتمہ ہوتے دیکھ کر میں نے مشورہ چاہا۔
سیلاب خان نے کہا۔''جو مناسب سمجھو۔''
وہاں سے ہم جنوب کی طرف آ گئے تھے۔ دشمن کے اس نقصان پر غزنی خیل والوں میں خوشی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی تھی۔
جنوب کی جانب دشمن شمال سے زیادہ فاصلے پر تھا، لیکن ان کے کچھ مورچے ایسے تھے جو سٹائر کی مار میں آ رہے تھے۔ گھنٹے ڈیڑھ کی نگرانی کے بعد مجھے دوبارہ موقع مل گیا تھا۔ دو آدمی کافی محتاط انداز میں اپنے مورچے سے نکلے تھے۔ لیکن ان کی احتیاط کسی کام نہیں آ سکی تھی۔ پہلے کو ٹانگ میں گولی لگنے کے بعد دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن اس دوران میں دوبارہ رائفل کو کاک کر چکا تھا اور اس کے مورچے میں گھسنے سے پہلے میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا۔
''کیا آپ کی کوئی گولی ضائع نہیں جائے گی؟'' نوشاد گل نے بہ ظاہر مزاحیہ انداز میں کہا تھا مگر اس کے لہجے

میں تحسین بھری تھی۔

"دورانِ جنگ گولیاں ضائع کرنے والوں کو ہارنا پڑتا ہے دوست۔"

"ویسے یہ گولیاں تو آپ ان کے سر میں بھی اتار سکتے ہیں نا۔" دلشاد گل نے معنی خیز لہجے میں پوچھا تھا۔

"پتا نہیں یار!......لیکن اس وقت میں کسی کے سر میں گولی اتارنا جائز نہیں سمجھتا۔"

سیلاب خان جلدی سے بولا۔"آپ جتنا کر رہے ہیں، اتنا ہی بہت ہے جناب۔"

سہ پہر ڈھلنے تک میں اطراف میں جا کر مختلف جگہوں سے غزنی خیل کے دشمنوں کو زخمی کرتا رہا۔ چونکہ میری اپنی زندگی کا انحصار بھی اسی منصوبے کے کامیاب ہونے میں تھا اس لیے میں نے فائر کرتے وقت کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔

دشمنوں کا کافی نقصان ہو چکا تھا۔ اس دوران جب بھی تیز فائرنگ شروع ہوتی دشمن کے قریب مورچہ سنبھالے غزنی خیل کے چھپے ہوئے نشانہ باز اپنا کام کر جاتے۔ یہ بات دشمن کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ آخر تیز فائرنگ کے بعد ان کے تین چار آدمی کیسے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے مرنے والے آدمی مسلسل مخصوص مورچوں ہی میں جان سے جا رہے تھے اس لیے انھوں نے وہ مخصوص مورچے خالی کرا لیے تھے۔ میں چونکہ مسلسل گھوم کر مختلف اطراف سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھا اس لیے میرے خلاف ان کی یہی حکمت عملی کام آئی تھی کہ وہ کم سے کم آڑ سے باہر نکلتے یا ان کے جسم کا کوئی حصہ آڑ سے باہر جھلکتا۔ بہ ہر حال کچھ بھی تھا مجموعی طور پر انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ غزنی خیل والے اتنی جلدی ان کے قابو میں آنے والے نہیں ہیں۔

شام کا اندھیرا چھاتے ہی تمام کمانڈروں اور خاص خاص افراد کو سردار سیلاب خان کے مورچے میں بلا کر رات کے لیے حکمت عملی کا جائزہ لیا جانے لگا۔ وہاں قریباً پندرہ بیس افراد اکٹھے ہو گئے تھے۔ اپنے سفری تھیلے کو ہلکا کرنے کے لیے میں نے کھانے پینے کی تمام اشیاء ان کے سامنے رکھ دیں تھیں۔ چند لمحوں میں وہ بسکٹ اور خشک چنے وغیرہ ہڑپ کر گئے تھے۔ سیلاب خان نے رسمی سا انکار کیا، لیکن باقیوں نے ذرا سا بھی تکلف نہیں کیا تھا۔

منصوبے کو آخری شکل دے کر تمام اپنے مورچوں میں لوٹ گئے تھے۔ سیلاب خان اور اس کے کمانڈ مجھ

سے خاصا مرعوب نظر آرہے تھے۔ سیلاب خان تو دو تین دفعہ برملا کہہ چکا تھا کہ میں ان کے لیے غیبی مددگار بن کر آیا ہوں۔ روشن خان غریب جو زخموں کی تاب نہ لاکر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، اس کے ختم ہو جانے کے بعد سیلاب خان اس کے، مجھے وہاں لانے کے فیصلے کو سراہ رہا تھا۔

دس بجتے ہی کمانڈر الفت بادشاہ اور کمانڈر امید علی ستر کے قریب افراد کو ساتھ لے کر جنوب مغرب کی جانب بڑھ گئے تھے۔ باقی تمام افراد کے ساتھ سیلاب خان شمالی نالے کے کنارے پہنچ گیا تھا۔

گیارہ بجتے ہی پرشور فائرنگ کے ساتھ الفت بادشاہ اور امید علی کے آدمیوں نے جنوب مغربی جانب ہلہ بول دیا۔ دشمن اس اچانک اور پرشور حملے سے پہلے تو گھبرا گئے تھے اس کے بعد انھوں نے بھی جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ منصوبے کے مطابق الفت بادشاہ اور امید علی نے ریڈیو سیٹ پر ایسی گفتگو کی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دشمن کے اگلے مورچوں تک پہنچ گئے ہیں اور چند گھنٹوں میں شلوبر گاؤں تک پہنچ جائیں گے۔

اس حملے کو روکنے کے لیے دشمن نے دائیں بائیں کے مورچوں سے مزید نفری اس جانب منگوالی تھی۔ تمام کی توجہ کا مرکز جنوب مغرب کی طرف ہی تھی۔ اگلا گھنٹا سخت فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ الفت جان اور امید علی نے اپنے آدمیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ انھوں نے ایک مخصوص حد سے آگے نہیں بڑھنا ہے۔ حملے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے انھوں نے اپنے پاس موجود چند راکٹ بھی فائر کر دیے تھے۔ اسی اثناء میں دشمن نے نزدیک کے مورچوں سے کافی نفری وہاں طلب کر لی تھی۔ توقع کے مطابق انھوں نے شمال مغربی اور جنوبی مورچوں سے اپنے آدمیوں کو اکٹھا کیا تھا کہ یہی مورچے زیادہ قریب تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد الفت بادشاہ اور امید علی نے دس پندرہ تیز رفتار جوانوں کو چھوڑ کر باقی نفری شمال کی جانب بھیج دی۔ ان آدمیوں کے پہنچتے ہی ہم تمام شمال مغربی جانب کی طرف بڑھنے لگے۔ اس جانب دشمن کی برائے نام نفری ہی موجود تھی۔ تمام کو یہی ہدایت کی گئی تھی کہ جب تک دشمن کی طرف سے فائر نہیں کیا جاتا کوئی فائر نہیں کرے گا۔ دشمن کی ساری توجہ جنوبی محاذ کی طرف تھی۔ ان کے خیال کے مطابق غزنی خیل والے شلوبر گاؤں تک پہنچنا چاہتے تھے، کہ ریڈیو سیٹ پر بات چیت کے ساتھ ساتھ غزنی خیل والوں نے اس جانب بھرپور حملہ بھی کر دیا تھا۔ اور دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کی ریڈیو سیٹ پر ہونے والی بات چیت سنتی رہتی تھیں۔

پیچھے رہنے والے پندرہ جوانوں نے بیس منٹ بعد اپنی جگہ سے پیچھے ہٹ کر اپنے آدمیوں سے آملنا تھا۔ شمالی جانب سے غزنی خیل کا پہلا آدمی دشمنوں کو اس وقت نظر آیا جب وہ ان سے سوڈیڑھ سو میٹر قریب پہنچ گیا تھا ۔نالے میں دشمن کے دو مورچے موجود تھے۔اپنے تمام آدمیوں کے سامنے سیلاب خان نے دس چاق و چوبند آدمیوں کی ٹولی رکھی ہوئی تھی۔دشمن کی طرف سے فائر آتے ہی وہ تمام لیٹ گئے تھے پیچھے آنے والے اس ٹولی سے پچاس ساٹھ قدم دور تھے۔اس ٹولی کے پاس راکٹ لانچر موجود تھا۔ دشمن کا فائر سنتے ہی انھوں نے دو راکٹ مورچے پر فائر کر دیے۔یوں بھی وہ مستقل مورچے نہیں تھے،بس عارضی طور پر پتھروں کی آڑ بنائی گئی تھی۔ ایسے مورچے رائفل،کلاشن کوف وغیرہ کی گولیوں کے لیے تو اچھی آڑ ثابت ہو سکتے تھے راکٹ لانچر اور 12.7mm وغیرہ کے لیے کوئی خاص رکاوٹ نہیں تھے۔

راکٹ نے مورچے کی دیوار گرا کر وہاں موجود بندوں کو زخمی کر دیا تھا۔سیلاب خان کے دو آدمی جھکے جھکے تباہ شدہ مورچے کے قریب پہنچے اور زخموں سے کراہنے والوں کو ہر تکلیف سے نجات دلا دی۔نالے میں دو مورچے اور بھی موجود تھے وہاں سے تیز فائرنگ کی آواز آنے لگی۔اس کے ساتھ ہی کوئی اپنے آدمی کو ریڈیو سیٹ پر بلانے لگا۔”سردار!......غزنی خیلوں نے شمال کی جانب حملہ کر دیا ہے اور ہمارے پاس نفری کم ہے۔مزید آدمی بھیجو۔“

اسی وقت دوسرے کی چیختی ہوئی آواز ابھری......”یہاں پر کوئی بھی موجود نہیں ہے اور نہ فائر کا جواب آرہا ہے۔“ غالباً وہ جنوب کی طرف اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں الفت بادشاہ اور امید علی نے اپنے پندرہ آدمی بٹھائے تھے ۔اس وقت تک وہ پندرہ اپنے باقی لشکر کے ساتھ آن ملے تھے۔

”تمام لوگ شمال کی جانب پہنچو،دشمن وہاں سے بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ وہ بھاری سی آواز شلوبر کے سردار کی تھی۔چونکہ میں سعدار سیلاب خان کے ساتھ کافی دیر سے ان کی ٹرانسمشن سن رہا تھا اس لیے مجھے اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔

دشمن کو غزنی خیل کی چال سمجھ میں آگئی تھی،لیکن وہ دیر کر بیٹھے تھے۔ان کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے غزنی خیلوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے دونوں مورچوں کو وہ راکٹ لانچر سے تباہ کر کے آگے بڑھ گئے تھے۔میں سردار سیلاب خان کے ساتھ موجود تھا۔وہ لڑائی میں وطن کی خاطر نہیں لڑ رہا تھا کہ اپنی جان خطرے میں ڈالتا۔وہ

دو قبیلوں کی لڑائی تھی جس میں میں خواہ مخواہ پھنس گیا تھا۔ میری تھوڑی بہت ہمدردی غزنی خیل کے ساتھ اس لیے تھی کہ میں خود ان کے ساتھ موجود تھا۔ ان سے علیحدہ ہونے کے بعد وہ لڑائی کس انجا کو پہنچتی اس سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسی وقت مغرب اور شمال کی جانب سے فائر آنے لگا تھا۔ یقیناً انھوں نے دور ہی سے فائر کرنا شروع کر دیا تھا۔

''یہاں سے جلدی نکلو......'' سیلاب خان نے چیخ کر اپنے آدمیوں کو آگے بڑھنے کا کہا۔

وہ نالہ کافی چوڑا تھا، تمام تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔

شمال کی جانب دشمن کی کافی نفری موجود تھی۔ اور اپنے عقب کو محفوظ رکھنے کے لیے سیلاب خان نے دو پارٹیاں مقرر کر دی تھیں، جنھوں نے وہیں رک کر دشمن کے تعاقب کو روکنا تھا۔ یہ سارا منصوبہ ہم نے گزشتہ رات بیٹھ کر ترتیب دیا تھا۔

دشمن نے تعاقب کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی مگر غزنی خیل والے اس جانب گھیرے سے نکل گئے تھے۔ رات کے وقت تعاقب کرنے میں خطرہ زیادہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ تعاقب سے باز نہیں آئے تھے۔

''مشر خان اور رشید جان کو کہو اپنے آدمی نالہ موڑ کے ساتھ روک دیں۔'' سیلاب خان کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے میں نے اسے یاد دلایا۔

سیلاب خان نے کہا۔ ''انھیں معلوم ہے۔''

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''معلوم ہے مگر یاد دہانی ضروری ہے۔ ایسے حالات میں سارے منصوبے ذہن سے محو ہو جایا کرتے ہیں۔''

سیلاب خان بغیر کسی حجت کے رک کر رشید جان اور مشر خان کو آواز دینے لگا۔ وہ سردار تھا لیکن میرے مشوروں پر یوں عمل کر رہا تھا جیسے اصل سردار میں ہوں۔

''مشر خانا، رشید جانا..........''

''جی سردار!'' تھوڑے فاصلے پر رشید جان کی آواز ابھری۔

''مشر خان کے ساتھ اپنی ذمہ داری سنبھالو۔''

”ٹھیک ہے سردار!......ہم تیار ہیں۔“ یہ کہتے ہی وہ اپنے آدمیوں کو آواز دے کر روکنے لگا۔ نالہ موڑ تک رشید جان نے اپنی پارٹی کے افراد کو روک لیا تھا۔ مشر جان نے اپنے آدمی شمالی جانب اور رشید جان نے غربی جانب ڈھلان پر چڑھا دیے تھے۔

اپنے تمام آدمیوں کے آگے بڑھتے ہی انھوں نے بے تحاشا فائر کھول کر تعاقب کرنے والوں کی پیش قدمی میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔

دشمن بھرپور انداز میں جوابی فائرنگ کرنے لگا۔ رات کے اندھیرے میں نالے کے اندر تو تیز حرکت کی جا سکتی تھی ڈھلان پر چڑھ کر بغیر روشنی کے تیز حرکت ممکن نہیں تھی۔ سیلاب خان کے آدمی نالے میں حرکت کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جبکہ دشمن کے لیے سامنے کی جانب سے کلاشن کوفوں کی برستی ہوئی گولیاں ایک ایسی رکاوٹ تھیں جس کی وجہ سے وہ قدم آگے نہیں بڑھا پا رہے تھے۔ منصوبے کے مطابق فرلانگ بھر آگے جا کر سیلاب خان نے دو پارٹیاں نالے میں اوپر ڈھلان تک ترتیب سے بٹھائیں اور ریڈیو سیٹ پر مشر خان اور رشید جان کی پارٹیوں کو پس قدمی کا حکم دے دیا۔ دونوں کمانڈر سب سے پیچھے تھے۔ الفت بادشاہ اور امید علی کی پارٹیوں کی لگی ہوئی جگہ سے گزرتے ہی انھوں نے اپنے بہ حفاظت گزرنے کی اطلاع دے دی تھی۔

شلوبر اور میام خیل کے آدمیوں کو جب فائرنگ کا جواب نہ ملا تو وہ ایک مرتبہ پھر احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ وہ سیلاب خان کے آدمیوں کی طرح بے فکری سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی انھیں یقین ہو گیا کہ سیلاب خان کے آدمی وہاں موجود نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ لیکن جونھی وہ اس جگہ پر پہنچے جہاں الفت بادشاہ اور امید علی کی پارٹیاں تعینات تھیں، ایک دم ہی ان پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ سب سے آگے موجود دس بارہ آدمی پہلے ہی ہلے میں نیچے گر گئے تھے۔ باقی جوابی فائر کرتے ہوئے وہ رک گئے اور آڑ کی تلاش میں پیچھے ہٹنے لگے۔

دس پندرہ منٹ مسلسل اور تیز رفتار فائرنگ کے بعد الفت بادشاہ اور امید علی خان اپنے آدمیوں کے ساتھ آگے بڑھ گئے، پہلے والی دو پارٹیوں نے اسی رستے پر اپنی جگہیں سنبھال لی تھی۔ پسپائی کا یہ طریقہ کار انھیں میں نے گزشتہ رات بڑی تفصیل اور وضاحت سے سمجھایا تھا۔

اس مرتبہ شلو برا اور میام خیل والے پھونک پھونک قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھے، لیکن انھیں گزرنا تو اسی رستے سے تھا جہاں غزنی خیل والے گھات لگائے موجود تھے۔ ان کے نزدیک پہنچتے ہی انھیں دوبارہ فائرنگ کا سامنا کرنا پڑ گیا اور پہلے کی طرح دس پندرہ منٹ کی تیز فائرنگ کے بعد وہ پارٹیاں اپنے رستے پر آگے بڑھ گئی تھیں۔ دشمن کو کافی نقصان پہنچ گیا تھا۔ مزید تعاقب کی ہمت ان میں باقی نہیں رہی تھی۔

ڈیڑھ دو کلومیٹر دور آ کر سیلاب خان نے اپنے تمام آدمیوں کو روک کر اکٹھا کیا اور چالیس چاق و چوبند آدمی عقب میں رکھ کر باقیوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ ان چالیس آدمیوں نے پچاس ساٹھ گز کا فاصلہ رکھ کر ان کے عقب میں رہتے ہوئے حرکت کرنا تھی۔ یقیناً دشمن بھی کوئی حکمت عملی تیار کر رہا تھا مگر اب وہ پہلے کی طرح بے احتیاطی سے ان کا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے سیلاب خان نے پکا اپنے ساتھ ہی رکھا ہوا تھا۔ گو تمام منصوبہ ہم نے پہلے ہی سے طے شدہ تھا، اس کے باوجود وہ تازہ حکمت علمی کے لیے مجھ سے مشورے کرتا رہا۔ جلد ہی ہمیں سفر کرنے کے لیے متبادل نالے بھی مل گئے تھے۔ وہ اس علاقے کو پہچانتے تھے اور انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کن رستوں پر چل کر وہ جلد از جلد غزنی خیل پہنچ سکتے تھے۔

ہمیں ساری رات چلتے ہوئے گزر گئی تھی۔ پانی وغیرہ تو لوگوں نے رستے میں آنے والے چشموں اور نالوں سے پی لیا تھا مگر بھوک کی وجہ سے قریباً تمام نڈھال سے تھے۔ جان بچانے کی جبلت ہی تھی جو وہ اتنا سخت مقابلہ کر کے دشمن کے گھیرے سے باہر نکل پائے تھے۔ جب ہم غزنی خیل کے قریب پہنچے تو صبح کا ملگجا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔

”دشمن کی تعداد زیادہ ہے وہ غزنی خیل کو گھیرنے کے لیے نہ پہنچ جائیں۔“ ڈھلان سے اترتے ہوئے میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

سیلاب خان نے جھکتے ہوئے کہا ”اب ہمیں ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ کھانے پینے کا سامان اور ایمونیشن وافر مقدار میں موجود ہے۔ باقی ہمارے بھی حلیف قبیلے موجود ہیں بس ان کے پاس پیغام بر بھیجنے کی ضرورت ہے“

”مطلب وہ اس طرف کا رخ نہیں کریں گے؟“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”شاید،لیکن ہم نے تو اعلان جنگ کر دیا ہے اور جب تک شلو بر والے ہمارے مطالبات پورے نہیں کرتے ہم بیٹھنے والے نہیں ہیں۔اس مرتبہ ہم بہت زیادہ تیاری کے ساتھ حملہ کریں گے۔“

گاؤں میں داخل ہوتے ہی سردار نے تمام کو جلد از جلد کھانا کھا کر تیار ہونے کا حکم دیا۔اس کا ارادہ جنوبی اور مغربی جانب کی پہاڑی پر اپنے آدمی تعینات کرنے کا تھا۔یہ دونوں پہاڑیاں گاؤں کے قریب واقع تھیں اور وہاں انھوں نے پہلے سے مورچے وغیرہ بھی بنا رکھے تھے۔

مجھے سردار سیلاب خان اپنی بیٹھک میں چھوڑ کر گھر میں گھس گیا۔تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا آدمی چائے اور پراٹھے لے آیا۔یقیناً اس وقت گھر میں جو کچھ تیار تھا سیلاب خان نے میری طرف بھجوا دیا تھا۔

گندم کی روٹی ایسی چیز ہے جس کا نعم البدل دنیا کی کوئی خوراک بھی نہیں ہو سکتی۔اور میں دو تین دن سے کھانا نہیں کھا سکا تھا۔دو تین پراٹھے کھا کر میں سونے کے لیے لیٹ گیا کہ رات بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔یوں بھی غزنی خیل والے اب خطرے کی حدود سے نکل آئے تھے اور اپنی لڑائی وہ خود لڑ سکتے تھے۔نہ تو مجھے ان سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ واسطہ کہ میں مزید چچا خواہ مخواہ بننے کی کوشش کرتا۔

☆......☆......☆

میری آنکھ کہیں ظہر کی آذان سن کر کھلی تھی۔وہی بوڑھا شخص جس نے ناشتا لایا تھا بیٹھک کے صحن میں بیٹھا نظر آیا۔مجھے جاگتے دیکھ کر وہ کھانے کا پوچھنے لگا۔

”شکریہ چاچا بھوک نہیں ہے،بس چائے پلوا دیں۔“ کہہ کر میں غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔

میرے نماز پڑھنے تک سیلاب خان وہاں پہنچ گیا تھا۔

”کیا حال جناب!“ خوش دلی سے کہتے ہوئے اس نے چارپائی پر نشست سنبھال لی۔

میں نے کہا۔”بالکل ٹھیک آپ سنائیں۔“اس دوران بوڑھا چاچا چائے کے برتنوں کے ساتھ نمودار ہوا۔

سیلاب خان کہنے لگا۔”فی الحال تو امن ہے،آدھے آدمی مورچوں پر پہنچ چکے ہیں اور باقی آرام کر رہے ہیں۔“

میں نے بوڑھے ملازم کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لیتے ہوئے پوچھا۔”آگے کا کیا ارادہ ہے؟“

وہ پر عزم لہجے میں بولا۔ ''جب تک لڑکی اور اسے لے جانا والا جوان نہیں مل جاتا یہ جنگ جاری رہے گی۔ دو تین دن تک جرگہ بلانے کا ارادہ ہے، اس کے بعد اگلی حکمت عملی طے کریں گے۔''

''اگر خفا نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں۔'' تازہ دودھ سے بنی چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں مستفسر ہوا۔

سوالیہ نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی کہ ایک لڑکی کے لیے آپ نے پہلے بھی اتنے آدمیوں کی قربانی دے دی ،مخالفین کے بھی کافی آدمی قتل ہو گئے۔ حالانکہ وہ لڑکی بالغ ہے اسے اپنی زندگی جینے کا حق ہے...... گو اس کا طریقہ کار غلط ہے مگر اس وجہ سے وہ موت کی سزاوار تو نہیں ٹھہرتی نا۔''

''ہونہہ!......'' گہرا سانس لیتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کے خیال میں ہمارے قبیلے کی ایک لڑکی دشمن قبیلے کے لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور ہمیں اس بات پر شکر ادا کرتے ہوئے کہ اس لڑکی نے اپنا شوہر خود ڈھونڈ لیا ہے خوشی کے شادیانے بجانے چاہیں۔''

اس کے طنز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے میں مستفسر ہوا۔ ''تو اس لڑکی کے حصول کے لیے اتنے گھرانوں کے چراغ بجھا دیے ہیں مزید کتنی جانیں ضائع کراؤ گے؟''

وہ اطمینان سے بولا۔ ''اگر آپ کا تعلق قبائلی علاقے سے ہوتا تو یقیناً یہ سوال آپ کے ذہن میں نہ اٹھتا۔''

''تو کیا قبائلیوں کے لیے جان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

''ضرور ہے، مگر ہماری خودداری اور انا پہلے ہے، جان کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ باقی دشمن قبیلے کے افراد بھی تو مر رہے ہیں، وہ اپنی غلطی کیوں نہیں تسلیم کرتے۔''

''وہ رقم ادا کرنے پر تو تیار ہیں اور کیا کریں۔'' میں نے دلیل پیش کی۔

وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ''ہمیں رقم کی نہیں، اس لڑکی کی ضرورت ہے جس کی وجہ سے ہماری بے عزتی ہوئی ہے اور اس لڑکے کی ضرورت ہے جس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔''

''تو انھیں مار کر آپ کو کیا ملے گا؟''

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہمارے سینوں میں ٹھنڈ پڑ جائے گی اور علاقے بھر میں کوئی غزنی خیل کے پیچھے بات نہیں کر سکے گا۔''

میں جان چھڑاتے ہوئے بولا۔ ''معذرت خواہ ہوں، مجھے ایسا کچھ کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔''

''جلد ہی سمجھ گئے ہو۔'' سیلاب نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''بہر حال آپ جانیں اور آپ کا کام، میں نے صبح آگے بڑھ جانا ہے۔''

''کیا پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے جانا کہاں ہے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''منزل کا تعین تو مجھے خود بھی نہیں ہے۔''

''اگر میرے لائق کوئی کام ہو تو آپ کے کام آ کر مجھے خوشی ہو گی۔''

''شکریہ سردار۔'' میرے لہجے میں ممنونیت بھری تھی۔

سیلاب خان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''اچھا آج رات کو ہم نے آپ کے لیے خصوصی دعوت کا اہتمام کیا ہے، غزنی خیل کے کافی جوان آپ کو ملنا اور دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کا غائبانہ تعارف سن سن کر تمام کے دل میں آپ سے ملاقات کا شوق جاگا ہوا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' اس کا معنی خیز انداز مجھے حیران کر گیا تھا۔

وہ میرے سر پر بم پھوڑتے ہوئے بولا۔ ''اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے جناب ایس ایس!......وہ ایسے نشانہ باز کو دیکھنا چاہتے ہیں جس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔''

''ایس......ایس۔'' میں گڑبڑا گیا تھا۔

''جی محترم!'' سیلاب خان آنکھیں میچتے ہوئے بولا۔ ''نوشاد گل آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اور آپ کو جوش دلانے کے لیے ہی اس نے شرط لگائی تھی۔ اسی رات آپ کے سو جانے کے بعد مجھے مورچے سے باہر بلا کر اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ چونکہ اسے آپ کی صلاحیتوں کا اچھی طرح اندازہ تھا اس لیے صبح سویرے ہی اس نے اپنی رائفل بچانے کے لیے شرط واپس لے لی تھی۔''

”اسے پہچاننے میں غلطی بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”اس کی بات سن کر میں نے بھی یہی سوچا تھا۔لیکن آپ کی نشانے بازی نے یقین دلا دیا۔“

اس مرتبہ میں نے کسی لولی لنگڑی دلیل کا سہارا لیے بغیر خاموشی اختیار کر لی تھی۔

وہ مجھے تسلی دیتا ہوا بولا۔”فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں،نوشاد گل اب کسی خان کا ملازم نہیں ہے۔ بلکہ سچ کہوں تو وہ آپ سے بہت زیادہ متاثر ہے،ہم سب پر بھی آپ کا احسان ہے کہ آپ کی وجہ سے ہم اس گھیرے سے باہر نکل سکے ہیں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں سردار!......نہ تو مجھے پریشانی ہے اور نہ کوئی خوف۔ بس یہ سوچ کر خفت ہو رہی ہے کہ لوگوں نے میرے بارے کچھ زیادہ ہی مبالغہ آمیزی کی ہوئی ہے۔“

”نوشاد گل کہہ رہا تھا کہ آپ نے اس کی آنکھوں کے سامنے پلوشہ خان وزیر کے سر پر رکھے گلاس کو نشانہ بنایا تھا۔کیا یہ جھوٹ ہے؟“

میں جلدی سے بولا۔”اسے اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں۔“

وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔”ان کے سردار جہان داد کے سر میں دو کلومیٹر دور سے گولی مارنا،یہ بھی اتفاقاً ہوا ہوگا،بلکہ سردار جہانداد کے سارے مرنے والے ساتھیوں کے سر میں اتفاقی طور پر گولی لگتی رہی ہوگی اور کل شلوبر اور میام خیل کے سارے آدمی بھی اتفاقی طور پر ہی زخمی ہوتے رہے ہیں۔“

میں خفیف ہوتا ہوا بولا۔”اچھا چھوڑیں اس موضوع کو آپ کی سمجھ میں میرا نکتہ نظر نہیں آئے گا۔“

”اچھا اب تو بتا دیں کہ افغانستان کس سلسلے میں آنا ہوا۔“اس نے موضوع تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”اپنے کچھ ساتھیوں کی تلاش میں نکلا ہوں۔“میں نے مجمل سا جواب دیا۔

وہ مزید کوئی سوال کیے اٹھتے ہوئے بولا۔”آپ آرام کریں شام کو ملاقات ہوگی۔“اور میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

شام کے بجائے سہ پہر ہی کو شام کے کھانے کا بند بست ہونے لگا تھا۔ وسیع بیٹھک کے صحن میں آلاؤ جلا کر وہ سالم دنبے روسٹ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ بھی مقامی طور کئی مقامی پکوان تیار کیے جا رہے تھے جن میں کابلی پلاؤ اور افغانی کباب وغیرہ شامل تھے۔

اسی دوران نوشاد گل اور گل ریز بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ یہ دونوں قبیل خان کے لشکر کا حصہ رہ چکے تھے، قبیل خان اور جہانداد خان کے قتل کے بعد انھوں نے صنوبر خان کا ساتھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ البتہ صنوبر خان کی موت بعد علام خیل کا کوئی ایسا سردار نہیں بچا تھا جس کے پاس یہ کام کر سکتے پس کسی اور سردار کے لشکر میں شمولیت اختیار کرنے کے بجائے یہ گاؤں واپس لوٹ آئے تھے۔ دونوں میرے نام اور کام سے اچھی طرح واقف تھے۔ خوش حال خان کے گاؤں میں ہونے والے جرگے میں گل ریز مجھے دیکھ چکا تھا، جبکہ نوشاد گل اس وقت قبیل خان کی بیٹھک میں موجود تھا جب میں نے پلوشہ کے سر پر رکھے گلاس کو نشانہ بنایا تھا۔ اس وقت نوشاد گل بڑی مشکل سے پلوشہ کی گولیوں کا نشانہ بننے سے بچ سکا تھا۔

دونوں مجھ سے مصافحہ کر کے بیٹھ گئے، ان کے ہمراہ چند اور جوان بھی میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے تھے۔ ان کے انداز میں مجھے ایک عقیدت اور مرعوبیت نظر آ رہی تھی۔ یوں بھی قبائلی علاقے میں اچھے نشانے باز کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ ان کی لڑائی کا دارومدار ہی ہتھیار کے استعمال پر ہے۔ تھوڑی دیر میں تمام بے جھجک ہو کر مجھ سے گپ شپ کر رہے تھے۔

سیلاب خان کی آمد کے بعد چند منچلوں نے میرا نشانہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کر دی، جس کی تائید تمام حاضرین محفل کرنے لگے تھے۔ میں نے بھی خواہ مخواہ کی بہانے بازی سے گریز کرتے ہوئے نوشاد گل کے ہاتھ سے سٹائر سنائپر لے لی کہ سٹائر، کلاشنکوف سے کئی گنا زیادہ بہتر تھی۔ نوشاد گل کو میں نے بیٹھک کی ایک دیوار کے ساتھ ایک سفید چادر لٹکانے کا کہا۔

اثبات میں سر ہلا کر اس نے ایک آدمی سے چادر لے کر دیوار سے لٹکا دی۔ دوسری دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کر میں نے بیس گولیاں تیز رفتاری سے فائر کیں۔ جونھی میں ایک میگزین خالی کرتا نوشاد گل مجھے بھری میگزین پکڑا دیتا۔ زیادہ تر لوگ اس بات پر حیران تھے کہ اتنی چوڑی چادر پر نشانہ بازی کر کے میں کون سی مہارت کا

ثبوت دے رہا ہوں۔لیکن کسی نے زبان سے یہ نہیں کہا تھا۔

فائر ختم کرتے ہی میں نے تمام کو کہا کہ وہ قریب جا کر چادر کو دیکھ لیں۔چادر کے قریب جا کر وہ حیرانی سے چیخ پڑے تھے،کیونکہ چادر پر میں گولیوں کے ذریعے انگریزی زبان میں ایس ایس لکھا تھا۔ اور ایسا کرنا کسی عام شخص کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ مظاہرہ دیکھ کر سیلاب خان نے بے ساختہ کہا......''اب تو لگتا ہے نوشاد گل آپ کے متعلق کچھ بتا ہی نہیں پایا تھا۔''

باقی لوگ بھی پہلے سے زیادہ مرعوب نظر آنے لگے تھے۔جبکہ میں خود کو خاصا خفیف محسوس کر رہا تھا۔بار بار تعریفی کلمات سن کر مجھے الجھن محسوس ہو رہی تھی۔کوئی میری پیٹھ تھپتھپا رہا تھا تو کوئی تعریف میں رطب اللسان تھا ،اور کوئی میرا شاگرد بننے پر تلا ہوا تھا۔

شام کی نماز کے بعد کھانا کھایا گیا اور اس کے بعد محفل موسیقی تھی۔رباب اور گھڑے کے ملاپ نے عجیب سماں باندھ دیا تھا۔مقامی گلوکار کی آواز خاصی دلکش تھی۔پشتو ٹپے سنتے ہی پلوشہ دھم سے میرے خیالوں میں آکودی تھی۔پشتو ساز پر تو وہ یوں بھی اتنا خوب صورت اور دلکش رقص کرتی تھی کہ دیکھنے والے سحر زدہ ہو جاتے تھے۔میرے دماغ میں وہ وقت فلم کی طرح چلنے لگا جب ملک ثقلین کے بیٹے کی شادی میں اس نے جادو بھرا خوب صورت رقص پیش کیا تھا۔

رات گئے تک پروگرام جاری رہا۔اور پھر میرے آرام کرنے کی درخواست پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

گھروں کو لوٹتے وقت کوئی بھی ایسا آدمی نہیں تھا جس نے مجھ سے مصافحہ نہ کیا ہو۔نوشاد گل جب جانے لگا تو اسے میں نے روک لیا۔تمام کے رخصت ہونے بعد میرے پاس سیلاب خان اور نوشاد گل ہی رہ گئے تھے۔

میں سردار سیلاب خان کو بولا......

''سردار!......اگر اجازت ہو تو میں نے نوشاد گل سے چند ضروری باتیں پوچھنا ہیں۔''

''ہاں......ہاں کیوں نہیں۔''جہاں دیدہ سردار فوراً میرے مطمح نظر تک پہنچ گیا تھا۔الوداعی مصافحہ کر کے وہ بھی چلا گیا۔

”نوشاد گل!......کیا میں یہ امید کر سکتا ہوں کہ جو پوچھوں گا آپ اس کا صحیح جواب دیں گے۔“

”ذیشان بھائی!......سردار قبیل خان اور اس کے بعد بننے والے سرداروں میں سے کوئی بھی نہ تو میرا رشتا دار تھا اور نہ کسی سے میری جذباتی وابستگی ہی تھی۔ میرا ان سے تعلق فقط مالک اور ملازم کا تھا۔ اس لیے آپ نے جو پوچھنا ہے بے جھجک ہو کر پوچھیں، اگر مجھے معلوم ہوا تو کبھی نہیں چھپاؤں گا۔“ وہ میرے اصل نام سے واقف تھا

”البرٹ بروک، ٹریسی والکر اور کرنل کولن فیلڈ میں سے کسی کو جانتے ہو؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔”تینوں کو جانتا ہوں۔“

میں نے پر جوش لہجے میں پوچھا۔”یہ تینوں یا ان میں سے کوئی ایک مجھے کہاں مل سکتا ہے۔“

”میں نے ایک بار صنوبر خان کے ساتھ البرٹ بروک اور کالی لڑکی کو غزنی میں پہنچایا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ وہ مستقل وہیں ہیں یا کہیں اور چلے گئے ہیں۔“

”میں غزنی تک کیسے پہنچ سکتا ہوں۔“

”یہاں سے آپ کو مرناہ گر جانا ہوگا، وہاں سے پکتیکا نزدیک ہی ہے۔ اس کے بعد زرغون شہر آئے گا۔ اس کے بعد پناہ اور اس سے آگے قرہ باغ ہے وہاں سے غزنی کی گاڑی مل جائے گی۔ اسی طرح اگر زرغون سے آپ سیدھا اب بند کا رخ کریں تو وہاں سے بھی غزنی جا سکتے ہیں۔ یہ میں سڑک کا راستہ بتا رہا ہوں، اگر آپ پکتیکا سے سیدھا غزنی کا رخ کریں تو یہ راستہ مختصر ہے مگر بڑی سڑک میسر نہیں ہے۔ اس طرف آپ کو کچے پکے رستوں اور پہاڑی علاقے کو عبور کرنا پڑے گا۔“

میں نے مزید ضروری معلومات دریافت کیں اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ تمام رات میں نے آگے کی حکمت عملی بناتے گزاری، غزنی ایک بڑا شہر تھا۔ اور وہاں امریکن فوج نے اپنی چھاؤنی بنائی ہوئی تھی۔ اس حساس علاقے میں گھسنا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ اس کے لیے مجھے کسی ایسے منصوبے کی ضرورت تھی جس میں غلطی کی گنجائش نہ ہوتی۔ مگر ایسا صرف سوچا جا سکتا تھا عملی طور پر اگر یہ ناممکن نہیں تو بہت زیادہ دشوار ضرور تھا۔ سب سے بڑھ کر میں نے کسی کو جان سے نہیں مارنا تھا کہ دور سے گولی چلا کر اپنا کام کر لیتا۔

مجھے تو ان کے کیمپ میں گھس کر اپنی بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنا تھے۔ یہ سراسر جاسوسوں والا کام تھا۔ گو ایک سنائپر کو وقت پڑنے پر ہر کام کرنا پڑتا ہے، لیکن پھر بھی نشانہ بازی اور مار دھاڑ سے جاسوسی ایک الگ کام تھا۔

صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے سیلاب خان کو کہہ کر کاغذ پین منگوایا اور نوشاد گل سے سنی ہوئی معلومات کو ایک نقشے کی صورت میں کاغذ پر اتار لیا۔ راستے کے لیے کھانے پینے کی چیزیں سفری تھیلے میں ڈال کر میں جانے کے لیے تیار تھا۔ اس وقت تک نوشاد گل اور چند اور جوان بھی پہنچ گئے تھے۔ میں تمام کی معیت میں چلتا ہوا غزنی خیل سے باہر نکلا اور ان سے الوداعی معانقہ کر کے غزنی خیل سے غزنی کی طرف روانہ ہو گیا۔

خان کلے کو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اب مرناہ گر سے ہوتے ہوئے میں نے پکتیکا پہنچنا تھا۔ مرناہ گر سے پکتیکا کے لیے گاڑی بھی مل جاتی تھی لیکن گاڑی میں سفر کرنے میں یہ قباحت تھی کہ میں کلاشن کوف ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔

غزنی خیل سے شمال کی جانب ایک چوڑے نالے میں کلومیٹر ڈیڑھ چلنے کے بعد مجھے مغرب کی طرف مڑنا تھا۔ موسم تقریباً صاف تھا۔ شمالی جانب ہلکے ہلکے بادل نظر آ رہے تھے اور بہ ظاہر بارش یا برف باری کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ میں اس بات سے بھی واقف تھا کہ بادلوں کو اکٹھا ہونے میں اتنی دیر نہیں لگنی تھی۔ اس موسم کے ہاتھوں میں ایک بار پہلے بھی مرتے مرتے بچا تھا اب میں اس موسم پر بالکل بھی اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ میرا پختہ ارادہ تھا کہ موسم کے ذرا سا بھی خراب ہونے پر میں بغیر سفر جاری رکھے کسی پناہ گاہ میں گھسوں گا۔ سردی کافی بڑھ گئی تھی، دسمبر شروع ہونے والا تھا اور دسمبر کی شروعات کے ساتھ ہی پہاڑی علاقے میں مزید برف باری ہونے کا امکان تھا۔

نالہ موڑ مڑتے ہی ہلکی ہلکی اترائی شروع ہو گئی تھی۔ موڑ مڑ کر میں چند قدم ہی لے پایا تھا کہ اچانک کسی نے زوردار آواز میں للکار کر مجھے رکنے کو کہا۔

ایک دم میرے قدم رک گئے تھے، آواز کی سمت دیکھنے پر چار آدمی جھاڑیوں کے جھنڈ سے برآمد ہوتے دکھائی دیے۔ چاروں مسلح تھے۔ یقیناً وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر مجھے روک رہے تھے۔

''ہتھیار نیچے پھینک دو۔'' ایک کرخت شکل کے لمبے آدمی نے دور ہی سے حکم جاری کیا۔

”شاید آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں...........“

”بکواس بند کرو اور ہتھیار نیچے پھینکو۔“اس مرتبہ اس نے کلاشن کوف میری جانب تان کر درشت لہجے میں کہا۔

افسوس بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے میں نے کلاشن کوف نیچے رکھی۔

”پیچھے ہو جاؤ۔“اس نے ہتھیار سے دور ہونے کا اشارہ کیا۔

میں چند قدم لے کر ہتھیار سے دور ہو گیا۔ ان چاروں کے چہروں پر چھائے خشونت بھرے تاثرات مجھے حیران کیے ہوئے تھے۔ لمبے آدمی نے قریب پہنچ کر بغیر شناخت پوچھے، گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے مجھے دور پھینکا۔

”تمھارے ساتھ کافی حساب کتاب باقی ہے بے غیرت شخص۔“اس کے لہجے میں شامل غیض وغضب مجھے حیران کیے دے رہا تھا۔ اس کے انداز پر مجھے بھی انتہائی غصہ آ گیا تھا لیکن اپنے جانب اٹھی تین کلاشن کوفوں کی موجودی میں میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ غصے کا کڑوا گھونٹ بھرتے ہوئے میں نے حتی الوسع نرم لہجے میں کہا۔

”دیکھو بھائی صاحب!...... یقیناً تمھیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں مسافر ہوں اور اس سے پہلے میں نے آپ لوگوں کو نہیں دیکھا۔“

”تم مسافر تھے، لیکن غزنی خیل قبیلے کے ساتھ مل کر تم نے ہمارے کتنے بندوں کو ناکارہ کیا اس بات سے تم واقف ہو گے۔ تمھارا کیا خیال ہے غزنی خیل میں ہمارا کوئی ہمدرد موجود نہیں ہے۔“

اس کی بات سنتے ہی میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ شاید وہ شلوبر قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ۔غزنی خیل قبیلے کے کسی غدار نے میرا مکمل راز فاش کر دیا تھا، یہاں تک کہ اس نے شلوبر قبیلے والوں کو میرے جانے کے رستے کے بارے بھی بتا دیا تھا۔ اور یقیناً شلوبر قبیلے کے یہ آدمی کافی دیر سے میری گھات میں بیٹھے ہوئے تھے۔ غزنی خیل قبیلے کے ساتھ کرنے والی ہمدردی مجھے راس نہیں آئی تھی۔ ایسی حالت میں تو سیلاب خان کے آدمی بھی میری مدد کو نہیں پہنچ سکتے تھے کہ انھیں اس بابت کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں بہت بری طرح

پھنس گیا تھا۔

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب تو بولتی ہی بند ہو گئی ہے۔''

زمین سے اٹھتے ہوئے میں نے اپنے کندھوں سے سفری تھیلے کی ڈوریاں نکالیں اور تھیلے کو زمین پر چھوڑتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ان کے ارادے مجھے چھوڑنے والے نہیں لگ رہے تھے۔

میں نے صلح کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو ساری بات معلوم نہیں ہے بھائی صاحب!...... میں واقعی مسافر ہوں اور غزنی خیل والے مجھے آپ کا آدمی پکڑ کر لے گئے تھے۔ اور اس سے پہلے کہ میں ان کی غلط فہمی دور کر کے اپنا سفر جاری رکھ پاتا، آپ لوگوں نے انھیں گھیر لیا اور میں بے گناہ پھنس گیا۔ اس کے بعد گزشتہ رات وہ گھیرا توڑ کر نکل بھاگے، میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے۔''

وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ''تمھارا قصور یہ ہے کہ بھاگنے کا سارا منصوبہ تمھارا تھا اور کل دن بھر تم ہمارے آدمیوں کو زخمی کرتے رہے ہو۔ تمھاری ہی ترکیب سے ہمارے کئی آدمی جان سے گئے ہیں۔''

انھیں خبر دینے والا محاذ پر نہیں گیا تھا ورنہ ہمارا کل کا منصوبہ کامیاب نہ ہو پاتا۔ یقیناً اسے کل لڑائی سے لوٹنے والوں ہی سے میرے بارے معلوم ہو پایا تھا اور اپنے کرم فرماؤں تک اس نے فوراً ساری بات پہنچادی تھی۔ میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ کے کسی بھی آدمی کو جان سے نہیں مارا۔''

''انھیں ٹانگوں اور بازوؤں میں گولی مار کر ناکارہ تو کیا ہے نا...... میں بھی تمھیں جان سے نہیں ماروں گا ،بس دونوں ٹانگوں اور بازوؤں میں گولی ماروں گا۔'' یہ کہتے ہی اس نے کلاشن کوف میرے جانب سیدھی کی۔

اس کے کلاشن کوف سیدھی کرتے ہی میں نے حرکت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر واضح لگ رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا تھا ویسا ہی کرنا چاہتا تھا۔

میں نے ہاتھ سر سے بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا میری آخری بات سن لو اس کے بعد جو مرضی آئے کرنا۔''

''سناؤ۔'' میری بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس نے کلاشن کوف کی بیرل زمین کی طرف جھکائی۔

اس وقت تک میں ایک سرسری نظر تینوں پر ڈال چکا تھا۔ وہ تمام اس کے عقب میں کھڑے تھے اور وہ سب

سے آگے کھڑا تمسخرانہ نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ ہمارے درمیان بس دو تین قدموں کا فاصلہ تھا۔ باقی تینوں اس سے چند قدم دور تھے ان تمام کے انداز میں بے پروائی تھی۔

اس کی کلاشن کوف کا رخ نیچے کی طرف ہوتے ہی میں زقند بھرتے ہوئے اس کے قریب ہوا اور اس سے پہلے کہ میرا ارادہ اس پر ظاہر ہوتا میں نے کلاشن کوف کی بیرل کو پکڑ کر اس کے دھانے کا رخ خود سے موڑتے ہوئے اپنے گھٹنے کو زوردار انداز میں اس کی ٹانگوں کے درمیان اٹھادیا۔

''اوغ۔'' کی آواز کے ساتھ وہ نیچے جھکا اور میں نے ایک جھٹکے سے کلاشن کوف اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

یہ سب کچھ اس سرعت سے ہوا تھا کہ وہ تینوں ہکا بکا کھڑے رہ گئے تھے۔ ان کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ کچھ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ میں نے مشاہدہ کیا تھا کہ اس علاقے میں اکثریت ایسے لڑاکوں کی تھی جو صرف ہتھیار کا استعمال ہی جانتے تھے۔ جسمانی داؤ پیچ سے وہ لوگ نابلد تھے۔ البتہ مجاہدین کے کیمپوں میں خالی ہاتھ لڑنے کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ دہشت گردوں میں بھی اکا دکا ایسے آدمی مل جاتے ہیں جو ہاتھ پیر کا استعمال جانتے ہوں، مگر ایسے لوگ بہت کم تعداد ہی میں مجھے ٹکرائے تھے۔

کلاشن کوف ہاتھ میں آتے ہی میں نے اس کا بٹ زوردار انداز میں گھٹنوں کے بل جھکے آدمی کے سر میں مارا، وہ منہ کے بل نیچے گر گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بیرل کا رخ ان تینوں کی طرف موڑ دیا۔ وہ تینوں بھی ابتدائی جھٹکے سے سنبھل کر حواسوں میں آئے، لیکن انھوں نے ذرا سی دیر کر دی تھی وہ جب تک کلاشن کوف کا رخ میری طرف کرتے میں ٹریگر دبا چکا تھا۔

دو بندے ٹانگوں میں گولی کھا کر چیختے ہوئے نیچے گر گئے، تیسرے آدمی نے ٹریگر دبانے کے ساتھ ہی پیچھے کی جانب چھلانگ لگادی تھی۔ اس نے کلاشن کوف برسٹ پر سیٹ کی ہوئی تھی۔ اگر وہ تیزی میں درستی نہ بھول جاتا تو یقیناً آج میں کہانی سنانے کے لیے زندہ نہ ہوتا۔ ٹریگر دباتے ہی چونکہ اس نے پتھر کی جانب چھلانگ لگائی تھی اس لیے بیرل کا رخ مجھ سے بائیں طرف ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے بائیں بازو میں شدید جلن کا احساس ہوا، اس کے جلد بازی میں فائر کیے گئے برسٹ میں سے ایک بھولی بھٹکی گولی میرے بازو کا مزاج پوچھ چکی تھی۔

اچانک ڈھلان کی طرف سے شدید فائرنگ ہونے لگی۔گولیاں میرے دائیں بائیں لگی تھیں۔ اگر میرے سامنے ان کا ایک آدمی بے ہوش نہ پڑا ہوتا تو ان گولیوں کا نشانہ میرے جسم نے بننا تھا۔میں نے فوراً خود کو زمین پر گرایا اور قریبی پتھر کے پیچھے رینگ گیا۔میرے بائیں بازو میں جلن تو ہو رہی تھی مگر بازو ٹھیک ٹھاک کام کر رہا تھا ،اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ گولی میرے بازو کو چھوتے ہوئے گزر گئی تھی۔

اب اسی پتھر کو نشانہ بنایا جا رہا تھا جس کے پیچھے میں چھپا تھا۔اوپر والوں سے زیادہ مجھے اس آدمی سے خطرہ تھا جو نالے ہی میں چھپا تھا۔آڑ کے دائیں جانب سے اس طرف نظر دوڑانے پر مجھے ایک کلاشن کوف کی بیرل اپنی جانب اٹھی نظر آئی ،اس کا باقی جسم پتھر کے پیچھے غائب تھا۔ایک دو چھوٹے چھوٹے برسٹ چلا کر وہ مجھے اپنے ساتھ الجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کا جسم تو نظر نہیں آ رہا تھا فقط کلاشن کوف پتھر کے پیچھے سے جھلک رہی تھی۔کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر میں نے کلاشن کوف کے اوپر نشانہ سادھتے ہوئے ٹریگر دبایا۔اس فاصلے سے نشانہ چوکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔گولی کلاشن کوف کے فرنٹ ہینڈ گارڈ پر لگی تھی۔کلاشن کوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔

میں نے فوراً کلاشن کوف کا رخ ڈھلان کی طرف کرتے ہوئے سیفٹی لیور کو برسٹ پر سیٹ کیا اور ٹریگر دبا دیا ۔دو تین گولیوں کے بعد۔''ٹرچ۔'' کی آواز نے مجھے کلاشن کوف کے خالی ہونے کی بری خبر سنائی۔یقیناً کلاشن کوف کی میگزین بھری ہوئی نہیں تھی ، کیونکہ میں تو چند گولیاں ہی فائر کر سکا تھا۔میری اپنی کلاشن ذرا فاصلے پر پڑی تھی۔وہاں تک جانے کے لیے مجھے دشمن کے سامنے ظاہر ہونا پڑتا جس کا نتیجہ موت کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتا تھا۔

ٹانگوں پر گولیاں کھانے والے کراہتے ہوئے اپنی جگہ پر تڑپ رہے تھے۔یقیناً انھیں طبی امداد کی ضرورت تھی ورنہ زیادہ خون بہنے کی وجہ سے انھیں جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔

اسی وقت نالے موڑ سے ہونے والی فائرنگ کی آواز نے مجھ پر یہ روح فرسا انکشاف کیا کہ وہاں پر دشمن کی کافی پارٹیاں موجود تھیں۔وہاں مزید لیٹنا بھی موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لینا تھا۔اور ایک بار اگر میں ان کے ہاتھ چڑھ جاتا تو میری زندگی کی ضمانت ضبط ہوتے

دیر نہ لگتی۔

اس پتھر سے بیس پچیس گز دور جھاڑیوں کا جھنڈ تھا، وہاں تک پہنچ کر میں اپنے فرار میں آسانی پیدا کر سکتا تھا۔ جھاڑیوں تک پہنچنے کے لیے مجھے جلدی کرنا تھی ورنہ دشمن کے نزدیک پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہتا۔ دشمن اس لیے بھی دور دور رہتے تھے کہ ان کے خیال کے مطابق میں مسلح تھا۔ جبکہ میں بغیر ایمونیشن کے بالکل بے دست و پا ہو گیا تھا۔

میں ابھی اس صورت حال سے نکلنے کی ذہنی ورزش ہی کر رہا تھا کہ بے ہوش پڑے آدمی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھ بیٹھا، میری کلاشن کوف اس سے دو تین قدم ہی دور پڑی تھی۔ میں نے نیفے میں اڑسا تیس بور نکال کر کاک کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

ہوش میں آتے ہی وہ چند لمحے کنپٹی مسلنے کے بعد زمین پر ہاتھ ٹیکتے ہوئے اٹھنے لگا۔ اسی وقت خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے میں زقند بھر کر پتھر کے پیچھے سے نکلا اور اس سے پہلے کہ وہ مکمل کھڑا ہو پاتا، اس کا دایاں بازو مروڑتے ہوئے میں نے اس کی پیٹھ اپنی چھاتی سے لگالی تھی۔

پتھر کے عقب میں چھپا وہ آدمی جس کی کلاشن کوف کو میں نے نشانہ بنایا تھا۔ مجھے اپنے ساتھی کے ساتھ مصروف دیکھ کر اس نے پتھر کے پیچھے سے نکل کر اپنی کلاشن کوف اٹھانا چاہی۔

بائیں ہاتھ سے اپنے اسیر کی کلائی تھامتے ہوئے میں نے دائیں ہاتھ میں پکڑا تیس بور کلاشن کوف کی طرف بڑھنے والے شخص کی طرف سیدھا کیا اور ٹریگر دبا دیا، مگر گولی فائر نہیں ہوئی تھی۔ اس طرح کے مقامی اسلحے کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ بغیر کسی وجہ کے رک جاتا ہے۔ اس وقت مجھے گلگارے کو تحفہ دیے ہوئے گلاک کی سخت کمی محسوس ہوئی تھی۔ اس بے چاری نے تو اصرار بھی کیا تھا کہ میں پستول اپنے ساتھ لے جاؤں۔ مگر اس وقت مجھے کسی ایسی صورت حال میں پھنسنے کا گمان نہیں تھا۔

پستول کو نیچے پھینک کر میں نے اسی لمبے آدمی کو ڈھال کی طرح اپنے سامنے پکڑ لیا۔ اس کے ساتھیوں نے چند ہوائی فائر کیے مجھے نشانہ بنانے کی صورت ان کے اپنے آدمی کو پہلے گولی لگتی۔ پتھر کے چھپے آدمی نے بھی کلاشن کوف اٹھا کر میری جانب تان لی تھی لیکن میرے سامنے ان کا ساتھی ڈھال کی صورت میں موجود تھا۔

ایک ہاتھ سے اس کا مروڑا ہوا بازو پکڑ کر دوسرا بازو میں نے اس کی گردن میں ڈالا اور اسے زبردستی اپنے ساتھ کھینچتا ہوا کلاشن کوف کے قریب پہنچ گیا۔ نیچے جھک کلاشن کوف اٹھانے کی صورت میں وہ میری گرفت سے نکل جاتا۔ میں نے ایک پاؤں سلنگ میں ڈال کر کلاشن کوف کو دھیرے سے زمین سے اٹھایا۔ اس دوران اس نے مچل کر میری گرفت سے نکلنا چاہا۔

اس کے گلے میں ڈالے ہوئے بازو کے پھندے کو مزید کستے ہوئے میں نے اسے خاموش دھمکی دی۔ کسی اکھڑ سے اکھڑ آدمی کو بھی سمجھانے کے لیے زبان سے زیادہ عملی دھمکی کام آتی ہے۔ اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ حرکت کرنا اس کی گردن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ جسم ڈھیلا چھوڑتے ہوئے اس نے تعاون کا اعلان کرتے دیر نہیں کی تھی۔

کلاشن کوف ہاتھ میں آتے ہی میں نے بیرل اس کی پیٹھ سے لگائی اور اس کے گلے سے بازو نکال لیا۔ کلاشن کوف کی سرد بیرل گردن میں پڑے ہوئے بازو سے بھی زیادہ ڈرانے والی تھی۔ وہ میرے سامنے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اس کا دوسرا ساتھی مجھے دھمکیاں دینے لگا۔

''اگر ایک منٹ کے اندر اندر تم غائب نہ ہوئے تو ان دونوں کے ساتھ لیٹے نظر آؤ گے۔'' میں نے زمین پر پڑے زخمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھمکی دی۔ اس نے فوراً ایک بڑے پتھر کے عقب میں آڑ لے لی تھی۔

میرے پاس وقت کم تھا، دیر ہونے کی صورت ان کے مزید ساتھی پہنچ جاتے اور میرا پکڑا جانا یقینی ہو جاتا۔ اس لمبے آدمی کو اپنے سامنے ڈھال کی طرح رکھ کر میں الٹے قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ اس کے ساتھیوں کو میری حکمت عملی سمجھ میں آ گئی تھی۔ انھوں نے مجھے دھمکانے کے لیے تیز فائرنگ شروع کر دی، لیکن ان کی کوئی بھی گولی ان کے ساتھی سے اتصال کیے بغیر مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

درختوں کے جھنڈ میں گھستے ہی میں دشمن کی تمام پارٹیوں کی نظر سے اوجھل ہو گیا تھا۔ اپنے قیدی کو میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھنے کو کہا۔

بغیر کسی لیت و لعل کے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ میں نے فوراً کلاشن کوف کے بٹ سے اس کے سر کی

مضبوطی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار پھر منھ کے بل نیچے گر گیا تھا۔ میں مڑ کر بھاگ پڑا۔ ان کے تعاقب سے پہلے میں وہاں سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ گھنی جھاڑیاں میری کافی مددگار ثابت ہو رہی تھیں۔

دس پندرہ منٹ بعد ہی میرے کانوں میں تیز فائرنگ کی آواز گونجی۔ یقیناً انھوں نے اپنے بے ہوش ساتھی کو تلاش کر لیا تھا۔

غزنی خیل والی لڑائی کے بعد اس جھڑپ کے دوران بھی میں نے پوری کوشش کی تھی کہ شلوبر کے کسی آدمی کو جان سے نہ ماروں۔ کیونکہ میں حتی الوسع کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ نہیں رنگنا چاہتا تھا۔ اور اس کوشش میں مجھے خاطر خواہ کامیابی ہوئی تھی۔ گزشتہ روز سے لے کر اب تک شلوبر کا کوئی آدمی میرے ہاتھوں قتل نہیں ہوا تھا۔ البتہ زخمی ہونے والوں کی تعداد دو درجن کے قریب پہنچ گئی تھی۔

نالے کے درمیان میں درخت موجود نہیں تھے۔ جھاڑیوں کے جھنڈ چونکہ ڈھلان پر تھے اس لیے مجھے ڈھلان پر ترچھا بھاگنا پڑ رہا تھا۔ فرلانگ بھر دور مجھے ان کے چیخنے، چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں نہ جانے وہ کیا حکمت علی تیار کر رہے تھے۔ ان آوازوں پر کان دھرے بغیر میں جھاڑیوں کے درمیان آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ آکسیجن لیول کم ہونے کی وجہ سے میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

دوڑتے دوڑتے میری نظر نالے کے درمیان میں پڑی۔ ان کے نو دس آدمی نالے کے بیچوں بیچ دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کا ارادہ مجھ سے آگے بڑھ کر ان جھاڑیوں کے جنگل کو گھیرنے کا تھا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میں نے چوہے دان میں پھنس جانا تھا۔

ایک دم رک کر میں نے ایسی جگہ پر پوزیشن سنبھالی جہاں سے پورا نالہ میری نظروں کے سامنے تھا، اس کے ساتھ ہی کلاشن کوف کو سنگل راؤنڈ پر سیٹ کرتے ہوئے میں نے سب سے آگے والوں کی ٹانگوں پر شست لے کر مسلسل تین بار ٹریگر دبا دیا۔

دو آدمی منھ کے بل گر کر تڑپنے لگے۔ باقی ایک دم بکھر کے دائیں بائیں پڑے پتھروں کی آڑ میں ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اندازے سے جوابی فائرنگ شروع کر دی۔ دو تین مزید گولیاں ضائع کر کے میں کروٹ تبدیل کرتا ہوا ایک جھاڑی کی آڑ میں پہنچا اور جھکے جھکے وہاں سے آگے بڑھنے لگا۔ انھیں ابھی تک

پتھروں کی آڑ سے نکلنے کی جرّات نہیں ہوئی تھی۔

تھوڑا سا آگے بڑھتے ہی میں کھڑے ہو کر دوڑ پڑا۔ کلومیٹر بھر آگے نالہ دو حصوں میں تقسیم ہو رہا تھا اور ان کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے مجھے اگلے نالے میں پہنچنا تھا۔ کیونکہ جلد ہی انھیں یقین ہو جانا تھا کہ میں آگے بڑھ گیا ہوں اور اس کے بعد وہ تیز رفتاری سے نالہ موڑ تک پہنچ سکتے تھے۔

میرے بائیں بازو میں ہلکی ہلکی جلن اور اچھا خاصا درد ہو رہا تھا۔ یقیناً گولی نے کافی گہری خراش ڈالی تھی۔ اپنے بازو کی جلد پر مجھے خون کی نمی بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ رک کر بازو پر پٹی وغیرہ لپیٹ سکتا۔ بس اطمینان تھا تو اتنا کہ گولی بازو کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکی تھی اور رگڑ کھاتے ہوئے نکل گئی تھی۔

نالے موڑ کے قریب پہنچنے تک میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ کلومیٹر بھر کا فاصلہ جو میدانی علاقے میں دس بارہ منٹ میں آسانی سے طے ہو جاتا ہے اور تھکن بھی محسوس نہیں ہوتی، پہاڑی علاقے میں اس سے دگنا وقت لگا کر بھی اتنا فاصلہ بہ مشکل طے ہو پایا تھا۔ اور اس کے ساتھ میرا سانس یوں پھولا ہوا تھا جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آ رہا ہوں۔

اس جگہ پر تین نالے آ کر اس چوڑے نالے میں مل رہے تھے۔ ایک نالہ دائیں طرف سے، دوسرا بائیں اور ایک نالہ سیدھا آ کر اس چوڑے نالے میں مل رہا تھا۔ مرناہ گر نامی گاؤں کو دایاں نالہ جاتا تھا، لیکن دائیں نالے میں جانے کے لیے مجھے وہ چوڑا نالہ عبور کرنا پڑتا جبکہ دشمن نالے میں موجود تھا اور تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سیدھا جانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا، کہ ایک تو اس نالے میں جھاڑیاں کم نظر آ رہی تھیں دوسرا اس نالے میں جاتے ہوئے میں دشمن کو دور سے نظر آ سکتا تھا۔ سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے میں بائیں طرف کے نالے میں گھس گیا کہ اس وقت میری پہلی ترجیح اپنی جان کو بچانا تھا۔ مرناہ گر گاؤں کو بعد میں بھی ڈھونڈا جا سکتا تھا۔

بائیں نالے میں مڑتے ہی میں نالے کے دائیں کنارے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ایک خاص فرق یہ پڑا تھا کہ اس جگہ سے چڑھائی شروع ہو رہی تھی حالانکہ پہلے میں اترائی میں بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ چڑھائی میں دوڑنا ناممکن تھا، میں تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ جھاڑیوں کے جھنڈ بتدریج اونچائی کی طرف چلے گئے تھے۔ میں

بھی نالے میں سیدھا چلنے کے بجائے ترچھا ہو کر اوپر کی طرف چلنے لگا۔ فرلانگ بھر چلنے کے بعد ہی مجھے عقب میں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔لیکن فائرنگ کا رخ متعین نہیں تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ میرے جانے کی سمت سے آگاہ نہیں تھے اور اندازے ہی سے فائر کر رہے تھے۔اس نالے کے دونوں کناروں پر گھنی جھاڑیوں کے جھنڈ موجود تھے، جبکہ سیدھے نالے میں بھی جھاڑیاں موجود تھیں۔اور وہی جھاڑیاں مجھے چھپنے میں مدد دے رہی تھیں۔

میں نے قدم روکتے ہوئے ایک جھاڑی کی اوٹ سے نالہ موڑ کی جانب نگاہ دوڑائی، وہاں پندرہ بیس کے قریب مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔یقیناً وہ میرے جانے کی سمت کا تعین کر رہے تھے۔ گو وہاں سے مجھے ان کے تیور تو نظر نہیں آ رہے تھے البتہ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ سخت غصے میں تھے۔ وہ مجھے ناکارہ کرنے آئے تھے، اس کے بجائے اپنے تین چار آدمی زخمی کرا بیٹھے تھے۔اور اتنے آدمیوں کے گھیرے سے ایک بندے کا یوں آرام سے نکل جانا انھیں ہضم نہیں ہو رہا تھا۔وہ لمبا آدمی جسے میں نے دو مرتبہ کلاشن کوف کا بٹ مار کر بے ہوش کیا تھا وہ مجھے نمایاں نظر آ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں اب ان کے قابو میں آ جاتا تو اس لمبے نے تو مجھے بغیر وضاحت سنے ہی گولی مار دینا تھی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہوئے آدھے سیدھے جانے والے نالے میں گھس گئے جبکہ بقایا اس نالے میں آ گئے جس میں میں موجود تھا۔البتہ دائیں مڑنے والے نالے کو انھوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔

اسی وقت میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر وہ نیچے ہی نیچے چلتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو مجھے وہیں چھپے ہوئے ان کے آگے نکل جانے کا انتظار کرنا چاہیے، اس کے بعد میں واپس جا کر مرناہ گر جانے والے نالے میں گھس کر خود کو محفوظ کر سکتا تھا۔اس طرح ان کے تعاقب سے بھی میری جان چھوٹ جاتی اور میری منزل بھی کھوٹی نہ ہوتی۔

لیکن جب میں نے اس پارٹی کو مزید تین حصوں میں منقسم ہوتے دیکھا تو مجھے اپنے منصوبے میں ترمیم کرنا پڑی۔ان میں سے چار آدمی نالے کے بائیں کنارے کی طرف بڑھے اور پھیل کر ڈھلان پر چڑھنے لگے۔چار

آدمی دائیں ڈھلان پر چڑھنے لگے کہ جس جانب میں چھپا ہوا تھا۔ جبکہ باقی نالے کی تہہ میں آگے بڑھنے لگے۔

اس کے ساتھ دوسری پارٹی کے آدمی جو سیدھے نالے میں گھسے تھے انھوں نے اپنے تین آدمی نالہ موڑ ہی پر چھوڑ دیے تھے۔ گویا میں کسی طرح اپنی تلاش میں آنے والوں کی نظر میں آنے سے بچ بھی جاتا تب بھی واپس نہیں جا سکتا تھا۔

اپنے منصوبے پر مٹی ڈالتے ہوئے میں جھاڑیوں کی آڑ میں آگے بڑھنے لگا۔ ان کی نظروں میں آنے سے بچنے کے لیے مجھے اپنی رفتار کم کرنا پڑی تھی۔ اب آگے بڑھنے کے بجائے میں اوپر چڑھنے پر زیادہ توجہ دے رہا تھا۔ پچاس ساٹھ گز چلنے کے بعد ایک دم چلغوزے کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، ان درختوں کی وجہ سے میں زیادہ تیزی سے سفر کر سکتا تھا، کیونکہ اب کھڑا ہونے کے باوجود میں دور سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔

اس پہاڑی کی بلندی اتنی زیادہ نہیں تھی جلد ہی میں چوٹی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ چوٹی سے پچاس ساٹھ گز نیچے ہی درختوں کا سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔ پہلے تو میں نے خطرے سے بچنے کا سوچا اور انھی درختوں کے اندر رہتے ہوئے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا، مگر پھر مجھے خیال آیا کہ دشمن کے بلندی پر پہنچنے کی صورت میں میں دونوں جانب سے گھیرے میں آ جاتا اور اس وقت کسی کی بھی نظر مجھ پر پڑ جاتی تو میرا وہاں سے بچ نکلنا مشکل ہو جاتا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے محتاط انداز میں بلندی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ چھدری چھدری جھاڑیوں اور اکادکا پتھریلی چٹانوں کی آڑ لیتا ہوا میں حتی الوسع کوشش کر رہا تھا کہ کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے۔ بدقسمتی یہ تھی کہ صبح سویرے ہی مجھے دشمن کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا اس وجہ سے دن گزرنے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر اندھیرا چھا جاتا تو مجھے مزید سہولت مل جانا تھی۔ پھر میں دور سے کسی کو نظر نہ آتا اور اس اندھیرے میں پہاڑی علاقے میں ایک آدمی کو تلاش کرنا کسی بڑے اتفاق ہی کے مرہون منت ہو سکتا تھا۔ اور عموماً ایسے اتفاقات ظہور پذیر نہیں ہوا کرتے۔

لیکن اندھیرا چھانے میں ابھی آدھے دن سے زیادہ وقت پڑا تھا۔ اور اتنی دیر ان موذیوں کی نظروں سے بچ کر حرکت کرنا نہایت دشوار تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ یہاں کے مقامی تھے سارا علاقہ ان کا دیکھا بھالا تھا۔ وہ مجھ سے زیادہ تیزی سے ان پہاڑوں میں سفر کر سکتے تھے اور انھیں سانس کا مسئلہ بھی میدانی علاقوں کے لوگوں کی نسبت کم پیش آتا تھا۔

میں اپنا سفری تھیلا بھی پیچھے ہی پھینک آیا تھا۔اب میرے پاس جیبوں میں موجود نقدی، پنڈلی سے بندھے خنجر اور کلاشن کوف کے علاوہ ضرورت کا کوئی سامان باقی نہیں بچا تھا۔کلاشن کا ایمونیشن بھی تھیلے ہی میں رہ گیا تھا۔شلوبر قبیلے سے فائرنگ کا تبادلہ ہونے کی صورت میں میں چند گولیوں سے کب تک ان کی پیش قدمی روک پاتا۔ وہ کافی طویل پہاڑی تھی ۔اور اوپر پہنچ کر میں کافی تیزی سے حرکت کر کے کسی مناسب نالے یا دوسری پہاڑی کا رخ کرسکتا تھا۔اور جتنا زیادہ میں دور ہوتا جاتا میری تلاش میں آنے والوں کا ایک دوسرے سے فاصلہ بڑھتا جاتا۔اس فائدہ یہ ہوتا کہ اگر اتفاقاً کوئی پارٹی مجھ سے ٹکرا بھی جاتی تو دوسرے اس کی مدد کو بروقت نہیں پہنچ سکتے تھے۔اور اتنا موم کا پتلا میں بھی نہیں تھا کہ تین چار آدمیوں کے قابو میں آجاتا۔

میں محتاط انداز میں حرکت کرتا ہوا دھیرے دھیرے سے چوٹی کے قریب پہنچتا جا رہا تھا۔ایک گھنی جھاڑی کے قریب پہنچ کر میں لمحہ بھر سانس لینے کو رکا، وہاں سے چوٹی تک پندرہ بیس قدم کا فاصلہ باقی تھا لیکن رستے میں کوئی نظری آڑ میسر نہیں تھی جس کا سہارا لے کر میں اوپر پہنچ سکتا۔لیکن بلندی پر پہنچنا بھی ضروری تھا اس لیے خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔نالے کی طرف نظر دوڑانے پر مجھے کوئی نظر نہ آیا کہ وہاں سے نہ تو نالے کی تہہ نظر آتی تھی اور نہ نالے میں موجود کوئی شخص اس جگہ کو دیکھ سکتا تھا۔البتہ میرے پیچھے ڈھلان چڑھنے والے افراد مجھے دیکھ سکتے تھے، اسی طرف نالے کے دوسرے کنارے پر ڈھلان چڑھنے والوں کی نظر بھی اس جانب اٹھ جاتی تو انھیں میں نظر آسکتا تھا، کیونکہ نالے کی چوڑائی اتنی زیادہ نہیں تھی۔دل ہی دل میں خدا کو یاد کرتے ہوئے میں نے اوپر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ تھوڑا سا فاصلہ میں نے دوڑ کر طے کرنے کی کوشش کی تھی۔ گو بلندی پر دوڑنا قریباً ناممکن ہوتا ہے کہ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس پھولنے تو کیا اکھڑنے لگتا ہے،لیکن چند قدم لینے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔اور پھر میں اوپر پہنچ کر ایک پتھر کی آڑ لینے ہی والا تھا کہ مخالف پہاڑی کی طرف سے تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری اور بلاشک وشبہ اس فائرنگ کا نشانہ میری ذات تھی۔بالکل آخری لمحات میں میں دیکھ لیا گیا تھا بہ قول شاعر......

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

گولی چلانے والا کا نشانہ خطا جانے کے باوجود میرا مقصد پورا نہیں پایا تھا۔نظر آ کر میں نے ایک بار پھر انھیں ہدف مہیا کر کے اپنے گرد گھیرا ڈالنے کا موقع دے دیا تھا۔ بہ ہر حال میرے پاس سوگ منانے یا سر پیٹنے کا وقت نہیں تھا۔ دوسری جانب اترنے کے بجائے میں نے بلندی پر ہی آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ پہاڑی پانچ چھے سو گز طویل تھی ۔اس کا رخ قریباً جنوب مغرب بن رہا تھا۔ فائرنگ کی آواز تواتر سے آنا شروع ہو گئی تھی۔ گو اب میں ان کی نظروں سے اوجھل تھا لیکن ان کی فائرنگ کے باعث دائیں بائیں پھرنے والی تمام پارٹیاں اس جانب متوجہ ہو گئی تھیں ۔اس کے ساتھ لازمی بات ہے انھوں نے یہ بات مخابرے پر بھی دوسری پارٹیوں کو بتا دی ہوگی۔ تھکن محسوس کرنے کے باوجود میری ٹانگوں میں بجلی بھر گئی تھی اور میں جلد از جلد وہاں سے دور ہو کر کسی ایسی جگہ پہنچنا چاہتا تھا جہاں میری تلاش کے لیے انھیں دوبارہ منتشر ہونا پڑ جاتا۔ بائیں جانب موجود نالا اس پہاڑی کے ساتھ ساتھ جنوب مغرب کی جانب مڑ رہا تھا، یقیناً نالے کی تہہ میں موجود آدمیوں نے سامنے کی طرف آ کر مجھے پکڑنے کی کوشش کرنا تھی۔ البتہ اس پہاڑی کے دائیں جانب جو دو تین نالے لگ رہے تھے میں ان میں سے کسی نالے میں اتر سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ ایک نالا چھوڑ کر دوسرے کے نظر آتے ہی میں ڈھلان اترنے لگا۔ اب میرے قدموں میں پہلے سے زیادہ تیزی آ گئی تھی۔ میں بہ مشکل ایک تہائی ڈھلان اتر پایا تھا کہ مجھے عقب میں فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ وہ چاروں آدمی جو میرے پیچھے پیچھے اس ڈھلان پر چڑھ رہے تھے یہ معلوم ہوتے ہی کہ میں بلندی پر ہوں انھیں نے اوپر پہنچتے ہوئے دیر نہیں لگائی تھی۔ بہ ہر حال ابھی تک وہ مجھ سے دور تھے اور اتنے فاصلے سے وہ مجھے نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔اپنے قدموں میں مزید تیزی لاتے ہوئے میں حتی الوسع کسی آڑ کو اپنے عقب میں رکھ کر آگے بڑھتا گیا۔نالے میں اترنے کے بعد ہی میں اگلی چڑھائی چڑھ سکتا تھا جونھی میں نالے میں اترا ایک مرتبہ پھر عقب میں فائر کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ مجھے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ سامنے کی پہاڑی پر زیادہ درخت نہیں تھے لیکن اس پر چڑھنے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ نیچے اترتے وقت ایک اور پریشان کن بات میرے مشاہدے میں آئی تھی، کہ جس نالے میں میں اترا تھا وہ اس سیدھے نالے سے ٹکرا رہا تھا جہاں شلوبر قبیلے والوں کی دوسری پارٹی میری تلاش میں گئی تھی۔اس لیے بجائے نالے میں آگے بڑھنے کے میرا بلندی پر پہنچنا ضروری تھا۔

دوڑتے دوڑتے میں یہ سب کچھ طے کر چکا تھا،اس لیے نالے میں رکنے کے بہ بجائے میں نے بلندی کا سفر شروع کر دیا تھا۔ایک بار پھر میرا سانس پھولنے لگا تھا لیکن وہ وقت سانس بحال کرنے کا نہیں تھا۔غزنی خیل قبیلے کے ساتھ ہمدردی کرنا مجھے کچھ زیادہ ہی مہنگا پڑ رہا تھا۔شلوبر قبیلے والے غزنی خیلوں پر آیا ہوا غصہ مجھ پر نکال رہے تھے۔یا شاید ان کی نگاہ میں میرا قصور نا قابل معافی تھا۔حالانکہ اپنے تیئں میں نے ان کے کسی آدمی کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا تھا، ورنہ بازو یا ٹانگ پر لگنے والی گولی کو سر میں مارنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

میری کوشش یہ تھی کہ کسی چٹان، جھاڑی یا درخت وغیرہ کی آڑ لے کر چلوں۔ان کے نالے میں اترنے تک میں کلاشن کوف کی کارگر رینج سے دور نکل جانا چاہتا تھا ورنہ نالے میں کھڑے ہو کر وہ مجھے آسانی سے نشانہ بنا لیتے۔(ویسے ایک بات میں قارئین کی معلومات کے لیے پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ اونچائی اور نشیب میں فائر کرتے وقت کسی بھی ہتھیار کی کارگر رینج بڑھ جایا کرتی ہے، لیکن یہ سنائپروں کا طریقہ کار ہے اور یہ حساب ایک کلیے کے تحت کیا جاتا ہے، عام آدمی اس بات سے واقف نہیں ہوتا ہے)

پوری کوشش کے باوجود میں مطلوبہ بلندی تک نہیں پہنچ پایا تھا کہ وہ بھاگتے ہوئے نیچے آ رہے تھے۔میں بہ مشکل دو سو میٹر اوپر پہنچا ہوں گا کہ انھوں نے نالے میں پہنچ کر فائرنگ شروع کر دی۔

فائر کی آواز کانوں میں پڑتے ہی میں فوراََ نیچے لیٹا اور ایک قریب پتھر کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ کے لیے تیار ہو گیا۔وہ چاروں بغیر کسی آڑ کا سہارا لیے نالے درمیان میں کھڑے تھے۔میری کلاشن کوف کا سیفٹی لیور سنگل راؤنڈ پر سیٹ تھا۔مطلوبہ رینج لگا کر میں نے شست لے کر درمیانی آدمی کی ٹانگوں کو نشانہ بنانے لگا۔یوں بھی ان کے رکے ہونے کی وجہ سے وہ آسان ہدف کی صورت اختیار کر گئے تھے۔لبلبی دباتے ہی مذکورہ آدمی نیچے گر گیا تھا ۔اس کے ساتھ ہی باقی آڑ کی تلاش میں پہاڑی کی جڑ کی طرف بھاگے۔ان کے چھپنے کا تماشا دیکھنے کے بجائے میں بلندی پر چڑھنے لگا۔پہاڑی کی جڑ میں چھپنے کی وجہ سے میں بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔اور جلد ہی انھیں اس بات کا احساس ہو جانا تھا۔ اور میرے گمان کے مطابق تھوڑی دیر بعد ہی ان کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔وہ نالے کے دوسرے کنارے پر جا کر کسی پتھر وغیرہ کی آڑ لے کر فائرنگ کر رہے تھے۔اتنی دیر میں میں مزید دور ہو گیا تھا۔دائیں بائیں پڑے پتھروں سے ٹکرانے والی گولیوں نے مجھے فوراََ ہی یہ باور کرا دیا تھا کہ

میں اب تک ان کی رینج ہی میں تھا۔
ایک مرتبہ پھر مناسب آڑ کے پیچھے لیٹ کر میں ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ زخمی آدمی اب تک اسی جگہ پر موجود تھا۔ زمین پر بیٹھ کر وہ اپنی ٹانگ پر کپڑا لپیٹ رہا تھا کیونکہ خون کے بہاؤ کو روکنے کے لیے یہ کام نہایت ضروری تھا۔ میں اگر چاہتا تو آسانی سے اس کا عدم آباد کا ٹکٹ کٹوا سکتا تھا، لیکن اب تک میں انھیں جان سے مارنے سے گریز کر رہا تھا۔
میں نے فائر کرنے والوں کی پوزیشنوں کا جائزہ لیا دو آدمی آڑ کے اوپر سے فائر کر رہے تھے اور ان کے سر میں گولی مارنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ تیسرا آدمی پتھر کی آڑ کی دائیں جانب سے فائر پر شروع تھا۔ میں نے اسی کے کندھے پر نشانہ سادھ کر فائر کر دیا۔ اس کی چیخ سنتے ہی باقی دونوں مکمل طور پر پتھر کے پیچھے چھپ گئے تھے۔
میں وقت ضائع کیے بغیر دوبارہ اوپر چڑھنے لگا۔ اس مرتبہ مجھے نشانہ بنانے کے بجائے وہ اپنے ساتھیوں کو سنبھالنے لگے۔ اس دوران میں ان کی رینج سے نکل گیا تھا۔ بلندی پر پہنچتے ہی میں نے دو تین منٹ رک کر سانس سیدھا کیا اور پھر ایک طرف کو بڑھ گیا۔
دشمن نے اوپر چڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چار میں سے دو زخمی ہو گئے تھے اور زخمی ساتھیوں کو اکیلا چھوڑ کر انھوں نے میرا تعاقب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انھوں نے ریڈیو سیٹ کے ذریعے اپنے دوسرے ساتھیوں کو وہاں بلا لیا ہو۔ میری بلا سے کوئی وجہ بھی تھی مجھے جلد از جلد وہاں سے دور نکلنا تھا۔ بیٹھے بٹھائے مفت کی مصیبت گلے پڑ گئی تھی۔ نہ روشن خان مجھے اس دن سیلاب خان کے پاس لے جاتا اور نہ میرا سفر کھوٹا ہوتا۔ اس ہنگامے میں پھنسنے پر اگر میرا کوئی فائدہ ہوا تھا تو بس اتنا کہ نوشاد گل کے ذریعے مجھے تھوڑی بہت معلومات مل گئی تھی۔ وہ بھی ادھوری سی کہ وہ ٹریسی اور البرٹ بروک کے ساتھ ایک بار غزنی خیل گیا تھا۔ اب نامعلوم وہ مستقل وہیں رہتے تھے یا ایک بار ہی کسی وجہ سے وہاں گئے تھے۔ خیر کچھ بھی تھا اب مجھے ایک بار تو غزنی تک جانا تھا۔ اگر البرٹ مجھے وہاں نہ بھی ملتا تب بھی شاید اس کے بارے کوئی ہلکا سا سراغ مل جاتا۔ البرٹ سے بھی بڑھ کر مجھے میجر جینیفر ہنڈسلے کو تلاش کرنا تھا۔ قوی امید تھی کہ اس معاملے میں وہ میری مدد ضرور کرتی۔ گو اس بارے وہ گزشتہ ملاقات میں سرسری سی معذرت کر چکی تھی، مگر اس وقت میں نے اس پر اتنا زور بھی نہیں دیا تھا

۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ واپس لوٹ چکی ہوتی۔ بہ ہر حال یہ بعد کی باتیں تھیں اس وقت تو مجھے جان بچانے کا مشکل مرحلہ در پیش تھا۔ شلو بر قبیلے کے لوگ پیر تسمہ پا کی طرح میرے پیچھے پڑے تھے۔ میرے تعاقب میں آنے والے گو اس پہاڑی کے نیچے ہی رک گئے تھے مگر ابھی تک میں خطرے کی حدود سے نہیں نکلا تھا۔

پہاڑی آگے جا کر ایک دوسرے بلند پہاڑ سے مل رہی تھی، درمیان میں کوئی نالہ وغیرہ بھی نہیں تھا۔ دوسری پہاڑی کی انتہائی بلندی پر مجھے برف کی سفیدی نظر آ رہی تھی ۔ میرے پاؤں میں اس وقت سپورٹس شوز تھے، گلگارے کے والد شمریز خان کے بوٹ میرے سفری تھیلے ہی میں رہ گئے تھے۔ ایک بار تو میں نے اوپر نہ چڑھنے کا سوچا، کیونکہ برف کی وجہ سے اپنے ساتھ پیش آنے والا حادثہ مجھے بھولا نہیں تھا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ۔

''میں نے کون سا وہاں رہنا ہے، اس بلندی کو عبور کر کے آگے گزر جاؤں گا۔''

یہ سوچتے ہی میرے قدم ایک بار پھر بلندی کی جانب بڑھ گئے۔ کافی مشکل چڑھائی تھی۔ مجھے صبح سے مسلسل کبھی دوڑنا پڑ رہا تھا اور کبھی چڑھائیاں چڑھنا پڑ رہا تھا۔ ایسی صورت میں تھکن ہونا اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ البتہ میں ایسے حالات میں جینا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ابھی تک مجھ میں کافی جان موجود تھی اور میں اتنا نہیں تھکا تھا کہ گر پڑتا۔

وہاں نصف بلندی تک درخت موجود تھے۔ جوں جوں میں بلند ہوتا گیا تیز ہوا کے ساتھ سردی بھی بڑھتی گئی۔ گو چڑھائی چڑھتے ہوئے زیادہ مشقت کی وجہ سے پسینہ آجاتا ہے اور سردی کم ہی لگتی ہے، مگر انسان کو سردی کے بڑھ جانے کا احساس ضرور ہو جاتا ہے۔

گھڑی دیکھنے پر سوئیاں ایک کا ہندسہ عبور کرتی نظر آئیں۔ مجھے دوڑتے، بھاگتے، نشیب و فراز عبور کرتے قریباً ساڑھے پانچ گھنٹے ہو رہے تھے۔ کیونکہ غزنی خیل سے میں صبح آٹھ بجے کے قریب روانہ ہوا تھا۔

مزید آدھے گھنٹے بعد میں اوپر پہنچ گیا تھا۔ چند لمحے میں سستانے بیٹھا لیکن ٹھنڈی ہوا میرا مزاج پوچھنے لگی تھی۔ آرام کا ارادہ ترک کرتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا۔ دوسری جانب نیچے اترنے سے پہلے میں نے پیچھے مڑ کر نگاہ دوڑائی، حد نگاہ تک پہاڑی سلسلے نظر آ رہے تھے۔ میرے پاس دوربین موجود نہیں تھی ورنہ میں اپنے دوستوں کی حرکت دیکھنے کی کوشش ضرور کرتا۔

نیچے اترتے وقت میری رفتار کافی تیز تھی۔ بیس پچیس منٹ میں میں دوسری جانب موجود نالے میں پہنچ گیا تھا۔ نالے میں بہتا پانی دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ صبح سے میں پانی نہیں پی سکا تھا۔ ہاتھوں کا اوک بنا کر میں چھوٹے بڑے پتھروں کے درمیان جاری شفاف پانی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ خوب سیر ہو کر ٹھنڈا پانی پینے کے بعد میں نالے ہی نالے میں آگے بڑھ گیا۔ بلندی پر چلنے والی تیز ہوا وہاں بالکل ہلکی ہلکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نالے کا رخ جنوب مغرب کی طرف تھا۔ نالے کے بائیں کنارے پر جھاڑیوں کا گھنا جھنڈ تھا جو بلندی کی طرف بتدریج چھدرا چھدرا ہوتا گیا تھا۔ البتہ دائیں جانب اکا دکا جھاڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ اپنے جسم کو آرام پہنچانے کے لیے میں مناسب رفتار سے چل رہا تھا۔ لیکن سکون شاید میری قسمت میں نہیں تھا۔ میں نالے موڑ سے سوڈیڑھ سو گز ہی دور تھا کہ مجھے چھ سات آدمی موڑ مڑ کر اس جانب آتے دکھائی دیے۔ ٹھٹک کر رکتے ہوئے میں نے فوراً قریبی جھاڑی کی آڑ لی، مگر میری تیزی کسی کام نہیں آئی تھی۔ انھوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور بغیر سیکنڈ ضائع کیے انھوں نے کلاشن کوفوں کا رخ میری جانب کرتے ہوئے فائر کھول دیا۔

ایک بار پھر میری دوڑ شروع ہو گئی تھی۔ چڑھائیاں سر کرنا اس دن میرے نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔ میں جھاڑیوں کی آڑ لے کر اوپر چڑھنے لگا۔ کندھے سے لٹکی ہوئی کلاشن کوف میں نے ہاتھوں میں پکڑ لی تھی۔ اگر وہ اسی طرح دوڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے تو مجھے جلد ہی آ لیتے۔ یہ سوچتے ہی میں نے رکتے ہوئے ان کی پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنے کی خاطر تین چار گولیاں فائر کر دیں۔ اپنے زخمی ساتھی انھیں بھولے نہیں تھے۔ وہ فوراً پتھروں کی آڑ لے کر جوابی فائرنگ کرنے لگے۔ میرے پاس ایمونیشن نہ ہونے کے برابر تھا، میں ان کے ہر فائر کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے مزید گولیوں کی بچت کرتے ہوئے میں نے فائر بند کیا اور جھاڑیوں کی آڑ لے کر اوپر چڑھنے لگا۔

جیسے ہی ان کی طرف سے فائرنگ رکی میں جھاڑیوں کی آڑ سے نکل کر ایک پتھر پیچھے لیٹا اور نالے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگے تھے۔ انھیں چند قدم لینے دینے کے بعد میں نے ایک گولی فائر کی لیکن جس جگہ سے میں فائر کر رہا تھا وہاں سے لیٹ کر انھیں نشانہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ البتہ گولی چلنے کی آواز نے انھیں بدحواس ہو کر لیٹنے پر ضرور مجبور کر دیا تھا۔ امید تھی کہ وہ اتنی جلدی اٹھنے کی ہمت نہ کرتے۔ البتہ لیٹے لیٹے

انھوں نے فائر ضرور کھول دیا تھا۔

میں نے رینگتے ہوئے قریبی جھاڑی کی آڑ لی اور اور ایک بار پھر اوپر چڑھنے لگا۔ یہ ایک طویل اور لمبی ڈھلان تھی جو بتدریج اوپر کو اٹھتی گئی تھی۔ نقشہ بینی کی اصطلاحات میں ایسی ڈھلان کو پہاڑ کا بازو کہتے ہیں یعنی پہاڑ کی وہ شاخ جس کی بلندی بتدریج کم ہو کر زمین سے مل جائے۔

بیس پچیس قدم اوپر جاتے ہی مڑ کر دیکھنے پر وہ مجھے حرکت کرتے نظر آئے، مگر اب وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچ چکے تھے اور میرے گولی فائر کرنے پر وہ زمین پر لیٹ کر آڑ لینے کے بجائے جھاڑیوں کی آڑ لینے کی کوشش کرتے۔ میں نے گولی ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور قدموں میں تیزی پیدا کر دی۔ یقیناً جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہی انھوں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دینا تھی۔ مقامی ہونے کی وجہ سے وہ مجھ سے زیادہ تیز رفتاری سے پہاڑی چڑھ سکتے تھے۔ مگر میری مثال اس وقت ایسے ہرن کی سی ہو گئی تھی جو جان بچانے کے خوف میں وہ چوڑی کھائی بھی پھلانگ جاتا ہے جسے اس کا تعاقب کرنے والا طاقتور شیر عبور نہیں کر سکتا۔

اکا دکا فائر کی میرے کانوں میں تسلسل سے آرہی تھی۔ یقیناً وہ گھنی جھاڑیوں کو فائر کے ذریعے چھان رہے تھے۔ کسی جھاڑی میں چھپنے کی تجویز بھی میرے زیرِ غور تھی لیکن ان کے گھنی جھاڑیوں پر فائر کرنے نے مجھے اس تجویز پر عمل کرنے سے باز رکھا تھا۔

مختلف مقامات سے اٹھنے والی فائروں کی آواز سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ وہ پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے۔ جھاڑیوں کا جھنڈ زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں نبھا سکتا تھا۔ میں اسی صورت میں بچ سکتا تھا کہ ان کے جھاڑیوں کے جنگل سے نکلنے سے پہلے بلندی پر پہنچ جاتا۔

جلد ہی میں ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے آگے اکا دکا جھاڑیاں ہی نظر آرہی تھیں۔ میں نے رفتار مزید تیز کر دی، مگر میں زیادہ دیر اپنی رفتار برقرار نہیں رکھ پایا تھا۔ میرا دل جیسے حلق کے رستے باہر آنے کو تیار ہو گیا تھا۔ مجبوراً مجھے بھاگنا ترک کرنا پڑا۔ لمحہ بھر رک کر میں نے اپنے سانس بحال کیے اور پھر تیز قدموں سے اوپر چڑھنے لگا۔ میں بہ مشکل سو ایک سو بیس گز ہی اوپر پہنچا ہوں گا کہ ایک مرتبہ پھر تیز فائرنگ کی آواز گونجی۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک بڑا پتھر پڑا تھا۔ اس کی آڑ لینے کے لیے میں نے رفتار بڑھائی مگر اس سے پہلے ہی مجھے یوں لگا جیسے

میری دائیں ران میں کوئی گرم انگارہ گھس گیا ہو۔ میں منھ کے بل نیچے گرا۔ اپنے ہاتھ سامنے ٹیکتے ہوئے میں نے خود کو زیادہ زخمی ہونے سے بچالیا تھا۔ وہاں سے رینگتے ہوئے پتھر تک جانا ناممکن تھا۔ کوشش کر کے میں سیدھا ہوا اور جھک کر پتھر کی جانب بڑھا۔ میری دائیں ٹانگ سے بڑی تیزی سے خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ پتھر کے قریب پہنچنے تک مجھے ایک اور جھٹکا لگا، اس مرتبہ گولی میری دائیں پنڈلی کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ بائیں پاؤں پر زور دیتے ہوئے میں نے ایک جھٹکا لیا اور پتھر کے پیچھے پہنچ گیا۔

آڑ میں جاتے ہی میں نے بغیر وقت ضائع کیے گلے سے لپٹا مفلر کھول کر اپنی ران پر لپیٹنے لگا۔ گولی ران کے اندر ہی رہ گئی تھی۔ مگر اس وقت گولی نکالنے سے زیادہ خون کے بہاؤ کو روکنا ضروری تھا۔ ران پر کس کر مفلر لپیٹنے کے بعد میں نے خنجر نکال کر اپنی قمیص کا دامن پھاڑا اور اسے دو ٹکڑوں میں بانٹ کر پٹی کی شکل دیتے ہوئے پنڈلی پر لپیٹنے لگا۔

پہلے پہل گولی کا زخم اتنی تکلیف نہیں دیتا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زخم میں درد اور جلن بڑھتی جاتی ہے۔ خاص کر جس زخم میں گولی اندر ہی رہ جائے وہ زیادہ تکلیف دیتا ہے۔

دونوں زخموں پر پٹی باندھنے کے بعد میں نیچے کی طرف متوجہ ہوا۔ یقیناً دشمن کو معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے گولی لگ چکی ہے۔ تین آدمی بڑی تیز رفتاری سے اوپر کی جانب بڑھتے نظر آئے۔ سب سے آگے والے کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے میں سانس روکا اور ٹریگر دبا دیا...... بس بہت رعایت ہو گئی تھی۔ میری جان چھوڑنے پر وہ یوں بھی آمادہ نہیں ہو رہے تھے، یہاں تک کہ اب تو سچ مچ مجھے جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ اچھل کر پیچھے کو الٹا اور نیچے لڑھکنے لگا۔ اس ساتھ آنے والے فوراً نیچے لیٹ گئے اس کے ساتھ انھوں نے موسلا دھار فائر کھول دیا۔ میں اس پتھر کے پیچھے محفوظ تھا۔ البتہ ان کی گولیوں سے بچنے کے لیے مجھے اپنا سر بھی آڑ کے پیچھے کرنا پڑ گیا تھا۔ دونوں نے پوری پوری میگزین ہی خالی کر دی تھی۔ جوں ہی ان کا فائر رکا میں نے اس پتھر کے دائیں جانب سے کلاشن کوف کا دہانہ نکال کر شست سادھ لی۔ ایک آدمی کو تو پتھر کی آڑ مل گئی تھی دوسرا یوں ہی لیٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس نے یہ بے وقوفی بھی کی تھی کہ کہنیاں ٹیک کر درست فائر کرنے کے لیے اپنا سر زمین سے بلند کیا ہوا تھا۔ ان کی دو میگزینوں کے جواب میں میں نے ایک اور گولی فائر کر دی۔ ہدف نے اٹھا ہوا سر اپنی کلاشن کوف پر ٹیک

دیا۔ ماتھے میں پیوست ہونے والی گولی نے اسے زیادہ تڑپنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

اتنی دیر میں پتھر کے پیچھے آڑ لیے ہوئے آدمی نے میگزین تبدیل کر لی تھی۔ اپنے ساتھی کا انجام دیکھتے ہی بدحواسی میں اس نے ایک بار پھر ٹریگر یوں دبایا کہ انگلی اٹھانا اسے بھول گیا تھا۔ میگزین زیادہ دیر تک گولیاں فراہم نہیں کر سکی تھی۔ برسٹ کی صورت فائر ہونے والی تیس گولیاں ختم ہونے میں وقت ہی کتنا صرف ہوتا ہے۔ زیادہ تر گولیاں اس پتھر سے ٹکرائی تھیں جو مجھے آڑ مہیا کیے ہوئے تھا۔ کچھ دائیں بائیں زمین میں لگ کر گرد اڑانے کا سبب بنی تھیں۔

میں اس کے فائر کے رکنے کا منتظر رہا۔ جونھی اس کا فائر رکا میں ایک بار پھر پتھر کی آڑ کے دائیں جانب سے اس طرف جھانکنے لگا۔ (قارئین یہ بات یاد رکھیں کہ دائیں ہاتھ سے فائر کرنے والے فائرر کے لیے کسی بھی آڑ کی دائیں طرف کا استعمال ہی مناسب رہتا ہے، کیونکہ آڑ کی بائیں جانب کا استعمال کرنے کی صورت میں اس کا زیادہ جسم دشمن کو نظر آ سکتا ہے)

وہ پتھر کے عقب میں بے حس لیٹا تھا۔ میرے خیال میں وہ میگزین تبدیل کر رہا تھا۔ مگر منٹ بھر بعد بھی جب اس کی جانب سے فائر نہ ہوا تو مجھے شک ہونے لگا کہ اس کے پاس گولیاں ختم ہو چکی ہیں۔

اسی وقت مجھے درختوں کے جھنڈ سے ان کے باقی چار ساتھی آگے بڑھتے نظر آئے۔ یقیناً وہ اپنے ساتھیوں کے انجام سے بے خبر تھے تبھی تو یوں بے فکری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ بھی چونکہ میری طرف متوجہ تھا اس لیے اسے بھی اپنے ساتھی نظر نہیں آئے تھے ورنہ وہ انھیں ضرور متنبہ کرتا۔ میں نے فوراً کلاشن کوف کی بیرل کا رخ آنے والوں کی طرف موڑا، میرا ارادہ کم از کم دو آدمیوں کو نشانہ بنانے کا تھا۔ درمیان والے آدمی کے سر کا نشانہ لیتے ہوئے میں نے لبلبی دبائی، اپنے پہلے ساتھی کی طرح وہ اچھل کر پیچھے گرا تھا۔ باقی تینوں نے فوراً آڑ لینے کی کوشش کی لیکن اتنی دیر میں میں ایک اور بار ٹریگر دبا چکا تھا۔ ان کا چوتھا آدمی بھی مجھے مارنے کی حسرت لیے پہلے والے تین کے پاس پہنچ چکا تھا۔ کلاشن کوف کے آٹو میٹک ہونے نے میرے کام کو آسان بنا دیا تھا۔

بچنے والے دونوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ ان کے اضطراری فائر سے گھبرا کر ان کے آگے لیٹے ہوا ساتھی گھبرا کر با آواز بلند انھیں فائر سے منع کرنے لگا۔ کیونکہ وہ ان کے اور میرے درمیان میں لیٹا ہوا تھا۔ انھیں

منع کرتے کرتے وہ اس پتھر کی اونچائی کا حساب نہیں رکھ پایا تھا جس کے پیچھے وہ چھپا ہوا تھا۔اس کی کھوپڑی کا عقبی حصہ پتھر کے اوپر سے جھلکا اور مجھے بس اتنا ہی ہدف درکار تھا۔سوگز سے چلائی ہوئی کلاشن کوف کی طاقتور گولی نے کھوپڑی کے عقب سے گھس کر اسے دنیا کی ہر فکر اور اندیشے سے دور کر دیا تھا۔

مرنے سے پہلے اس نے بچنے والوں دونوں ساتھیوں کو مرنے والوں کے انجام سے باخبر کر دیا تھا۔بلکہ ان دونوں نے بھی دیکھ لیا تھا ٹانگوں اور بازوؤں میں لگنے والی گولیاں اب سر اور ماتھے میں پیوست ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

اچانک ان میں سے ایک آدمی نے اٹھ کر نیچے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔یقیناً وہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔لیکن اب چاہے وہ خوفزدہ ہو کر، چاہے کسی مقصد سے بھاگتے میں انھیں رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔وہ بہ مشکل تین قدم ہی لے پایا تھا۔اس سے آگے گولی نے اسے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔اس کے تڑپتے ہوئے جسم کو ایک بڑے پتھر نے نیچے لڑھکنے سے روکا تھا۔

اب ہم دو بچ گئے تھے۔ممکن تھا کہ اسے مزید ساتھیوں کی کمک مل جاتی ،مگر فی الحال وہ بھی اکیلا تھا۔اپنے آخری ساتھی کے ہلاک ہوتے ہی اس نے بھی اپنی کلاشن کوف کو برسٹ پر سیٹ کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے برسٹ میری جانب فائر کرنے لگا۔مجبوراً مجھے پتھر کے پیچھے سر چھپانا پڑا۔

اچانک اس کے فائر سے مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کھڑا ہو گیا ہو۔اس کے ساتھ ہی اس کا فائر آہستہ آہستہ دور ہٹنے لگا۔یقیناً وہ بھاگنے کی کوشش میں تھا۔اور اس مقصد کے لیے وہ مجھے سر اٹھانے نہیں دینا چاہتا تھا۔وہ ہر برسٹ تین چار گولیوں کا فائر کر رہا تھا۔میں اس کے فائر ہونے والے برسٹ گننے لگا۔ساتویں اٹھویں برسٹ پر میں نے رسک لیتے ہوئے پتھر سے جھانکا۔وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیکے نئی میگزین لگا رہا تھا۔اگر مجھے پتھر سے جھانکنے میں دو سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ دوبارہ فائر شروع کر چکا ہوتا۔جب میں نے جھانکا اس وقت وہ کلاشن کوف کو کاک کر رہا تھا۔جبکہ میری کلاشن کوف پہلے سے کاک تھی اور یقیناً وہ مجھ سے تیز رفتار فائر نہیں تھا۔نئی میگزین سے گولی چلانے کی حسرت دل میں لیے وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملا تھا۔

آخری دشمن کے مرتے ہی میں نے اپنا سر پتھر پر ٹیک دیا تھا۔ایک دم مجھے اپنے زخموں میں ہونے والی

تکلیف کا احساس ہونے لگا۔ مجھے نہایت ناگفتہ بہ صورت حال کا سامنا تھا۔ میری دائیں ٹانگ میں دو گولیاں لگی تھیں ۔ پٹی باندھنے کے باوجود خون رس رہا تھا۔ اور پوری ٹانگ جیسے پھوڑا بنی ہوئی تھی۔ ایسی حالت میں پہاڑی پر چڑھنا تو مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ البتہ بہت زیادہ ہمت کر کے نیچے اترنے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔

کلاشن کوف کی میگزین اتار کر دیکھنے پر مجھے فقط دو گولیاں نظر آئیں ۔ یہ چالیس راؤنڈ والی میگزین تھی گویا اڑتیس گولیاں میں فائر کر چکا تھا۔ میگزین لگا کر میں نے سیفٹی لگائی اور کلاشن کوف کا بٹ ڈنڈے کی طرح نیچے ٹیک کر اس کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ میری ٹانگ میں اتنا شدید درد اٹھا تھا کہ کراہیں روکنے کے لیے مجھے سختی سے ہونٹ بھینچنے پڑ گئے تھے۔

لمحہ بھر درد کو سہارنے کے بعد میں نے اترائی میں قدم بڑھا دیے۔ چند قدم لینے کے بعد ہی میں بے دم ہو کر بیٹھ گیا۔ درد بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ دائیں ٹانگ جیسے مفلوج ہوتی جا رہی تھی۔ میں دائیں ٹانگ کو نیچے لگانے کے بجائے بائیں ٹانگ پر کودتا ہوا نیچے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اچانک مجھے عقب میں آہٹ سنائی دی میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، چار مسلح افراد ڈھلان سے نیچے آتے دکھائی دیے۔

میری کلاشن کوف میں فقط دو گولیاں باقی تھیں ۔ میرے اندازے کے مطابق جو آدمی سب سے پہلے میری گولی کا نشانہ بنا تھا، اس کی میگزین میں گولیاں موجود ہونی چاہیے تھیں۔ وہ وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر پڑا تھا ۔میں اس قابل نہیں تھا کہ تیزی سے حرکت کرتا۔ لیکن اب زندگی، موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ میں نے تیزی سے حرکت کرنے کی کوشش کی اور دو تین قدم لیتے ہی میرا بایاں پاؤں ایک چھوٹے سے پتھر کے اوپر آکر پھسلا، میں منھ کے بل گرا اور اس کے ساتھ ہی لڑھکتے ہوئے نیچے جانے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میری دائیں ٹانگ پر کوئی ہتھوڑے مار رہا ہو۔ کوشش کے باوجود میں خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔ شاید میری مشکل ایک پتھر کی چٹان نے حل کی تھی۔

شاید میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس وقت تک میں اپنے حواس کھو چکا تھا۔ اور ایسے وقت میں جب دشمن سر پر پہنچ چکا ہو بے ہوش جانے کا مطلب زندگی سے ہاتھ دھو لینا تھا۔ میری ساری کوششیں اور تگ و دو رائگاں گئی تھیں۔ بہ قول شاعر......

زندگی تم نے کب وفا کی ہے
اپنی خوش فہمی ہی بلا کی ہے

☆......☆......☆

آنکھ کھلتے ہی میں چند لمحے بے دھیانی میں پڑا رہا۔ گو ایک سنائپر کا دماغ ہر وقت چوکنا ہی رہتا ہے اور نیند سے اٹھتے ہی اسے ماحول اور صورت حال کا اچھی طرح ادراک ہوتا ہے۔ مگر اس وقت میں نیند سے نہیں جاگا تھا بلکہ طویل بے ہوشی سے اٹھا تھا۔

آہستہ آہستہ میرا شعور بیدار ہوا اور مجھے یاد آ گیا کہ میں کہاں ہوں۔ مجھے حیرانی اس بات پر تھی کہ ابھی تک میں زندہ کیسے ہوں۔ شلوبر قبیلے کے آدمیوں کو تو مجھے بغیر کسی تاخیر کے ہلاک کر دینا چاہیے تھا۔ مگر میں نہ صرف زندہ تھا بلکہ ٹانگ، پنڈلی اور بازو پر بندھی ہوئی سفید پٹیاں بھی مجھے یہ باور کرا رہی تھیں کہ بے ہوشی کے دوران ہی میرا آپریشن وغیرہ ہو چکا تھا۔ میں نے دائیں بائیں نظریں گھمائیں وہ جگہ مجھے کسی غار کی طرح لگی، کیونکہ کمرے کی دیواریں اتنی کھردری اور بے ترتیب نہیں ہو سکتی تھیں۔ میں فرش پر بچھے ایک نرم گدے پر لیٹا تھا۔ سرہانے کی طرف دیوار میں گڑی کیل کے ساتھ ایک ڈرپ لٹکی تھی جس کا ایک سرا سوئی کے ساتھ میری کلائی سے جڑا تھا۔ میرے پاؤں کی طرف ایک بیٹری پڑی تھی جس سے منسلک تار چھت میں لگے ایک ڈی سی بلب کو روشن کیے ہوئے تھی۔ دروازے کی جگہ ایک کالے رنگ کا کمبل لٹکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے عقب میں دروازہ موجود بھی تھا یا نہیں۔ اندر جلنے والے بلب کی وجہ سے رات دن کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

نہ جانے بے ہوشی کے دوران کتنا وقت گزر گیا تھا۔ میری کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی غائب تھی۔ اسی طرح میرا لباس بھی تبدیل کر دیا گیا تھا۔ جس طرح میری دیکھ بھال کی گئی تھی، میرے ساتھ ایسا برتاؤ شلوبر قبیلے والے تو کسی صورت میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں ذہنی ورزش میں مشغول ہو گیا، لیکن کافی دیر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے بعد بھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اور پھر میں انھی سوچوں میں غرق تھا کہ پردہ ہٹا کر کوئی اندر داخل ہوا۔

آنے والے کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا دل خوش گوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ وہ کمانڈر عبدالحق تھا۔ اسی کی وجہ سے میرا تعارف پہلی بار مجاہدین سے ہوا تھا اور اس کے بعد مجاہدین میرے کافی کام آئے تھے۔

”آپ کو ہوش آ گیا ہے۔“ محبت بھرے انداز میں کہتے ہوئے وہ قریب آکر بیٹھ گیا۔

میں مسکرایا۔ ”ہوش تو آگیا ہے مگر سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“

”جن مسلح آدمیوں کو دیکھ کر آپ بھاگنے کی ناکام کوشش میں بے ہوش ہوئے تھے وہ آپ کے دشمن نہیں مجاہدین تھے۔“

میں نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا۔ ”اس کا مطلب ہے میرا بے ہوش ہو جانا فائدہ مند رہا، ورنہ میں نے مقابلے سے باز نہیں آنا تھا۔“

کمانڈر عبدالحق نے قہقہہ لگایا۔ ”یقیناً ہمارے مجاہدین کے چند سانس بقایا تھے۔“

میں خفیف ہوتا ہوا بولا۔ ”خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“

”کسر نفسی ہے آپ کی، ورنہ وہاں کافی لاشیں بکھری ہوئی نظر آئی ہیں اور تمام کے سر میں گولی لگی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”ویسے آپ کسی افغانی قبیلے سے کیسے ٹکرا گئے۔ یہ لوگ تو پاک آرمی کے دشمن نہیں ہیں۔“

”لمبی کہانی ہے۔“

وہ مسکرایا۔ ”ایسی حالت میں کہانیاں سنانے کے علاوہ آپ کے پاس کوئی کام نہیں بچا۔“

”پہلے تو آپ یہ بتائیں کہ مجاہدین وہاں کیسے آگئے اور انھوں نے مجھے پہچانا کیسے۔“

”پہچانا کہاں ہے، وہاں آپ اکیلے ہی زندہ بچے تھے اس لیے آپ کو لے آئے۔ یہاں خوش قسمتی سے میں خود موجود تھا۔ بس سب سے پہلے تو آپ کو طبی امداد دی، ٹانگ میں پھنسی گولی نکالی، مرہم پٹی کی اور پھر کمزوری کی وجہ سے ڈرپ لگا دی۔ یہ پانچویں ڈرپ ختم ہوئی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میری کلائی سے سوئی نکال کر وہاں روئی رکھ کر دبا دی۔

”گویا مجھے بے ہوش ہوئے دوسرا دن ہے۔“

”کل شام کو آپ کو یہاں لایا گیا تھا۔ اور ابھی رات کے بارہ بجنے کو ہیں۔“

”آپ سوئے نہیں۔“

”ڈرپ ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔“

میں نے پوچھا۔”یہ جگہ غار کی طرح لگ رہی ہے۔“

”یہ غار ہی ہے۔ جس جگہ آپ کا دشمنوں سے مقابلہ ہوا ہے اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ہمارا یہ ٹھکانہ موجود ہے۔“

”یعنی میں نے بے دھیانی میں صحیح سمت اختیار کیے رکھی۔“

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔”اور اب آپ تفصیل بھی بتا دیں کہ یہ لوگ کیوں آپ کے پیچھے پڑے تھے۔“

جواباً میں نے غزنی خیل اور شلوبر کی آپس کی لڑائی میں اپنے غلطی سے پھنس جانے کے متعلق بتانے لگا۔ ساری تفصیل سنتے ہی اس نے پوچھا۔

”آپ نے افغانستان آنے کی وجہ نہیں بتائی۔“

اس مرتبہ میں نے البرٹ بروک کے ہاتھوں بلیک میل ہونے اور اپنی بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنے کے متعلق ضروری تفصیل دہرا دی۔ پلوشہ کے ساتھ میری شادی کی خبر سن کر وہ خوش ہو گیا تھا۔

”سب سے پہلے تو شادی کی مبارک ہو۔“

”خیر مبارک بھائی!......مگر اب نہ جانے وہ کس حال میں ہو گی۔“ میں افسردہ ہو گیا تھا۔

”پلوخان کسی سے مار کھانے والا نہیں۔ وہ میرا بہت لاڈلا شاگرد تھا۔ تمام استادوں سے میں نے اس کی تعریف ہی سنی ہے۔ ایک مشن میں تو وہ میرے ساتھ بھی کام کر چکا ہے، یقین مانو دل خوش ہو جاتا ہے اس کی کارکردگی دیکھ کر۔“

”ہاں، مگر اس وقت وہ پلوخان تھی اور ابھی پلوشہ ہے۔“

وہ بے تکلفی سے بولا۔”نام کی تبدیلی سے کچھ نہیں ہوتا یار!“

''بات نام کی نہیں جنس کی تبدیلی کی ہے بھائی!......ایک جوان لڑکی کو دشمنوں کے ہتھے چڑھنے کے بعد کیا مشکلات درپیش آسکتی ہیں اس بارے یقیناً آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔''

''یہ تو صحیح کہا۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔''مگر آپ خواہ مخواہ برے گمان نہ پالیں اللہ پاک بہتر کرے گا۔''

''ایک اسی ذات کا سہارا ہے۔''میں نے امید ظاہر کی۔

''تو اب آپ غزنی جائیں گے۔''

میں نے کہا۔''ارادہ تو یہی ہے۔''

''آپ کے زخم ٹھیک ہوتے کچھ وقت تو لگے گا اور میرا نہیں خیال کہ اس وقت تک البرٹ بروک وغیرہ آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوں گے۔''

''مجھے اپنا ہتھیار نظر نہیں آ رہا۔''دائیں بائیں نظریں دوڑاتے ہوئے میں نے موضوع تبدیل کیا۔

''ساتھی وہاں پڑے سارے ہتھیار ہی سمیٹ لائے تھے اور ان میں موجود کمانڈر نصر اللہ خوجل خیل کی خاص کلاشن کوف پہچاننے میں مجھے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔''

میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔''بڑی تیز نظر ہے آپ کی۔''

''وہ میرے استاد ہیں اور میں نے ان کے ہمراہ ان گنت معرکوں میں حصہ لیا ہے۔ان کی کلاشن کوف اس لیے بھی خصوصی ہے کہ انھوں نے اعلان کیا تھا کہ یہ کلاشن کوف وہ ایسے شخص کو تحفہ میں دیں گے جو ان کی نظر میں اس کا صحیح حق دار ہوگا۔اور میرا خیال ہے انھوں نے ایسا آدمی تلاش کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔''

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔''یقیناً آپ مذاق اچھا کر لیتے ہیں۔''

''اچھا آپ سچ سچ بتائیں کہ استاد محترم نے یہ کلاشن کوف آپ کے حوالے کرتے ہوئے کیا فرمایا تھا؟''

مجھے نصر اللہ خوجل خیل کی باتیں اچھی طرح یاد تھیں۔انھوں نے بھی کمانڈر عبدالحق اے ملتی جلتی ہی باتیں کی تھیں۔یوں بھی مجاہدین کے درمیان میری نشانہ بازی کا کافی چرچا تھا۔اور اس کی وجہ یہی تھی کہ کچھ تو مجھ میں قدرتی طور پر نشانے بازی کی صلاحیت موجود تھی اور کچھ یار لوگوں کی مبالغہ آرائی نے مجھے شہرت دے دی تھی۔

میں جواب سے پہلوتہی کرتے ہوئے بے پروائی سے بولا۔ ''یہ بعد کا مسئلہ ہے فی الحال تو مجھے بھوک لگی ہے۔''

''اوہ مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔ میں آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔'' خفت بھرے انداز میں کہتے ہوئے وہ غار سے باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

افغانستان کے مختلف پہاڑوں میں مجاہدین نے ٹھکانے بنا رکھے ہیں۔ وہ بھی مجاہدین کا ایک محفوظ ٹھکانہ تھا۔ اور میری خوش نصیبی کہ جس جگہ میرا شلوبر قبیلے سے آخری ٹاکرا ہوا یہ ٹھکانہ وہاں سے قریب ہی تھا۔ اس کی حیثیت رستے میں آنے والی ایک چوکی کی سی تھی کہ پاکستانی سرحد عبور کرنے والے مجاہدین وہاں ایک دن گزار کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ وہاں مجاہدین کی محدود تعداد ہی رہتی تھی، اس کے باوجود اس ٹھکانے کے دائیں بائیں ہونے والی کسی بھی کارروائی کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

اس دن بھی جب میرا شلوبروں سے فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا انھیں بھی وہ فائرنگ سنائی دے گئی تھی۔ وہاں کمانڈر عبدالحق ہی امیر تھے۔ انھوں نے چار آدمی صورت حال کا جائزہ لینے بھیجے۔ اور ان چاروں کو زندہ حالت میں صرف میں ہی ملا تھا، اس لیے وہ مجھے اٹھا لائے۔ کمانڈر عبدالحق نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ میری ٹانگ کا آپریشن انھوں نے خود ہی کیا تھا۔ کچھ بے ہوشی کے ٹیکے اور کچھ کمزوری کی وجہ سے مجھے انتیس، تیس گھنٹوں بعد ہی ہوش آسکا تھا۔

میرے ہوش میں آنے کے اگلے دن شلوبر قبیلے کا ایک وفد وہاں پہنچ گیا تھا۔ اپنی لاشیں وہ ایک دن پہلے ہی اٹھا کر لے گئے تھے۔ لیکن اب ان کی آمد کا مقصد اپنے ہتھیاروں کی واپسی اور مجھے تحویل میں لینا تھا۔ کمانڈر عبدالحق کو ساری تفصیل معلوم تھی۔ ان کے ہتھیار واپس کرتے ہوئے کمانڈر عبدالحق نے الٹا انھیں مطعون کیا کہ ان کی وجہ سے ایک مجاہد زخمی ہوا ہے۔ چونکہ اس ساری کارروائی میں شلوبر قبیلے کی غلطی زیادہ تھی اس لیے جلد ہی انھیں مجھے تحویل میں لینے کے مطالبے سے دست بردار ہونا پڑا۔ میرا غزنی خیل قبیلے کا ساتھ دینا اپنی جان بچانے کی وجہ سے تھا۔ اور جب تک شلوبروں نے مجھے مجبور نہیں کیا، تب تک میں نے ان کے کسی آدمی کو جان سے بھی نہیں مارا تھا۔ البتہ آخری معرکے میں مجبور ہو کر مجھے انتہائی اقدام اٹھانا پڑا تھا۔ اسی بات کو کمانڈر عبدالحق

نے نہایت وضاحت سے انھیں سمجھا دیا، کہ اگر میں چاہتا تو جتنے آدمی زخمی کیے تھے ان تمام کو جان سے بھی مار سکتا تھا۔ اور یہ بات تو انھیں بھی تسلیم تھی کہ میری فائر کی ہوئی گولیوں سے ان کا کوئی بھی آدمی جان سے نہیں گیا تھا سوائے ان سات آدمیوں کے جنھیں مارنا میرے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ شلوبروں کو اس لیے بھی خاموش ہونا پڑا کہ کسی قبیلے سے تو وہ دشمنی پال سکتے تھے، مجاہدین کے لشکر ساتھ ٹکر لینا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کے ساتھ غزنی خیل قبیلے سے بھی ان کی لڑائی عروج پر تھی اس لیے یہ محاذ انھیں بند کرنا ہی مناسب لگا اور ہتھیاروں کی واپسی ہی کو غنیمت سمجھتے ہوئے وہ واپس چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد کمانڈر عبدالحق نے مجھے ساری تفصیل کہہ سنائی تھی۔ ایک خواہ مخواہ کی مصیبت سے جان چھوٹنے کا سن کر میں نے سکھ بھرا سانس لیا تھا۔ ان سے کوئی بعید نہ تھا کہ کبھی دوبارہ میرے سامنے آنے پر میری جان کے درپے ہو جاتے۔ اب کمانڈر عبدالحق کے سمجھانے کی وجہ سے یقیناً میرے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے وہ سو بار سوچتے۔

کمانڈر عبدالحق کی بات ختم ہوتے ہی میں نے شرارت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”ویسے آپ نے جھوٹ کیوں بولا کہ میں آپ کا ساتھی ہوں اور مجاہد ہوں۔“

وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”آپ کے مجاہد ہونے میں مجھے تو کوئی شبہ نہیں پھر یہ جھوٹ کیسے ہو گیا۔ اسی طرح ساتھی صرف اس کو نہیں کہتے جو آپ کے شانہ بہ شانہ لڑے، بلکہ وہ آدمی بھی ہمارا ساتھی ہی کہلاتا ہے جو لڑ تو کسی دوسرے محاذ پر رہا ہو لیکن اس کا اور ہمارا مقصد مشترک ہو۔“

”گویا آپ کے نزدیک میرا اور آپ کا مقصد مشترک ہے۔“

”بالکل مشترک ہے، آپ بھی کفر سے برسرِ پیکار ہیں ہم بھی یہی مقصد لیے میدان میں اترے ہوئے ہیں ،بس طریقہ کار تھوڑا مختلف ہے۔ بلکہ آپ نے تو کئی بار اسلحے کی صورت میں مجاہدین کی کھلم کھلا مدد بھی کی ہے۔ اور ایسا کوئی ساتھی ہی کیا کرتا ہے غیر نہیں۔“

میں مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے جی میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

کمانڈر عبدالحق میری ہنسی میں شامل ہوتا ہوا بولا۔ ”غلط الفاظ واپس لینے ہی میں بھلائی ہوتی ہے۔“

☆......☆......☆

زندگی میں ایک دم ٹھہراؤ آ گیا تھا۔اس سے پہلے بھی میں ایک بار زخمی ہو کر کمانڈر نصراللہ خوجل خیل کی بیٹھک میں صاحب فراش رہ چکا تھا۔جب میری تیماردار، میری جانِ حیات پلوشہ تھی۔گو اس وقت تک اس سے اقرار الفت تو نہیں ہو پایا تھا اس کے باوجود وہ وقت ایک خوشگوار یاد کی صورت میرے دل میں مقید تھا۔پلوشہ نے جس طرح میری خدمت کی تھی اور جیسے میرا خیال رکھا تھا ایسا کوئی نہایت ہی محبت کرنے والا ہی رکھ سکتا ہے۔اور اب وہ پلوشہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔لگتا تھا شاید اسے دیکھے صدیاں بیت گئی ہوں۔اپنے آرام وسکون کو ٹھوکر مار کر وہ میری بے گناہی کے ثبوت حاصل کرنے گئی تھی۔اس کے ساتھ میرا یار سردار خان بھی تھا۔نہ جانے وہ بہن بھائی کہاں بھٹکتے پھر رہے تھے۔

میرے دن رات نہایت بے کیف گزر رہے تھے۔عضو معطل بن کر میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ بس آنے جانے والے مجاہدین کی باتیں سن کر میں جی کو بہلاتا رہتا۔اکیلا بیٹھنے کی صورت میں تو پلوشہ فوراً آ دھمکتی تھی۔بہ قول مومن......

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کھانے پینے کا سامان اور روزمرہ ضروریات کا دوسرا سامان وہ پکتیکا سے لے کر آتے تھے۔

مجھے وہاں ہفتے سے زیادہ ہونے کو تھا۔اس دن بھی چار مجاہد آئے ہوئے تھے۔وہ چھٹی جا رہے تھے۔ میں بھی کمانڈر عبدالحق کے ساتھ بیٹھا ان کی باتیں سن رہا تھا۔وہ چاروں گردیز سے آئے تھے۔

کمانڈر عبدالحق اسلام نامی مجاہد کو مخاطب ہوا۔”اسلام بھائی!......اس مرتبہ کچھ دیر سے چھٹی جا رہے ہو۔“

اسلام نے جواب دیا۔”یوں تو میرا ارادہ پچھلے ماہ ہی چھٹی جانے کا تھا مگر کام کچھ بڑھ گیا تھا مجبوراً مہینا بھر مزید گزارنا پڑا۔“

”تو ان کی چھٹی بھی موّخر کرنا تھی نا۔“ کمانڈر عبدالحق نے مزاحیہ انداز میں باقی تینوں کی طرف اشارہ کیا۔

اسلام ہنسا۔”کیوں مجھے مروانے کے چکروں میں ہو یار!......ایک تو دشمن نے ہماری حرکت کو محدود کیا ہوا ہے اور تم چاہتے ہو اندرونِ خانہ بھی دشمن کھڑے ہو جائیں۔“

”یہ تو خیر کمانڈر زیادتی کر رہا ہے۔“شفیق نامی مجاہد صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔”انھوں نے خود ہی ہمیں چھٹی کے لیے زور دیا ہے۔“

عبدالحق پوچھنے لگا۔”ویسے دشمن کی بات میرے سر پر سے گزر گئی ہے۔“

اسلام نے حیرانی سے پوچھا۔”کیا آپ تک یہ خبر نہیں پہنچی؟“

”کون سی۔“کمانڈر عبدالحق ہمہ تن گوش ہو گیا۔میرے کان بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

اسلام تفصیل بتلاتے ہوئے بولا۔”ایک برطانوی نشانے باز نے حقیقت میں اپنی زندگی اجیرن کر رکھی ہے ۔قریباً بیس بائیس مجاہد اس کی گولی کا شکار ہو چکے ہیں۔ڈیڑھ دو کلو میٹر کے فاصلے سے بھی کم بخت کی گولی سر ہی میں لگتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری حرکت کافی محدود ہو گئی ہے۔اندھیرے کے تیر کی طرح نہ جانے کس کونے سے نکلتا ہے اور ہمارے دو تین ساتھیوں کو شہید کر کے غائب ہو جاتا ہے۔ اپنے مخبروں سے ہمیں یہی معلوم ہوا ہے کہ اس کا نام نک سٹیورٹ ہے برطانوی آرمی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی مددگار بھی کوئی برطانوی لڑکی ہی ہے وہ بھی اچھی خاصی ماہر نشانہ باز ہے۔ ہم اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے ہیں۔“

عبدالحق گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔”عجیب بات سنا رہے ہو۔“

اسلام نے کہا۔”ہونہہ، عجیب سہی مگر حقیقت ہے۔“

میں ان کی گفتگو میں مخل ہوا۔”آپ لوگوں کے پاس دور مار ہتھیار نہیں ہے کیا؟“

اسلام میری طرف متوجہ ہوا۔”کیوں نہیں ہے۔ چند ماہ پہلے ہی ہمارے ہاتھ تین ہیوی رائفلیں لگی ہیں۔ کمانڈر صدیق بتا رہا تھا کہ وہ رینج ماسٹر ہیں۔اور دو کلو میٹر تک کسی بھی آدمی کو ان سے نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ان کا ایمونیشن بھی موجود ہے لیکن دو کلو میٹر تو کیا ہم میں سے کوئی دو تین سو میٹر کے فاصلے پر بھی اس رائفل سے نشانہ نہیں بنا سکتا۔ہمیں تو بے کار وزن ہی محسوس ہو رہی ہیں۔“

وہ رینج ماسٹر کو بے کار وزن کہہ رہا تھا۔یقیناً ان میں سے کوئی رینج ماسٹر کی افادیت سے واقف نہیں تھا۔ورنہ وہ کبھی بھی ایسا نہ کہتے۔میں نے پوچھا۔”کمانڈر صدیق بھی اس سے فائر نہیں کر سکتا۔“

”کمانڈر صدیق نے ان رائفلوں کے اندر موجود کتابچے سے ان کا نام ہمیں بتایا ہے۔باقی اس رائفل کے

بارے وہ بھی کچھ زیادہ نہیں جانتا۔“

”صحیح ہے۔“ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں خاموش ہو گیا۔

کمانڈر عبدالحق بڑے غور سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ مگر میں جان بوجھ کر انجان بنا بیٹھا رہا۔

اسلام، عبدالحق کی طرف متوجہ ہوا۔ ”ویسے آپ نے ذیشان بھائی کا مکمل تعارف نہیں کرایا۔“

”ذیشان بھائی کا تعلق پاک آرمی سے ہے اور انھوں نے کافی بار ہماری مدد کی ہے۔ اب کسی کام کے سلسلے میں افغانستان آنا ہوا، رستے میں غلط فہمی میں ایک قبیلے سے ٹاکرا ہو گیا، انھی سے لڑتے ہوئے زخمی ہو گئے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے ٹھکانے کے نزدیک ہی یہ لڑائی ہوئی تھی، بس ہم بھائی کو یہاں لے آئے۔ ہفتہ ڈیڑھ ہی ہوا ہے تب سے یہیں پر ہیں۔ اور جب تک مکمل صحت یاب نہیں ہو جاتے میں انھیں کہیں جانے کی اجازت بھی نہیں دوں گا۔“

اسلام فوراً شاکی ہوا۔ ”کس قبیلے سے لڑائی ہوئی تھی، کم از کم آپ کو ان سے گلہ تو کرنا چاہیے تھا۔ جو شخص ہمارا مددگار رہ چکا ہو وہ ہمارا ساتھی ہی ہے اور ہمارے ساتھیوں کو کوئی یوں زخمی کرے اس کی اجازت ہم نہیں دے سکتے۔“

کمانڈر عبدالحق ہنسا۔ ”صحیح کہہ رہے ہیں آپ، گلہ کرنا تو ہمارا بنتا تھا لیکن ایک چھوٹا سا مسئلہ تھا اس لیے مجھے خاموش ہونا پڑا۔“

”کیسا مسئلہ؟“ اسلام نے حیرانی سے پوچھا۔

کمانڈر عبدالحق اطمینان سے بولا۔ ”یہی کہ اس قبیلے کے دو درجن افراد زخمی ہوئے اس کے علاوہ انھیں سات لاشیں بھی اٹھانا پڑیں۔“

”کک......کیا مطلب؟“ اسلام ششدر ہی تو رہ گیا تھا۔ اس کے باقی تین ساتھی بھی حیرانی سے مجھے گھورنے لگے تھے۔

کمانڈر عبدالحق نے منھ بنایا۔ ”میں نے عبرانی تو نہیں بولی، سادہ پشتو ہی میں بات کی ہے۔“

”مگر اکیلا آدمی......؟“

کمانڈر عبدالحق تحسین امیز لہجے میں بولا۔ ”جی اکیلا آدمی اگر ایس ایس ہو تو بہت کچھ کرسکتا ہے۔“

”ایس ایس ......“ اسلام نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”گویا آپ کا مطلب ہے ذیشان بھائی ہی ایس ایس ہے۔ وہی پلوخان، میرا مطلب پلوشہ کا ساتھی۔“

”ساتھی نہیں شوہر کہو......اب محترم نے پلوشہ بیٹی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔“

”مبارک ہو ذیشان بھائی۔“ اسلام نے فوراً ہی پرخلوص لہجے میں کہا۔

”شکریہ دوست۔“ میں نے انکساری سے کہا۔

اس کے بعد ہم کافی دیر وہاں بیٹھے رہے، موضوعِ گفتگو میری ذات ہی بنا رہا۔ اسلام اور اس کے ساتھیوں نے ساری گپ شپ کو پسِ پشت ڈال کر میری کہانی میری زبانی سننے پر اصرار کیا تھا۔ گو میری زیادہ تر باتیں تو ان تک پہنچی ہوئی تھیں مگر کسی اور زبانی پہنچی ہوئی باتوں میں جھوٹ اور مبالغے کی ملاوٹ ضرور ہوتی ہے۔ میں ان کے اصرار کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹک پایا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن کمانڈر اسلام اور اس کے تینوں ساتھی جانے سے پہلے الوداعی ملاقات کے لیے آ گئے تھے۔ میں نے ان سے جانے کے رستے کی بابت دریافت کیا۔

اسلام نے جو راستہ بتلایا وہ خواگا او بو سے گزر کر ہی جاتا تھا۔ خواگا او بوگل گارے کا گاؤں تھا۔

”خواگا او بو تو آپ لوگوں نے دیکھا ہے اس کے جنوبی جانب ایک اکیلی حویلی ہے شمریز خان کی، کبھی ان سے واسطہ پڑا ہے۔“

اسلام اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”بالکل دیکھی ہوئی ہے، البتہ کبھی ان سے ملنے کی نوبت نہیں آسکی۔“

اسلام کا ساتھی عبدالصمد بولا۔ ”میں نے ان کی بیٹھک میں ایک رات گزاری تھی۔“

”بس جاتے ہوئے چچا شمریز اور ان کے گھر والوں کو میرے بہت سے سلام و دعا پہنچا دینا اور انھیں کہہ دینا کہ میں بالکل خیریت سے ہوں۔“

اسلام نے پوچھا۔ ''اور کچھ۔''

''بس اللہ پاک آپ کو خیر سے لے جائے۔'' میں نے معانقے کے لیے ہاتھ پھیلا دیے۔

انھیں رخصت کرنے میں غار سے باہر تک گیا تھا۔ اب بیساکھی کے سہارے میں اچھا بھلا چل لیتا تھا۔ میرا زخم پہلے سے کافی بہتر ہو گیا تھا۔ بازو کے زخم کا تو کھرنڈ بن کر بھی اتر چکا تھا۔ لیکن پنڈلی اور ران کا زخم اتنی جلدی مکمل ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔

اس دن دوپہر کو کھانا کھاتے ہوئے کمانڈر عبدالحق مستفسر ہوا۔ ''ذیشان بھائی!...... ایک بات پوچھوں؟''

میں خفیف ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔''

''شکریہ۔'' کہہ کر اس نے پوچھا۔ ''کل آپ اسلام بھائی سے دور مار رائفل کے بارے کیوں پوچھ رہے تھے، کیا آپ اس رائفل کو استعمال کرنا جانتے ہیں؟''

ایک لمحہ سوچ کر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''جانتا ہوں۔''

''اگر میں کہوں کہ آپ ہمارے کسی ساتھی کو اس رائفل کا استعمال سکھا دیں تو کیا یہ درخواست منظور ہو جائے گی۔''

میں نے بھرپور قہقہہ لگایا۔ ''درخواست اور منظوری، عبدالحق بھائی!...... کچھ زیادہ ہی میٹھا نہیں ڈال دیا۔''

عبدالحق نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''کسی سے بھی کام لینے کے دو طریقے ہیں حکم دینا یا درخواست کرنا اور ہم آپ سے درخواست ہی کر سکتے ہیں۔''

''اپنوں کو نہ تو حکم دیا جاتا ہے اور نہ درخواست کی جاتی ہے۔ بس ان تک اپنی خواہش پہنچا دی جاتی ہے۔''

وہ فوراً اپنی سابقہ بات سے رجوع کرتا ہوا بولا۔ ''تو بس سمجھ لیں کہ میں نے اپنی خواہش آپ تک پہنچا دی ہے۔''

میں صاف گوئی سے بولا۔ ''عبدالحق بھائی!...... آپ کی خواہش کو پورا کرنا، میرے لیے نہایت ہی دشوار اور مشکل ہوتا۔ لیکن اس حالت میں میں کوئی بھی کام کرنے کے قابل نہیں ہوں اس لیے آپ رائفل اور سیکھنے والے دو تین آدمی یہیں پر بلوا لیں میں انھیں تربیت دے دوں گا۔''

عبدالحق نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''کہنا تو نہیں چاہیے مگر آپ کا زخمی ہونا ہمارے لیے فائدہ مند ہی رہا ہے۔'' اس کی بات نے مجھے بھی ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

دو دن بعد چار آدمی رینج ماسٹر کے دو بکس لے کر پہنچ گئے تھے۔ اس کے ساتھ وہ رینج ماسٹر کی دو سو گولیاں بھی لائے تھے۔ کمانڈر عبدالحق نے گزشتہ دن میرا عندیہ لیتے ہی وائرلیس بیس پر اپنے گردیز کیمپ میں موجود کمانڈر سے بات کر لی تھی۔ اور کوڈ ورڈ میں انھیں رائفلیں، ایمونیشن اور آدمی بھیجنے کا بتا دیا تھا۔ اس دعوت کو غنیمت جانتے ہوئے انھوں نے بغیر کسی تاخیر کے چار آدمی اس جانب روانہ کر دیے تھے۔

ان دنوں میں مجھے وقت گزارنا مشکل ہو جایا کرتا تھا۔ حالانکہ جب پلوشہ زخمی تھی اس وقت ہم نے دو ماہ کے قریب عرصہ یونھی کوئی کام کیے بغیر گزار دیا تھا۔ مگر وہ دو ماہ میری زندگی کے سب سے زیادہ تیز گزرنے والے دن تھے۔ رات، دن لمحوں میں بیت جایا کرتے تھے۔ اور اب وہی شب روز مہینوں پر محیط ہو گئے تھے۔

گردیز کیمپ سے آنے والے چاروں جواں سال مجاہد تھے۔ ان میں سے دو تو میرے ہم عمر تھے جن کا نام صغیر اور احسان تھا۔ اسلم مجھ سے سال دو سال بڑا ہو گا جبکہ مبین بہ مشکل اٹھارہ انیس سال کا لڑکا تھا۔

رات ہی کو میں نے رینج ماسٹر کے دونوں بکس کھول کر سامان کا جائزہ لے لیا تھا۔ سارا سامان مکمل دیکھ کر میں نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ سردار اور میں نے امریکہ میں سنائپر کورس کے دوران اس رائفل کے متعلق بہت تفصیل سے پڑھا تھا۔ اور یہ وہ رائفل جس سے میں سب سے زیادہ فائر کیا ہے۔ (اس رائفل بارے کہانی کی شروعات میں میں کافی کچھ لکھ چکا ہوں اس لیے اگر کسی کو رینج ماسٹر کے بارے جاننے کا شوق ہو تو انھی صفحات کو دوبارہ پڑھ لے)

''صبح نماز کے بعد تیار رہنا۔'' میں نے چاروں سیکھنے والوں کو تربیت کا وقت بتایا اور وہ سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔

کمانڈر عبدالحق کچھ دیر مزید میرے ساتھ بیٹھا رہا۔ اس کے جانے کے بعد میں سونے کے لیے لیٹ گیا کہ صبح آرام کا موقع نہ ملتا۔

صبح کی نماز کے بعد ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر چاروں جوان پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر عبدالحق نے بھی ان کے ہمراہ بیٹھ کر سیکھنے میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔

میں نے تمہیدی بات چیت میں رینج ماسٹر کی خوبیوں پر روشنی ڈالی اور انھیں باور کرایا کہ ایک تربیت یافتہ آدمی اس رائفل سے کتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس کے بعد میں انھیں رائفل کے پرزوں وغیرہ کے بارے تفصیل سے بتلانے لگا کہ کس طرح وہ اس رائفل کو ٹکڑوں میں کھول سکتے تھے۔ وہ سارا دن میں انھیں رائفل کے متعلق ہی پڑھاتا رہا اس کے ساتھ انھیں بھی موقع دیا کہ وہ بار بار رائفل کو کھولیں جوڑیں۔ اس کے ساتھ میں انھیں اس رائفل سے مختلف پوزیشنوں سے فائر کرنے کے طریقے بھی بتلاتا رہا۔ وہ سارا کام چونکہ ہم بند کمرے میں بھی کر سکتے تھے اس لیے غار کے اندر بیٹھ کر ہی سکھلائی کرتے رہے۔

اگلے دن میں میں انھیں غار سے باہر لے گیا تھا۔ سنائپر رائفل میں سب سے زیادہ کام چونکہ ٹیلی سکوپ سائیٹ کا ہوتا ہے اس لیے اس کے بارے جاننا ایک سنائپر کے لیے بہت زیادہ ضرری ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کہ وہ سنائپر بننے نہیں آئے تھے لیکن انھیں اچھا نشانے باز تو بننا تھا۔ لیوپولڈ سائیٹ کے بارے ہم سنائپر ہونے کے باوجود پورا ہفتہ پڑھتے رہے تھے۔ میں انھیں وہ سب کچھ تو اس لیے بھی نہیں پڑھا سکتا تھا کہ اس کام میں کافی وقت صرف ہو جاتا۔ میں بس انھیں ضروری اور کام کی باتیں بتاتا رہا۔ لیوپولڈ سائیٹ پر تو عام آدمی صحیح طریقے سے رینج بھی نہیں لگا سکتا۔ ہر فاصلے کے لیے ایلیویشن ڈرم پر مخصوص کلک لگانے پڑتے ہیں۔ تمام کلکس کی ترتیب میں نے انھیں لکھ کر دے دی تا کہ وہ اسے زبانی طور پر یاد رکھیں۔ وہ پورا دن میں انھیں لیوپولڈ سائیٹ ہی متعلق پڑھاتا رہا۔ کمانڈر عبدالحق بھی سیکھنے میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ رات کو وہ اپنے غار میں کافی دیر تک دن کی سکھلائی کو دہراتے رہے تھے۔ مجاہدین کا وہ ٹھکانہ غار در غار بنا ہوا تھا۔ یوں جیسے کسی مکان میں کئی کمرے بنے ہوتے ہیں۔

تیسرے دن میں انھیں فائر کروانے لگا۔ رائفل کے صفر ہونے کے بعد وہ چھ سات سو میٹر کے فاصلے پر آسانی سے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ عملی طور پر رینج ماسٹر کی کارکردگی دیکھ کر انھیں بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ کمانڈر عبدالحق نے بھی درجن بھر گولیاں چلا کر اپنا نشانہ آزمایا تھا۔ اگلے دو ہفتوں میں میں

انھیں مختلف فاصلوں سے فائر کرواتا رہا۔ ان میں سب سے اچھا فائر مبین تھا جو عمر میں تمام سے چھوٹا تھا۔ وہ پندرہ سو میٹر دور کے ہدف کو نشانہ بنا لیتا تھا۔ چونکہ ان کے پاس گولیوں کی محدود تعداد تھی اس لیے ہر آدمی روزانہ تین چار گولیاں ہی فائر کر پاتا۔ اس سارے تربیتی عرصے کے دوران انھوں نے چند بار میرا فائر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر زخمی ہونے کا بہانہ کر کے میں نے معذرت کر لی تھی۔ البتہ آخری دن جب ان کے پاس فقط دو گولیاں باقی بچی تھیں، کمانڈر عبدالحق نے اصرار کیا کہ وہ دونوں گولیاں میں فائر کروں۔

اس کی حکم نما التجا پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے میں نے دونوں گولیوں سے انیس سو میٹر دور دو چھوٹے پتھروں کو نشانہ بنا کر رینج ماسٹر پر ان کا اعتماد مزید پختہ کر دیا تھا۔

اگلے دن ان چاروں نے واپس جانا تھا۔ کیونکہ گردیز کیمپ میں بڑی بے چینی سے ان کا انتظار ہو رہا تھا۔ رات کو انھیں اپنے کمرے میں بٹھا کر میں نے سنائپنگ کے متعلق اہم باتیں دہرائیں، کچھ نئے نکتے ان کے گوش گزار کیے تا کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔

صبح سویرے واپس جاتے ہوئے چاروں بڑی عقیدت سے مجھے ملے تھے۔ میرے دن پھر بے زاری سے گزرنے لگے۔ پنڈلی کا زخم تو قریباً ٹھیک ہی ہو گیا تھا لیکن ران کا زخم ابھی تک اتنا ٹھیک نہیں ہوا تھا کہ میں آگے بڑھ سکتا۔ سردی کی وجہ سے زخم یوں بھی ٹھیک ہونے میں زیادہ وقت لیتا ہے۔ اب میں کمانڈر عبدالحق کے ساتھ اپنے ٹھکانے سے پانچ چھے سو میٹر دور چلا جاتا تھا۔

ایک دن ہم سہ پہر کو لوٹے تو یہ روح فرسا خبر سننے کو ملی کہ صغیر برطانوی سنائپر نک سٹیورٹ کی گولی کا شکار ہو کر جام شہادت نوش کر گیا تھا۔ جبکہ اسلم شدید زخمی تھا۔ گولی اس کے سر سے رگڑ کھاتے ہوئے گہرا زخم چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ وہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کیمپ تک واپس پہنچا تھا۔ بعد میں صغیر کی لاش اٹھانے کے لیے جانے والے پانچ آدمیوں میں سے دو آدمی بھی نک سٹیورٹ یا اس کی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔ یوں لاش اٹھانے کے لیے انھیں رات کا انتظار کرنا پڑ گیا تھا۔ اس بات کو دو دن گزر گئے تھے۔ اب شہداء کے گھروں تک یہ خبر پہنچانے کے لیے جو دو آدمی جا رہے تھے ان کی زبانی ہم تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی۔

اسلم اور صغیر دونوں میرے شاگرد تھے۔ تین ہفتے تک ہم دن رات مسلسل ساتھ رہے تھے۔ اب ایک دم

ان کی موت کا سن کر میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ ہفتہ بھر پہلے ہی وہ ایک امید لے کر یہاں سے واپس لوٹے تھے۔ برطانوی سنائپرز کو انجام تک پہنچانے کے لیے وہ پرعزم تھے۔ گو ان سنائپرز کی جو کہانیاں مجھ تک پہنچ چکی تھیں اس کے بعد ان چاروں سے مجھے اتنی زیادہ امید تو نہیں تھی کہ وہ، انھیں ختم کر سکیں گے۔ لیکن یہ تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ خود ان کا نشانہ بن جائیں گے۔ حالانکہ میں نے انھیں سنائپرز کے حربوں اور چالاکیوں سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔ یقیناً وہ میری ہدایات پر صحیح طریقے سے عمل نہیں کر سکے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ اپنے ساتھی کی لاش اٹھانے کے لیے وہ یوں منھ اٹھا کر بھاگتے چلے گئے تھے۔ حالانکہ میں انھیں اچھی طرح بتلا چکا تھا کہ ایک سنائپرز مخالف کی نفسیات سے کھیلتا ہے۔ اور اپنے ہدف کا انتظار کرنے کے لیے وہ گھنٹوں نہیں دنوں انتظار کر سکتا ہے۔ گو تمام آدمی یہ بات نہیں جانتے تھے مگر میرے دو اور شاگرد، مبین اور احسان تو وہاں موجود تھے وہ انھیں اس خطرے سے آگاہ کر سکتے تھے۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ احسان وغیرہ نے انھیں خبردار نہیں کیا تھا یا انھوں نے خود ہی بے پروائی برتی تھی۔

صغیر ایک ہنس مکھ اور بہادر جوان تھا۔ اس کا تعلق مانسہرہ جیسے خوب صورت علاقے سے تھا۔ اس کے دل میں اسلام اور پاکستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ رینج ماسٹر سے فائر کرتے ہوئے وہ اکثر کہتا تھا......

''استاد ذیشان!...... امید کرتا ہوں ان دونوں کی موت میری ہی گولی سے لکھی ہو۔''

جب میں نے انیس سو میٹر سے پتھر کو نشانہ بنایا تھا، تب اس نے بے ساختہ کہا تھا۔ ''اگر ان کافروں کو پتا چل گیا کہ ہمارے استاد ایس ایس کا نشانہ کیسا ہے، یقیناً وہ بھاگنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔''

کمانڈر عبدالحق نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔ ''بیٹا!...... استاد کو چھوڑو، اپنی سناؤ۔''

وہ عزم سے بولا۔ ''میں تو انھیں بھاگنے بھی نہیں دوں گا۔''

آنے والے وقت سے کوئی بھی واقف نہیں ہوتا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس نے انھی سنائپرز کا نشانہ بننا ہے تو شاید ایسے دعوے نہ کرتا۔ اس کی شادی کو ایک ہی سال ہوا تھا۔ محاذ پر آنے سے پہلے اس کی بیوی امید سے تھی۔ اس نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ وہ نو ماہ گزارنے کے بعد ہی گھر جائے گا تا کہ اپنی بیوی اور بچے سے ملنے کی دہری خوشی سے لطف اندوز ہو سکے۔ اسے چھٹی سے آئے آٹھ ماہ ہو چکے تھے اور اب ایک مہینا گزار کر اس نے گھر جانا

تھا۔لیکن اجل نے اسے موقع ہی نہیں دیا تھا۔اپنے محبوب کی آمد کے لیے چشم براہ بیوی کو اس کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

کمانڈر عبدالحق میری غار میں داخل ہوا۔''ذیشان بھائی!......آپ تو رو رہے ہیں۔''اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

مجھے معلوم ہی نہیں ہوا تھا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔''پتا نہیں یار۔''آنکھوں پر الٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اگر موت کے بعد فنا ہو جانا ہوتا تو کافی گھاٹے کا سودا تھا۔''اس نے مجھے سمجھایا تھا یا شاید تسلی دی تھی۔

''جانتا ہوں۔''میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔''لیکن دکھ اور غم کا احساس قدرتی ہوتا ہے۔''

''اللہ پاک ان کے درجات بلند کرے۔''کمانڈر عبدالحق میرے ساتھ ہی بستر پر بیٹھ گیا۔

دوسرے دن مخابرے پر اسلم کی حالت کے بارے معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ بچ نہیں سکا تھا۔ یقیناً علاج کی بہتر سہولت نہ ہونے کی وجہ سے وہ جانبر نہیں ہو سکا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے تین چار ہفتے بھی میں کمانڈر عبدالحق کا مہمان بنا رہا۔مجھے وہاں رکے ہوئے دو ماہ سے زائد عرصہ ہو گیا تھا۔لیکن بغیر تندرست ہوئے میں اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے جب تک میں مکمل صحت یاب نہ ہو گیا میں نے وہاں سے ہلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔اسی اثناء میں کمانڈر اسلام اپنے ایک ساتھی کے ساتھ چھٹی کاٹ کر لوٹ آیا تھا۔اس کے ہمراہ گئے ہوئے باقی دو ساتھی کسی وجہ سے واپس نہیں لوٹ سکے تھے۔مجھے ابھی تک وہیں موجود پا کر کمانڈر اسلام خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

''شکر ہے ذیشان بھائی آپ یہیں مل گئے،ورنہ آپ کی تلاش میں کہاں کہاں پھرنا پڑتا۔''

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔''میرا خیال ہے میں نے آپ سے قرض وغیرہ تو نہیں لیا تھا۔''

''آپ کی ایک امانت ساتھ پھرا رہا ہوں یار!''اسلام نے سفری تھیلے سے ایک شاپر نکال کر میری طرف

بڑھایا۔

”یہ کیا ہے؟“میں سچ مچ حیران رہ گیا تھا۔

”بھول گئے،آپ نے جاتے وقت مجھے کوئی پیغام دیا تھا۔“

”چچاشمریز نے بھیجا ہے یہ۔“میرے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔”میرے حوالے تو اسی نے کیا ہے،اب بھیجنے والا کون ہے یہ معلوم نہیں۔“

”بہت اچھا گھرانا ہے۔اللہ پاک انھیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔“

”آمین۔“اسلام کے ساتھ کمانڈر عبدالحق کے منہ سے بھی دعائیہ کلمہ ادا ہوا۔اسلام کی بات جاری رہی۔

”ویسے آپ کا نام لیتے ہی ہماری جو پذیرائی ہوئی اس کا تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ہمیں تو لگ رہا تھا کہ شمریز آپ کا سگا چچا ہے۔اور پھر اس کے دونوں چھوٹے بچوں نے ہم سے اتنے سوال کیے کہ بیان سے باہر ہے۔ اپنے لالا جان کے زخمی ہونے کا سن کر تو وہ رونے لگے تھے۔ جب انھیں ساری کہانی سنائی تب انھیں افاقہ ہوا، کہ ان کے لالا جان نے زخمی ہونے سے پہلے کتنوں کو زندگی کی قید سے آزادی دلائی ہے۔کوئی پردے کے پیچھے سے بھی ہماری گفتگو سنتا رہا ہے۔اور میرا خیال ہے یہ سامان اسی نے بھجوایا ہے۔“

میں نے جلدی سے کہا۔”ہاں وہ بھی میری منہ بولی بہن ہے۔لیکن آپ کو کیسے معلوم کہ کوئی پردے کے پیچھے بھی موجود ہے۔“

”جب میں آپ کے بارے تفصیل سنا رہا تھا تو اس نے وہیں سے بے ساختہ دو تین سوال پوچھے تھے۔اور جب اگلی صبح ہم جانے لگے تو شمریز چچا نے با اصرار ہمیں اسی رستے سے واپس لوٹنے کی درخواست کی تھی۔کل صبح جب وہاں سے نکلے تو یہ سامان تو چچا شمریز نے ہمارے حوالے کیا لیکن یہ سامان آپ تک پہنچانے کی ہدایات پردے کے پیچھے سے موصول ہوئی تھیں۔“

میں نے کہا۔”میں شاید دو دن پہلے رخصت ہو گیا ہوتا،مگر عبدالحق بھائی نے ایک دن اور ایک دن اور کی رٹ لگا کے مجھے زبردستی روکا ہوا تھا۔“

عبدالحق نے فوراً کہا۔”دیکھ لیں،بڑوں کی بات ماننے میں کتنے فائدے ہوتے ہیں۔“

''آپ کی وجہ سے بس اسلام بھائی کی مشقت میں کمی ہوئی ہے کہ انھیں امانت سے جان چھڑانے کا موقع مل گیا۔ ورنہ میں جہاں بھی جاتا اسلام بھائی یہ مجھ تک ضرور پہنچا دیتے۔ کیوں اسلام بھائی۔''میں نے تصدیق چاہنے کے انداز میں اسلام کی طرف دیکھا۔

''بلاشک وشبہ۔''اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رات کافی ہوگئی تھی، کچھ دیر مزید بیٹھ کر وہ رخصت ہو گئے۔ میں نے اگلی صبح آگے جانے کا بتا دیا تھا۔اس ضمن میں کمانڈر عبدالحق سے رہنمائی مانگی تو اس نے یہ کہہ کر خاموش کرا دیا کہ مجھے رستے کے لیے ایک رہنما مل جائے گا۔ مجھے اس کے علاوہ کیا چاہیے تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں کالے رنگ کے شاپر کو کھولنے لگا۔ اس میں ایک خوب صورت سوئیٹر، ایک گرم ٹوپی اور ہلکے بھورے رنگ کا کپڑوں کا سلا ہوا سوٹ بند تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک رقعہ بھی موجود تھا۔ گلگارے کی لکھائی پہچانتے ہوئے مجھے ذرا بھی دقت نہیں ہوئی تھی۔ سلام ودعا کے بعد لکھا تھا۔

''امید کرتی ہوں کہ یہ سامان جلد ہی آپ تک پہنچ جائے گا۔ آپ نے اسلام چچا کے ذریعے اپنی خیریت کا احوال بھیجا سن کر دل تشکر سے بھر گیا کہ آپ نے ابھی تک ہمیں یاد رکھا ہے۔ اور یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ہم اس قابل ہیں کہ اب تک آپ کو نہیں بھولے۔ آپ کے زخمی ہونے کا سنا بہت افسوس ہوا۔ اگر ابو جان اجازت دیتے تو یقیناً میں آپ کو ملنے وہیں پہنچ جاتی لیکن انھوں نے منع کر دیا۔ آپ کی گڑیا بہن رنڑا بھی بہت پریشان ہوئی، مگر جب اسے معلوم ہوا کہ آپ کتنوں کو مار کر زخمی ہوئے تب اسے افاقہ ہوا۔ اور یہ بتانے کی ضرورت تو غالباً نہیں ہو گی کہ اسلام چچا کی آمد کے بعد سے اب تک روزانہ آپ کا تازہ کارنامہ سننا پڑتا ہے۔ آپ کے معاملے میں نہ تو وہ میرے ڈانٹنے کی پروا کرتی ہے اور نہ مجھ سے ڈرتی ہے۔ آپ کا دیا ہوا پستول اس نے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ پہلے پہل تو اس نے مجھ پر الزام دھرا کہ میں نے آپ سے چرایا ہے۔ بعد میں بڑی مشکل سے اسے یقین دلایا کہ آپ ہی نے میرے حوالے کیا ہے۔ ثمر خان آپ جیسا نشانہ باز بننے کے لیے روزانہ مشق کرتا ہے۔ دونوں اب پہلے کی طرح مجھ سے نہیں ڈرتے۔ ہر وقت آپ کی واپسی کی دھمکی دیتے رہتے ہیں۔ انھیں تنگ کرنے کے لیے مجھے آپ کی کافی ساری برائیاں کرنا پڑتی ہیں جواباً وہ لڑنے سے بھی باز نہیں آتے۔ یہ

کپڑے میں نے ماموں جان کے ساتھ خان کلے جا کر خریدے ہیں اور سلائی بھی خود کیے ہیں۔اگر سلائی اچھی نہ لگے تب بھی آپ نے پہننے ضرور ہیں۔آپ کی گڑیا بہن کو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی پتا چلا ہے کہ میں آپ کے لیے کپڑوں کا جوڑا اور سوئیٹر بھیج رہی ہوں، چونکہ صبح چچا اسلام نے آگے جانا ہے اس لیے بے چاری کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ کچھ خرید سکتی۔ لگی منتیں کرنے کہ میں یہ سوئیٹر اس کا نام لے کر آپ کے پاس بھجوادوں۔لیکن آپ کو تو معلوم ہے کہ آپ دونوں بہن بھائیوں کی چاہت مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی اس لیے میں نے سختی سے انکار کر دیا۔بس ساری رات اسی تگ ودو میں رہی کہ آپ کو کیا تحفہ بھیجے۔ثمر خان کے لیے ماموں جان شہر سے گرم ٹوپی اور رنڑا کے لیے گرم شال لے کر آئے تھے۔گرم شال تو صرف لڑکیاں ہی اوڑھ سکتی تھیں۔بے چاری نے ثمر خان کی منتیں کر کے اس سے گرم ٹوپی اس شرط پر مستعار لی کہ ماموں جان سے ٹوپی کی قیمت معلوم کر کے وہ اسے اتنی ہی رقم دے گی۔اور وہی ٹوپی آپ کو بھجوادی۔باقی ابو جان بھی خیریت سے ہیں۔ان کا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔تمام آپ کو ڈھیروں سلام و دعا کہہ رہے ہیں۔پلوشہ بہن سے جونہی ملاقات ہوتی ہے اسے فوراً ہمارے بارے تفصیل سے بتلانا اور اسی رستے سے واپس بھیجنا۔ ان سے ملنے کو میرا بہت دل کرتا ہے۔اور ہاں میں آپ کو بتایا تھا نا کہ نصیر خان نے اپنے بیٹے سے میرا رشتا کرنے کے لیے دس لاکھ کی آفر کی تھی اور ابو جان نے پندرہ لاکھ مانگے تھے۔اب وہ پندرہ لاکھ دینے کو تیار ہو گیا ہے۔لیکن ابو جان نے سال ڈیڑھ کی مہلت مانگ لی ہے وہ فی الحال میری شادی نہیں کرنا چاہتے، شاید میں بھی یہی چاہتی ہوں۔اجازت چاہوں گی اپنا بہت بہت خیال رکھنا۔میری پیاری بہن پلوشہ کو جلد از جلد ڈھونڈنا۔اللہ پاک آپ کا حامی و ناصر ہو......از طرف گلگارے شمریز خان۔"

خط کے ہر لفظ سے محبت خلوص اور اپنائیت ٹپک رہی تھی۔رنڑا گڑیا کی بھیجی ہوئی ٹوپی تو میں نے اسی وقت سر پر اوڑھ لی۔خلوص اور اپنائیت کی چاشنی نے ان تحائف کو بہت قیمتی بنا دیا تھا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد، گلگارے کے بھیجے ہوئے کپڑے اور سوئیٹر پہن کر میں آگے جانے کے تیار تھا۔ کپڑے بالکل میرے ناپ کے مطابق تھے۔کمانڈر عبدالحق کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔

”میرا خیال ہے آپ کی یہاں زیادہ ضرورت ہے۔“
”صحیح کہا، مگر میرے علاوہ غزنی تک جانے کا مختصر رستہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے اور یوں بھی کمانڈر اسلام میری واپسی تک یہیں رہے گا۔“
”چلیں پھر بسم اللہ پڑھیں۔“ میں نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اور وہ سر ہلاتے ہوئے آگے ہو گیا۔
غزنی تک ہم نے پیدل ہی جانا تھا۔ میں نے رستے میں کافی وقت ضائع کر دیا تھا، نامعلوم البرٹ بروک وغیرہ اب تک غزنی میں تھے یا کہیں اور منتقل ہو گئے تھے۔ لیکن میرے پاس ان کے بارے یہی آخری معلومات تھی اس لیے مجھے ایک بار تو وہاں ضرور جانا پڑتا۔ وہاں جانے کے بعد ہی میں اگلی منزل کا تعین کر سکتا تھا۔
تھوڑا سا آگے آتے ہی میں نے پوچھا۔ ”یہاں سے ہم مرناہ گر جائیں گے؟“
”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم مرناہ گر، پکتیکا اور زرغون شہر وغیرہ کو نظر انداز کرتے ہوئے پہاڑیوں کے بیچوں بیچ مختصر رستوں سے آگے بڑھیں گے۔“
میں نے کہا۔ ”گردیز کیمپ بھی تو رستے ہی میں آتا ہے نا۔“
”نہیں وہ دوسری جانب ہے، اس سے کم وقت تو غزنی پہنچنے میں لگے گا۔“
”وہاں سے صغیر شہید پارٹی تو دو دونوں میں ہم تک پہنچ گئے تھے۔“
وہ گردیز سے ارگون اور سار و بی تک گاڑیوں میں آئے تھے۔ وہاں سے مختصر رستے پر مرناہ گر پہنچ گئے۔“
میں نے پوچھا۔ ”اس کا مطلب گردیز سے میران شاہ والا راستہ انھیں قریب پڑتا ہوگا۔“
”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بہت قریب پڑتا ہے اور گاڑی کا راستہ ہے، مگر وہ راستہ ہمارے لیے محفوظ نہیں اس لیے چکر کاٹ کر اس طرف سے آنا پڑتا ہے۔“
”ہونہہ!“ کر کے میں خاموش ہو گیا۔
اس نے میری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے پکتیکا کے مضافات میں موبائل فون کے سگنل بھی شروع ہو جاتے ہیں۔“
”اس کا مطلب آگے شہروں میں موبائل فون کے سگنل آتے ہیں۔“

”بالکل آتے ہیں۔AWCC یعنی افغانستان وائرلیس کمونیکیشن ،روشن،ADIA وغیرہ۔“

”پھر تو رابطوں میں سہولت رہتی ہوگی۔“

”بہت زیادہ۔“اس نے اثبات میں سر ہلایا۔”اوراب کام شروع ہے ان شاءاللہ جلد ہی سرحدی پہاڑوں پر بھی سگنل آنے شروع ہو جائیں گے۔“

میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔”گویا اس بہانے چچا شمریز اوران کے گھر والوں سے بات چیت ہو جایا کرے گی۔“

کمانڈر عبدالحق ہنسا۔”لگتا ہے بات کافی بڑھ گئی ہے۔“

”ہاں بھائی، بہت مخلص گھرانا ہے۔اس کے ساتھ انھوں نے میری زندگی بھی بچائی ہے۔“میں اسے اپنے برف باری میں پھنسنے کی تفصیلات بتانے لگا۔

عبدالحق نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔”یہ تو اللہ پاک کا نظام ہے،انسان کو وہاں سے دیتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔“

”بے شک۔“میں نے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔

عبدالحق ان رستوں کا شناور تھا۔اور پھر کافی عرصے سے اس کا واسطہ پہاڑوں سے پڑ رہا تھا تبھی وہ ڈھلان پر کافی تیزی سے حرکت کرتا تھا۔دوپہر ڈھلے ہم ایک چشمے کے کنارے دن کا کھانا کھا رہے تھے۔

کھانے کے بعد گرم قہوے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میں نے پوچھا۔”ویسے بہتر ہوتا کہ آپ مجھے نقشہ بنا کر دے دیتے۔“

”دراصل میں غزنی کے علاقے میں مصروف عمل مجاہدوں سے آپ کا رابطہ بھی کرانا چاہتا تھا۔“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔”کیا مطلب وہ کوئی اور مجاہد ہیں؟“

وہ مجھے سمجھاتا ہوا بولا۔”بالکل،افغانستان میں مختلف گروپ کفر سے برسر پیکار ہیں اور ہر گروپ کا علیحدہ کمانڈر ہے۔آپ کو تو بس ہمارے گروپ کے کچھ لوگ جانتے ہیں،باقی گروپس کے لیے آپ بالکل ہی انجان اور لاتعلق شخص ہوں گے۔“

میں نے پوچھا۔ ”تو کیا افغانستان میں کام کرنے والے تمام گروپس آپ کو جانتے ہیں۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن میں انھیں اپنی پہچان کرا سکتا ہوں، تمام چھوٹے کمانڈروں کے پاس بھی مختلف پاس ورڈز اور خفیہ معلومات ہوتی ہیں جن میں میں آپ کو حصہ دار نہیں بنا سکتا اسی وجہ سے مجھے خود آپ کے ساتھ سفر طے کرنا پڑا۔“

”ویسے افغانستان میں کتنے گروپ کام کر رہے ہیں۔“ قہوہ پی کر ہم آگے چل پڑے تھے۔

”کافی زیادہ گروپ ہیں.........“ وہ ان گروپوں کی تفصیل بتانے لگا۔ شام تک ہم ایک چھوٹی سی آبادی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ دونوں نے مشورے سے وہیں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ایک بھلے آدمی کے گھر سے ہمیں کھانا اور ٹھکانہ مل گیا تھا۔ صبح سویرے نماز پڑھ کر ہم نے ناشتا کیا اور اللہ پاک کا نام لے کر چل پڑے ۔اگلے دو دن ہم نے آرام سے سفر کرتے ہوئے رستے ہی میں گزارے تھے۔ اس دوران ہمیں دریائے غزنی بھی عبور کرنا پڑا۔ ہم دن کو سفر کرتے اور رات کو کسی کے مہمان بن جاتے۔ تیسرے دن سہ پہر ڈھلے ہم مجاہدین کے ایک خفیہ ٹھکانے تک پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر عبدالحق نے اپنی پہچان کروائی، فوراً ہمیں خوش آمدید کہا گیا۔

رات کے کھانے پر کمانڈر بسم اللہ جان ہماری آمد کی غایت پوچھ رہا تھا۔

”ایک ذاتی کام ہی سمجھ لو۔“ عبدالحق نے تفصیل بتانے سے گریز کیا تھا۔ شاید میری مرضی معلوم کیے بغیر وہ کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔

بسم اللہ جان نے تفصیل جاننے میں دلچسپی ظاہر کیے بغیر کہا۔ ”بس یہ بتا دیں کہ ہم کیا مدد کر سکتے ہیں۔“

عبدالحق نے کہا۔ ”فی الحال تو کوئی نہیں البتہ جب بھی کسی مدد کی ضرورت ہوئی آپ کو ضرور تکلیف دیں گے۔“

بسم اللہ جان خوش دلی سے بولا۔ ”خوش آمدید۔“

رات کو جب ہم بستر پر لیٹے تو میں کمانڈر عبدالحق کو مخاطب ہوا۔ ”میرا خیال ہے اب آپ کی ذمہ داری بھی ختم ہو گئی ہے۔“

”نہیں یار!......آپ جس دشمن کے خلاف کام کر رہے ہیں وہ میرا بھی اتنا ہی دشمن ہے۔“

”ویسے یہاں تک میں پہنچ تو گیا ہوں مگر کوئی لائحہ عمل ذہن میں نہیں آ رہا۔“میں نے اس موضوع پر مزید بات نہ کر کے گویا اس کی بات مان لی تھی۔

عبدالحق اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔”پہلے ان کے کیمپ کا جائزہ لے لیں پھر منصوبہ بھی بنا لیں گے۔“

☆......☆......☆

اگلے دن ہم نے اپنے ہتھیار مجاہدین کے ٹھکانے پر چھوڑے اور ایک رہنما کو ساتھ لے کر غزنی شہر کی طرف چل پڑے۔امریکن آرمی کا کیمپ شہر کے مضافات میں تھا۔کیمپ کیا پورا قلعہ تھا۔سیکیورٹی کے اتنے سخت انتظامات کہ حقیقتاً وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔امریکنز کی رہائش تک چار پانچ حفاظتی حصار بنے ہوئے تھے۔اتنی فول پروف سیکیورٹی دیکھ کر میرے دماغ میں کیمپ کے اندر گھسنے کا خیال بھک سے اڑ گیا تھا۔

”میرا خیال میں اندر گھسنے کی کوشش کرنا نری خودکشی ہی ہو گی۔“میں نے آنکھوں سے لگی دوربین کمانڈر عبدالحق کی طرف بڑھائی۔

میرے ہاتھوں سے دوربین لے کر اس نے آنکھوں سے لگانے کی زحمت کیے بغیر کہا۔”مجھے پہلے سے معلوم تھا،مگر میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ آپ خود جائزہ لے لیں۔“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔”آپ پہلے یہ کیمپ دیکھ چکے ہیں؟“

”نہیں۔“اس نے نفی میں سر ہلایا۔”اگر دیکھ چکا ہوتا تو اپنے ساتھ کسی رہنما کو کیوں لاتا،مگر ان کے تمام کیمپ اسی طرح سے فول پروف بنائے گئے ہیں اور یہ بھی باقی کیمپوں کی طرح ہی ہے۔امریکن بس اپنی فلموں ہی میں دلیری دکھا سکتے ہیں،حقیقتاً اتنے بزدل ہیں کہ میں بتا نہیں سکتا۔“

”کیا یہ کیمپ سے باہر نہیں نکلتے۔“

”نکلتے ہیں،مگر بہت کم اور خاطر خواہ انتظام کے بعد ایک قافلے کی صورت باہر آتے ہیں۔سب سے آگے ایک خصوصی گاڑی چلتی ہے جس میں جیمر نصب ہوتا ہے جس کی وجہ سے کوئی بھی ٹائم بم یا آئی ڈی وغیرہ چال نہیں کر سکتی۔اور اگر اتفاق سے آئی ای ڈی پھٹ بھی جائے تب بھی آگے والی گاڑی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔عقب میں چلنے والی گاڑیوں میں بھی کئی افغان اور امریکن ہتھیار بردار تیاری حالت میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ہیلی

کا پٹر بھی عموماً قافلے کے ساتھ ہی چلتا ہے۔“

میں نے پوچھا۔”پاکستان میں تو البرٹ بروک وغیرہ اتنا اہتمام نہیں کرتے تھے۔“

”کیونکہ وہاں وہ امریکنوں کی حیثیت سے سفر نہیں کرتے۔ وہاں وہ دہشت گردوں کی گاڑیوں میں چھپ کر حرکت کرتے ہیں اور کسی کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ان گاڑیوں میں کوئی امریکی جارہا ہے۔“

اس دن ہم امریکن کیمپ کا چاروں اطراف سے جائزہ لے کر واپس آ گئے۔ واپس پہنچتے ہوئے شام ہوگئی تھی۔ صبح ناشتے کے بعد سے ہم کچھ نہیں کھا سکے تھے، کیمپ پہنچتے ہی ہم نے سب سے پہلے کھانا کھانا پسند کیا۔ رات کو سونے سے پہلے ہم ایک مناسب لائحہ عمل ترتیب دے رہے تھے۔

میں نے کہا۔”بھائی مجھے اس کا ایک ہی حل نظر آ رہا ہے کہ ان کا کوئی اہم آدمی اپنے قبضے میں کریں اور پھر مذاکرات کے ذریعے اپنی شرائط منوالیں۔“

”صحیح کہا۔“ عبدالحق نے میری تائید میں سر ہلایا۔”مگر اصل مسئلہ ہی کسی اہم آدمی کو پکڑنے کا ہے۔ ان بزدلوں کے ہوٹل اور تفریح کے دوسرے انتظامات حفاظتی حصار کے اندر ہی کیے گئے ہیں۔ اس طرح نہ انھیں باہر نکلنا پڑتا ہے اور نہ انھیں کوئی خطرہ ہوتا ہے۔“

”ان کے کیمپ پر تو حملہ کیا جا سکتا ہے نا۔“

”شاید، مگر اس طرح ہم انھیں جانی نقصان تو پہنچا سکتے ہیں کسی کو پکڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ یہ حملہ دور سے راکٹ وغیرہ پھینک کر ہی کیا جا سکے گا۔ ورنہ کیمپ کے حفاظتی انتظامات تو آپ نے خود دیکھ ہی لیے ہیں۔“

”شہر میں خریداری وغیرہ کے لیے تو جاتے ہوں گے۔“

”ضرورت کا سامان انھیں کیمپ کے اندر ہی پہنچا دیا جاتا ہے۔ اور سامان لانے والے مخصوص افراد ہوتے ہیں جنھیں شناخت کے کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔“

”اب یہی طریقہ رہ گیا ہے کہ ان کے کسی قافلے پر گھات لگائی جائے۔“

”ہاں، لیکن وہ تب ہی ممکن ہے کہ ہمیں پہلے سے ان کے قافلے کے جانے کے وقت اور سمت کے بارے معلوم ہو جائے۔ اس صورت میں بھی ہمیں کمانڈر بسم اللہ جان کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔“

میں نے پوچھا۔"تو کیا کمانڈر ہماری مدد نہیں کرے گا؟"

"کیوں نہیں۔"

"بہتر تو یہی ہوگا کہ انھیں ساری بات بتا کر مشورہ مانگا جائے،شاید وہ کسی دوسری تجویز کی طرف رہنمائی کر دیں۔"

"ٹھیک ہے کل ان سے بات کریں گے۔" کمانڈر عبدالحق میرے ساتھ متفق ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن کمانڈر بسم اللہ جان صبح سویرے ہی کہیں نکل گیا تھا۔ان کی واپسی کہیں رات گئے ہوئی تھی۔یوں ایک دن بعد ہی ان سے بات ہو سکی۔ساری بات سن کر وہ گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔چند لمحوں بعد اس نے زبان کھولی۔

"ان کے قافلے تو پندرہ بیس دن بعد حرکت کر ہی لیتے ہیں،لیکن ایک تو ضروری نہیں کہ ہر قافلے میں کوئی اہم شخصیت موجود ہو۔اور دوسرا قافلے کی حفاظت کے لیے عموماً ہیلی کاپٹر بھی ساتھ چلتا ہے۔ایسی صورت میں قافلے پر حملہ تو کیا جا سکتا ہے کسی کو گرفتار کرنا مشکل ہوتا ہے۔"

میں پھیکے انداز میں بولا۔"گویا ہمارا منصوبہ کسی کام کا نہیں۔"

کمانڈر بسم اللہ جان نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔"ایک طریقہ تو ہے،لیکن اس میں زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔"

ہم نے بیک زبان پوچھا۔"وہ کیا؟"

"غیر ملکی میڈیا کے کافی نمائندے افغانستان کے بڑے شہروں میں موجود ہیں،اسی طرح ان شہروں میں کچھ دوسرے مقاصد سے آئے ہوئے امریکی شہری بھی موجود ہوتے ہیں.........."

"مگر ہمیں میڈیا کے نمائندوں یا عام امریکنز سے کیا مطلب۔" میں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔

کمانڈر بسم اللہ نے افسوس بھرے انداز میں سر ہلایا۔"میرا خیال ہے میری بات درمیان ہی میں ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ ”معذرت خواہ ہوں۔“

”تو میں کہہ رہا تھا کہ ان میں امریکن سی آئی اے کے کچھ ایجنٹ بھی چھپے ہوتے ہیں۔ اب ان سیکرٹ ایجنٹس کو کیسے پہچانا جا سکتا ہے اس بارے میں بس اتنی ہی رہنمائی کر سکتا ہوں کہ اس کے لیے ایسے افراد کی نگرانی کرنا پڑے گی اور یہ کافی تھکا دینے والا کام ہے۔“

”گویا اب مجھے جاسوس بننا پڑے گا۔“

”جی۔“ کمانڈر بسم اللہ جان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور شہر میں رہنے کے لیے آپ کے پاس اپنی شناخت موجود ہونا چاہیے یہ نہ ہو دوسروں کو پکڑتے ہوئے اپنی جان پھنسا بیٹھیں۔“

میں نے کہا۔ ”اب کام تھوڑا مشکل ہو گیا ہے۔“

”نہیں اس کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کر لیں گے۔“ عبدالحق نے مجھے تسلی دی۔

میں نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“ بسم اللہ جان بھی اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

عبدالحق نے کہا۔ ”افغانستان میں کافی کنسٹریکشن کمپنیاں کام کر رہی ہیں جن میں پاکستانی مزدور اور انجینئر وغیرہ کام کر رہے ہیں۔“

”تو۔“ میں نے مزید وضاحت چاہی۔

”آپ کسی بھی کمپنی میں بہ طور مزدور وغیرہ شامل ہو کر اپنے پاکستانی شناختی کارڈ پر آسانی سے گھوم سکتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ویزا وغیرہ بھی تو بنانا ہو گا نا؟“

”ویسے سردیوں میں تو کنسٹریکشن کمپنیوں کا کام ٹھپ ہو جاتا ہے۔“ اس سے پہلے کہ عبدالحق میرے سوال کا جواب دیتا بسم اللہ جان نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

”یہ امریکہ نہیں ہے کہ یہاں ویزوں کی اتنی جانچ پڑتال ہو اور نقلی ویزہ بنانا اتنا مشکل نہیں ہے۔ باقی کنسٹریکشن کمپنیاں سائیٹوں کا کام سردی کی وجہ سے روک دیتی ہیں لیکن تھوڑا بہت دفتری سٹاف موجود رہتا ہے۔“ عبدالحق نے ایک ہی سانس میں ہم دونوں کا اعتراض ختم کر دیا تھا۔

اس کے بعد ہم باقی تفصیلات طے کرنے لگے۔اگلے دن عبدالحق نے وہاں سے کابل جانا تھا کیونکہ اس کی واقفیت جس کنسٹریکشن کمپنی میں تھی وہ کابل کے مضافات میں کام کررہی تھی۔وہیں پر اس نے میرے لیے ویزہ وغیرہ بھی بنوانا تھا۔میں نے بھی اس کے ساتھ چلنے پر اصرار کیا تھا لیکن اس نے منع کر دیا کیونکہ میرا سڑک کے ذریعے کابل جانا کسی طور مناسب نہیں تھا۔خود عبدالحق کے پاس افغانستان کی شناخت موجود تھی۔

☆......☆......☆

اگلے دن کمانڈر عبدالحق مجھ سے اجازت لے کر رخصت ہوگیا۔جاتے ہوئے اس نے ایک کیمرے والے موبائل فون میں میری چند تصاویر کھینچ لی تھیں۔ایک مجاہد کو میں نے اپنے ذاتی کام میں گھسیٹ لیا تھا۔گو ان مجاہدین کی زندگی کا مقصد ہی کفر کے خلاف برسرِ پیکار رہنا ہے،لیکن ان کا طریقہ کار مختلف ہوتا ہے۔

اس کے جانے کے بعد ایک بار پھر میں فارغ تھا۔فروری کے وسط میں سردی کا زور ٹوٹنے لگتا ہے مگر یہاں ابھی تک سخت سردی پڑ رہی تھی۔کمانڈر عبدالحق نے یہی کہا تھا کہ اسے میرے کام میں ہفتے سے زیادہ وقت لگ جائے گا۔اب اسے ڈیڑھ ہفتہ بھی لگ سکتا تھا اور دو سے تین ہفتے بھی۔اس کی واپسی تک مجھے کوئی کام نہیں تھا۔خود کو مصروف رکھنے کے لیے میں فارغ اوقات میں مختلف ورزشیں کر کے وقت گزارتا رہتا۔اس طرح پلوشہ کی یادوں سے بھی کچھ افاقہ ہو جاتا اور کسرت بھی ہو جاتی۔

کمانڈر عبدالحق کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا جب ایک رات کمانڈر بسم اللہ جان میرے پاس آگیا۔میں سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔

”آپ غالباً سو رہے ہیں۔“ مجھے رضائی میں گھسا دیکھ کر وہ واپس مڑنے لگا۔

میں نے جلدی سے کہا۔”ارے نہیں بھائی آئیں بیٹھیں،فارغ آدمی کو اتنی جلدی کہاں نیند آتی ہے۔“

”اچھا۔“ کر کے وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”آپ کام میں مصروف ہوتے ہیں اس لیے آپ کے پاس نہیں بیٹھتا ورنہ میرا دل چاہتا ہے کہ رات گئے تک آپ کے ساتھ گپ شپ کروں۔“

”گویا فراغت آپ کو راس نہیں آرہی۔“ اس نے بہ ظاہر ہنستے ہوئے پوچھا۔نا معلوم کیوں مجھے اس کا لہجہ

معنی خیز لگا تھا۔

''آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں، مجھے مسلسل فارغ رہنا پڑ رہا ہے اور یہ بے کاری نرا سر درد ہی تو ہے۔''

''ویسے ایک کام تو ہے اس بہانے ہماری بھی مدد ہو جائے گی اور آپ کو بھی ملنے جلنے کا موقع مل جائے گا۔''اس کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ صرف اسی خاطر ہی میرے پاس آیا تھا۔اور گفتگو کا رخ اتفاقاً ایسے موضوع کی جانب مڑ گیا کہ اسے اپنی بات کرنے میں آسانی ہو گئی تھی۔

میں خوش دلی سے بولا۔''کمانڈر آپ بے جھجک کام بتائیں، اگر میرے بس میں ہوا تو انکار نہیں سنو گے۔''

''عبدالحق بھائی کہہ رہے تھے کہ آپ کا نشانہ بہت اچھا ہے۔''کام بتانے سے پہلے اس نے تصدیق کرنا ضروری سمجھا تھا۔

میں نے انکساری سے کہا۔''لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔''

اس نے متبسم ہو کر کہا۔''تو لوگوں کے سمجھنے کو نظر انداز تو نہیں کیا جا سکتا ناوہ کیا کہتے ہیں......

برا کہے جسے دنیا اسے برا کہیے

زبان خلق کو نقارہ خدا کہیے

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔''گویا آپ کے نزدیک اچھا نشانہ باز ہونا برائی کی علامت ہے۔''

وہ ترکی بہ ترکی بولا۔''بالکل، مخالفین کو ایسا آدمی بہت برا لگتا ہے۔''

''غالباً آپ یہی چاہتے ہیں کہ وہ مجھے برا ہی سمجھتے رہیں۔''میں نے جوابی وار کیا۔

''پرسوں ایک خصوصی تقریب منائی جا رہی ہے، محکمہ موسمیات کی پیشن گوئی کے مطابق اگلے تین چار دن موسم صاف رہے گا۔دھوپ سے لطف اندوز ہونے کے لیے یہ محفل ایک کھلی جگہ منعقد ہو گی۔ایک بڑا سا کیک کاٹا جائے گا اور اس دوران آپ ہمیں یقین دلا سکتے ہیں کہ دشمن آپ کو یونہی برا نہیں سمجھتے۔''آخری فقرہ اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''یہ پکی اطلاع ہے۔''میں ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''ہاں۔''اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”لیکن اس دن میں نے کمانڈر عبدالحق کے ساتھ کیمپ کا جائزہ لیا تھا۔مجھے تو کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں سے ہم کیمپ کے اندر موجود کسی شخص کو نشانہ بنا سکیں، کیونکہ کیمپ کے نزدیک جو دو ٹیکریاں ہیں وہاں افغان آرمی تعینات ہے۔“

وہ اطمینان سے بولا۔”جنوبی ٹیکری پر کل رات ہمارا قبضہ ہو جائے گا،سارا منصوبہ بنا لیا گیا ہے۔اور میرا خیال ہے کہ جنوبی ٹیکری سے کیمپ کے اندر مناسب طریقے سے فائر کیا جا سکے گا۔“

”شاید اس ٹیکری پر بغیر شور شرابہ کیے قبضہ نہ کیا جا سکے۔“میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔”ایک بھی گولی چل گئی تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔اور ہم نے وہاں کافی وقت گزارنا ہے۔“

وہ تیقّن سے بولا۔”ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا۔اس ٹیکری پر جو لوگ تعینات ہیں ان میں ہمارا ایک آدمی موجود ہے۔کل رات کو تمام کے کھانے میں زود اثر بے ہوشی کی دوا شامل ہو جائے گی اور اس کے بعد یقیناً کوئی مزاحمت کے قابل نہیں رہے گا۔“

”یہ سارا منصوبہ آپ نے میری نشانہ بازی کی وجہ سے بنایا ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔“

”ایسے منصوبے ہم وقتاً فوقتاً بناتے رہتے ہیں،کیونکہ ہم دشمن کو آرام سے رہنے نہیں دے سکتے۔ویسے یہ منصوبہ پچیس دسمبر کے لیے ترتیب دیا گیا تھا،لیکن موسم خراب ہونے کی وجہ سے جو تقریب کھلے میدان میں ہونا تھی وہ بند سٹیڈیم میں منائی گئی۔بس ہم نے اپنا جو آدمی وہاں تک پہنچایا تھا اسے کہہ دیا کہ وہ کسی مناسب موقع کی آمد تک وہیں ٹکا رہے۔اور اب وہ مناسب موقع آ گیا ہے۔ہم نے جو منصوبہ پہلے بنایا تھا اس کے مطابق ہم وہاں راکٹ فائر کرتے ہیں گو وہ تمام راکٹ اندازے سے فائر کیے جاتے ہیں اور کبھی کبھار ہی کوئی راکٹ نشانے پر لگتا ہے لیکن ہمارا اصل مقصد افراتفری پھیلانا اور انھیں یہ باور کراتے رہنا ہے کہ ہم موجود ہیں۔“

”تو یہ کام آپ کسی بھی وقت کر سکتے ہیں یوں کسی تقریب کا انتظار کرنے کا کیا مطلب؟“

”کیونکہ تقریب کے وقت تمام اکھٹے ہوتے ہیں اور ایک بھی راکٹ نشانے پر لگ جائے تو کافی تباہی پھیلا سکتا ہے،دوسرا ان کے جشن کے موقع پر ایسی کارروائی ان میں زیادہ مایوسی پھیلاتی ہے۔“

”میرے گولی چلانے سے تو ایک دم افراتفری پھیل جائے گی اور اس صورت میں میں تین چار سے زیادہ

افراد کو نشانہ نہیں بنا پاؤں گا۔ شاید آپ کے راکٹوں کو بھی ضائع کرنے کا باعث بن جاؤں۔‘‘

’’ہمارے پاس ایسے موقعوں کے لیے ون او سیون راکٹ ہیں جن کا لانچر نہیں ہوتا بس راکٹ ہی کو سیدھائی دے کر ہم مطلوبہ سمت میں ان کا رخ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یوں کبھی کبھار تو ایک آدمی کا بھی نقصان نہیں ہوتا اور کبھی چند افراد ہلاک ہو جاتے ہیں، جبکہ آپ کے فائر سے دو تین تو مردار ہو ہی جائیں گے۔ خاص کر بڑے آدمیوں کی موت سے ان کے مورال پر کافی اثر پڑے گا۔‘‘

’’جب تک میں تقریب کی جگہ کا فاصلہ ناپ نہیں لیتا تب تک یہ کہنا قبل از وقت ہوگا، کہ میں کتنوں کو نشانہ بنا سکتا ہوں۔ اس ضمن میں مجھے کچھ سامان بھی درکار ہوگا۔‘‘ اس کا سارا منصوبہ سمجھ میں آتے ہی میں نے اسے اپنی ضروریات سے آگاہ کرنا مناسب سمجھا۔

’’آپ اپنی ضروریات کے بارے بتائیں۔‘‘

’’سب سے پہلے تو ایک دور مار رائفل چاہیے ہوگی، اس کے ساتھ دوربین، ونڈ میٹر، لیزر رینج فائینڈر ....‘‘ میں اسے مطلوبہ سامان کے بارے تفصیل سے بتلانے لگا۔

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ’’چلیں میں آپ کو اپنے پاس موجود سامان دکھا دیتا ہوں جو چیز کم ہوگی اس کا بندوبست ان شاء اللہ کل ہو جائے گا۔‘‘

میں سر ہلاتا ہوا بستر سے نکل کر اس کے ہمراہ ہولیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک تہہ خانے میں موجود تھے۔ وہاں ہتھیاروں کے درمیان ڈریگنو اور گلیل سنائپر رائفل کے علاوہ رینج ماسٹر بھی موجود تھی۔ اور رینج ماسٹر کی موجودی میں دوسری رائفلوں سے مجھے کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ یہ تمام امریکن اور افغان فوجیوں سے چھینا گیا سامان تھا ۔سوائے ونڈ میٹر کے مجھے اپنے مطلب کی ہر چیز مل گئی تھی۔ یہاں تک کہ ایک اچھی کوالٹی کا سائیلنسر بھی موجود تھا

’’سامان تو قریباً مکمل ہی ہے۔‘‘ میں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلایا۔

کمانڈر بسم اللہ جان خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ’’ویسے ان میں سے کافی چیزیں ایسی ہیں جن کے استعمال کے بارے ہم نہیں جانتے تھے۔ ہمارے نزدیک وہ بالکل فالتو تھیں پھر بھی میں نے یہ سوچ کر رکھ چھوڑی تھیں کہ شاید کبھی کام آجائیں۔ آج لگتا ہے میرا یہ فیصلہ مفید ثابت ہوا۔‘‘

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب سب سے اہم کام یعنی فاصلہ ناپنا رہ گیا ہے کہ اس ٹیکری سے تقریب کی جگہ کا فاصلہ کتنا ہوگا۔''

''ویسے آپ کتنے فاصلے سے کسی آدمی کو نشانہ بنالیں گے۔''

''دو کلو میٹر۔'' میں نے رینج ماسٹر کی رینج کے مطابق کہا۔

''مطلب کمانڈر عبدالحق کی آپ کے بارے بتلائی گئی بات حقیقت ہے۔''

''اب میں کمانڈر عبدالحق کو جھوٹا تو نہیں کہہ سکتا نا۔'' میں نے لطیف انداز میں چوٹ کی اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

مجھے بستر تک پہنچا کر اس نے اجازت لی اور رخصت ہو گیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر رائفل کو صفر کر لیا تھا۔ سائیلنسر کی موجودی میں مجھے فائر کرتے ہوئے کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تھا۔ رینج ماسٹر رائفل کی تو بور سائیٹنگ بھی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب فائر کرنے کی سہولت موجود ہو تو بور سائیٹنگ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ (بور سائیٹنگ بغیر گولی چلائے رائفل کو صفر کرنے کا طریقہ ہے)

رات کو کمانڈر بسم اللہ جان اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ مذکورہ ٹیکری پر پہنچ گیا تھا۔ انھیں سارے افغان فوجی بے ہوش ہی ملے تھے۔ پوری پوسٹ قبضے میں لیتے ہی اس نے موبائل فون پر کال کر کے اپنے ساتھیوں کو مطلع کر دیا۔ اس کے ایک ساتھی نے مجھ تک بھی یہ اطلاع پہنچا دی تھی۔

میں نے صبح سویرے وہاں پہنچنا تھا۔ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی میں ایک ڈبل کیبن میں بیٹھا اس ٹیکری کی طرف روانہ تھا جہاں مجاہدین کا قبضہ ہو چکا تھا۔

ہم نے بہ مشکل آدھا راستہ طے کیا تھا کہ کمانڈر بسم اللہ جان کی کال آ گئی۔ اس نے میرے ساتھ بات کرنا چاہی۔ اور میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے موبائل فون میری جانب بڑھا دیا۔

وہ سلام وغیرہ کے بعد بولا۔ ''ذیشان بھائی!...... میرا خیال ہے یہاں آپ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔''

"کیوں؟" میں نے حیرانی کے اظہار میں دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ مایوس کن لہجے میں بولا۔ "میں نے اس جگہ کا فاصلہ ناپا ہے دو کلو میٹر سے زیادہ فاصلہ بن رہا ہے۔"

"یہ طے کرنا میرا کام ہے۔" ٹیکری کی بلندی ذہن میں لاتے ہوئے میں نے اس سے اتفاق نہیں کیا تھا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے میری آمد کو میری صواب دید پر چھوڑ دیا تھا۔

ڈرائیور بے خوف و خطر، گاڑی کو اس ٹیکری کے عقب میں لے گیا تھا۔ پہلے والی تین گاڑیاں بھی وہیں چھپا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ ہماری رہنمائی کے لیے دو آدمی ٹیکری سے نیچے آئے ہوئے تھے۔ ان کی ہدایات پر ڈرائیور نے گاڑی پہلے والی گاڑیوں کے ساتھ کھڑی کی اور ہم ان کی رہنمائی میں اوپر چڑھنے لگے۔ ٹیکری کے اوپر پہنچتے ہی کمانڈر بسم اللہ جان ہمیں اپنا منتظر نظر آیا۔ اس کے چہرے پر چھائے تاثرات یقیناً میرے منھ سے کوئی امید بھری خبر سننے کے خواہاں تھے۔ میں نے بھی اس سے مصافحہ کرتے ہی فاصلہ ناپنے والے آلے (لیزر رینج فائینڈر) کے متعلق دریافت کیا۔

"آئیں میرے ساتھ۔" وہ مجھے ساتھ لے کر پوسٹ کی شمالی جانب لے گیا۔ امریکن کیمپ بالکل ہی میرے سامنے تھا۔ ایک وسیع میدان کے بیچوں بیچ تقریب کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ دھوپ سے لطف اندوز ہونے کی خاطر شامیانے وغیرہ نہیں لگائے گئے تھے۔ یو کی شکل میں صوفہ سیٹ اور کرسیاں ترتیب سے لگائی گئی تھیں۔ ایک جانب چند چوڑی میزیں جوڑ کر کھانا وغیرہ رکھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ میں نے فاصلہ ناپنے والا آلہ تھامتے ہی ترتیب سے رکھے صوفوں کا فاصلہ ناپا۔ وہ بائیس سو میٹر تھا۔ جبکہ رینج ماسٹر کی کارگر رینج دو ہزار میٹر ہے۔

"کتنا فاصلہ ہے۔" فاصلہ ناپتے ہی میں نے کمانڈر بسم اللہ جان سے تصدیق چاہی۔

اس نے مایوسی بھرے انداز میں کہا۔ "بائیس سو۔"

اطمینان بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے میں نے اپ ہل، ڈاؤن ہل پروٹیکٹر کے ذریعے ہدف کا زاویہ معلوم کیا۔ وہ جگہ ہماری ٹیکری سے تیس ڈگری نشیب میں تھی۔ کوسائن فیکٹر کو استعمال کرتے ہوئے میں نے رائفل پر لگانے والی رینج معلوم کی جو کہ انیس سو پانچ میٹر بن رہی تھی۔

(اس سے پہلے غالباً میں بتا چکا ہوں کہ جب بھی کوئی سنائپر نیچے سے بلندی کی طرف یا بلند مقام سے نیچے کی

طرف فائر کرتا ہے تو وہ ہدف کی براہ راست پڑھی جانے والی رینج نہیں لگاتا بلکہ افقی رینج لگاتا ہے۔اس مقصد کے لیے اسے ہدف چاہے وہ نیچے ہو یا اوپر اس کا زاویہ درکار ہوتا ہے کہ سنائپر سے ہدف کی بلندی یا گہرائی کا کتنا زاویہ بن رہا ہے۔اور پھر اس زاویے اور فاصلے کو ایک مخصوص تناسب سے جمع تفریق کرنے سے مطلوبہ رینج معلوم ہو جاتی ہے۔قبیل خان کے جانشین سردار جہانداد خان کو میں نے اسی فارمولے کو بروئے کار لاتے ہوئے بلندی کی طرف فائر کر کے کیفر کردار تک پہنچایا تھا۔)

''میرا خیال ہے فائر کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب رہے گی۔''ایک ہموار سطح دیکھ کر میں نے کمانڈر بسم اللہ جان کو کہا۔''یہاں ایک کمبل وغیرہ بچھوا دیں تاکہ میں آرام دہ حالت میں لیٹ کر فائر کر سکوں۔''

اس نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔''کیا فاصلہ ناپنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہے؟''

''نہیں۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔''فاصلہ بائیس سو میٹر ہی بن رہا ہے۔لیکن نشیب میں ہونے کی وجہ سے رائفل پر رینج انیس سو میٹر لگے گی۔''

''وہ کیوں؟''اس کی حیرانی برقرار تھی۔

''اس کیوں کو کھوجنے کے لیے آپ کو میری شاگردی اختیار کرنا پڑے گی۔''ہنستے ہوئے میں رائفل کی میگزین بھرنے لگا۔

''اس کا فیصلہ آپ کے فائر کے بعد ہی کر سکوں گا۔''میرے پر اعتماد لہجے نے اسے خوش کر دیا تھا۔

میں نے برجستہ کہا۔''فائر کے بعد شاید میری پیش کش برقرار نہ رہے۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔''یہ بھی ممکن ہے فائر کے بعد مجھے ہی اپنے مطالبے سے دست بردار ہونا پڑے۔''

میں نے منھ بناتے ہوئے کہا۔''اب اتنے بھی برے دن نہیں آئے۔''

''چلو دیکھ لیں گے۔''

دو میگزینیں بھر کر میں نے رائفل کے ساتھ رکھیں۔اتنی دیر میں میری بتائی ہوئی جگہ پر ایک آدمی نے نرم کورین کمبل بچھا دیا تھا۔رائفل پر ٹیلی سکوپ سائیٹ لگا کر میں نے صوفوں کی جانب سیدھائی دی۔ایلی ویشن ڈرم پر مطلوبہ رینج لگائی اور رائفل کو کاک کر کے سیفٹی لگا دی۔اب بس ان کے آنے کی دیر تھی۔دھوپ خوب روشن

تھی تقریب کی جگہ پر ہلکی پھلکی چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ ملازم کھانے کی میز پر برتن وغیرہ لگا رہے تھے۔ کچھ صوفوں اوران کے سامنے پڑی شیشوں کی میزوں کو صاف کر رہے تھے۔

رائفل کو وہیں چھوڑ کر میں کھڑا ہو گیا۔ ''سادہ کپڑے کی چھوٹی سی جھنڈی درکار ہو گی۔''

''جھنڈی......؟'' بسم اللہ جان کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''ہاں۔'' میں وضاحت کرتا ہوا بولا۔ ''ونڈ میٹر نہیں ہے نا تو ہوا کی رفتار ناپنے کے لیے ایک جھنڈی سامنے لگوا دو۔''

''اب جھنڈے سے کیسے ہوا ناپی جائے گی؟'' کمانڈر بسم اللہ جان کی سمجھ میں میری بات نہیں آ رہی تھی۔ اور آ بھی کیسے سکتی تھی، یہ تو سنائپرز کے اپنے تجربات ہوتے ہیں اور وہ کوئی سنائپر تو نہیں تھا۔

میں اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''ہوا کی وجہ سے جھنڈے کا کپڑا اس کے ڈنڈے کے ساتھ ایک مخصوص زاویہ بناتا ہوا لہراتا ہے۔ ہوا جتنی تیز ہوتی ہے کپڑا اتنا ہی سیدھا اڑتا ہے۔ اس زاویے کو ناپ کر ہم سنائپرز اندازہ لگا لیتے ہیں کہ ہوا کی رفتار کیا ہے اور پھر رفتار معلوم کر کے ہم دائیں بائیں فرق ڈالنے والی ناب کے ذریعے ٹیلی سکوپ سائیٹ پر مناسب رینج لگا سکتے ہیں، اس طرح کہ ہوا گولی پر اثر انداز نہ ہو سکے۔''

''اتنے بکھیڑے، مجھ سے تو نہیں پالے جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''کامیاب فائر کرنے کے لیے ایسے بکھیڑے پالنا پڑتے ہیں کمانڈر جی۔'' کہتے ہوئے میں رہائشی بینکر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ''اپنے چہرے پر کپڑا لپیٹ لو، ہم نے افغان فوجیوں کو قتل نہیں کرنا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر چہرے پر مفلر لپیٹ لیا۔ اندر موجود مجاہدوں نے بھی اپنے چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ اس پوسٹ پر بیس کے قریب افغان فوجی موجود تھے۔ تمام کو انھوں نے باندھ دیا تھا۔ بسم اللہ جان کے دو مسلح ساتھی ان کی نگرانی کر رہے تھے اور باقی افغان فوجیوں کا اسلحہ، ایمونیشن اور دوسری کام کی چیزیں نیچے لے جا کر اپنی گاڑی میں لوڈ کر رہے تھے۔

اندر کا جائزہ لے کر ہم باہر نکل آئے۔ ایک طرف پلاسٹک کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان پر بیٹھ ہم وقت

گزارنے لگے۔تھوڑی دیر تک مجاہدین ایمونیشن اور ہتھیاروں وغیرہ کو دو گاڑیوں میں لوڈ کر چکے تھے۔آدھے افراد کو کمانڈر بسم اللہ جان نے واپس جانے کا حکم دیا کیونکہ فائر ہونے کے بعد ہم نے وہاں سے فرار ہونا تھا اور مناسب یہی تھا کہ اس سے پہلے سامان والی گاڑیاں اپنے ٹھکانے کی طرف بھیج دی جاتیں۔

تقریب والی جگہ پر لوگوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔رائفل کے پیچھے لیٹ کر میں لیوپولڈ سائیٹ کے سے تقریب والی جگہ کا جائزہ لینے لگا۔رینج ماسٹر کی ٹیلی سکوپ سائیٹ عام انسانی آنکھ سے پچیس گنا زیادہ طاقتور ہے۔اس میں پورا منظر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔آنے والے گورے سائیٹ کے اندر صاف نظر آ رہے تھے۔زیادہ تر تو صوفوں پر بیٹھ گئے تھے البتہ اکا دکا دائیں بائیں جوڑیوں میں کھڑے ہو کر بات چیت کر رہے تھے۔باوردی بیرے انھیں مشروبات پیش کر رہے تھے۔غالباً یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں ہو گی کہ وہ کون سا مشروب تھا۔افغان فوج کے چند آفیسر بھی مجھے صوفوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئے تھے۔ان کی پہچان مجھے فوجی وردی کی وجہ سے ہو پائی تھی۔اکا دکا خواتین بھی نظر آ رہی تھیں۔

میری نظریں پھسلتی ہوئی ایک لڑکی پر مرکوز ہوئیں اور میں چونک گیا۔الگ تھلگ بیٹھی ہاتھ میں پکڑے جام سے ہلکی ہلکی چسکیاں لے رہی تھی۔وہ میجر جینیفر ہنڈ سلے تھی۔لیکن اس وقت بھی وہ ٹریسی والکر کا روپ دھارے ہوئے تھی۔

تمام کے انداز سے یہی لگ رہا تھا کہ انھیں کسی کا انتظار ہے۔درمیان میں پڑا ٹو سیٹر صوفہ سیٹ خالی پڑا تھا اس کے ساتھ پڑے ہوئے سنگل سیٹ صوفوں پر دو آدمی بیٹھے تھے۔باقی تمام کرسیاں اور صوفے بھی تقریباً بھر چکے تھے۔

پھر ایک لمبے تڑنگے سفید سوٹ والے آدمی کی آمد پر تمام نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر اسے تعظیم دی تھی۔درمیان والے صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے اس نے تمام کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سب نے اپنی جگہ پر نشست سنبھال لی۔میں نے نظر بھر کر سامنے لگے جھنڈے کو دیکھا جو بالکل ہلکے انداز میں ہل کر واضح کر رہا تھا کہ ہوا کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی کہ گولی کو ہدف سے دائیں بائیں کر سکتی۔مطمئن ہو کر میں دوبارہ سائیٹ میں دیکھنے لگا۔جبکہ میرے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے نے سیفٹی ہٹا دی تھی۔

”ذیشان بھائی !......میرا خیال ہے مزید انتظار فضول ہوگا۔“ میرے ساتھ لیٹے بسم اللہ جان نے بھی فائر کرنے کا عندیہ دیا۔

میں نے درمیانی صوفے پر پھیل کر بیٹھے آدمی کے چہرے پر نشانہ سادھتے ہوئے کہا۔”میرا بھی یہی خیال ہے۔بس مہمان خصوصی کا انتظار تھا۔“ یہ کہتے ہی میں نے سانس روکا اور ایک جھٹکے سے ٹریگر دبا دیا۔اس وقت وہ گلاس کو منہ کی طرف لے جا رہا تھا لیکن اس کے مقدر کا رزق یقیناً پورا ہو چکا تھا تبھی گلاس کے ہونٹوں تک پہنچنے سے پہلے رینج ماسٹر کی گولی اس کے ماتھے تک کا سفر طے کر چکی تھی۔طاقت ور گولی نے اس کی کھوپڑی کا دایاں حصہ ہی اڑا دیا تھا۔

”وہ مارا۔“ بسم اللہ جان نے پر جوش انداز میں نعرہ لگایا۔مگر میں نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر رائفل کو دوبارہ کاک کر کے دائیں جانب بیٹھے ہوئے آدمی کی طرف بیرل کا رخ موڑا تمام لوگ ایک لمحے کے لیے سن ہو گئے تھے۔میرے فائر کرنے سے پہلے دائیں اور بائیں جانب بیٹھے ہوئے دونوں آدمی صوفے پر تڑپنے والے کو مدد دینے کے لیے اس کے قریب ہوئے ،مگر وہ ہر قسم کی مدد سے دور جا چکا تھا۔دائیں جانب والے آدمی کے ساکت ہوتے ہی میں نے دوبارہ ٹریگر دبایا اور وہ آدمی بھی اپنی کھوپڑی کے چوتھائی حصے سے ہاتھ دھو بیٹھا ۔رینج ماسٹر کی گولی اس کی کھوپڑی سے گزر کر بائیں طرف موجود آدمی کے کندھے کو بھی زخمی کر گئی تھی۔ایک نے جان سے ہاتھ دھوئے جبکہ دوسرا زخمی ہو کر تڑپنے لگا تھا۔صوفے سے نیچے گرنے کی وجہ سے مجھے اس کا صحیح نشانہ نہیں مل رہا تھا۔اس پر وقت ضائع کیے بغیر میں دوسروں کو نشانہ بنانے لگا۔سرعت سے میں نے میگزین میں موجود باقی تین گولیاں فائر کیں۔میرا نشانہ زیادہ تر وہ بنے جو شاک کی سی کیفیت میں اپنی جگہ پر ہکا بکا بیٹھے یا کھڑے رہ گئے تھے۔

میگزین خالی ہوتے ہی میں نے نئی میگزین لگائی اور رائفل کاک کر کے اپنا اگلا شکار ڈھونڈنے لگا۔وہاں چیخ و پکار مچ گئی تھی۔کچھ لوگ صوفوں کے عقب میں پناہ لے رہے تھے۔کچھ بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔اور کچھ ہمدردی دکھاتے ہوئے تڑپنے والوں کی مدد کی کوشش کر رہے تھے۔میری انگلی نے دو مرتبہ ٹریگر دبا کر مزید دو کو ان کے انجام تک پہنچایا۔اسی دوران مجھے وہ زخمی ہمت کر کے اٹھتا ہوا نظر آیا۔اس کے کندھے میں تو اتفاق سے گولی

لگی تھی البتہ اس کے سر میں میں جان بوجھ کر گولی اتارنا چاہتا تھا۔اس کے سیدھا ہوتے ہی میری بیرل کا رخ اس کی جانب گھوما اسی وقت کوئی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا کہ وہ جینیفر تھی۔زخمی کو اپنے جسم کے پیچھے چھپاتے ہوئے اس کی نظریں اسی جانب اٹھی تھیں جہاں ہم موجود تھے۔وہ زبردست سنائپر تھی اور اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کس جگہ سے فائر کیا جا رہا ہے۔مگر پھر بھی اس کا یوں بے وقوفوں کے انداز میں کسی کو بچانے کے لیے اپنے جسم کی آڑ مہیا کرنا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

اچانک ایک خیال میرے ذہن میں لہرایا اور میں چونک گیا۔”کیا اس نے پہچان لیا تھا کہ فائر کرنے والا میں ہوں اور اسی وجہ سے یوں دلیرانہ انداز میں میرے کھڑی ہو گئی تھی۔“

اسی وقت ایک دوسرا آدمی ان کے قریب پہنچا۔یقیناً وہ جینیفر کی وجہ سے ہمت کر کے قریب آیا تھا۔اور یہ بہادری اسے مہنگی پڑی۔جونھی جینیفر کی نظر اس پر پڑی اس نے چیخ کر اسے واپس جانے کو کہا۔گو اس کے الفاظ تو میرے کانوں تک نہیں پہنچے تھے مگر اس کے ہاتھوں کے اشارے اور انداز سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔مگر اس کی یہ نصیحت یا مشورہ بے سود رہا تھا۔جب تک دوسرے کی سمجھ میں جینیفر کی بات آتی، رینج ماسٹر کی گولی اسے سمجھا چکی تھی۔اس کے بائیں کان کے ساتھ لگنے والی گولی نے اسے دائیں جانب اچھال دیا تھا۔اس کا آدھا جسم صوفے پر اور آدھا نیچے تھا اس حالت میں تڑپتے ہوئے وہ کافی مضحکہ خیز نظر آ رہا تھا

میں نے دوبارہ رائفل کاک کی لیکن جینیفر وہاں سے ہٹنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہی تھی۔میرے ہمراہ لیٹے ہوئے کمانڈر بسم اللہ جان نے کہا۔”ذیشان بھائی!......دوران جنگ،لڑائی میں شامل عورتوں مردوں کی تخصیص ختم ہو جایا کرتی ہے۔“یقیناً وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ میں جینیفر کے عورت ہونے کی وجہ سے اس پر گولی نہیں چلا پا رہا۔اس کی بات سن کر مجھے لگا کہ میں جینیفر پر گولی نہ چلا کر کچھ غلط کر رہا ہوں۔اس وقت میں اس سے ہونے والی آخری ملاقات کو سوچ رہا تھا جب میں نے اسے بتایا تھا کہ اس کے سامنے آنے کی صورت میں میں اس پر گولی چلانے سے خود کو نہیں روک پاؤں گا۔اور اب اپنے الفاظ پر عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔میں نے دل ہی دل میں ”الوداع جینی!“ کہا اور میری انگلی کا دباؤ ٹریگر پر بڑھنے لگا۔

......۞......۞......

کوشش کے باوجود میں ٹریگر نہیں دبا سکا تھا۔میں نے رائفل کے بٹ پر ماتھا ٹیک دیا۔
مجھے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر کمانڈر بسم اللہ جان ایک مرتبہ پھر بولا۔''کیا سوچ رہے ہو اتنا وقت نہیں ہے۔''
اسے جواب دیے بغیر میں نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن میرے دل میں نہاں اس کی محبت مجھے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔مجھ سے ملنے کی خاطر اس نے وہاں تک آنا گوارا کیا تھا اور اب میں کیسے اس کی جان لے لیتا
''ذیشان بھائی اٹھو چلیں۔''بسم اللہ جان زیادہ انتظار نہیں کر سکا تھا۔مجھے کہتے ہی وہ اپنے ساتھیوں کو مخاطب ہوا......''راکٹ فائر کردو۔''
جینیفر کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں نے ایک سرسری نظر صوفوں کی قطار پر گھمائی۔ایک کونے میں چھپے شخص کی کھوپڑی نظر آ رہی تھی۔
کاک شدہ گولی سے اسے چھپنے کی ضرورت سے بے نیاز کرتے ہوئے میں اٹھ گیا۔کمانڈر بسم اللہ جان مجھ سے پہلے کھڑا ہو گیا تھا۔
''ذیشان بھائی!......ان کا کافی نقصان ہو چکا ہے،تھوڑی دیر تک وہ پوری قوت سے یہاں حملہ کر دیں گے۔اور یقیناً ہیلی کاپٹر کی وجہ سے ہمیں نا قابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔''
میری سمجھ میں اس کا تیزی کرنا آ گیا تھا۔میں نے رائفل کو کھولے بغیر کندھے پر رکھا اور نیچے کی طرف دوڑ لگا دی۔اس وقت تک بسم اللہ جان کے ساتھی راکٹ فائر کر چکے تھے۔
دس منٹ میں میں نیچے پہنچ گیا تھا۔بسم اللہ جان اور اس کے ساتھی بھی میرے قریب پہنچ چکے تھے۔رائفل کو میں نے ڈبل کیبن کی عقبی نشست پر رکھا۔بسم اللہ جان ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے تیزی سے درختوں کے جھنڈ سے نکالی اور ایک مخصوص جانب بڑھتا گیا۔اس کے باقی ساتھی دوسری گاڑی میں بیٹھ کر ہمارے پیچھے ہی چل پڑے تھے۔دو گاڑیاں اسلحے وغیرہ کی بھر کر وہ پہلے ہی وہاں سے بھیج چکے تھے۔

کمانڈر بسم اللہ جان سیدھا چلتا رہا۔وہ کچا رستہ آگے جا کر ایک سڑک سے مل گیا تھا۔وہاں پر اس کے ساتھی ہم سے مخالف سمت مڑ گئے۔

''باقیوں نے اپنی سمت تبدیل کر لی ہے۔''میں نے بسم اللہ جان کو مطلع کرنا مناسب سمجھا تھا۔

''انھوں نے ہمارے ساتھ نہیں جانا۔'' مجھے مطلع کرتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملانے لگا۔رابطہ ہوتے ہی اس نے مختصراً کہا۔''ہم آرہے ہیں۔''اور جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کرتے ہوئے ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چار پانچ کلومیٹر کے بعد اس نے گاڑی سڑک سے اتار کر پہاڑی کے دامن میں نظر آنے والے دو گھروں کی طرف موڑ دی وہ سڑک سے چھے سات سو گز دور تھے۔ان گھروں کے قریب گاڑی روکتے ہوئے وہ بولا ۔''رائفل اٹھالو۔'' کلاشن کوف اس نے ہاتھ میں پکڑ لی تھی۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے عقبی نشست پر پڑی رینج ماسٹر اٹھالی۔گاڑی کو رکتے دیکھ کر ایک گھر سے درمیانی عمر کا ایک مرد بھاگتے ہوئے باہر نکلا۔ہم سے رسمی مصافحہ کر کے اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی واپس سڑک کی جانب موڑ لی۔

''چلو۔''بسم اللہ جان نے مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔دروازے پر ایک بوڑھا بابا ہمیں منتظر نظر آیا۔ دونوں سے معانقہ کر کے اس نے خوش آمدید کہا۔اسی وقت بسم اللہ جان نے مجھے اس ٹیکری کی طرف متوجہ کیا جہاں دو ہیلی کاپٹر اڑتے نظر آرہے تھے۔انھوں نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی میری نظر دو تین کم عمر بچوں پر پڑی جو صحن میں کھیل رہے تھے۔ایک کمرے کے دروازے سے ایک جواں سال عورت کا چہرہ جھلک رہا تھا، مجھے اپنی جانب متوجہ پا کر وہ چہرہ غائب ہو گیا۔ہم بوڑھے کی معیت میں چلتے ہوئے ایک ایسے کمرے میں داخل ہوئے جو خوب سجا ہوا تھا۔اندر داخل ہو کر وہ رکا نہیں بلکہ آگے بڑھتا گیا۔کمرے سے ملحق غسل خانے میں گھس کر اس نے ہمارے اندر داخل ہونے کا انتظار کیا ۔جونھی ہم بھی اندر گھسے اس نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔غسل خانے کی چاروں دیواروں پر پلاسٹک کی زرد رنگ کی شیٹ لگی ہوئی تھی۔دروازہ بند کر کے اس نے دروازے کے عقب میں آنے والی شیٹ کو ہٹایا اور دیوار کو دھکیلا تو

وہ پیچھے ہٹتی چلی گئی دیوار ہٹتے ہی تنگ سا دروازہ نظر آیا۔ وہ بوڑھا اندر داخل ہو گیا اس کے پیچھے پیچھے بسم اللہ جان اور سب سے آخر میں میں تھا۔ اس تنگ سی گیلری کا اختتام سیڑھیوں پر ہوا جو نیچے جا رہی تھیں۔ بارہ سیڑھیاں اتر کر ہم زیر زمین کمرے میں پہنچے کافی کھلا تہہ خانہ تھا۔ شمالی اور جنوبی دیواروں پر ٹنگے دو بلب تہہ خانے کو خوب روشن کیے ہوئے تھے۔ چاروں دیواروں کے ساتھ ایک ایک چارپائی لگی ہوئی تھی جن پر صاف ستھری چادریں بچھی ہوئی تھیں۔ دو چارپائیوں پر موٹی رضائیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ شاید انھیں ہماری تعداد کے بارے بسم اللہ جان پہلے سے آگاہ کر چکا تھا۔ درمیان میں لکڑی کی ایک میز بھی نظر آ رہی تھی جس پر ہاتھ سے کڑھائی کی ہوئی ایک سفید چادر بچھی تھی۔

بوڑھے نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے رینج ماسٹر کو ایک چارپائی پر رکھا اور خود دوسری چارپائی پر نشست سنبھال لی۔

ہمارے بیٹھتے ہی بوڑھے نے پوچھا۔ ''چائے یا قہوہ۔''

''بہرام چچا! ہم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔'' کمانڈر بسم اللہ جان نے کسی قسم کے تکلف کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

بہرام سر ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔

''ذیشان بھائی بہت عمدہ۔'' بوڑھے بہرام کے باہر جاتے ہی بسم اللہ جان نے تحسین آمیز لہجے میں گفتگو کی ابتدا کی۔

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''بتایا تھا نا شاگرد بنانے کی پیش کش محدود مدت کے لیے ہے۔''

بسم اللہ جان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب تو میں زبردستی شاگرد بنوں گا۔''

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ویسے سچ تو یہ ہے کہ اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ کسی کو سکھا سکوں۔''

''یہ قدرتی صلاحیت ہوتی ہے ذیشان بھائی، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کے سکھانے پر بھی ہم آپ کی طرح نشانہ باز نہیں بن سکتے۔''

''ہم گاڑی پر یہاں سے دور بھی نکل سکتے تھے۔'' میں نے صفائی سے موضوع تبدیل کیا۔

”بہت مشکل تھا۔ دیکھا نہیں تھا اس پوسٹ پر دو ہیلی کاپٹر پہنچ گئے تھے۔ اور اب تک کافی ساری گاڑیاں بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ سڑکوں کی ناکا بندی بھی ہو گئی ہو گی۔ وہ سارے علاقے کا گھیراؤ کر لیں گے۔ اس لیے جب تک ہماری تلاش کی سرگرمی مانند نہیں پڑتی، ہمیں چند دن یہیں گزارنے پڑیں گے۔“

میں نے پوچھا۔”جو آدمی ہماری گاڑی لے گیا ہے اسے کوئی کچھ نہیں کہے گا؟“

اس نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔”نہیں اس کے کاغذات وغیرہ مکمل ہیں، یہ گاڑی بھی اسی کے نام پر ہے۔ اس وقت اس نے ایک آدمی کو گھر سے اٹھا کر ائیر پورٹ پہنچانا ہے۔ اس پر کسی صورت کوئی بات نہیں آ سکتی۔“

”یہ سب کچھ آپ نے پہلے سے طے کیا ہوا تھا۔“

”پہلے ہی سے طے کرنا پڑتا ہے یار!“

”بہ قول آپ کے ہم یہاں چند دن رہیں گے، اس دوران کمانڈر عبدالحق واپس آ گیا پھر؟“

”اس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی ہم نکل چلیں گے۔ ورنہ خواہ مخواہ خطرہ مول لینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔“

”ٹھیک ہے۔“میں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا دیا۔

”برا نہ مناؤ تو ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو۔“میں اسے حیرانی سے گھورنے لگا۔

”آپ نے اس لڑکی کو کیوں کچھ نہیں کہا۔ حالانکہ وہ آپ کے لیے نہایت آسان ہدف تھی۔“ وہ میجر جینیفر ہنڈسلے کے بارے مستفسر تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ وہ میرے لیے کیا تھی۔

میں نے کہا۔”آپ نے اس وقت مجھے اس پر گولی چلانے کی ترغیب بھی دی تھی۔ ویسے آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نے اس پر نشانہ سادھا ہوا ہے۔“

”آپ اتنی تیز رفتاری سے فائر کر رہے تھے اچانک ہی آپ رک گئے۔ اور دوربین میں مجھے بھی وہ لڑکی واضح نظر آ رہی تھی، کہ باقی لوگ چھپنے کے لیے بھاگتے پھر رہے ہیں اور وہ سینہ تانے کھڑی ہے۔ کوئی وجہ تو تھی نا۔ اس وقت مجھے یہی لگا کہ آپ عورت سمجھ کر اس پر گولی نہیں چلا رہے۔ لیکن بعد میں سوچا تو معاملہ کچھ اور لگا

۔کیوں کہ کوئی امریکن عورت اتنی دلیر نہیں ہوسکتی جو یوں اکڑ کر ایک سنائپر کے سامنے کھڑی رہے جبکہ دائیں بائیں اس کے کئی ساتھیوں کی لاشیں بھی بکھری پڑی ہوں۔سب سے بڑھ کر ہماری جانب یوں دیکھ رہی تھی جیسے ہم اسے نظر آرہے ہوں۔''

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے کہا۔''وہ میجر جینیفر ہنڈ سلے ہے۔میرے ساتھ اس نے سنائپر کورس کیا ہے اور افغانستان کے محاذ پر وہ مجھے ملنے کی خاطر ہی پہنچی ہے۔''

''اسے کیا معلوم کہ آپ افغانستان میں ہیں اور یہ کہ ابھی فائر کرنے والے آپ ہی ہیں۔اور آپ کو کیسے معلوم کہ وہ آپ کی خاطر یہاں پہنچی ہے۔''وہ ایک ہی سانس میں کئی سوال کر گیا تھا۔

''گزشتہ کئی ماہ سے میں وزیرستان میں مصروف تھا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ دہشت گردوں کا اصلی سرپرست امریکہ ہی ہے وہاں وزیرستان میں جس دہشت گرد سے میرا ٹکراؤ ہوا وہ امریکنز کا خاص پرزہ تھا۔اس کی اور اس کے جانشین کی موت کے بعد مجھے ایک جرگے میں سامنے آنا پڑا، وہیں سے میری تصویر امریکنز تک پہنچ گئی۔چونکہ میں سال بھر پہلے ہی امریکہ سے سنائپر کورس کر کے آیا تھا اس لیے مجھے پہچاننے میں انھیں کوئی دقت نہ ہوئی۔میجر جینیفر امریکہ کی خفیہ ایجنسی کی میجر ہے اور مجھ سے محبت کی دعوے دار بھی۔پس مجھے امریکہ کے لیے کام کرنے پر راضی کرنے کے لیے وہ افغانستان آنے پر تیار ہوگئی............''میں نے جینفر کے متعلق تمام ضروری باتیں کمانڈر بسم اللہ جان کے سامنے دہرادیں۔

میری بات کے اختتام پر اس نے پرخیال انداز میں سر ہلایا۔''تو وہ آپ کو ہمارے خلاف استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔''

''ہوں۔''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ویسے یہ بات اب تک بھی واضح نہیں ہوئی کہ اس میجر کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ فائر کرنے والے آپ ہیں۔''

''جتنی دور سے انھیں نشانہ بنایا جا رہا تھا، شاید جینی کے نزدیک اتنے فاصلے سے میں ہی کسی کو نشانہ بنا سکتا ہوں۔''

''اب کی ہے کام کی بات۔''وہ چہکا۔''ویسے ایک حبشن سے عشق لڑانے کا خیال آپ کو کیسے آیا۔اتنی دور

سے بھی اس کی بدصورتی مجھ پراثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکی۔''

یقیناً طاقت ور دوربین سے جینیفر کے ٹریسی والکر کے روپ کی کالک اسے واضح ہوگئی تھی۔

میں نے سنجیدہ انداز میں کہا۔''کمانڈر!......اگر آپ نے اس کی اصل شکل دیکھ لی تو جو پہلا خیال آپ دماغ میں آئے گا وہ یہی ہوگا کہ اسے مسلمان کر کے نکاح پڑھاؤں یا اہل کتاب سے نکاح پڑھوانے کی اجازت سے فائدہ اٹھایا جائے۔''

''مذاق کر رہا تھا یار!''میری سنجیدگی کو اس نے غصے پر محمول کیا تھا۔

''مگر میں مذاق نہیں کر رہا، بلاشک وشبہ وہ ایسی ہی ہے۔''اسی وقت بوڑھا بہرام خان کھانے کے برتن اٹھائے اندر داخل ہوا۔اور ہم چپ ہو گئے۔

ہمارے کھانا کھانے کے دوران بہرام چاچا قہوہ بنا کر لے آیا تھا۔قہوہ پی کر میں نے بہرام چاچا سے رائفل صاف کرنے کے لیے کپڑا مانگا اور رینج ماسٹر کو کھول کر صاف کرنے لگا۔بسم اللہ جان آرام کرنے لیٹ گیا تھا۔

☆......☆......☆

چند دن ہمیں وہیں گزارنے پڑ گئے تھے۔اس دوران کمانڈر بسم اللہ جان موبائل فون پر بھی محتاط انداز میں گفتگو کیا کرتا تھا۔شہر بھر میں مجاہدین کی تلاش میں کافی چھاپے مارے گئے مگر دشمنوں کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ان کا کافی نقصان ہوا تھا۔نو آدمی بشمول ایک کرنل اور لیفٹیننٹ کرنل کے ہلاک ہوئے تھے اور ایک لیفٹیننٹ کرنل زخمی ہوا تھا۔زخمی ہونے والا وہی تھا جسے میجر جینیفر ہنڈ سلے کی بدولت رعایت ملی تھی۔مرنے والے قریباً سارے آفیسر ہی تھے۔بس ایک افغانی فوجی غلطی سے مارا گیا تھا۔وہ بھی اس وجہ سے کہ اس کا باقی جسم صوفے کے عقب میں چھپا تھا اور صرف اس کا سر آڑ سے باہر نظر آ رہا تھا۔مرنے والے سینئر کا نام جان مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔وہ کرنل کولن فیلڈ تھا۔یقیناً وہ وزیرستان میں حلیہ تبدیل کر کے آیا تھا۔یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں پر اس کے بہروپ میں کوئی اور آیا ہو اور اس کا صرف نام استعمال کیا گیا ہو۔البرٹ بروک بھی مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔شاید وہ بھی حلیہ تبدیل کر کے مجھے ملتا رہا تھا یا پھر وہ وہاں موجود ہی نہیں تھا۔جینیفر تو ٹریسی والکر کے حلیے میں مجھے نظر آ گئی تھی۔اتنے فاصلے سے شکلیں بالکل واضح تو نظر نہیں آتیں لیکن جس کے ساتھ کچھ وقت بتایا

جا چکا ہو اس کی پہچان مشکل نہیں ہوتی ۔شکل وصورت ،جسمانی خال وخد اور حرکات وسکنات بھی کسی آدمی کی پہچان میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

جینیفر کے معاملے میں میرے دل میں ایک اور دھڑکا بھی موجود تھا۔اگر اس نے مجھے پہچان لیا تھا تو وہ یہ بات اپنے سینئرز کو بتا سکتی تھی۔اور اتنے اہم آدمیوں کی اموات کے ذمہ دار کو یقیناً وہ پہلی فرصت میں مروانا پسند کرتے ۔لیکن پھر اپنی جینی سے مجھے یہ بات بعید نظر آئی کہ وہ مجھے مروادے گی۔اگر وہ سینہ تان کر میرے سامنے کھڑی ہوسکتی تھی تو مجھے بھی یہ حق حاصل تھا کہ وہ میرے خلاف کسی کارروائی کی ذمہ دار نہ بنتی۔

اس کارروائی کے بعد کمانڈر بسم اللہ جان نے اپنے تمام ساتھیوں کو انڈر گراؤنڈ ہو جانے کا حکم دے دیا تھا ۔خود میں اور وہ بھی ہفتہ بھر اسی تہہ خانے میں چھپے رہے۔اس دوران بہرام چاچا اور اس کا بیٹا دلگیر خان ہماری ضروریات کا خیال رکھتے رہے۔کمانڈر عبدالحق ابھی تک نہیں لوٹا تھا اس وجہ سے مجھے بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔

حالات کے تھوڑا سا سازگار ہوتے ہی ہم دلگیر خان کی گاڑی میں بیٹھے اپنے ٹھکانے کا رخ کر رہے تھے ۔رینج ماسٹر اور بسم اللہ جان کی کلاشن کوف دلگیر خان ایک دن پہلے بسم اللہ جان کے خفیہ اڈے تک پہنچا چکا تھا ۔اس وقت ہمارے پاس اپنی حفاظت کے لیے ایک ایک پستول موجود تھا۔ہم کسی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر پہاڑوں میں چھپے خفیہ اڈے تک پہنچ گئے تھے۔ہمیں پہاڑ کے دامن میں اتار کر دلگیر خان وہیں سے رخصت ہوگیا ۔ہم جب غار در غار ٹھکانے کے پاس پہنچے تو ہمیں پر جوش طریقے سے خوش آمدید کہا گیا۔انھوں نے منصوبہ اتنا بڑا نہیں بنایا تھا جتنا کہ دشمن کا نقصان کر چکے تھے۔اور اس کارروائی کا روحِ رواں میں تھا۔اس سے پہلے کمانڈر عبدالحق انھیں میری نشانہ بازی کے کافی واقعات سنا چکا تھا مگر حالیہ واقعہ کے تو وہ خود شاہد تھے۔ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی دور سے یوں کامیاب نشانہ بازی ممکن ہو پائے گی۔

☆......☆......☆

عبدالحق کو گئے ہوئے تین ہفتے ہو گئے تھے۔اس نے کچھ زیادہ ہی وقت لے لیا تھا۔

تیسرے ہفتے کے اختتام پر وہ لوٹ آیا۔اس تک بھی میرے حالیہ کارنامے کی خبر پہنچ گئی تھی۔ ملتے ساتھ اس نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے شاباش کہا تھا۔وہ بھی کامیاب لوٹا تھا۔رات کو آرام کے لیے لیٹتے وقت وہ تفصیل

بتانے لگا۔ ہماری کارروائی کی تفصیلات وہ پہلے ہی باریک بینی سے کرید چکا تھا۔ مجھے ان تفصیلات کو جاننے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی کہ اس نے کس طرح میرے ویزے وغیرہ کا بندوبست کیا اور کیسے ایک کنسٹریکشن کمپنی میں جگہ پیدا کی۔ اس کا خیریت اور کامیابی سے لوٹ آنا ہی میرے لیے کافی تھا۔ ویزے کی ضمن میں خرچ ہونے والی رقم میں نے اس کے حوالے کر دی تھی۔ اب میرے پاس لے دے کے گلگارے بہن کی دی ہوئی رقم ہی باقی بچی تھی۔ اور غزنی جانے کے لیے مجھے پیسوں کی اچھی خاصی ضرورت پڑ سکتی تھی بہر حال وہ بعد کا مسئلہ تھا اس بارے میں کچھ نہ کچھ کر ہی لیتا، فی الحال مجھے آگے کا لائحہ عمل طے کرنا تھا۔

جینیفر سے رابطے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی ورنہ مجھے اتنے پاپڑ بیلنے نہ پڑتے۔ مجھے اپنی بے وقوفی پر غصہ آنے لگا، اگر آخری ملاقات میں، میں نے اس سے رابطہ نمبر لے لیا ہوتا تو اتنا مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔

☆......☆......☆

اس کے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی میں بھی اندر گھس گیا۔ اس سے دو میزیں چھوڑ کر مجھے خالی نشست مل گئی تھی۔ بیرے کو قہوہ لانے کا بتا کر میں بہ ظاہر سرسری نظر ہوٹل کے ہال میں دوڑانے لگا۔

میں پچھلے ایک ہفتے سے غزنی میں موجود تھا۔ میری شناخت کے کاغذات پورے تھے۔ آتے وقت کمانڈر بسم اللہ جان نے چند ساتھیوں کے پتے دیے تھے، جن سے میں ضرورت کی کوئی چیز بھی مانگ سکتا تھا۔ کسی کے گھر میں پناہ لینے کے بجائے میں نے ایک سستے سے ہوٹل میں رہنا پسند کیا تھا۔ کیونکہ بغیر اشد ضرورت کے میں کسی کو تنگ کرنا یا خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ دوسرا امریکن تھا جس کا میں تعاقب کر رہا تھا۔ اس سے پہلے میں ایک امریکن صحافی کے پیچھے تین دن تک پڑا رہا تھا مگر وہ بندہ صاف نکلا، اب یہ دوسرا تھا اور اس کی بھی کوئی مشکوک حرکت نظر نہیں آئی تھی۔ وہ سارا دن غزنی کے مضافات میں گھومتا، مختلف مقامات کی تصاویر لیتا، مقامی لوگوں سے ملاقات کرتا۔ یوں جیسے وہ کوئی خاص رپورٹ تیار کر رہا ہو۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس ایک نائن ایم ایم پستول موجود تھا جو مجھے کمانڈر بسم اللہ جان سے ملا تھا۔ اس پستول سے فائر کر کے میں نے اس کے ٹھیک ہونے کی اچھی طرح تسلی کر لی تھی۔

شام تک میں اسی صحافی کے تعاقب میں لگا رہا۔ اندھیرا چھانے پر میں اپنے ہوٹل میں لوٹ آیا تھا۔ چونکہ

مسلسل ایک ہوٹل میں رہنا مجھے مشکوک کر سکتا تھا اس وجہ سے میں دو تین دن سے زیادہ کسی ہوٹل کو اپنا مسکن نہیں بنا تا تھا۔صبح میرا ارادہ کابل جانے کا بن رہا تھا کیونکہ غزنی میں مجھے اپنے مقصد کا حصول مشکل نظر آنے لگا تھا۔

رات کا کھانا میں ہوٹل کے ہال ہی میں بیٹھ کر کھاتا اور اس بہانے وہاں موجود لوگوں پر نظر بھی ڈال لیا کرتا ۔کھانا کھانے کے دوران ایک مقامی آدمی پر میری نظر پڑی ،اس نے چہرے پر مفلر کی طرح کالے رنگ کی چادر لپیٹی ہوئی تھی ۔داخلی دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے ایک طائرانہ نگاہ ہال میں دوڑائی ۔اس کی نظر ایک لمحے کے لیے مجھ پر رکی اور پھر دائیں بائیں کا جائزہ لے کر وہ مجھ سے دو ٹیبل چھوڑ کر بیٹھ گیا۔چال ڈھال سے وہ کچھ دیکھا بھالا لگ رہا تھا، مگر میرے ذہن میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کہاں دیکھا ہے ۔گو اس معاملے میں میری یاداشت بہت تیز ہے اور کوئی ایسا آدمی جس سے میرا ہلکا سا بھی واسطہ رہ چکا ہو مجھے بھولتا نہیں ہے،لیکن ذہن پر زور دینے کے باوجود مجھے یاد نہیں آسکا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔شاید چہرے سے لپٹی ہوئی چادر کی وجہ سے میں اسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔کھانا کھا کر میں نے قہوہ پیا،اس دوران اس نے بھی اپنے لیے قہوہ منگوالیا تھا۔قہوہ پی کر بھی وہ وہیں بیٹھا رہا۔یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کن اکھیوں سے مجھے ہی دیکھ رہا ہے۔

جونھی میں نشست چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا میں نے اسے بھی استقبالیہ کا رخ کرتے دیکھا۔کمرے میں پہنچ کر میں نے چابی کے سوراخ سے آنکھ لگا دی ۔اندازے کے مطابق تھوڑی دیر بعد ہی مجھے گیلری میں قدموں کی آہٹ سنائی دی جو میرے کمرے کے سامنے آکر رک گئی ۔چابی کے سوراخ سے بھی مجھے اسی کے کپڑوں کا رنگ نظر آرہا تھا۔میں فوراً دروازے سے ایک طرف ہوا کیونکہ مجھے شک تھا کہ وہ چابی کے سوراخ سے اندر جھانکنے کی کوشش کرے گا۔مگر میرے اندازے کے برعکس دروازے پر ہلکی سی۔''ٹھک ٹھک۔'' ہوئی۔

پستول ہاتھ میں تھام کر میں نے اسے چھپانے کے لیے جسم پر چادر لپیٹی اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

''اسلام علیکم ذیشان بھائی!''اس نے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا تھا۔اب اسے پہچاننے میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔اس کا نام تو میں نہیں جانتا تھا البتہ امریکی کیمپ پر حملے کے وقت وہ میرے ساتھ ہی تھا۔

''آپ۔''میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے اسے اندر آنے کا موقع دیا۔اس کے اندر گھستے ہی میں نے دروازہ بند کر دیا۔

”بیٹھو۔“ لکڑی کی پرانی سی کرسی کی طرف اشارہ کر کے میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”شکریہ۔“ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گیا۔

”آپ کا نام مجھے نہیں آتا۔“

”احمد۔“

”تو احمد بھائی وہیں ہال ہی میں مل لیتے۔ مجھے ایسے ہی ڈرا دیا۔“

”میں نے سوچا آپ مجھے نہیں پہچان پائیں گے۔اور اپنا تعارف کرانے کے لیے علیحدگی کی ضرورت تھی۔“

”ہوٹل میں گھستے ہی میں نے آپ کو پہچان لیا تھا۔بس چہرہ چھپا ہونے کی وجہ سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں دیکھا ہے۔“

”آپ کا پتا مجھے کمانڈر سے معلوم ہوا ہے اور انھی نے مجھے آپ سے ملنے کا کہا ہے۔“

میں نے پوچھا۔”خیریت۔“

”ہاں خیریت ہے،ایک مشکوک شخص کے بارے اطلاع دینا تھی۔“

”تو موبائل فون پر بتا دیتے۔“ کمانڈر بسم اللہ جان نے ایک موبائل فون بھی میرے حوالے کیا تھا۔

”مناسب یہی ہے کہ میں دور سے اس کی شکل آپ کو دکھا دوں۔“

میں نے پوچھا۔”ابھی جانا پڑے گا۔“

”جی۔“اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

تھوڑی دیر بعد آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ہوٹل سے تھوڑی دور آتے ہی ہم اکٹھے ہو گئے تھے۔مجھے ساتھ لیے وہ پیدل ہی ایک جانب روانہ ہو گیا۔امریکی کیمپ پر حملے کے بعد وہ چھپنے کے لیے شہر میں آ گیا تھا۔یہاں اس کا اپنا گھر موجود تھا۔مجھے کمانڈر بسم اللہ جان نے جن آدمیوں کے پتے دیے تھے ان میں ایک احمد بھی تھا لیکن یہاں آ کر میں کسی سے بھی نہیں ملا تھا۔اس کی گفتگو کا لب لباب یہی تھا کہ کمانڈر بسم اللہ جان کے دو مخبروں کی لاشیں ایک دن کے فرق کے ساتھ غزنی کے مضافات سے ملیں۔مخبر عموماً دونوں جانب سے ملے ہوتے ہیں اس لیے انھیں اپنا راز نہیں بتایا جاتا۔دونوں کو مارنے سے پہلے تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا

۔ان میں سے ایک کا تعلق افغان آرمی سے تھا۔اوراس نے مرنے سے ایک دن پہلے کمانڈر بسم اللہ کے ساتھی بلال سے بات کر کے اپنے تعاقب کی بابت مطلع کیا تھا۔ہر مخبر کے سامنے ایک ہی آدمی کو سامنے لایا جاتا ہے جو اس مخبر سے رابطے میں رہتا ہے۔اوراس فوجی کے ساتھ بلال کا رابطہ تھا۔وہ چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا۔بلال نے اسے چھٹی ختم کر کے واپس حاضر ہونے کا مشورہ دیا تھا،لیکن اگلے ہی دن شہر کے مضافات سے اس کی لاش ملی تھی۔بلال فوراً زیرزمین ہوگیا،البتہ جانے سے پہلے اس نے فوجی کا تعاقب کرنے والے کی پہچان احمد کو کرادی تھی۔گزشتہ روز ایک دوسرے مخبر کی لاش ملی۔دوسرے نے بھی کئی بار مجاہدین کو کام کی خبریں پہنچائی تھیں۔دوسرا ایک صحافی تھا۔ کمانڈر بسم اللہ جان کو شک تھا کہ دونوں قتل ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔اس نے احمد کو مجھ سے رابطہ کر کے مخبر کا تعاقب کرنے والے کی بابت بتانے کا کہا۔اوراب احمد مجھے اسی مقصد سے وہاں لے جارہا تھا۔مشکوک شخص کے ٹھکانے تک احمد تمام تفصیل دہرا چکا تھا۔وہ غزنی کے بہترین ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔رات اتنی نہیں بیتی تھی۔ہوٹل کا ہال تقریباً بھرا ہوا تھا۔ہم بھی ایک کونے میں خالی میز کے گرد بیٹھ گئے۔

''دوسری منزل کمرہ نمبر بتیس اے میں رہتا ہے۔کرس کارٹر نام ہے۔شاید کھانے کے لیے نیچے ہال میں آجائے۔''دائیں بائیں نظریں دوڑاتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔''اگر میں نہ ہوتا تو آپ اس کے ساتھ کیا کرتے۔''

''ایسے جاسوسوں کو ہم بھی معاف نہیں کرتے۔''اسی وقت بیرہ ہمارے قریب آیا۔

''دوکافی۔''احمد نے اس کے دریافت کرنے سے پہلے بتادیا اور وہ سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گیا۔احمد مجھے ہوٹل کے بارے ضروری باتیں بتانے لگا۔کافی پی کر بھی ہم کافی دیر بیٹھے رہے۔اور پھر ہم مایوس ہو کر اٹھنے ہی لگے تھے کہ احمد ایک دم میری طرف جھکا۔

''وہ سفید سوٹ والا سیڑھیوں سے اتر کر آرہا ہے۔''میں غیر محسوس انداز میں اس طرف متوجہ ہوا۔گھٹے ہوئے مضبوط جسم اور لمبے قد والا ایک آدمی مجھے سیڑھیوں سے اترتا دکھائی دیا۔ہال میں طائرانہ نظر دوڑا کر وہ ایک خالی میز کی طرف بڑھ گیا۔اس کے نشست سنبھالنے تک چاق و چوبند بیرہ اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔اس کے آرڈر دینے تک بدیسی لباس میں ملبوس ایک مقامی حسینہ سیڑھیاں اترتی ہوئی اس کے قریب پہنچی اور بے تکلفی

سے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ لڑکی کی پیٹھ ہماری جانب تھی۔ اس کے انداز سے واضح نظر آ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی رہائش پذیر ہے۔

''یہ کون ہے۔'' کن اکھیوں سے اسے گھورتے ہوئے میں احمد سے مستفسر ہوا۔

''اس طرح کی کئی لڑکیاں یہاں مل جاتی ہیں بس جیب کا منھ کھولنا پڑتا ہے۔''

''میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔'' وہاں مزید بیٹھنا مجھے مناسب نہیں لگا تھا۔

اثبات میں سر ہلاتے ہوئے احمد نے بیرے کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اور بل ادا کر کے ہم وہاں سے باہر نکل آئے۔ کرس کارٹر لڑکی سے محو گفتگو تھا لیکن اس کی آنکھیں کسی سرچ لائیٹ کی طرح چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

ہوٹل سے نکلتے ہی میں نے کہا۔ ''مجھے کچھ رقم چاہیے۔''

''چلو۔'' وہ مجھے ساتھ لے کر ایک پلازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں لگی اے ٹی ایم مشین سے مطلوبہ رقم نکال کر اس نے میرے حوالے کی اور ہم واپس مڑ آئے۔

میرے ہوٹل کا رخ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟''

''صبح اس ہوٹل میں کمرہ لوں گا باقی لائحہ عمل بعد کا مسئلہ ہے۔''

''اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا۔'' اس نے پر خلوص لہجے میں آفر کی۔

''موٹر سائیکل مل جاتی تو اس کے تعاقب میں آسانی رہتی۔ لازماً اس کے پاس ذاتی یا کرائے کی گاڑی ہو گی۔''

''ضرور ملے گی۔ مگر اتنی سردی میں موٹر سائیکل کی سواری کچھ مشکل ہو جاتی ہے۔ میں خود ٹیکسی میں آتا جاتا ہوں۔''

''مجبوری ہے، شاید بر وقت ٹیکسی نہ مل پائے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''صحیح کہا۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم ہوٹل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو اشارہ کر کے روکا۔ اندر بیٹھتے ہی وہ اپنے گھر کا پتا بتانے لگا۔ وہ پتا پہلے سے میری یاداشت

میں محفوظ تھا کہ بسم اللہ جان اس کا پتا میرے حوالے کر چکا تھا۔البتہ میں نے وہاں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

گھر کے سامنے اتر کراس نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا اور اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

میں نے پوچھا۔''ساتھ کون رہتا ہے۔''

وہ مسکرایا۔''تمھاری بھابی۔''

اسی وقت اندر سے قدموں کی چاپ ابھری اور ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔''کون؟''

اس نے جواب دیا۔''احمد، میرے ساتھ مہمان بھی ہے۔''

دروازہ کھلتے ہی میری نظر ایک جواں سال خاتون پر پڑی جس نے مہمان کا سن کر چہرہ ڈھانپ لیا تھا صرف اس کی آنکھیں چادر کے عقب سے جھلک رہی تھیں۔اس پر نظر پڑتے ہی میں نے سر جھکا لیا تھا۔وہ بھی دروازہ کھول کر پیچھے مڑ گئی۔

''احمد بھائی!......چائے پانی کا تکلف نہ کرنا۔''میں نے فوراً اسے منع کیا۔''بلکہ موٹر سائیکل باہر ہی لے آؤ۔''

''ایک پیالی قہوہ، سردی کے ساتھ مقابلہ کرنے میں مدد دے گا۔''

''پھر کسی وقت سہی۔''

''ٹھیک ہے۔''مجھے وہیں رکنے کا اشارہ کر کے وہ اندر گھسا اور لمحہ بھر بعد موٹر سائیکل لیے باہر نکل آیا۔اس کے ہاتھوں میں چمڑے کے دستانے اور موٹر سائیکل کے سیفٹی گارڈ کے ساتھ لٹکا ہیلمٹ دیکھ کر میں نے سکھ کا سانس لیا تھا کہ سردی کے موسم میں بغیر دستانوں اور ہیلمٹ کے موٹر سائیکل چلانا ایک عذاب ہی ہوتا ہے۔

اس سے الوداعی مصافحہ کر کے میں واپس ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔

وہ رات میں نے اسی ہوٹل میں گزاری۔کابل جانے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا تھا۔نو دس بجے کے قریب ناشتا کر کے میں اپنا مختصر سامان اٹھا کر نکل آیا۔دوسرا ہوٹل اتنی دور نہیں تھا کہ مجھے ٹیکسی وغیرہ کا تکلف کرنا پڑتا۔پندرہ بیس منٹ میں میں وہاں پہنچ گیا تھا۔ہوٹل کے ہال مجھے اکا دکا گاہک ہی نظر آئے۔ایسے ہوٹلوں کی رونق

رات کے وقت دیکھنے والی ہوتی ہے۔

استقبالیے پر جا کر میں نے کمرے کا پوچھا۔ نچلی منزل میں ایک کمرہ خالی تھا مگر میں نے دوسری منزل پر کمرہ لینا پسند کیا تھا۔

کمرے کی چابی میرے جانب بڑھاتے ہوئے استقبالین معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”سر اگر کوئی خاص خدمت درکار ہو تو بلا تکلف حکم کرنا۔“

”ضرور۔“ چابی پکڑتے ہوئے میں نے منھ بنایا۔ اس کی خاص خدمت سے میں ناواقف نہیں تھا۔ لیکن اس طرح کی غلیظ خدمتوں سے میں یونھی بہتر تھا۔

تین دنوں کا ایڈوانس کرایہ جمع کرا کے میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر کمرے میں گزار کر میں ہوٹل کے ہال میں آن بیٹھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری بے خبری میں وہ باہر نہ نکل جائے۔ ایک سنائپر کو جاسوس بننا پڑ گیا تھا۔

گو انتظار دنیا کا پر اذیت کام ہے، مگر سنائپر بے چارے کا تو انتظار کے ساتھ بہت مضبوط رشتہ ہے۔ اپنے شکار کے انتظار میں سنائپر کو کئی کئی گھنٹے بلکہ دن گزارنے پڑ جاتے ہیں۔

آہستہ آہستہ ہال میں بیٹھے لوگوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ میں دو مرتبہ چائے منگوا کر پی چکا تھا۔ اسی اثناء میں دوپہر کے کھانے کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ میں نے بھی کھانا منگوا لیا اور پھر بہ مشکل کھانے سے فارغ ہوا تھا کہ میں نے کرس کارٹر کو سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ رات والی تتلی بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ وہ اب بھی سکن ٹائیٹ پاجامے اور بہ مشکل ناف تک آتی شرٹ میں ملبوس تھی۔ البتہ سردی کی وجہ سے گھٹنوں تک آتے فر کے کوٹ نے چھپنے کے کافی تقاضے پورے کر دیے تھے۔ کوٹ سامنے سے کھلا ہونے کی وجہ سے مجھے دور ہی سے اس کے پیٹ کی سفیدی نظر آ گئی تھی۔ ہال میں رکنے کے بہ جائے وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ اسے دیکھتے ہی میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر بیرے کو بل لانے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ان کے دروازے کے قریب پہنچنے تک میں نے بل دستخط کر کے واپس بیرے کی طرف بڑھایا اور ان کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

میرے دروازے سے نکلنے تک وہ پارکنگ میں پہنچ کر سفید رنگ کی کار میں بیٹھ رہے تھے۔ میں ان پر توجہ

دیے بغیر موٹر سائیکل کی طرف بڑھ گیا۔ میرے موٹر سائیکل ان لاک اور اسٹارٹ کرنے تک وہ پارکنگ سے نکل کر سیمنٹ کی روش پر چڑھ چکے تھے۔ میں نے ان کے سڑک تک جانے کا انتظار کیا اور پھر موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔

شہر میں کسی کا تعاقب کرنے کے لیے موٹر سائیکل ایک بہترین سواری ہے۔ میں محتاط انداز میں کار کا تعاقب کرتا رہا۔ مگر وہ شاید شاپنگ وغیرہ کے لیے نکلے تھے۔ دو تین پلازوں میں گھوم پھر کر انھوں نے تھوڑی بہت خریداری کی اور واپس چل پڑے۔ اس دوران میں سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا رہا تھا، مگر کرس کارٹر کی کوئی مشکوک حرکت میری نظر میں نہ آسکی۔

اسے ہوٹل کی پارکنگ میں مڑتے دیکھ کر میں آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر میں واپس ہوٹل کی جانب مڑ آیا۔

ہال میں مجھے وہ نظر نہیں آئے تھے۔ میں استقبالین کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی تک صبح والا آدمی بیٹھا تھا۔

''جی سر!'' وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

''ایک چھوٹا سا کام پڑ گیا تھا۔''

''حکم کریں۔'' ایک آنکھ میچتے ہوئے اس نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''ابھی دو منٹ پہلے ایک گورے کے ساتھ براؤن کوٹ میں ملبوس ایک تتلی یہاں سے گزری ہے، مجھے تو مقامی لگ رہی تھی۔ حقیقت میں ایسا ہی ہے یا میری نظر کا قصور ہے۔''

''بڑی تیز نظر ہے آپ کی۔'' اس کے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''بہر حال حکم کریں۔''

''میرا دل ساتھ لے گئی ہے، وہی واپس لینا تھا۔''

''ہاہاہا۔'' اس نے کھلے دل سے قہقہہ لگایا۔ ''ویسے اس سے بڑھیا مال بھی موجود ہے۔''

میں نے منھ بنایا۔ ''بڑھیا مال خاک پسند آئے گا جب دل کسی اور کے قبضے میں ہو۔''

''پھر تو معذرت خواہ ہوں، کیونکہ وہ ہمارے ہوٹل سے تعلق نہیں رکھتی۔''

''دھت۔'' میں نے بیزاری بھرے انداز میں استقبالیہ کاؤنٹر پر مکا رسید کیا۔

''اگر وہ ہمارے ہوٹل کی ہوتی تب بھی گورے کی مرضی کے بغیر کسی گاہک کو وقت نہ دے پاتی۔''

''کہیں اکیلی بھی جاتی ہے یا وہ خبیث ہر وقت ساتھ ہی چپکا رہتا ہے۔''

''کبھی دیکھا نہیں ہے، البتہ آپ کا رقیب کافی دفعہ اکیلے بھی نکل جاتا ہے۔''

''اگر میں کہوں کہ جب بھی وہ یا لڑکی اکیلے کہیں جائیں تو مجھے فوراً معلوم ہو جائے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے جیب سے سو ڈالر کا نوٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

سو ڈالر کے نوٹ کو حریص نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ جلدی سے بولا۔''صبح دس سے شام چھ بجے تک آپ کو یہ اطلاع بغیر کسی رکاوٹ کے مل سکتی ہے۔''

''آپ کا نام؟''میں نے نوٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''شان علی۔''نوٹ جھپٹتے ہوئے اس نے جیب میں ڈال لیا تھا۔

''میں اپنے کمرے میں منتظر رہوں گا۔'' اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔سارا دن ہوٹل کے ہال میں بیٹھنے سے بہتر تھا کہ نگرانی کا کام میں کسی اور سے لیتا۔یوں بھی میں نے گورے کے بجائے اس لڑکی میں دلچسپی ظاہر کی تھی تا کہ شان کو کوئی شک نہ ہو۔

شام چھ بجے کے قریب مجھے انٹرکام پر شان علی کی کال موصول ہوئی۔''سر!......میں چھٹی کر رہا ہوں آپ کا رقیب اور تتلی کمرے ہی میں ہیں۔''

''شکریہ۔'' کہہ کر میں نے رسیور رکھا اور تیار ہو کر باہر نکل آیا۔یوں بھی کافی آرام کر لیا تھا۔آٹھ بجے تک میرا کوفت زدہ انتظار جاری رہا۔آٹھ بجے وہ اس لڑکی کے ہمراہ نیچے ہال میں آ کر بیٹھ گیا۔کھانا کھا کر دونوں تھوڑی دیر بیٹھے رہے۔ان کے دوبارہ کمرے کا رخ کرنے پر بھی میں وہیں بیٹھا رہا کہ کہیں وہ اکیلا نہ لوٹ آئے ۔مگر مزید آدھا گھنٹا انتظار کے بعد بھی اسے واپس نہ آتے دیکھ کر میں کمرے کی طرف بڑھ گیا۔میرے اندازے کے مطابق اتنی رات گئے وہ باہر نہ جاتا۔

دروازہ کنڈی کر کے میں بہ مشکل بوٹ اتار پایا تھا کہ موبائل فون بجنے لگا۔سکرین پر کمانڈر بسم اللہ جان کا نام چمک رہا تھا۔

”اسلام علیکم۔“میں نے کال وصول کی۔

”وعلیکم اسلام! آپ کہاں ہیں؟“اس کی آواز میں شامل گھبراہٹ مجھے حیران کرگئی تھی۔

”اسی ہوٹل میں جہاں ہمارادوست مقیم ہے۔“

وہ سرعت سے بولا۔”فوراً وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو،احمد صبح سے غائب ہے،شاید آپ بھی ان کی نظروں میں آگئے ہوں۔“

”مگر......“

”تفصیل بتانے کاوقت نہیں ہے ذیشان بھائی!“اس نے قطع کلامی کی۔

”ٹھیک ہے۔“رابطہ منقطع کرتے ہوئے میں وہاں سے نکلنے کا سوچنے لگا۔شاید میں نے دیر کردی تھی احمد کے ان کے ہتھے چڑھنے کا ایک ہی مطلب ہوسکتا تھا کہ میں کل سے ان کی نظروں میں ہوں۔اور یقیناً اسی وجہ سے کرس کارٹر نے بھی اپنے کسی آدمی سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ان کی نظروں میں آئے بغیر میں ہوٹل سے نکل نہیں سکتا تھا۔البتہ یہ ممکن تھا کہ وہ صرف میری نگرانی کررہے ہوتے اور میں باہر نکل کر انھیں جل دے کر بھاگ جاتا لیکن اس کے بعد کرس کارٹر میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔یقیناً میرے غائب ہونے کے بعد وہ بھی منظر عام سے ہٹ جاتا بہتر یہی تھا کہ میں اسے یرغمال بنا کر ہوٹل سے اڑن چھو ہونے کی کوشش کرتا۔ایک نتیجے پر پہنچ کر میں نے پستول کی نال پر سائیلنسر چڑھایا اور جسم پر چادر لپیٹ کر باہر نکل آیا۔گیلری سنسان پڑی تھی۔کمرہ نمبر بتیس اے تک میں دبے قدموں چلتا ہوا پہنچا۔دائیں بائیں دیکھ کر میں نے گیلری کے خالی ہونے کا یقین کیا اور سائیلنسر کو لاک کے ساتھ لگا کر ٹریگر دبادیا۔

”ٹھک۔“کی آواز ابھرتے ہی میں دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔وہ دونوں ایسی حالت میں نہیں تھے کہ کمرے سے باہر ہونے والی۔”ٹھک۔“انھیں متوجہ کرسکتی۔یقیناً کرس کارٹر کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں ایسی جرات کا مظاہرہ کروں گا۔میرے آندھی وطوفان کی طرح اندر گھسنے پر وہ ہڑبڑا گئے تھے۔لڑکی کے

منھ سے سریلی چیخ برآمد ہوئی مگر اس وقت تک میں دروازہ بھیڑ چکا تھا۔

''تولیہ لپیٹ لو۔'' میں نے ہکابکا بیٹھی لڑکی کو اس کی بے لباسی کی طرف متوجہ کیا۔

اس نے ہڑبڑاتے ہوئے تولیہ اٹھا کر لپیٹ لیا تھا۔

''تم اسی طرح کھڑے ہو جاؤ۔'' کرس کارٹر کو میں انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔

''یقیناً تمھیں اپنی جان عزیز نہیں ہے۔'' کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

میں ہنسا۔''یہ کسی صحافی کا لہجہ تو نہیں ہے۔''

میری بات پر وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا تھا۔

اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے کہا۔''گھوم جاؤ۔'' وہ آہستہ سے گھوم گیا۔

''اپنے ہاتھ پیچھے باندھ لو۔'' میں نے اگلا حکم دیا۔یہ کہتے ہوئے میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

ہاتھ پیچھے لاتے ہوئے وہ ایک دم میری طرف مڑ کر پستول پر جھپٹا۔مجھے اس سے اسی قسم کی کارروائی کی توقع تھی۔پستول والا ہاتھ نیچے کرتے ہوئے میں نے پستول کو اس کی دست برد سے بچایا اس کے ساتھ ہی میرا بایاں مکا نیم دائرہ بناتا ہوا اس کی ٹھوڑی کی طرف بڑھا۔اس کی سمجھ میں کچھ آنے سے پہلے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔وہ لہراتا ہوا منھ کے بل نیچے گر گیا۔اگر فرش پر دبیز قالین موجود نہ ہوتا تو یقیناً اس کا تھوبڑا ٹیڑھا ہو گیا ہوتا۔

''کھڑی ہو جاؤ۔'' میں نے پستول کی نال سے لڑکی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔اسے میں پشتو میں مخاطب کر رہا تھا۔وہ لرزتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ایسی لڑکیوں کی بزدلی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہوتی۔

''اس طرف۔'' میں نے پستول کی نال سے اسے غسل خانے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

''مم...... مجھے جانے دو میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' وہ باقاعدہ کانپنے لگ گئی تھی۔

''تعاون کرو گی تو یقیناً جان بچ جائے گی۔''

وہ پر جوش لہجے میں بولی۔''میں ہر قسم کے تعاون پر تیار ہوں۔'' میری بات کا اس نے الٹا مطلب لیا تھا۔

''ہر قسم کا تعاون چھوڑو،بس تھوڑی دیر غسل خانے میں گزار لو۔'' اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے میں نے غسل خانے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور مطمئن ہوتے ہوئے اسے اندر دھکیل دیا۔

کرس کارٹر کسی بھی وقت ہوش میں آسکتا تھا۔لڑکی سے بے فکر ہوتے ہی میں نے کرس کارٹر کی ٹائی اٹھا کر اس کے ہاتھ پشت پر باندھے تاکہ ہوش میں آنے پر وہ کوئی غلط حرکت نہ کرسکے اور لباس کی تلاشی لینے لگا۔اس کا پرس اور موبائل فون میں نے اپنی جیب میں منتقل کر دیا۔تکیے کے نیچے پڑے بریٹا نے مجھے خوش کر دیا تھا۔گلاک کی طرح یہ بھی اعلا کوالٹی کا پستول تھا۔جلدی جلدی باقی کمرے کی تلاشی لے کر میں کمانڈر بسم اللہ جان کو کال کرنے لگا۔

''ہاں ذیشان!'' کال وصول کرتے ہی اس نے بے صبری سے پوچھا۔''کیا آپ کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ چکے ہیں؟''

''میں اسی کے کمرے میں ہوں اور اب اسے کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا ہوگا۔''

''کیا مطلب۔'' وہ حیرانی سے چیخ پڑا تھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''مطلب یہ کہ میں نے اسے بے ہوش کر دیا ہے اور اسی سے احمد کے بارے بھی معلوم ہو جائے گا۔''

''ہوٹل سے باہر کیسے نکالیں گے؟''

''آپ دو تین ساتھیوں کو گاڑی دے کر ہوٹل کی جانب بھیجیں میں اسے باہر نکالنے کی سعی کرتا ہوں۔''

''مطلب ٹاکرا ہو کر رہے گا۔'' اس نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔

''اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، میری کال کا انتظار کرنا۔''

اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔اسی اثناء میں کرس کارٹر کسمسا کر اٹھ بیٹھا تھا۔

میں نے لڑکی کو غسل خانے سے باہر نکال کر کپڑے پہننے کو کہا۔وہ ابھی تک سخت خوفزدہ تھی۔لرزتے کانپتے ہوئے اس نے کپڑے پہن لیے۔

''اب اسے بھی پتلون پہنا دو۔'' میں کرس کارٹر کی طرف اشارہ کیا۔

سر ہلاتے ہوئے وہ کرس کا انڈرویئر اور پتلون اٹھا کر اس کی طرف بڑھ گئی۔

کرس نے بے چوں وچراں پتلون پہن لی تھی۔وہ بار بار منھ کھول کر اپنے جبڑے کو ہلا رہا تھا۔یقیناً میرے دائروی مکے نے اس کے جبڑے کو ہلا دیا تھا۔

''یہ کوٹ بھی اسے اوڑھا دو۔''میں نے گرم اوور کوٹ اس کی طرف بڑھایا۔وہ کوٹ کافی کھلا تھا۔لڑکی نے اس کے کندھوں پر کوٹ ڈال کر سامنے سے بٹن بند کر دیے۔اب محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہیں۔

کرس کارٹر کے نزدیک جا کر میں نے پستول جیب میں ڈالا اور کہا۔

''اپنا منھ بند کرو۔''اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں اس نے منھ بند کر لیا۔میں نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو اس کے جبڑوں کے دائیں بائیں رکھ کر اندر کی طرف ٹھوکر لگائی۔اس کے جبڑوں کی ہڈیاں اپنے جوڑوں میں بیٹھ گئی تھیں۔

''چلو۔''انھیں آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے میں اپنے کمرے میں لے آیا۔خوش قسمتی سے گیلری اس وقت بھی خالی پڑی تھی۔اگر کوئی موجود بھی ہوتا تب بھی اسے کچھ معلوم نہ ہو پاتا۔

''بیٹھ جاؤ۔''اپنے کمرے داخل ہوتے ہی میں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔میں نے خود بیڈ پر نشست سنبھال لی تھی تھوڑی دیر بعد ہی کمانڈر بسم اللہ جان کی کال آنے لگی تھی۔

''اسلام علیکم!''میں کال وصول کی۔

''پانچ منٹ میں دو گاڑیاں ہوٹل کے سامنے پہنچ جائیں گی۔ہر گاڑی میں تین آدمی سوار ہیں۔''

''ٹھیک ہے ہم بھی باہر آرہے ہیں۔''مختصراً کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''انگلش سمجھتی ہو؟''میں نے لڑکی سے پوچھا اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہاں سے تم دونوں اکھٹے باہر نکلو گے۔لڑکی!......تم کرس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کے ساتھ چپک کر چلو گی۔میں تم سے ایک قدم پیچھے چلوں گا۔اگر ذرا بھی گڑبڑ کی کوشش کی تو مسٹر کرس!......یاد رکھنا وہ تمھاری زندگی کی آخری بے وقوفی ہو گی۔استقبالیہ پر جا کر بتاؤ گے کہ تم ایک دن کے لیے کہیں جا رہے ہو۔میں اپنے کمرے کی چابی استقبالین کو واپس کر کے اپنا حساب بے باق کروں گا۔اس دوران تم وہیں ٹھہر کر میرے منتظر رہو

گے۔میں جانتا ہوں کہ نیچے ہال میں تمھارا ایک یا اس سے زیادہ ساتھی موجود ہیں، مگر وہ عمر گھٹانے کے علاوہ تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔''

وہ ہونٹ بھینچے خاموش بیٹھا رہا۔

''اب اٹھو اور چل پڑو، چہرے پر بھی ذرا خوش گواری لاؤ۔بالکل ویسا ہی موڈ جیسا میری آمد سے پہلے بنایا ہوا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے میں اپنے جسم پر چادر لپیٹ لی تھی تاکہ پستول نظر نہ آئے۔

سیڑھیاں اتر کر ہم ہال میں پہنچے۔اتنی رات گزرنے کے بعد بھی ہال مکمل خالی نہیں ہوا تھا۔اکادکا میز پر اب بھی گاہک بیٹھے نظر آرہے تھے۔میرے حکم کے مطابق وہ دونوں استقبالیہ کی طرف بڑھنے لگے میں ان کے قریب ہی چل رہا تھا۔

''ہم کہیں جا رہے ہیں کل تک لوٹ آئیں گے اگر کوئی میرا پوچھنے آئے تو بتا دینا کہ کل شام تک واپس پہنچ جاؤں گا۔'' کرس کارٹر نے رٹا رٹایا فقرہ دہراتے ہوئے کمرے کی چابی استقبالین کی طرف بڑھا دی۔

''ٹھیک ہے سر۔'' استقبالین نے کاروباری مسکراہٹ چہرے پر بکھیری۔

''میں کمرہ چھوڑ رہا ہوں، بل بنا دیں۔'' استقبالین سے مخاطب ہوتے ہوئے بھی میرا رخ ان دونوں کی جانب تھا۔وہ استقبالیہ کاؤنٹر کے ساتھ کھڑے ہو کر ہال کا جائزہ لے رہے تھے۔

استقبالین نے پوچھا۔''سر کمرہ نمبر پلیز۔''

کمرہ نمبر بتا کر میں نے کمرے کی چابی بھی اس کی جانب بڑھا دی۔

حساب کتاب کر کے اس نے بل اور میرا پاسپورٹ میری جانب بڑھا دیا۔بل ادا کر کے میں نے کہا۔

''ایک منٹ ذرا رجسٹر دکھانا۔''

''یہ لیں سر۔'' اس نے رجسٹر میری جانب گھمایا۔ایک نظر صفحے پر گھماتے ہوئے میں نے تیزی سے وہ صفحہ پھاڑ کر اپنے ساتھ رکھ لیا۔

''کک......کیا......'' اس نے کچھ کہنا چاہا مگر پستول کی جھلک دیکھتے ہی خاموش ہو گیا تھا۔

اسی دوران ایک لمحے کے لیے میں کرس کارٹر سے غافل ہوا۔اس نے کندھے سے لڑکی کو میری جانب دھکا

دیا اور بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔

لڑکی کو واپس دھکیل کر میں اس کے پیچھے بھاگ پڑا۔ اسی وقت مختلف کونوں سے تین افراد کھڑے ہوئے۔ میں نے فوراً گھٹنا نیچے ٹیک کر کرس کی پنڈلی پر فائر کر دیا۔ وہ بھاگ رہا تھا لیکن اس کا مجھ سے فاصلہ چند قدموں سے زیادہ نہیں تھا۔ گولی ضائع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ اوندھے منہ نیچے گرا۔ تین آدمی پستول نکال کر ہماری طرف بڑھے تینوں مقامی ہی تھے۔ دائیں بائیں میزوں پر بیٹھے گاہکوں کو بھی گڑبڑ کا پتا چل گیا تھا۔ چند نسوانی چیخیں بلند ہوئیں۔ کوئی پولیس کو بلانے کا مشورہ دینے لگا۔ تین چار آدمی دروازوں کی طرف بھاگے کچھ کونوں میں سمٹ گئے تھے۔

میں بھاگ کر کرس کے قریب پہنچا۔ وہ کراہتے ہوئے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر میں نے زبردستی کھڑا کر دیا۔

اس کے ساتھی بھی قریب پہنچ گئے تھے۔ تینوں کے تیور خاصے بگڑے ہوئے تھے۔

''اگر کسی نے ہوشیاری کی کوشش کی تو یہ جان سے جائے گا۔'' کرس کی کنپٹی سے پستول لگاتے ہوئے میں نے انھیں دھمکایا۔

''بچے گا تو بھی نہیں۔'' ایک نے جوابی دھمکی دی۔

صورت حال کافی بگڑ چکی تھی۔ اگر مزید وقت گزرتا تو پولیس بھی وہاں آجاتی۔ انھوں ایک خاص بے وقوفی کی تھی کہ وہ ایک جانب اکٹھے ہو گئے تھے۔ اگر وہ میرے چاروں جانب کھڑے ہو گئے ہوتے تو میں زیادہ خطرے میں ہوتا۔ سرعت سے سوچتے ہوئے میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ اور کرس کو اپنے سامنے ڈھال کی طرح پکڑتے ہوئے کہا۔

''میرے تین گننے تک اگر تم لوگوں نے پستول نیچے نہ پھینکے تو یہ جان سے جائے گا۔ ایک......''

انھوں نے میرے گنتی شروع کرتے ہی ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور اسی لمحے میں کام کر گزرا۔ بغیر لمحہ ضائع کیے میں نے پستول سیدھا کیا اور ٹریگر کو مسلسل دباتا گیا۔ تینوں کے ماتھے میں گولیاں لگی تھیں۔ اتنی تیزی سے پستول سے فائر کر کے کسی کے سر میں گولی مارنا ایک فن ہی تھا۔ مگر وہاں مجھے سراہنے کے بجائے تیز نسوانی

چیخیں ابھرنا شروع ہوگئی تھیں۔

''چلو۔'' میں نے کرس کو دھکیلا۔

وہ کراہتے، لنگڑاتے ہوئے آگے بڑھا۔ہوٹل کے داخلی دروازے کے باہر کھڑے دو ہتھیار بردار دربان یقیناً میرے لیے مسئلہ پیدا کردیتے، مگراسی وقت دروازے سے چار کلاشن کوفوں والے اندر گھسے۔ان میں سے دو کو میں پہچانتا تھا۔وہ کمانڈر بسم اللہ جان کے ساتھی تھے۔ایک نے دربانوں پر کلاشن کوف پکڑ کر انھیں ایک طرف ہونے کا اشارہ کیا۔باقی تینوں میرے قریب آگئے۔

''کیا حکم ہے۔''

''وقت نہیں ہے اسے اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کلاشن کوف ساتھی کے حوالے کی اور کرس کو کندھے پر اٹھا کر واپس مڑ گیا۔ دروازے کے سامنے ہی دو ڈبل کیبن کھڑی تھیں۔ بیٹھتے ہوئے میں نے ایک آدمی کو احمد کی موٹر سائیکل کی چابی پکڑائی اور پارکنگ میں کھڑی موٹر سائیکل کی جانب اشارہ کرکے کہا۔

''آپ احمد بھائی کی موٹر سائیکل لے آئیں۔''

وہ سر ہلاتا ہوا نیچے اتر گیا۔دونوں ڈبل کیبن آگے پیچھے حرکت کرتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔میں چادر سے پٹی پھاڑ کر کرس کی پنڈلی سے باندھ دی تھی ورنہ زیادہ خون بہہ جانے سے اس کی جان کو بھی خطرہ ہوسکتا تھا۔تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہم ہوٹل سے دور ہوتے گئے ۔میں کرس کے ہمراہ آگے والی گاڑی میں تھا۔تھوڑی دور آتے ہی دوسری گاڑی ہم سے علیحدہ ہوگئی تھی۔پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد ہم ایک درمیانے مکان کے سامنے رک گئے۔ہارن سن کر ایک شخص نے باہر جھانکا اور گاڑی کو پہچانتے ہی دروازہ کھول دیا۔

وہ ایک درمیانہ سا مکان تھا۔گاڑی صحن میں کھڑی کرکے ہم نیچے اترے اور مکان میں موجود آدمی کی رہنمائی میں چلتے ہوئے ایک خفیہ کمرے میں پہنچے۔گو وہ کمرہ دوسرے کمروں کے درمیان ہی میں تھا مگر اس انداز میں بنایا گیا تھا کہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کمرہ موجود ہے۔

اندر گھستے ہی ہم نے فی الفور کرس سے پوچھ گچھ شروع کردی۔

”احمد کہاں ہے؟“میں نے پہلا سوال ہی اپنے گمشدہ ساتھی کے متعلق پوچھا تھا۔

”کون احمد۔“اس نے بے پروائی سے کہتے ہوئے خود کو نڈر ظاہر کرنا چاہا۔

”دیکھو مسٹر کرس !......احمد کے بارے تمھیں زبان تو کھولنا پڑے گی ۔آرام سے یا تکلیف برداشت کر کے۔“

وہ اطمینان سے بولا۔”اگر خواہ مخواہ تشدد کرنے کا شوق ہے تو آگے بڑھو۔“

”آری مل جائے گی۔“میں نے میزبان سے پوچھا۔

”جی۔“اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

اس کی واپسی تک میں نے اس کی پتلون کا پائنچہ موڑ کر زخمی پنڈلی کو ننگا کر دیا تھا۔وہ ہونٹ بھینچے میری کارروائی دیکھتا رہا۔دو تین منٹ بعد میزبان آری لیے نمودار ہوا۔

”اس کی ٹانگ یہاں گھٹنے سے پکڑو۔“میں نے میزبان ہی کو کہا۔اوراس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے گھٹنے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

”تت......تم کیا کر رہے ہو۔“میرا اطمینان بھرا انداز اسے خوفزدہ کر گیا تھا۔

”زخمی پنڈلی کو کاٹ کر علیحدہ کر دیتا ہوں، یہ تو اب یوں بھی بے کار ہے۔“یہ کہتے ہوئے میں نے زخم سے انچ بھر اوپر آری رکھی۔

”ایک منٹ......“وہ لرزتے ہوئے ایک پتا دہرانے لگا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا اور انھوں نے اوپر نیچے سر ہلا کر سمجھ جانے کا اشارہ کر دیا۔

”تیار ہو جاؤ۔“کرس کارٹر کو میزبان کے حوالے کر کے میں باقیوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔

انھوں نے کال کر کے دوسری گاڑی کو بھی بلا لیا تھا۔رستے ہی میں ہمیں دوسری گاڑی نے مل جانا تھا۔

”کیا ابھی جانا ضروری ہے۔“بسم اللہ جان کے ایک ساتھی نے پوچھا جس کا نام مجھے بعد میں حیدر معلوم ہوا تھا۔

میں نے کہا۔''ہاں دیر کرنے سے وہ اسے کسی دوسری جگہ بھی منتقل کر سکتے ہیں۔''

''ہونہہ۔''حیدر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔حیدر کے علاوہ میرے ساتھ شمال خان اور میر قلم خان بیٹھے ہوئے تھے۔باقی افراد دوسری گاڑی میں تھے۔ایک چوک پر دوسری گاڑی ہماری منتظر کھڑی تھی۔ہمارے آگے بڑھتے ہی وہ پیچھے پیچھے چل پڑے۔

مطلوبہ مکان گنجان آبادی میں تھا۔وہاں تک ہمیں آدھا گھنٹا لگا تھا۔ایک چوک پر گاڑی روکتے ہوئے حیدر نے کہا۔''سامنے پہلی گلی میں دوسرا مکان وہی ہے۔''

''آپ لوگ یہیں رکو میں جائزہ لیتا ہوں۔''میں نے نیچے اترنے کے لیے دروازہ کھولا۔

''میں جاتا ہوں۔''میر قلم نے اپنی خدمات پیش کیں۔

''آپ بس تیاری حالت میں رہنا۔''میں نے مفلر چہرے کے گرد لپیٹا اور نیچے اتر گیا۔

''میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔''میر قلم بھی میرے ساتھ ہو لیا تھا۔

رات ختم ہونے کو تھی۔سڑکوں پر آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔دونوں گاڑیاں چوک سے تھوڑا آگے لا کر انھوں نے سڑک کے ایک جانب کھڑی کر دیں۔میں اور میر قلم چہل قدمی کے انداز میں آگے بڑھنے لگے۔گو نہ تو صبح کی نماز کا وقت ہوا تھا اور نہ مٹر گشت کا وقت تھا۔ہماری حرکت شکوک کے دائرے میں آ رہی تھی۔لیکن ہم احتیاط کو نظر انداز کیے آگے بڑھتے گئے۔گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے مطلوبہ گھر کے دروازے سے روشنی چھلکتی ہوئی نظر آئی۔واضح نظر آ رہا تھا کہ گھر دروازہ کھلا ہوا ہے۔

''مجھے لگتا ہے وہ نکل گئے ہیں۔''آگے جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے میں گلی میں مڑ گیا۔

''صحیح کہہ رہے ہو۔کھلے دروازے کو دیکھ کر تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دشمن افراتفری میں بھاگ گئے ہیں۔''میر قلم نے میری تائید میں سر ہلا دیا۔

مطلوبہ مکان کے سامنے پہنچتے ہی مجھے اپنا اندازہ صحیح ہوتا نظر آیا۔نہ صرف داخلی دروازہ کھلا تھا بلکہ اندر کمروں کے دروازے بھی کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔وہ روشنی کو جلتا اور دروازوں کو کھلا چھوڑ کر بھاگے تھے۔

''میرا خیال ہے اندر چل کر جائزہ لے لیتے ہیں۔''میر قلم نے مشورہ دیتے ہوئے آگے قدم بڑھا دیے

۔میں سر ہلاتا ہوا اس کے پیچھے ہولیا۔

مختصر صحن کے بعد برآمدہ نظر آرہا تھا جس کے بعد کمروں کے دروازے تھے۔ میر قلم مجھ سے دو قدم آگے تھا جونھی وہ برآمدے کے قریب پہنچا اچانک ہی مجھے اس کی گردن کے نیچے ایک سرخ نقطہ نظر آیا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ یقیناً وہ لیزر پوائنٹ کا نشان تھا۔ کسی نے ہم پر نشانہ سادھا ہوا تھا۔

''نیچے لیٹ جاؤ۔'' خود کو زمین پر گراتے ہوئے میں چیخا۔ لیکن میر قلم کو دیر ہو گئی تھی۔ میرے الفاظ جب تک اس کی سمجھ میں آتے اس کی گردن میں گولی پیوست ہو گئی تھی۔ میری طرح وہ بھی اوندھے منھ ہی گرا تھا لیکن اس کے گرنے میں اس کی مرضی شامل نہیں تھی۔

نیچے گرنے کے ساتھ میں ساکت نہیں ہوا تھا بلکہ زقند بھر کر میں نے برآمدے کے ستون کے ساتھ آڑ ڈھونڈ لی۔ انھوں نے مکان کے دروازے کھلے چھوڑ کر ہمارے لیے چارہ ڈالا تھا اور ہم بغیر سوچے سمجھے ان کی چال میں آگے تھے۔ گو اس مکان میں گھستے وقت میرے دماغ میں ہلکی سی کھٹک موجود تھی لیکن میں احتیاط نہیں برت سکا تھا۔ ستون کی آڑ میں آکر میں نے جیب سے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا، مگر فائر کرنے والے مخالف مکان کی چھت پر تھے اور پستول کی رینج سے دور تھے۔

میرے سامنے ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ ستون کی آڑ میں بہر حال تھوڑا بہت خطرہ موجود تھا۔ چھت پر لیٹے فائرر نے مجھے نشانہ بنانے کے لیے چند اور فائر کیے تمام گولیاں ستون میں لگی تھیں۔ اسی وقت کلاشن کوف کے فائر کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ اندازے کے مطابق وہ میرے ساتھیوں کا جوابی فائر تھا۔ میرے لیے واپس دروازے تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہونا مناسب سمجھا۔ اور کلاشن کوف کا دوسرا برسٹ فائر ہوتے ہی میں چھلانگ لگا کر کمرے میں داخل ہوا، مگر میری بدقسمتی کہ کمرہ خالی نہیں تھا۔

''ہاتھ اوپر۔'' انگریزی میں پکارا گیا تھا۔ وہ دو نقاب پوش تھے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے منھ سے الفاظ کی ادائی ہونے تک میں فائر کر چکا تھا۔ مجھے ہینڈز اپ کرانے کی حسرت دل میں لیے وہ سر میں گولی کھا کر مردہ چھپکلی کی طرح نیچے گرا، اس کا ساتھی زیادہ چست ثابت ہوا تھا۔ میرے دوبارہ ٹریگر دبانے سے پہلے اس نے بائیں پاؤں پر گھومتے ہوئے اپنے دائیں پاؤں سے میرے پستول والے ہاتھ کو نشانہ بنا لیا تھا۔ اس کی ٹھوکر

سے پستول میرے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔اس کے بعد بھی اس کی حرکت رکی نہیں تھی۔دوسرا پاؤں زمین پر رکھتے ہوئے وہ دوبارہ گھوما اور اس کی دوسری ٹانگ میری چھاتی میں لگی۔میں دیوار سے ٹکرا گیا تھا۔اس کے حملوں میں بڑی تیزی تھی۔میرے جوابی حملے سے پہلے سیدھے ہو کر اس نے اپنا گھٹنا میری ناف میں مارنے کے لیے اوپر اٹھایا،لیکن اس وقت تک میں سنبھل چکا تھا۔اس کا وار میں نے اپنے ہاتھوں پر سہا اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے سر کی زوردار ٹکر اس کی چھاتی میں رسید کی اور فوراً ہی مجھے پتا چلا کہ وہ مرد نہیں کوئی عورت تھی۔میری ٹکر کھا کر وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور ایک دم اپنے بائیں پاؤں پر گھومی۔اس کا دایاں پاؤں میرے چہرے کی طرف بڑھا۔

سر کو ذرا سا نیچے جھکاتے ہوئے میں نے اس کا وار خطا کیا۔دایاں پاؤں نیچے لگاتے ہوئے اس نے دوسرا پاؤں اٹھا کر حملہ کرنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی میری زبردست ٹھوکر اس کی پیٹھ پر پڑ چکی تھی۔

وہ منھ کے بل نیچے گری لیکن اپنے ہاتھوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس نے چہرے کو زمین پر لگنے سے بچا لیا تھا۔اور پھر اسی طرح پڑے رہنے کے بجائے وہ کروٹ تبدیل کرتی ہوئی میری اگلی ٹھوکر کی زد سے دور ہو گئی۔دو تین کروٹیں لے کر وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔اس کے تیز حملے اور قد و قامت مجھے کسی شک میں مبتلا کر رہا تھا۔شک دور کرنے کے لیے میں نے اگلے حملے سے پہلے چہرے پر لپٹا مفلر کھولا۔وہ حملے کے لیے پر تول رہی تھی،میرا چہرہ دیکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

''ذی تم؟''میرے کانوں میں جینیفر کی سریلی آواز گونجی۔میرا اندازہ ٹھیک نکلا تھا وہ جینی ہی تھی۔میرے جواب دینے سے پہلے تین ہتھیار بردار اندر گھستے چلے آئے تھے۔چاروں نے نقاب اوڑھے ہوئے تھے۔

''ہاتھ اوپر۔''ان میں سے ایک پشتو میں بولا تھا۔

میں نے فوراً ہاتھ اٹھا لیے۔باہر اب تک فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

''ٹریسی جانا ہوگا۔''ایک دوسرا آدمی جینیفر کو انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ جینیفر سے سینئر یا اس کا ہم رینک تھا۔

''باہر والوں کو بھی اندر بلا لو اور دو آدمی چند منٹ تک یہیں کمرے کے اندر سے فائر کا جواب دیتے رہو

اس کے ساتھ وہ بولا۔ ’’ایک آدمی اس کے ہاتھ باندھ دو۔‘‘

’’جی سر!‘‘ ایک آدمی نے اثبات میں سرہلا دیا۔ جبکہ دوسرے نے اس کے اشارے پر میرے ہاتھ پشت پر باندھے اور میری تلاشی لے کر جیبوں میں موجود سامان نکال لیا۔

مجھے حراست میں لے کر وہ کمرے میں موجود اندرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ دوسرے کمرے کے کونے میں سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔ سیڑھیاں اتر کر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی شمالی دیوار میں تنگ سی سرنگ نظر آرہی تھی۔ جینیفر آگے ہوگئی اس کے پیچھے میں تھا۔ میرے عقب میں باقی آرہے تھے۔ کافی طویل سرنگ تھی ۔اس کے اختتام پر سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں۔ ہم پہلے والے مکان سے قریباً پانچ چھ مکان دور آگئے تھے۔

اس دوران میرا دماغ اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہا کہ کیا کرنا چاہیے۔ نہ جانے جینی میری کچھ مدد کر پاتی یا نہیں۔ آخر وہ خود امریکن سرکار کی ملازم ہی تو تھی اور جب اس سے ایک سینئر آدمی موجود تھا تو اس کا کیا بس چلتا ۔اگر وہ دھوکے سے مجھے فرار کر دیتی تب بھی اس پر بات تو آسکتی تھی۔ پہلی دفعہ میرا نام لینے کے بعد اس نے دوبارہ مجھے مخاطب کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اور اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ میرے ساتھ شناسائی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دوسرے مکان کے صحن میں آتے ہی میرے کانوں میں ایک بار پھر فائرنگ کی آواز آنے لگی تھی۔ صحن میں دو گاڑیاں تیاری حالت میں کھڑی تھیں۔ میرے چہرے پر کالا کپڑا چڑھا کر انھوں نے ایک گاڑی کی عقبی نشست پر دھکیلا اور اس مکان سے باہر نکل آئے۔ ان کی بات چیت سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ جینی اور دوسرا امریکن اسی گاڑی میں تھے۔ اس کا نام الیگزینڈر تھا اور وہ جینی سے سینئر لگ رہا تھا۔ موضوعِ گفتگو مجاہدین کا خفیہ ٹھکانہ تلاش کرنے کی جستجو تھی۔ یقیناً احمد سے انھیں کچھ معلوم نہیں ہو پایا تھا۔

گاڑی آدھا پون گھنٹا چلتی رہی۔ رکنے پر ایک آدمی نے مجھے بازو سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔

تھوڑی دیر بعد میں ایک کرسی پر بندھا ہوا بیٹھا تھا۔ میرے سر پر چڑھا کپڑا انھوں نے اتار دیا تھا ۔الیگزینڈر نے مجھے باندھنے والوں کو کہا۔

’’مجھے غزنی میں موجود دہشت گردوں کے تمام ٹھکانوں کی تفصیل چاہیے۔ اور تفتیش کرتے ہوئے بس اتنا

خیال کرنا کہ اسے مرنا نہیں چاہیے باقی ہاتھ پاؤں کاٹتے ہو یا ناک کان اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔“

”فکر نہ کریں سر!“ دونوں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا دیا۔ جینی ٹریسی والکر کے روپ میں وہاں کھڑی مجھے گہری نظروں سے گھور رہی تھی۔

”چلیں۔“ الیگزینڈر جینی سے مستفسر ہوا۔

جینی نے پرخیال لہجے میں کہا۔ ”سر!...... میرا خیال ہے اس آدمی کو مجھے خود سنبھالنا ہوگا۔“

”ہاں، اپنے دونوں آدمیوں کی نگرانی کر لینا۔ اگر صحیح سوال جواب نہیں کرتے تو آپ پوچھ گچھ کر لینا۔“

”آپ سمجھے نہیں سر!...... میرا مطلب ہے پہلے ہمیں کرس کارٹر صاحب کی بازیابی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“

الیگزینڈر بے پروائی سے بولا۔ ”جب دہشت گردوں کے تمام ٹھکانوں کی بابت معلوم ہو جائے گا تو کرس کارٹر بھی بازیاب ہو جائے گا۔“

جینیفر نے منھ بنایا۔ ”پہلے پکڑے جانے والے دہشت گرد سے ہم نے کیا اگلوا لیا ہے جو اس سے تمام ٹھکانوں کی بابت معلوم ہو جائے گا۔“

”تم کیا چاہتی ہو؟“ الیگزینڈر نے مفاہمتی انداز میں پوچھا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ”سر، کرس کارٹر کو آزاد کرانا ضروری ہے۔“

”ہاں مگر اس کے لیے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، یہ نہ ہو اسے آزاد کراتے ہوئے کوئی اور نقصان کرا بیٹھو۔“

جینیفر اعتماد سے بولی۔ ”میں سنبھال لوں گی سر۔“

”ویسے پہلے کوشش کر لو اگر کچھ معلوم ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر کرس کارٹر کی واپسی کا کچھ کریں گے۔“ الیگزینڈر نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔ ان دونوں کی بات چیت سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ الیگزینڈر کی نظر میں میں انگلش سے نابلد تھا۔ اسی وجہ سے وہ یوں آزادی سے بات چیت کر رہا تھا۔ البتہ جینیفر کی بات اور تھی۔

”ٹھیک ہے سر!“ جینیفر نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ رخصت ہو گیا۔

”تم دونوں بھی جاؤ۔“جینیفر نے دونوں مقامی افراد کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔

ان کے جاتے ہی اس نے سب سے پہلے میری بندشیں کھولیں اور پھر ایک کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔

”تو میرا اندازہ ٹھیک تھا، اس دن تم ہی تھے۔“بغیر کسی تمہید کے وہ مطلب کی بات پر آ گئی۔

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔”تم نے کیسے اندازہ لگایا۔“

”اتنے فاصلے سے سر میں گولی مارنا کسی عام آدمی کا کام نہیں ہوسکتا۔“

”پھر بھی میں افغانستان میں موجود نہیں تھا، اگر کوئی اور ہوتا تو یقیناً تم ماری جاتیں۔“

”صحیح کہہ رہے ہو، مگر کیا کروں کہ اتنے فاصلے سے یوں صفائی سے فائر کرنے والا تمھارے علاوہ ایک نک سٹیورٹ ہی دیکھا ہے اور نک تو ہمارا اتحادی ہے۔“

”یہ کون ذات شریف ہے؟“میں نے انجان بن کر پوچھا۔حالاں کہ اس کے بارے مجھے کمانڈر اسلام سے معلوم ہوا تھا۔

”برطانوی فوج کا ایک سپاہی ہے، اس کی ساتھی لورا براؤن بھی اچھی نشانہ باز ہے۔“

”اچھا اب میرے ساتھ کیا کرنا ہے؟“

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔”تمھارے ساتھ کیا کرسکتی ہوں سوائے محبت کرنے کے؟“

”بکواس نہ کرو۔اور میں نے کہا تھا کہ واپس امریکہ چلی جاؤ، اس دن بڑی مشکل سے تمھیں بچایا تھا۔“

”بس دو تین ماہ میں واپس چلی جاؤں گی، ملنے آؤ گے نا؟“

”ملنے آنا تو شاید مشکل ہو البتہ اپنا فون نمبر بتا دو کال کرلیا کروں گا وہ بھی پلوشہ سے پوچھ کر۔“آخری فقرہ میں نے مسکراتے ہوئے ادا کیا تھا۔

”کہاں ہے وہ آفت کی پرکالہ۔“جینیفر بھی مسکرادی تھی۔

”وہ بھی افغانستان آئی ہوئی ہے۔“

”سچ، کہاں ہے؟“اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

میں صاف گوئی سے بولا۔ ”یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔“

”کیا مطلب؟“ اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

جواباً میں نے اپنی گرفتاری اور ثبوتوں کی تلاش وغیرہ کی ساری کہانی اجمالاً دہرا دی۔

وہ کہنے لگی۔ ”تمھیں مجھ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔“

”کیسے رابطہ کرتا۔ اور معاف کرنا تم سے رابطہ کرنے کی کوشش میں تو اس حالت میں پہنچا ہوں۔“

”یہ کون سی رابطہ کرنے کی کوشش تھی۔“ اس نے منھ بنایا۔ ”ہمارے آدمیوں کو قتل کرنا اور انھیں اغواء کرانا مجھے تلاش کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔“

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تو تم لوگوں نے پاکستان میں کوئی کسر چھوڑی ہے۔“

”جانتے ہو، البرٹ بروک اور کرنل کولن فیلڈ دونوں اس دن تمھاری گولی کا نشانہ بن گئے تھے۔“

”وہ دونوں میرے مجرم بھی تو تھے۔“

”بہرحال اس دن حملہ کرنے والوں کو بہت کوشش سے ڈھونڈا جا رہا ہے۔ گو پہلے تو مجھے اندازہ تھا کہ گولی چلانے والے تم ہو، جو بعد میں یقین میں تبدیل ہو گیا تھا لیکن میں نے کسی کو ہلکا سا اشارہ بھی نہ دیا۔ باقی جیسن سمتھ کی جان بچاتے ہوئے میں نے حماقت کا ثبوت دیا تھا، لیکن اس حماقت کی بدولت بعد میں میرا یقین پختہ ہو گیا تھا کہ فائر کرنے والے واقعی تم ہی ہو۔“

میں نے پوچھا۔ ”جیسن کے ساتھ تمھارا کیا تعلق ہے؟“

”استاد ہے میرا۔ اور اتنی ہمت میں اس لیے کر پائی تھی کہ کولن فیلڈ کے سر میں لگنے والی گولی نے میری سوچوں کو تمھاری جانب موڑ دیا تھا۔ اس کے بعد جب دوسرے افراد کو بھی سر ہی میں گولی لگنا شروع ہوئی تو مجھے معلوم ہو گیا کہ ہو نہ ہو فائر کرنے والا ذی ہے۔“

”اچھا اب میرے بارے کیا سوچا ہے۔“

”سوچنا کیا ہے، ابھی جاؤ اور کرس کارٹر کو رہا کر دو۔“

میں ہنسا۔ ”تو تم مجھے یونھی جانے دو گی۔“

”شک ہے کیا؟“

”نہیں، مگراس طرح تم سے باز پرس ہوسکتی ہے۔“

”نہیں تمھارے بدلے ہمیں کرس کارٹرمل جائے گا نا۔اور بالفرض وہ تمھارے قبضے میں نہ ہوتا میں تب بھی تمھیں چھوڑ دیتی۔“

”واپس امریکہ کب جارہی ہو؟“

”کہا تو ہے دوتین ماہ میں چلی جاؤں گی۔“

میں نے پوچھا۔”البرٹ بروک تو رہا نہیں، کیا میری بے گناہی کے ثبوت بھی اس کے ساتھ ضائع ہو گئے ہیں۔“

اس نے معنی خیز مسکراہٹ سے پوچھا۔”اگر تمھیں وہ ثبوت میں لا دوں تو کیا انعام ملے گا۔“

”کیا انعام چاہیے۔“

”مجھ سے شادی کرلو۔“

”پاکستانی ایجنسیوں کے ہاتھوں شاید بچ جاؤں لیکن پلوشہ مجھے قتل کرنے امریکہ تک بھی پہنچ جائے گی۔“

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔”اتنا ڈرتے ہو اس سے۔“

”کیا نہیں ڈرنا چاہیے؟“

”پیلا وشہ کی ذمہ داری میں لیتی ہوں۔“

میں زچ ہوتے ہوئے بولا۔”جینی!......تنگ نہ کیا کرو۔“

”اچھا میں کوشش کروں گی، وعدہ نہیں کرسکتی میرا نمبر یاد کرلو۔“اس نے ایک نمبر دہراتے ہوئے کہا۔”اس پر رابطہ کرکے معلوم کرلینا امریکہ واپسی سے پہلے تمھارا کام کر جاؤں گی۔“

اس کا نمبر ذہن نشین کرتے ہوئے میں نے اپنا نمبر دہراتے ہوئے کہا۔”اپنا امریکہ کا رابطہ نمبر بھی بتادو۔“

میرا نمبر اپنے سیل فون میں محفوظ کرکے وہ اپنا نمبر بتاتے ہوئے مسکرائی۔”ابھی تک تمھاری یاداشت ویسی ہی ہے۔“

اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے میں مطلب کی بات پر آیا۔’’میں احمد کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔‘‘

’’کون احمد؟‘‘اس نے حیرانی سے پوچھا۔

’’ہمارا جو آدمی تمھارے پاس قید ہے۔‘‘

اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔’’ضروری ہے کیا؟‘‘

’’ہاں، کیونکہ یہاں میری حیثیت مہمان کی سی ہے، میں بس اپنی بے گناہی کے ثبوت ہی حاصل کرنے آیا ہوں پھر واپس چلا جاؤں گا۔اور اب اگر میں وہاں جا کر کرس کارٹر کی رہائی کی بات کروں گا تو یقیناً اچھا نہیں لگے گا۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے جلد سے جلد وہ ثبوت تمھارے حوالے کر کے جان چھڑانا بہتر رہے گا۔‘‘

میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔’’مجھ سے جان چھڑانا چاہتی ہو۔‘‘

’’ہاں۔‘‘اس نے اثبات میں سر ہلایا۔’’سچ کہوں تو اپنے لیے شوہر دیکھنا شروع کر دیا ہے۔‘‘

’’کس وقت جانا ہوگا۔‘‘

اس نے کہا۔’’بھوک لگی ہو تو ناشتا منگوا دیتی ہوں۔‘‘

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

چلو،مگر آنکھیں باندھنا پڑیں گی۔‘‘

میں ہنسا۔’’مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔‘‘

’’ہاں۔‘‘اس نے صاف گوئی سے اقرار کیا۔’’اس بارے اعتبار نہیں کر سکتی۔میں جانتی ہوں تمھارے سب سے بڑے دشمن امریکی ہیں۔‘‘

’’تم بھی تو امریکی ہو۔‘‘

اس نے قہقہہ لگایا۔’’میں تو تمھیں پیاری ہوں نا۔اور جب بھی پیلا وشہ سے ملاقات ہوئی اسے ضرور بتاؤں گی کہ تم نے کس طرح میری جان بخشی کی۔‘‘

’’اچھا بتا دینا یار، فی الحال تو چلیں ناں۔‘‘

''ٹھیک ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد ہم گاڑی میں بیٹھے ہم ایک مخصوص سمت میں روانہ تھے۔ احمد بھی ساتھ تھا۔ احمد اور میرے سر پر جینفر کے کہنے پر کالا کپڑا چڑھا دیا تھا اور ہمارے ہاتھ پشت پر بندھے تھے۔ ایک غیر معروف ہوٹل کے سامنے گاڑی روک کر اس نے میرے سر سے کپڑا اتارا اور کہا۔''اپنے آدمیوں کو کہو کرس کارٹر کو یہاں لے آئیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''نہیں، میں خود جا کر اسے لے آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے، میں یہیں بیٹھ کر تمھارا انتظار کروں گی۔'' بغیر کسی تکرار کے وہ اپنے ساتھ موجود تین مسلح مقامی محافظوں کو نیچے اترنے کا اشارہ کرتے ہوئے نیچے اتر گئی۔

احمد کو کافی زیادہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ عقبی نشست پر ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اسے مخاطب کیے بغیر میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور موبائل فون نکال کر کمانڈر بسم اللہ کو کال کرنے لگا۔ پہلی ہی گھنٹی پر کال وصول کر لی گئی تھی۔

''جی۔'' اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

''ذیشان بات کر رہا ہوں۔'' میں نے فوراً اپنا تعارف کرایا۔

اس نے بے صبری سے پوچھا۔''آپ کہاں ہیں؟''

''میں احمد کے گھر کی طرف جا رہا ہوں، احمد بھی میرے ساتھ ہے۔ آپ یوں کریں کہ کرس کارٹر کو ایک گاڑی میں بٹھا کر وہیں لے آئیں باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''سمجھانے کا وقت بھی نہیں ہے، فی الحال جو کہا ہے وہ کریں۔''

''کہیں یہ سب......''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔''نہیں میں کسی دباؤ یا مجبوری کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہے۔ مختصراً اتنا جان لیں کہ احمد کے بدلے کرس کارٹر کو واپس کرنا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' مزید بحث سے گریز کرتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

احمد کا مکان میں نے دیکھا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہمیں چند منٹ انتظار کرنا پڑا تھا۔ مکان کو تالا لگا ہوا تھا ہم گاڑی ہی میں بیٹھے رہے۔

''شمسہ کہاں ہے؟'' گاڑی میں چھائی خاموشی کو احمد کی نحیف آواز نے توڑا۔

''کون شمسہ؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا اور پھر ایک خیال کے تحت کہا۔ ''شاید ہماری بھابی کا نام شمسہ ہے۔''

کچھ کہے بغیر اس نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''وہ محفوظ ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

بسم اللہ جان کے آدمیوں کے پہنچتے ہی میں نے احمد ان کے حوالے کیا وہ کرس کارٹر کی آنکھیں بند کر کے لائے تھے۔ اسے اپنی گاڑی میں منتقل کر کے میں نے انھیں جانے کا کہا اور خود مطلوبہ ہوٹل کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہوٹل کے قریب پہنچتے ہی میں نے سے کال کر کے باہر بلا لیا تھا وہ بڑی شدت سے میری منتظر تھی۔ کرس کارٹر کو دیکھتے ہی اس نے میرا شکریہ ادا کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تمھیں واپس چھوڑ کے آنا پڑے گا۔''

''شکریہ، تم جاؤ۔''

''موقع ملتے ہی میں خود رابطہ کروں گی، تمھیں کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جاتے ہوئے وہ مجھے سمجھانا نہیں بھولی تھی۔

اس کے جاتے ہی میں نے ٹیکسی پکڑی اور اپنے خفیہ ٹھکانے کے قریب ایک مناسب مقام پر اترا اور احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ تمام بے صبری سے میرے منتظر تھے۔ احمد کے لیے انھوں نے ایک ڈاکٹر کو بلا لیا تھا جو اس کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ میری آمد کے ساتھ حیدر نے بسم اللہ جان کو کال کر کے موبائل فون میری جانب بڑھا دیا۔

سلام ودعا کے بعد وہ تفصیل پوچھنے لگا۔

''وہی لڑکی مل گئی تھی یار! مجھے رہا کرنے کا اسے یہی بہانہ مناسب لگا کے میرے بدلے کرس کارٹر کو طلب کر

لے۔میں نے اپنی رہائی کے ساتھ احمد کا بھی مطالبہ کر دیا۔"

"آپ کا کام تو درمیان ہی میں رہ گیا۔"

"کوئی بات نہیں، اللہ پاک کوئی اور سبب بنا دے گا۔"

اس نے پوچھا۔"مطلب دوبارہ سے پوری محنت کرو گے۔"

"فی الحال تو آرام کروں گا چند دن بعد ہی کچھ سوچوں گا۔"میں نے جینی کی آفر کا ذکر مناسب نہیں سمجھا تھا۔

"تو پھر یہاں آجاؤ۔"

میں نے گول مول انداز میں کہا۔"جب آنا ہوگا بتا دوں گا۔"اور اس نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا۔میں وہیں ٹھہر کر جینی کے جواب کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔مجھے قوی امید تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ کر لے گی۔

احمد اور میں اسی خفیہ کمرے میں رہنے لگے۔تیسرے دن احمد کی بیوی بھی وہیں آگئی تھی اور اس کی آمد کے ساتھ احمد اور اس کی بیوی کے حوالے ایک علیحدہ کمرہ کر دیا گیا تھا۔اپنی آمد کے دوسرے دن وہ احمد کو ساتھ لے کر میرا شکریہ ادا کرنے بھی آئی تھی۔اسے معلوم ہو گیا تھا کہ احمد کی جان میری ہی وجہ سے بچی تھی۔شب و روز کافی بے کیفی سے گزر رہے تھے۔مجھے پاکستان سے آئے ہوئے بھی کئی ماہ گزر گئے تھے اور ابھی تک میں کسی واضح کامیابی کے نزدیک نہیں پہنچا تھا۔اب تو لے دے کے جینی ہی کی امید باقی تھی۔کئی بار میرا گھر کال کرنے کو جی چاہا مگر پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ انھوں نے پلوشہ کے بارے پریشانی ظاہر کرنا تھی جس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔مگر یہ سوچ مجھے زیادہ دیر نہ روک سکی۔اگلے دن میں نے ابو جان کے نمبر پر کال کر دی۔

"یار!خود تو پہلے بھی نظر نہیں آتے تھے اس بار تو ہماری بیٹی کو بھی غائب کر دیا ہے۔"سلام و دعا کے بعد ابو جان کے شکوے شروع ہو گئے۔

"تو کہاں ہے وہ آپ کے پاس ہی تو چھوڑ گیا تھا۔"میں الٹا ان سے استفسار کرنے لگا۔

"اپنے بھائی کے ساتھ وزیرستان گئی تھی بیٹا، اس کے بعد پتا نہیں چلا۔"

میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔"اچھا میں وزیرستان جانے کی کوشش کرتا ہوں شاید مل جائے۔"

"اتنی دیر تو نہیں ہونا چاہیے تھی بیٹا، گلناز بہن بھی بہت پریشان ہے اور تمھاری پھوپھو نے تو رو رو کر برا حال

کرلیا ہے۔''

''اسے کچھ نہیں ہوتا ابو جان وہ لڑکی کم اور لڑاکا زیادہ ہے۔''

ابو جان نے امید بھرے لہجے میں کہا۔''وزیرستان جانے سے پہلے گھر کا ایک چکر لگا لیتے۔''

''کوشش کروں گا ابو جان، مگر مشکل نظر آ رہا ہے۔''میں نے گول مول جواب دیا۔

''اچھا اپنی پھوپھو جان سے بات کرو۔''ابو جان نے موبائل فون پھوپھو جان کو پکڑا دیا۔وہ پلوشہ کے متعلق بہت پریشان تھیں، انھیں تسلی دے کر میں نے پلوشہ کی ماں گل ناز سے بھی بات کی، چونکہ ابو جان اور پھوپھو پشتو نہیں جانتے تھے اس لیے وہ بے فکری سے پلوشہ کے بارے محو گفتگو ہو گئی۔

''بیٹا!......میں نے اسے منع کیا تھا، مگر وہ میری کوئی بات ہی نہیں مان رہی تھی۔اس کا کہنا تھا کہ تمھیں اس کی مدد کی ضرورت ہے اور وہ گھر میں نہیں بیٹھ سکتی۔تمھاری وجہ سے مجھے بھی زور دینا مناسب نہ لگا، آخر تمھارے بھی تو ہم پر اتنے احسان ہیں۔''

''ماں جی اپنوں کا حق ہوتا ہے احسان نہیں ہوا کرتا۔باقی فکر نہ کریں میں افغانستان ہی میں ہوں اور ایک چھوٹا سا کام کر کے اسے ڈھونڈنا شروع کر دوں گا۔''انھیں تسلی دے کر میں نے چند منٹ مزید گپ شپ کی اور رابطہ منقطع کر دیا۔

گھر والوں کی خیریت جان کر مجھے کافی تسلی ملی تھی لیکن اس کے ساتھ پلوشہ کے بارے میں زیادہ فکر مند ہو گیا تھا۔اس کا کوئی اتا پتا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔کمانڈر عبدالحق کو میں نے پہلے سے پلوشہ کے بارے بتایا ہوا تھا کہ مجاہدین سے اس کے بارے معلوم کرتا رہے اور وہ گاہے گاہے معلوم کرتا بھی رہا تھا، مگر اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔گلگارے نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ جہاں میں البرٹ بروک وغیرہ کو ڈھونڈوں گا وہیں پلوشہ بھی مجھے مل جائے گی کہ وہ بھی انھی کو تلاش کر رہی ہو گی، مگر وہ یہاں کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔اگر اس نے امریکنوں کے خلاف کوئی کام کیا ہوتا تو جینی کو کچھ نہ کچھ سن گن ضرور ہوتی مگر اس نے بھی پلوشہ کے بارے استفسار کر کے گویا لاعلمی ظاہر کر دی تھی۔

اتنا عرصہ اس سے جدا رہنے کے بعد کبھی کبھی تو یوں محسوس ہونے لگتا کہ وہ میری زندگی میں آئی ہی نہیں اور

میں ایک لمبا سپنا دیکھ کر بیدار ہو گیا ہوں۔ پلوشہ کی ہنستی مسکراتی صورت ہر وقت نظروں میں رہنے کے باوجود لگتا تھا کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ایسی کوئی لڑکی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے متعلق مختلف قسم کے اندیشے بھی میرے دل میں سرسراتے رہتے۔ اس کی صلاحیتوں پر بھروسا ہونے کے باوجود میرا دل لرزتا رہتا تھا کہ کہیں وہ کسی ایسی مشکل میں نہ پھنس جائے جس سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہ ہو اور اس وقت تو میں بھی اس کی مدد کے لیے موجود نہ ہوتا۔ گو سردار خان ایک مخلص اور غیرت مند دوست تھا۔ پلوشہ کا وہ ہر ممکن خیال کرتا مگر مجھے یہ سوچ بھی تسلی نہیں دیتی تھی۔

☆......☆......☆

دن بھر میں اس مختصر مکان ہی میں گھومتا رہتا۔ کبھی احمد کے ساتھ گپ شپ کرتا اور کبھی یونھی صحن میں چکراتا رہتا۔ وہاں سے باہر جانے کی ضرورت مجھے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس دن میں احمد کے ساتھ بیٹھا رات کا کھانا کھا رہا تھا جب کمانڈر عبدالحق کی کال موصول ہوئی۔

سلام ودعا کے بعد عبدالحق کہنے لگا۔ ''ایک خوش خبری ہے آپ کے لیے۔''

میں نے جوش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا پلوشہ کا پتا چل گیا؟''

''ان شاء اللہ وہ بھی لگ جائے گا، لیکن فی الحال ایک اہم امریکن ہاتھ لگا ہے، اب ہم آپ کی بے گناہی کے ثبوتوں کا سودا کر سکتے ہیں۔''

میں نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''بھلا وہ کیسے؟''

''کل ایک قافلے پر گھات لگائی ہے اسی میں یہ ہاتھ لگا ہے۔''

''مگر یوں ایک دم، اچانک......''

''یہاں آ جاؤ نا پھر گپ شپ کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ احمد بھی ہماری گفتگو کی طرف متوجہ تھا پوچھنے لگا......

''کیا پلوشہ مل گئی ہے؟''

''نہیں کوئی امریکن ہاتھ لگا ہے اور اب مجھے وہیں جانا ہوگا۔''

اس نے پوچھا۔ ”اس وقت؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

احمد نے حیدر کو کال کر کے گاڑی منگوالی۔ میں احمد سے الوداعی ملاقات کر کے وہاں سے نکل آیا۔ حیدر اور اس کے ساتھ دو افراد میرے ساتھ جانے کے لیے تیار تھے۔

گھنٹے ڈیڑھ کے بعد ہم بغیر کسی رکاوٹ کے مخصوص ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر بسم اللہ جان اور عبدالحق بڑے تپاک سے مجھے ملے۔ ان سے جو تفصیل معلوم ہوئی اس کے مطابق گزشتہ کل انھیں امریکن قافلے کی آمد کے بارے معلوم ہوا اور وہ ایمرجنسی میں کارروائی کر گزرے۔ امریکنز نے گاڑیاں بھگانا شروع کر دیں افراتفری میں ایک گاڑی سڑک سے لڑھک کر الٹی ہوگئی۔ باقی گاڑیوں والے اس کے لیے رکے نہیں تھے۔ امریکیوں کی بدقسمتی کہ قافلے کی حفاظت کے لیے ساتھ ہیلی کاپٹر بھی موجود نہیں تھا پس جب تک انھیں کچھ سمجھ آتا مجاہدین نے الٹی ہوئی گاڑی سے چار آدمیوں کو نکال لیا تھا۔ ان میں دو محافظ، ایک ڈرائیور اور ایک آفیسر تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ کابل سے امریکنز کے غزنی کیمپ کے لیے ایک کمانڈنگ آفیسر آ رہا تھا جو کیمپ تک پہنچنے سے پہلے مجاہدین کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ یہ دوپہر کا واقعہ تھا اور اب تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ میں نے مذکورہ آدمی سے ملنے کا کام صبح پر ٹالا اور آرام کے لیے لیٹ گیا۔ کمانڈر بسم اللہ جان کے جانے کے بعد بھی عبدالحق اور میں کافی دیر گپ شپ کرتے رہے۔ میں پلوشہ اور سردار کے غائب ہوجانے کے بارے تشویش کا اظہار کرتا رہا۔ اس نے اپنے طور پر تو مجھے تسلی دینے کی کوشش کی مگر میں بچہ نہیں تھا جو ان تسلیوں سے بہل جاتا۔ میری چھٹی حس بار بار کسی بڑی مصیبت کا اعلان کرنے لگتی۔ کوئی دلیل اور تسلی اس ضمن میں فائدہ نہیں دے رہی تھی۔ عبدالحق سے میں نے جینیفر کی بات اور اس کے مدد کرنے کا ذکر بھی کیا تھا۔

”آپ کے لیے تو کافی مددگار ثابت ہوئی ہے۔“ عبدالحق نے دبے لفظوں میں اس کی تعریف کی تھی۔

☆......☆......☆

صبح ناشتے کے بعد میں کمانڈر عبدالحق کے ساتھ قیدی کو دیکھنے چل پڑا۔ اپنے چہروں پر ہم نے مفلر لپیٹ لیے تھے، کیونکہ اس آفیسر کو ہم نے سودے میں استعمال کر کے واپس بھیجنا تھا اور ایسے کسی آدمی کے سامنے اصل

شکل میں جانا مناسب نہیں تھا۔ وہاں ایک بہت بڑی حیرت میری منتظر تھی۔ قیدی کو دیکھتے ہی میں اچھل پڑا تھا ۔وہ میجر جیمس میتھونی تھا۔ وہ میرا استاد تھا۔ایک قابل اور ذہین شخص کو یوں کرسی پر بندھا دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔اس سے میں نے کافی کچھ سیکھا تھا۔ہمیں اندر داخل ہوتا دیکھ کر وہ ہماری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔اسے پہچانتے ہی میں تیر کی طرح اس کی طرف بڑھا اور اگلے ہی لمحے میں اس کی بندشیں کھول رہا تھا۔کمانڈر عبدالحق کو میرا جوش دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی، لیکن اس نے مجھے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔اتنا تو وہ بھی جانتا تھا کہ میں وہ کام کسی خاص مقصد ہی سے کر رہا تھا۔خود میجر جیمس میتھونی بھی حیرت زدہ رہ گیا۔اس کی بندشیں کھول کر میں اس کے سامنے آیا اور اپنے چہرے سے مفلر اتار دیا۔

''ذیشان!......''اس کی حیرت دگنی ہو گئی تھی۔

''جی سر!''میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔بے ساختہ اٹھتے ہوئے وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ اس سے معانقہ کر کے میں کمانڈر عبدالحق کو مخاطب ہوا۔''یہ میرا استاد ہے،اسے کسی بہتر کمرے میں منتقل کرنا پڑے گا۔''

''اپنے کمرے میں لے چلتے ہیں۔''کمانڈر عبدالحق نے فوراً مشورہ دیا۔اور میں اپنے استاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔تھوڑی دیر بعد ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔عبدالحق چائے وغیرہ کا بندوبست کرنے نکل گیا تھا۔

''آپ بھی دہشت گردوں کے ساتھ مل گئے ہو۔''جیمس میتھونی نے چھوٹتے ہی پوچھا تھا۔

''میرا خیال ہے دہشت گرد کون ہے اس بارے بحث رہنے دیتے ہیں سر!''

وہ خفیف ہوتا ہوا بولا۔''معذرت خواہ ہوں۔''

''ایسا کہہ کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں،آپ میرے استاد ہیں۔''

وہ ہنسا۔''اب تو آپ کی قید میں ہوں۔''

''آپ قیدی نہیں ہیں، جب چاہیں آپ کو چھوڑ دیا جائے گا۔''

''اتنی مہربانی کس لیے؟''

”یہ مہربانی نہیں ہے۔“

”آپ تو پاکستان آرمی میں تھے اور جہاں تک میری معلومات ہے پاکستان آرمی افغانستان میں کسی قسم کی کارروائی میں ملوث نہیں ہے۔“

”ٹھیک کہا سر، میں یہاں اپنے کسی کام سے آیا ہوں۔“

”اپنا کام، مطلب وہی جہاد وغیرہ کا شوق؟“ اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز شامل تھا۔

”جہاد کا شوق تو ہے سر، مگر پاکستان آرمی کا کوئی سپاہی صرف اسی جہاد میں شامل ہوسکتا ہے جس کی اجازت آرمی کی طرف سے ملی ہو۔“

”پھر......“ اس نے حیرانی ظاہر کی۔

اب طنز کی باری میری تھی۔ ”اس کے پیچھے بھی آپ لوگوں کی مہربانی شامل ہے۔“

”بھلا وہ کیسے؟“ اس نے کچھ جاننے کی کوشش کی۔

جواباً میں نے اس کے سامنے البرٹ بروک اور کرنل کولن فیلڈ کی ساری کارروائیاں دہرا دیں جو کہ انھوں نے مجھے بلیک میل کرنے کی خاطر کی تھیں۔

میری بات کے اختتام پر وہ پوچھنے لگا۔ ”اور ان کے قتل میں یہی وجہ کارفرما تھی۔“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہاں پر میں اکیلا آیا تھا اور مجھے کچھ مددگاروں کی ضرورت تھی۔ یقیناً دنیا میں لے دے کے اصول پر کام چلتا ہے پس مجھے مجاہدین کی مدد کرنا پڑی۔“

”یقیناً اتنی دور سے آپ ہی انھیں نشانہ بنا سکتے تھے۔ جب مجھ تک کرنل کولن فیلڈ اور دوسرے آفیسرز کے قتل کی بات پہنچی میرا پہلا خیال تمھاری طرف گیا تھا، لیکن پھر یہ خیال آیا کہ پاکستان آرمی کا کوئی سپاہی افغانستان میں کیسے آسکتا ہے۔“

میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں البرٹ بروک اور کرنل کولن فیلڈ کی کارروائی سے آپ بے خبر تھے۔“

”مجھے کرنل کولن فیلڈ کے قتل کے بعد ہی امریکہ سے بلایا گیا ہے۔ اور مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے کیوں اتنا

غلط کام کیا، کسی کو مجبور نہیں کرنا چاہیے۔''

''میرے دماغ میں تو یہی خیال تھا کہ شاید آپ ہی نے البرٹ بروک کو میرے بارے مطلع کیا ہو۔''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔'' اسے کرنل سکاٹ ڈیوڈ یا کرنل جولی روز ویلٹ سے پتا چلا ہوگا۔''

''ہونہہ!......تو آپ اب کرنل ہیں۔''

اس نے تصحیح کی۔''لیفٹیننٹ کرنل۔''

''جانتے ہیں سر، آپ کو پکڑنے کی وجہ، میری بے گناہی کے ثبوتوں کا حصول ہے۔''

وہ ہنسا۔''تو گویا اب میرا سودا کیا جائے گا۔''

''سودا کیا جانا تھا، لیکن اب تو بغیر کسی معاہدے کے آپ کو رہا کروں گا۔''

''کیا باقی آپ کی بات مان لیں گے۔''

''ماننا پڑے گی، جب ان کا مقصد میری بے گناہی کے ثبوتوں کا حصول تھا تو پھر آپ کے بارے فیصلہ کرنا میرا حق ہے۔

اس نے ممنونیت سے کہا۔''شکریہ ذیشان!''

اسی وقت کمانڈر عبدالحق چائے کے ساتھ کچھ کھانے کے لوازمات لے آیا۔

جیمس نے کہا۔''ویسے میں ناشتا کر چکا تھا۔''

میں نے کہا۔''ہم بھی۔''

کمانڈر عبدالحق چائے کے برتن چھوڑ کر باہر نکل گیا تھا۔ یقیناً وہ ہمیں تنہائی میں گپ شپ کا موقع دینا چاہتا تھا۔ یوں بھی وہ انگریزی نہیں جانتا تھا کہ ہماری بات چیت اس کے پلے پڑتی۔

جیمس کو اپنے بستر پر لٹا کر میں عبدالحق کے بستر پر لیٹ گیا اور دائیں بائیں کی باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ اسے سونے کے لیے چھوڑ کر میں باہر نکل آیا۔ اسے میں نے بتا دیا تھا کہ رات کو اسے واپس چھوڑ آؤں گا۔

کمانڈر بسم اللہ جان کو کمانڈر عبدالحق ساری بات بتا چکا تھا، اس نے کسی قسم کے استفسار کی ضرورت محسوس

نہیں کی تھی۔

☆......☆......☆

رات کا کھانا کھا کر ہم جانے کے لیے تیار تھے۔ جانے سے پہلے میں نے جینی کو رابطہ کرنے کا میسج کر دیا تھا ۔خفیہ ٹھکانے سے نکلنے سے پہلے ہم نے کرنل جیمس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ رستے ہی میں جینی کی کال آ گئی تھی۔ میرے ہیلو کرتے ہی وہ بولی۔

''ذی!...... تمھیں بتایا تھا کہ خود سے رابطہ نہ کرنا۔''

میں ہنسا۔''مجبوری تھی یار!''

''ذی ہم پر بہت کڑا وقت آیا ہوا ہے، ایک آفیسر کل سے دہشت گردوں کے قبضے میں ہے، اسے ڈھونڈنے کے لیے کوئی لائحہ عمل سوچا جا رہا ہے۔''

میں ہنسا۔''ویسے امریکہ سے بڑا دہشت گرد کون ہو سکتا ہے۔''

''مذاق کا وقت نہیں ہے ذی۔'' یہ کہتے ہوئے اسے کوئی بات یاد آئی اور وہ پوچھنے لگی۔''جانتے ہو وہ ہے کون؟''

''میں مذاق نہیں کر رہا۔ اور مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے اس کے بارے۔''

''ذی تمھیں اپنا استاد جیمس میتھونی تو یاد ہو گا۔''

''استاد بھی کبھی بھولتے ہیں، ہمارا مذہب تو استادوں کی تکریم کی اتنی ہدایت کرتا ہے جو تم لوگ سوچ بھی نہیں سکتے''

اس نے ایک دم اشتیاق سے پوچھا۔''کیا تم اس معاملے میں ہماری کوئی مدد کر سکتے ہو؟''

''اگر میرا جواب ہاں میں ہو اور میں انھیں با حفاظت لے بھی آؤں تو کیا انعام دو گی۔''

اس نے قہقہہ لگایا۔''کیا انعام لو گے، میں تو کب کی سراپا انعام بنی پھر رہی ہوں تم خود ہی انکار پر مائل ہو۔''

''بکواس کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا۔''

وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔''اچھا سچ بتاؤ، کچھ کر سکتے ہو۔''

''جس ہوٹل کے سامنے آخری ملاقات ہوئی تھی وہاں کتنی دیر میں پہنچ سکتی ہو۔''

وہ صاف گوئی سے بولی۔ ''موجودہ حالات میں تو بالکل نہیں آسکتی۔''

''اگر میں کہوں میں جیمس صاحب کو گھنٹے تک وہیں لا رہا ہوں پھر؟''

''ذی!......میں رابطہ منقطع کر رہی ہوں۔'' اس نے میری بات کو مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

''اچھا یہ لو بات کرو۔'' میں نے ساتھ بیٹھے جیمس کو موبائل پکڑا دیا۔ ''سر!......جینی سے بات کریں۔''

جیمس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو گڈ گرل۔''

''سر!......'' اس نے اتنے زور سے کہا تھا کہ میرے کانوں تک اس کی آواز پہنچی تھی۔

''میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے اور میں اس وقت مسٹر ذیشان کے ساتھ ہوں۔ وہ مجھے کہیں چھوڑنے جا رہے ہیں۔''

جانے اس نے جواب میں کیا کہا تھا کہ جیمس نے موبائل میری جانب بڑھا دیا۔

موبائل کان سے لگاتے ہی میں نے پوچھا۔ ''یقین آیا۔''

وہ وارفتگی سے بولی۔ ''ذی!......آئی لو یو، میں بس آدھے گھنٹے میں وہاں پہنچ رہی ہوں۔''

''کوشش کرنا کہ اکیلی آنا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

غزنی شہر کے مضافات میں پہنچتے ہی میں نے کرنل جیمس کی آنکھوں پر سے پٹی کھول دی۔ میں اپنے ساتھ بس ڈرائیور کو ہی لایا تھا۔

ہوٹل کے سامنے ہی ہمیں جینیفر بڑی بے صبری سے منتظر ملی گاڑی کے رکتے ہی وہ آگے بڑھی اور میرے اترتے ہی مجھ سے لپٹ گئی۔

''ذی!......بہت بہت شکریہ۔''

میں نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ نیویارک نہیں ہے محترمہ۔''

وہ برا منائے بغیر کرنل جیمس میتھونی کی طرف بڑھ گئی۔

''کیسی ہو آفیسر۔'' جیمس نے اس سے پرتپاک مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

وہ مسکرائی۔ ”عمدہ سر۔“

”اچھا میں چلوں گا۔“ میں ان کی گفتگو میں مخل ہوا۔

”ٹھیک ہے۔“ جیمس نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا۔ جینی دوبارہ زبردستی گلے ملی اور وہ دونوں اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ میں نے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ تھوڑی دور آتے ہی وہ مجھے مخاطب ہوا۔

”رات یہیں شہید خان کے گھر گزار لیتے ہیں، صبح نکل چلیں گے۔“

شہید خان کا گھر وہی خفیہ ٹھکانہ تھا جہاں احمد بھی ٹھہرا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے وہیں چلو“ میں نے اثبات میں سر ہلا کر کمانڈر بسم اللہ جان کو کال کر کے وہاں رکنے کا بتانے لگا صبح بھی احمد کے اصرار پر ہم نے واپس لوٹنے کا پروگرام اگلے دن کے لیے مؤخر کر دیا تھا۔ رات گئے مجھے جینی کی کال ملی۔ میری ہیلو کے جواب میں وہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔

”ذی، تمھاری بے گناہی کے سارے ثبوت میں نے حاصل کر لیے ہیں۔“

”کیا......؟“ میرا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

”سچ کہہ رہی ہوں۔“ جینی کھل کھلائی۔ ”کیا یقین نہیں آرہا۔“

”ہاں۔“ میں نے صاف گوئی سے اقرار کیا۔

”ذی، حقیقت تو یہ ہے کہ میں اتنی جلدی ان ثبوتوں تک رسائی نہیں پا سکتی تھی، یہ کرنل جیمس میتھونی کی مہربانی ہے کہ کل جاتے ہی انھوں نے کرنل کولن فیلڈ کی جگہ کیمپ کی قیادت سنبھالی اور سب سے پہلا کام یہی کیا کہ تمھاری بے گناہی کے ثبوت میرے حوالے کر دیے۔“

”جینی!......اگر یہ سچ ہے تو میں بغیر کسی تاخیر کے انھیں حاصل کرنا چاہوں گا۔“

وہ اعتماد سے بولی۔ ”کہاں پہنچاؤں۔“

”وہی پرانا ہوٹل بہتر رہے گا۔“

”نہیں، اس مرتبہ کسی اچھے ہوٹل میں ملیں گے، اکھٹے بیٹھ کر کھانا کھائیں گے تھوڑی دیر گپ شپ کریں گے اس کے بعد تم یوں بھی ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاؤ گے۔“ آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“میں نے فوراً حامی بھری۔

اس نے ایک مشہور اور اچھے ہوٹل کا نام لیتے ہوئے کہا۔”کل دوپہر میں کمرہ نمبر پندرہ میں تمھاری منتظر رہوں گی۔“

میں نے دوبارہ۔”ٹھیک ہے۔“ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

اگلے دن دوپہر کو میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ہٹ دھرمی کا اظہار کر کے اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور وہ تمام وڈیو دکھانے لگی جن کے شروع اور آخر میں ان کی اپنی باتیں اور منصوبے تھے جو وہ مجھے قابو میں کرنے کے لیے بنا رہے تھے۔دو تین وڈیو دیکھ کر میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے جینی، یہ لیپ ٹاپ میں لے جاؤں گا۔“

”اس یو ایس بی میں تمام ڈاٹا ڈال دیا ہے۔“اس نے ایک یو ایس بی میرے جانب بڑھائی۔

یو ایس بی پکڑتے ہوئے میں نے کہا۔”لیپ ٹاپ بھی لے جاؤں گا۔“

وہ ہنسی۔”بے شک مجھے بھی لے جاؤ۔“

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔”ویسے شرم کی بات ہے کہ تمھارے سامنے وہ میرے خلاف منصوبے ترتیب دیتے رہے اور تم نہ صرف آرام سے وہ سب کچھ سنتی رہیں بلکہ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی انھیں نوازتی رہیں اور مجھے اشارہ تک نہ دیا۔“

وہ ہنسی۔”صحیح کہا اور میں اپنے فعل پر بالکل بھی شرمندہ نہیں ہوں۔“

”گویا مجھ سے پہلے تمھاری ذمہ داریاں ہیں۔“

”نہیں تم سے پہلے اور تم سے بعد بھی تم ہی ہو۔“

”جھوٹ بولنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“میں سچ مچ خفا تھا۔

”ذی، ایسا میں نے ملک و قوم کے لیے نہیں اپنے لیے کیا تھا، میرا خیال تھا کہ شاید اس طرح تم امریکہ جانے کے لیے تیار ہو جاؤ اور سچ کہوں تو تمھیں بلیک میل کرنے کے منصوبے میں میں پیش پیش تھی۔“اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔

''تو وزیرستان میں آخری ملاقات کے موقع پر جب میں نے کسی بھی صورت امریکہ کے لیے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا، تب بھی تم نے یہ مواد میرے حوالے کیوں نہیں کیا۔''

''اس وقت تمام مواد البرٹ بروک کے پاس تھا، مجھ سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ اسے میں نے اپنے اور تمھارے بارے سب کچھ سچ بتا دیا تھا اور اس کے بعد تمھارے معاملے وہ مجھ پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔''

''اچھا جانے دو اس بحث کو، اب ارادہ کیا ہے۔''

اس نے انکشاف کیا۔''مہینے ڈیڑھ تک واپس جا رہی ہوں اور جاتے ساتھ شادی کا ارادہ ہے۔''

میں نے مزاحیہ انداز میں کہا۔''مجھے کیوں سنا رہی ہو۔''

''سنا نہیں رہی آخری موقع دے رہی ہوں، اب بھی وقت ہے مجھے روک سکتے ہو۔''

''کیا فائدہ، مجھ سے شادی کرنے کے ایک ماہ کے اندر تم اپنے فیصلے پر پچھتانا شروع کر دو گی۔ ہم مشرقی لوگ اپنی بیوی کو اتنی آزادی نہیں دے سکتے جو تمھارے ہاں میسر ہے۔''

وہ پر جوش لہجے میں بولی۔''میں پابندی برداشت کر لوں گی۔ بلکہ ایسا ہے کچھ عرصہ میرے ساتھ رہ کر دیکھ لو اگر تمھارے معیار پر پوری نہ اتری تو بے شک شادی نہ کرنا۔''

''بغیر شادی کے لڑکی، لڑکے کا اکٹھے رہنا بھی تمھاری ثقافت ہے، ہمارے ہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولی۔''تم اور پیلا وشہ بھی تو شادی سے پہلے اکٹھے رہتے رہے ہو، تمھارا کیا خیال ہے میں کچھ نہیں جانتی۔''

میں جلدی سے بولا۔''تمھارے پاس نہایت غلط معلومات ہیں، پلوشہ اور میرے اکٹھا رہنے کا مقصد قبیل خان کا خاتمہ تھا۔''

وہ وثوق سے بولی۔''ممکن ہے ایک وجہ یہ بھی ہو، لیکن بھول گئے کیسے پیلا وشہ کے ایک بار پکارنے پر بھاگے چلے آئے تھے۔ مانو یا نہ مانو تمھارے دل میں پہلے سے اس کے بارے میں ایسے خیالات موجود تھے۔''

میں اسے جھڑکتے ہوئے بولا۔''جب بات کا پتا نہ ہو تو خواہ مخواہ بکواس نہیں کی جاتی۔''

وہ موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولی۔''اچھا دفع کرو، یہ بتاؤ ملنے آؤ گے کہ نہیں۔''

''کال پر بات کرلوں گا اور میرا خیال ہے اتنا کافی ہے۔یوں بھی وہاں آ کر تمھارے شوہر سے مار کھانے سے بہتر ہے میں آؤں ہی نا۔''

''بڑے آئے مظلوم۔''اس نے میرا منھ چڑایا۔اور میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''ویسے کوئی دولھا ڈھونڈا بھی ہے یا واپسی ہی پر کچھ سوچو گی۔''

''کئی مرد عندیہ دے چکے ہیں،بس ابھی جا کر کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔''

میں نے کہا''تمھارے لیے یہی بہتر ہے۔کیونکہ ہماری شادی میں پلوشہ کے علاوہ بھی کئی رکاوٹیں ہیں۔''

''بالکل اور سب سے بڑی رکاوٹ ہے تمھاری ناپسندیدگی۔''اس نے منھ بنایا۔

میں نے جھلا کر کہا۔''لڑکیاں چاہے کتنے بڑے عہدے پر کیوں نہ ہوں سوچنا انھوں نے دل ہی سے ہوتا ہے۔ہماری شادی میں جو قباحتیں ہیں ان کے بارے میں تمھیں تفصیل سے آگاہ کر چکا ہوں اس کے باوجود تم یہی سمجھتی ہو تو بھاڑ میں جاؤ۔''

''پیلاوشہ میں ایسی کون سے بات ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔''وہ میری ناگواری خاطر میں نہیں لائی تھی۔

''مجھ میں ایسی کون سے بات ہے جو تمھیں اپنے ملک کے پرکشش،خوب صورت اور اپنے ہم مذہب جوان پسند نہیں آرہے۔''

''یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔اور تمھارے اس سوال سے مجھے علم بھی ہو گیا ہے جو تم باور کرانا چاہتے ہو۔''

''کیا؟''

''یہی کہ،وہ مجھ سے خوب صورت ہے اور تمھیں زیادہ پیاری ہے۔''

''جینی،تم خواہ مخواہ بات کو بگاڑ رہی ہو پلوشہ کے ہوتے ہوئے بھی مجھے مذہب دوسری شادی کی اجازت دیتا ہے لیکن یقین کرو تم بچپن سے جس ماحول میں پلی بڑھی ہو اسے چھوڑنا تمھارے لیے ممکن نہیں ہوگا،یہ محبت کا بھوت اترنے میں مہینے سے زیادہ نہیں لگے گا۔''

وہ مسکرائی۔''اچھا یار چھوڑو،خواہ مخواہ صفائیاں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''صفائیاں نہیں دے رہا حقیقت بیان کر رہا ہوں۔''

”کیا میں واقعی تمھیں پیاری لگتی ہوں؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اور اس بات پر تمھیں بھی یقین ہے۔“

اس نے کہا۔ ”اور پیلا وشہ۔“

”وہ بھی۔“

”سچ کہوں تو پیلا وشہ مجھے بہت پیاری لگی ہے۔“ اس نے انکشاف کیا۔

”وہ بہت مظلوم ہے اور اس سے بھی زیادہ ہمت والی ہے۔“

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ ”ویسے میرے بارے کیا کہہ رہی تھی۔“

میں نے قہقہہ لگایا۔ ”کچھ ایسا نہیں کہا جو بتایا جائے۔“

وہ منھ بناتے ہوئے بولی۔ ”جانتی ہوں اس خونخوار بلی کو۔“ نہ جانے کیوں مجھے اس کے لہجے کی گہرائی میں شفقت جھلکتی نظر آرہی تھی۔

”اچھا مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے، تھوڑی خریداری کرنا ہے۔“

”اس وقت تو دو تین ہزار ڈالر ہی ہوں جیب میں، اگر زیادہ چاہئیں تو منگوا لیتی ہوں۔“

میں نے بے تکلفی سے کہا۔ ”دو ہزار کافی ہیں۔“

وہ ممنونیت سے بولی۔ ”تمھارا رقم مانگنا مجھے اچھا لگا۔“

ہم کافی دیر گپ شپ کرتے رہے پھر اس سے اجازت لے کر میں وہاں سے نکل آیا۔ الوداع ہوتے وقت وہ کافی اداس ہو گئی تھی۔ لیکن بچھڑنا تو آخر تھا۔ اپنی عادت پر عمل کرتے ہوئے اس نے مجھے خدا حافظ کہا اور میں وہاں سے باہر نکل آیا۔ اپنی بے گناہی کے ثبوت میں نے حاصل کر لیے تھے۔ واپسی کا ارادہ کرنے کے ساتھ میرے دل میں کچھ خریداری کا خیال آیا، کیونکہ میں گلگارے، رنڑا اور ثمر خان وغیرہ کے لیے کچھ تحائف لینا چاہتا تھا۔ گھنٹا ڈیڑھ خریداری میں لگا کر میں واپس شہید خان کے مکان پر پہنچ گیا۔ وہاں احمد، اس کی بیوی اور میزان سے آخری ملاقات کر کے میں ڈرائیور کے ساتھ واپس چل پڑا۔ عبدالحق اور بسم اللہ جان کو میں کامیابی کی خبر سنا چکا تھا۔ انھوں نے کال ہی پر مجھے بہت بہت مبارک باد دی تھی۔

”گویا اب واپس جاؤ گے۔“ رات کو لیٹتے وقت عبدالحق مجھے مخاطب ہوا۔

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اور پلوشہ بیٹی کے بارے کیا سوچا ہے۔“

ایک دم مجھے خیال آیا کہ ثبوت ملنے کی خوشی میں میں نے اپنی جان حیات کو بھلا دیا تھا جو میرے لیے جانے کہاں خوار ہوتی پھر رہی تھی۔

میں نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔”میرے ذہن ہی سے یہ اہم کام نکل گیا تھا۔“

”چلو اب بتا دو کیا پروگرام ہے۔“

میں فوراً بولا۔”پلوشے کو ڈھونڈ کر واپس جاؤں گا۔“

”ایک سودا کرو گے۔“

”کیسا سودا؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”پلوشہ بیٹی کو ڈھونڈنے کا کام میں اپنے ذمہ لیتا ہوں، میرا مطلب یہ کام میں چند مجاہدین کے ذمہ لگاتا ہوں آپ میرا ایک کام کر دیں۔“

”کون سا کام؟“

”نک سٹیورٹ نامی نشانہ باز ہمارا کافی نقصان کر چکا ہے۔“

”میرا خیال ہے پہلے بھی کافی دیر ہوگئی ہے۔ پلوشہ جب تک مل نہیں جاتی مجھے یکسوئی حاصل نہیں ہوگی۔“

”ایسا کرتے ہیں آپ میرے ساتھ گردیز چلیں میں وزیرستان میں رابطہ کر کے کسی کمانڈر کے ذمہ پلوشہ کی تلاش کا کام لگاتا ہوں۔ آپ کے مطابق آخری بار وہ کمانڈر نصر اللہ خوجل خیل سے ملے تھے اس کے بعد کہاں گئے یہ کسی کو بھی پتا نہیں ہے۔ اب میرے خیال میں ان کی تلاش کا کام وہیں شروع کرنا پڑے گا اور اس ضمن میں کافی آدمی استعمال ہوں گے، تو بہتر یہی ہے کہ آپ میری بات مان لیں۔“

میں نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔”گویا، میرے انکار کرنے پر آپ پلوشہ کی تلاش میں میری مدد نہیں کریں گے۔“

وہ فوراً بولا۔”ایسا میں نے کب کہا ہے۔“

”آپ پلوشہ کی تلاش کا کام پہلے بھی تو شروع کرا سکتے تھے۔“میں شاکی ہوا۔

”ہاں، آپ کی طرح مجھے بھی امید تھی کہ وہ جلد یا بدیر مل جائے گی، مگر یہ نہیں سوچا تھا کہ آپ کا کام ختم ہونے کے بعد بھی اس کی کوئی سن گن نہیں ملے گی۔ اور سب سے بڑھ کر آپ نے بھی تو کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔“

اس کی بات صحیح تھی پلوشہ کے ضمن میں مجھ سے تھوڑی سے بے پروائی ہو گئی تھی۔ مجھے کسی نہ کسی کو اس کی تلاش میں شروع دن سے لگا دینا چاہیے تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں خیال آیا۔

”کس کو لگاتا۔“ مجاہدین میرے زرخرید یا ملازم نہیں تھے کہ جہاد چھوڑ کر میری بیوی کو تلاش کرتے پھرتے۔ پاکستان آرمی سے میں یوں بھی بھاگتا پھر رہا تھا، جو دوست کسی قابل تھا وہ پہلے سے میرے کام کے سلسلے میں مصروف تھا اس کے علاوہ میں کر کیا سکتا تھا۔

”مجھے خاموش پا کر وہ دوبارہ بولا۔“ اگر اس کے علاوہ کوئی حل سوجھتا تو ہم آپ کو بالکل تکلیف نہ دیتے۔ یقین مانو اس خبیث کی ہمت بہت بڑھ گئی ہے۔ اب تو لگتا ہے ہمیں گردیز کیمپ کو خیر باد کہنا پڑے گا اور گردیز کیمپ کے بعد وہ کسی اور جگہ کو تاڑ لے گا۔ آپ کے شاگرد بھی اسے روکنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ صغیر اور اسلم پہلے شہید ہو گئے تھے، ایک ہفتہ پہلے مبین اور احسان بھی باقی نہیں رہے۔“

وہ چاروں میرے شاگرد تھے، گو انھوں نے صرف نشانہ بازی کے متعلق ہی تھوڑا بہت سیکھا تھا لیکن میرے ساتھ انھوں نے جو دو تین ہفتے گزارے تھے وہ وقت ایک یاد کی صورت میری یادداشت میں محفوظ تھا۔ وہ نک سٹیورٹ کو ہلاک کرنے کی کوششوں میں خود شہید ہو چکے تھے۔ ایک منجھے ہوئے سنائپر کا مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ نک سٹیورٹ کی جینیفر بھی کافی تعریف کر چکی تھی۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ ایک خطرناک سنائپر تھا اور ایسے شخص کے مقابل آنے کا مطلب خود کو شدید خطرے میں ڈالنا تھا کیوں کہ وہ اس علاقے میں کافی عرصے سے سرگرم تھا۔ گویا گردیز کا علاقہ اس کے لیے ہوم گراؤنڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اپنی مرضی کے میدان کا انتخاب کر کے مجھے کسی مشکل سے دوچار کرنا اس کے لیے دشوار نہ ہوتا۔ اس سب کے باوجود بھی مجھے جان سے زیادہ پلوشہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

”کس سوچ میں گم ہو۔“ مجھے خاموش پا کر وہ مستفسر ہوا۔

’’عبدالحق بھائی آپ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ضروری نہیں کہ ایک سنائپر کے مقابلے میں آپ سنائپر ہی کو لائیں، اس کے خلاف کوئی اور منصوبہ بھی تو بنایا جاسکتا ہے۔
’’ایسا بہت پہلے سوچ کر اس پر عمل کرنے کے باوجود ہم ناکامی کا سامنا کر چکے ہیں۔‘‘
میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔’’پلوشہ کی تلاش کے لیے رابطہ کرلو۔ اس کے علاوہ میری بے گناہی کے ثبوت بھی ایک خاص آدمی تک پہنچانے ہوں۔‘‘
’’ایس ایس زندہ باد۔‘‘ عبدالحق نے خوش دلی سے نعرہ بلند کیا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ہم بسم اللہ جان اور اس کے ساتھیوں سے الوداع ہو رہے تھے۔ کمانڈر بسم اللہ نے مجھ سے معانقہ کرتے ہوئے کہا۔’’ذیشان بھائی!......آپ کی یاد آئے گی۔‘‘
’’آپ کی محبت ہے کمانڈر، یقیناً آپ کی مدد کے بغیر میں یہ سب کچھ نہ کرسکتا۔‘‘
’’ہم نے آپ کے لیے اتنا نہیں کیا جتنا آپ نے ہمارے لیے کیا ہے۔‘‘
میں ہنسا۔’’چلو حساب برابر ہو گیا۔‘‘
وہاں سے کچھ رستہ گاڑی میں بیٹھ کر گئے اور پھر پیدل روانہ ہوئے ہماری منزل پکتیکا کا ٹھکانہ تھی۔ گو ہم گردیز تک گاڑی میں جاسکتے تھے، مگر میرے پاس جو ثبوت موجود تھے ان کی حفاظت کے لیے گاڑی کے بجائے ہم نے پیدل رستے کو ترجیح دی تھی۔
راستے میں کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا اور ہم خیریت سے اس خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر اسلام ہمیں پرتپاک انداز میں ملا۔
’’یقیناً آپ کامیاب لوٹے ہیں۔‘‘ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔
میں نے کہا۔’’الحمداللہ۔‘‘
باقی افراد سے مصافحہ کر کے ہم بیٹھ گئے۔ کمانڈر عبدالحق مختصر لفظوں میں کارگزاری سنانے لگا۔ اس کی بات کے اختتام پر کمانڈر اسلام تصدیقی انداز میں مجھے مخاطب ہوا۔’’گویا اب واپسی کا ارادہ ہے۔‘‘

”نہیں۔“ میرے بجائے کمانڈر عبدالحق نے جواب دیا۔”ابھی تک ذیشان بھائی کا ایک کام رہتا ہے۔“

اسلام نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا۔”یقیناً ذیشان بھائی نے اپنی بیگم صاحبہ کو ڈھونڈنا ہوگا۔“

”نہیں۔“ عبدالحق نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔”پلوشہ بیٹی کو ڈھونڈنے کے لیے آپ جا رہے ہیں۔ اور اس کی شروعات آپ کریں گے استاد محترم نصر اللہ خان خوجل خیل سے مل کر۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ اسلام سچ مچ حیران رہ گیا تھا۔

”ذیشان بھائی سے ایک معاہدہ ہو گیا ہے، یہ ہمارے لیے نک سٹیورٹ کا شکار کرے گا اور ہم پلوشہ بیٹی کو ڈھونڈیں گے۔“

”یہ ہوئی نا بات۔“ اسلام خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ اسی دوران رات کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کھانا کھا کر ہم نے عشاء کی نماز پڑھی، تھکے ہونے کے باوجود ہم کافی دیر بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ کمانڈر عبدالحق نے اسلام کو تفصیل سے پلوشہ کے ڈھونڈنے کی ترتیب بتا دی تھی۔ لیکن اس سے پہلے اسے اورنگ زیب صاحب کو مل کر میری بے گناہی کے ثبوت ان کے حوالے کرنا تھے۔ اورنگ زیب صاحب کا موبائل فون نمبر میں نے اسے دے دیا تھا۔ کمانڈر اسلام کو میں نے ایک یو ایس بی بھی دی تھی جو اسے اورنگ زیب صاحب کے حوالے کرنا تھی۔ ایک یو ایس بی میں نے اپنے پاس رکھ لی تھی جبکہ لیپ ٹاپ میں نے اسی ٹھکانے پر رکھوا دیا تھا۔ ثبوتوں کو گم کرنے کا میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

اگلی صبح کمانڈر اسلام ایک ساتھی ہمراہ روانہ ہو گیا۔ شمریز چچا اور ان کے گھر والوں کے لیے میں نے کافی تحائف خریدے تھے وہ تمام سامان میں نے ان کے حوالے کر دیا تھا۔

کمانڈر اسلام نے معنی خیز لہجے میں کہا۔”مطلب چچا شمریز خان آپ کو بھولا نہیں ہے۔“

میں نے فلسفیانہ لہجے میں جواب دیا۔”ایسے لوگ بھلائے جانے کے قابل نہیں ہوتے۔“

”صحیح کہا۔“ اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور الوداعی معانقہ کر کے۔”فی امان اللہ۔“ کہتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

کمانڈر عبدالحق نے رات ہی کو ایک نزدیکی ٹھکانے سے دو تین آدمی منگوا لیے تھے، جو دوپہر تک ہمارے

پاس پہنچ گئے تھے۔ہم نے وہ دن بھی وہیں گزارا تھا۔دوسرے دن ہم دونوں گردیز روانہ ہو گئے۔کمانڈر عبدالحق بہت جوش میں تھا۔نک سٹیورٹ نے کافی مجاہدوں کوشہید کیا تھا اور اب وہ بدلہ لینے کے لیے بے چین تھا۔

مجھے جاننے والے میری نشانے بازی پر اندھا اعتماد کرتے تھے،ان کے نزدیک میں ایک ہیرو کی طرح تھا ۔جبکہ بذات خود میرے دل میں یہ خوف جاگزیں رہتا کہ آیا میں لوگوں کی توقعات پر پورا بھی اتر پاؤں گا یا نہیں ۔عمومی طور پر لوگ جس آدمی کے لیے خوش اعتقاد ہوتے ہیں اس کے بارے بہت سی باتیں خود سے طے کر لیتے ہیں۔اوراس کے خلاف بات سننا تو درکنار سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے۔میری نشانہ بازی بھی کچھ لوگوں کے لیے یہی صورت اختیار کر گئی تھی۔کچھ صلاحیت اور کچھ مبالغہ آئی نے مجھے اس بلندی پر اٹھا دیا تھا جس کا میں خود کو اہل نہیں سمجھتا تھا۔

ہم دونوں وہاں سے مرناہ گر روانہ ہوئے۔وہاں سے ہوتے ہوئے ہم ساروبی اور ارگون کے رستے گردیز پہنچ گئے۔یہ افغانستان کے صوبے پکتیا کا دارلحکومت ہے۔مجاہدین کا ٹھکانہ شہر سے کافی ہٹ کر پہاڑوں کے بیچ میں تھا۔رستے میں ہمارے دو دن مزید ضائع ہو گئے تھے۔وہاں ہم رات کو پہنچے تھے۔دن کے وقت ان پہاڑی سلسلوں میں حرکت کرنا کافی دشوار گزار ہو گیا تھا۔نک سٹیورٹ نے مجاہدین کی دن کی نقل وحرکت کو محدود کر دیا تھا ۔نہ جانے کس جگہ پر چھپے ہوئے وہ اپنی دور مار رائفل کے ذریعے ان پہاڑوں میں گھومنے والے افراد کو نشانہ بنا تا رہتا۔اس ضمن میں اس نے کافی ایسے افراد کو بھی نشانہ بنا دیا تھا جن کا اس جنگ سے دور دور کا واسطہ نہیں تھا ۔مرد تو کجا وہ عورتوں کو بھی معاف کرنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔یوں بھی امریکیوں کے لیے تیسری دنیا کی عوام انسانیت کیا جانوروں کا درجہ بھی نہیں رکھتی۔اب اسی نک سٹیورٹ اور اس کی ساتھی لورا براؤن کے ساتھ میرا ٹاکرا ہونے والا تھا۔نہ جانے یہ مقابلہ کیا رنگ لاتا۔

✪......✪......✪

گردیز کیمپ بھی دوسرے ٹھکانوں کی طرح غاروں کے مجموعے پر مشتمل تھا۔اور وہ غار جن پہاڑی سلسلوں میں موجود تھے وہ پہاڑی سلسلے کافی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔وہاں ایک بلند پہاڑی پر نک سٹیورٹ اور اس کی ساتھی لورا براؤن نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔اس پہاڑی کی تین اطراف میں بالکل سیدھی ڈھلانیں تھیں جنھیں نقشہ بینی میں ہم ''اسکارپمنٹ'' پڑھتے ہیں۔اوپر چڑھنے کے لیے صرف ایک ہی جانب راستہ موجود تھا جہاں پر سخت پہرہ تھا۔نک سٹیورٹ اس پہاڑی کی بلندی سے کافی دور دور تک نشانہ بنالیتا تھا۔ویسے وہ مستقل وہاں نہیں رہتا تھا،کبھی کبھار وہ نیچے اتر کر بھی اپنا شکار ڈھونڈنا شروع کر دیتا۔مجاہدین نے اسے مارنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا لیکن کامیابی سے ہنوز دور تھے۔اور اب میری شکل میں وہ ایک نئی کوشش کر رہے تھے ۔اس بار وہ کافی مطمئن تھے۔البتہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس ٹاکرے کا کیا انجام ہونے والا ہے۔اس مرتبہ میرے مخالف ایک ایسا سنائپر موجود تھا جس کی نشانہ بازی کی اس کے دشمن بھی تعریف کر رہے تھے۔میری طرح وہ بھی سر ہی میں گولی مارتا تھا۔جس پہاڑی پر وہ موجود تھا وہاں مستقل ٹھکانہ بنا کر رہنا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ وہاں غار وغیرہ موجود نہیں تھے۔البتہ امریکن آرمی کے لیے ایسی پہاڑی پر رہائش کی سہولت مہیا کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔مجاہدین بھی وہاں مورچے وغیرہ بنا کر رہ سکتے تھے لیکن وہ مورچے بالکل کھلے میں ہوتے اور امریکنز انھیں آسانی سے ہیلی کاپٹر سے نشانہ بنا سکتے تھے۔اس وجہ سے انھوں نے کبھی اس پہاڑی پر رہائش اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

یہ ساری تفصیل مجھے گردیز کیمپ کے کمانڈر ضلع خان سے ملی تھی۔اگلی صبح میں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ ان کے پاس موجود سنائپر رائفلوں کا جائزہ لیا،تاکہ اپنے لیے ہتھیار کا چناؤ کر سکوں۔کسی بھی لڑائی کا حصہ بنتے وقت سب سے زیادہ اہمیت ہتھیار کی ہوتی ہے۔اور سنائپرز کی جنگ میں تو ہتھیار کا درجہ عام لڑائی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

ان کے پاس تین ہیوی سنائپر یعنی رینج ماسٹر دو ڈریگنو،ایک سٹائر سنائپر اور ایک گلیل موجود تھیں۔ان میں سب سے بہتر رینج ماسٹر تھی کیوں کہ اس کی کارگر رینج باقی سنائپر رائفلوں سے زیادہ تھی۔اس کے علاوہ میں نے اس پر بہت زیادہ مشق بھی کی ہوئی تھی۔میں نے تینوں رینج ماسٹر کا معائنہ کیا اور ان میں سے ایک رائفل اپنے لیے

منتخب کر لی۔ گھنٹا ڈیڑھ میں نے رائفل کی صفرنگ کی اور پھر رائفل کی صفائی کرنے لگا۔ یہاں ایک بات قارئین کے گوش گزار کر دوں۔ ایک اچھا سنائپر ایک ہی گولی سے رائفل کو جانچ لیتا ہے کہ وہ نشانہ سادھنے کے مقام سے کتنا دائیں بائیں یا اوپر نیچے مار رہی ہے۔ اور اپنے اندازے سے وہ اسی رائفل سے دوسری گولی چلا کر ہدف کو نشانہ بھی بنا سکتا ہے لیکن ایسا کرنا عارضی طور پر تو قابل قبول ہے مستقل بنیادوں پر نہیں۔ جب سنائپر نے ایک رائفل کو مسلسل زیر استعمال رکھنا ہو تب وہ اس کو صفر ضرور کرتا ہے اور اس کے لیے سنائپر کو کم از کم رائفل سے پانچ گولیاں فائر کرنا پڑتی ہیں۔ اور صفر کرنے کے بعد ہی ایک سنائپر اپنے ہتھیار پر اعتماد کر سکتا ہے۔

دن کا بقیہ حصہ میں نے علاقے سے واقفیت حاصل کرنے اور مختلف لوگوں کو پیش آنے والے حادثات کی تفصیل سننے میں گزارا۔ نک سٹیورٹ نے اپنے ٹھکانے سے دو کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر بھی چند آدمیوں کو کامیابی سے نشانہ بنایا تھا۔ یقیناً اس نے بلندی کا فائدہ اٹھا کر اپ ہل، ڈاؤن ہل تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے اہداف کو نشانہ بنایا تھا۔ اور یہ بات ظاہر کرتی تھی کہ وہ ایک منجھا ہوا سنائپر تھا۔ میرے بارے بھی جاننے والے یہی کہتے تھے۔ نامعلوم اب ہم دونوں میں سے کس کو کامیابی ملنے والی تھی۔ یہ ایسی جنگ تھی جس میں غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ اسے اس لحاظ سے بھی فوقیت حاصل تھی کہ اس کا کوئی مخصوص ہدف نہیں تھا۔ مار کے علاقے میں وہ جو حرکت دیکھتا اپنا کام کر گزرتا۔ اس کے برعکس مجھے صرف اسی کو نشانہ بنانا تھا۔

اگلی صبح طلوعِ آفتاب سے پہلے ہی میں ضلع خان کے ایک آدمی کے ساتھ مخصوص ٹھکانے سے باہر نکل آیا تھا۔ میرا ارادہ کسی ایسی پہاڑی پر ڈیرا ڈالنے کا تھا جہاں سے میں نک سٹیورٹ کی روزمرہ پر نظر رکھ سکتا۔ سب سے بڑا مسئلہ اس کی پہچان کا تھا کہ اس کے بعد ہی میں اسے نشانہ بنا پاتا۔

گزشتہ دن ہی میں نے ضلع خان کے آدمی اکرم کو تفصیل سے چلنے کے طریقہ کار کے متعلق بتا دیا تھا۔ چلتے ہوئے آڑ کا استعمال کیسے کرنا ہے، درختوں کے تنوں اور جھاڑیوں سے کس طرح فائدہ اٹھانا ہے، پس منظر سے کیسے بچنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ ایک تربیت یافتہ مجاہد تھا اس لیے اس کے دماغ میں میری باتیں اچھی طرح آ گئی تھیں۔

میں نک سٹیورٹ کے ٹھکانے کے زیادہ سے زیادہ قریب جا کر جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اپنی جگہ سے چلنے سے

پہلے میں نے اس کے ٹھکانے کے دائیں بائیں موجود پہاڑیوں کا دوربین کی مدد سے گہری نظر سے جائزہ لیا تھا ۔اور پھر ایک مخصوص پہاڑی کا چناؤ کر کے میں نے اکرم کو اپنی منزل سے آگاہ کر دیا تھا۔

ہم نالے میں اتر کر مطلوبہ سمت کو چل پڑے۔نالے میں اتر کر ہم دور کے دکھاؤ سے محفوظ ہو گئے تھے۔اس لیے ہماری رفتار بھی تیز رہی اور ہمیں درختوں یا پتھریلی چٹانوں کی آڑ وغیرہ لینے کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑی تھی۔نالے کے اندر جہاں تک محفوظ جا سکتے تھے ہم اطمینان سے گپ شپ کرتے ہوئے چلتے رہے۔اکرم کا تعلق بنوں سے تھا اور وہ پچھلے کئی سال سے افغانستان جہاد میں شامل تھا۔میں اسے سنائپرز سے بچنے کے لیے ضروری احتیاطوں کے بارے بتاتا رہا۔اس دوران اس نے کافی سوال بھی پوچھے تھے۔وہ مجھ سے کافی متاثر دکھائی دیتا تھا۔باتوں باتوں میں کہنے لگا۔

”سچ کہوں تو ذیشان بھائی،آپ کی آمد سے پہلے آپ کے بارے بہت کچھ سن رکھا تھا اور میری خواہش تھی کہ کبھی اپنی آنکھوں کے سامنے آپ کو فائر کرتے ہوئے دیکھوں۔“

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔”کل رائفل کو صفر کرتے وقت میں کافی گولیاں فائر کی تھیں امید ہے آپ کی تمنا پوری ہو گئی ہو گی۔“

وہ جلدی سے بولا۔”نہیں وہ تو آپ پتھروں کو نشانہ بنا رہے تھے۔اور میری خواہش ہے کہ دشمن کے سر میں آپ کی گولی کو لگتا دیکھوں۔اور اسی وجہ سے میں بڑی کوشش سے آپ کے ساتھ آپایا ہوں۔“

اس کی بات پر میں نے ہلکی سی ہنسی اچھالی۔لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بننا ایک خوش کن بات ہوتی ہے،لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض اوقات لوگوں کی توقعات پر پورا اترنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔کیونکہ کوئی بھی کارنامہ سرانجام دینے کے لیے قسمت کا شامل حال ہونا ضروری ہوتا ہے۔اور مقدر کس وقت دغا کر جائے یہ کوئی نہیں جانتا۔

ہم ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں سے آگے چڑھائی تھی اور اس جگہ پر ہم نک سٹیورٹ کے ٹھکانے سے دیکھے جا سکتے تھے۔گو ضروری نہیں تھا کہ اس وقت وہ اپنے ٹھکانے ہی پر ہوتا۔اس کا کسی دوسرے پہاڑ کی چوٹی پر موجود ہونا بھی ممکن تھا۔یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس وقت وہ نیند کے مزے لے رہا ہوتا۔اس کے علاوہ بھی کئی احتمال ممکن

تھے۔اور ایک سنائپر کو میدان جنگ میں سارے امکانات کو مدنظر رکھ کر حرکت کرنا پڑتی ہے۔

اوپر کی جانب حرکت کرتے ہوئے میں نے درختوں، جھاڑیوں اور پتھروں کی آڑ کا استعمال خود بھی کیا اور اکرم کو بھی بار بار محتاط رہنے کا مشورہ دیتا رہا۔اوپر پہنچ کر ہمیں مطلوبہ پہاڑی بالکل قریب نظر آنے لگی جہاں پہنچ کر میں نے نک سٹیورٹ کے ٹھکانے کی نگرانی کرنا تھی۔لیکن اتنے قریب نظر آنے کے باوجود ابھی تک ایک نالا درمیان میں حائل تھا۔اس لیے وہ تھوڑی سی دوری ختم کرنا بھی ہمیں کافی دشوار لگا تھا۔دوسری طرف کے نالے میں اتر کر ہم اوپر پہنچ گئے۔وہ نالہ ہمارا، دو گھنٹے سے زیادہ وقت ضائع کر گیا تھا۔اور اتنا وقت احتیاط سے حرکت کرنے کی وجہ سے لگا تھا۔

بلندی پر پہنچ کر بھی ہم نک سٹیورٹ والی پہاڑی سے کافی نیچے تھے۔وہاں اس وقت مورچہ وغیرہ بنانا تو ممکن نہیں تھا البتہ آڑ میں رہ کر میں نے اپنے جسم، رائفل اور اکرم کو جھاڑیوں کی سبز ٹہنیوں سے چھپا ضرور لیا تھا۔ایک درمیانی پتھر کے پیچھے لیٹ کر میں نے رائفل کو دوپائی پر لگا دیا۔اس کے بعد فاصلہ ناپنے والے آلے سے مطلوبہ پہاڑی کا درمیان ناپا اور ٹیلی سکوپ سائیٹ پر رینج لگا دی۔اکرم خاموشی سے میری کارروائی دیکھتا رہا۔

”اکرم یاد رکھنا، کسی بھی قسم کی ناگہانی صورت حال میں آڑ چھوڑنے کی غلطی نہ کرنا۔اب ہم خطرے کی حدود میں موجود ہیں اور آڑ سے باہر رہنے والا عضو تمھارے جسم کا حصہ نہیں رہے گا۔“

وہ خوش دلی سے بولا۔”بے فکر رہیں ذیشان بھائی، میں محتاط ہوں۔“

رینج ماسٹر پر لگنے والی لیوپولڈ ٹیلی سکوپ سائیٹ کارکردگی کے لحاظ سے ایک عمدہ سائیٹ ہے۔عام آنکھ کی نسبت پچیس گنا زیادہ دکھانے کی خاصیت رکھتی ہے۔میں نے سائیٹ کے سامنے والا اور عقبی کور ہٹائے اور سامنے والے علاقے کا جائزہ لینے لگا ابھی تک میں نے رائفل کو کاک نہیں کیا تھا۔

جس پتھر کے پیچھے ہم لیٹے تھے وہاں سے ہم لیٹ کر ہی دشمن کی نظر اور فائر سے بچ سکتے تھے۔

اکرم نے پوچھا۔”میرا کیا کام ہوگا؟“

”تمھارا کام دائیں بائیں کا جائزہ لے کر کسی بھی ہلکی سی حرکت کے بارے مجھے مطلع کرنا ہے۔میگزین کو لوڈ کرنا وغیرہ وغیرہ۔“

اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ ”وغیرہ کا مطلب ہے اس کے علاوہ بھی کوئی کام ہے۔“

”سنائپر کے ساتھ جو دوسرا آدمی ہوتا ہے اس کے بہت سارے کام ہوتے ہیں، مگر وہ تم نہیں کر سکو گے۔“

”مثلاً۔“ یقیناً اسے سنائپنگ کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کا شوق تھا۔

”ہوا کی رفتار ناپنا اور تیز یا درمیانی ہوا کی صورت میں حساب لگا کر ڈیفلیکشن معلوم کر کے لگانا، فاصلہ ناپنا، رینج لگانا، فائر ہونے والی گولی کو جانچنا بھی تمھاری ذمہ داریوں میں آتا ہے، مگر فی الحال تمھیں ان کاموں کے بارے معلوم نہیں ہے۔ اس لیے کوئی بے احتیاطی کیے بغیر پڑے رہو۔“ اجمالاً اس کی ذمہ داریاں دہراتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اسے محتاط رہنے کی تاکید کر دی۔

اور اس کی ”ٹھیک ہے۔“ سنتے ہی میں نے سائیٹ سے علاقے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اچانک مجھے ہلکی سی چمک دکھائی دی۔ یہ چمک نک سٹیورٹ کے ٹھکانے والی پہاڑی کے بائیں جانب موجود نسبتاً ہموار اور ہماری طرف موجود ڈھلان سے آئی تھی۔ میں نے فوکسنگ ناب کو گھما کر منظر کو مزید واضح کیا۔ اس جگہ کا فاصلہ ہم سے ڈیڑھ کلومیٹر ہوگا۔ سبزے کے ڈھیر نے مجھے مزید چونکا دیا تھا۔ میں نے فوراً رائفل کاک کر کے مطلوبہ رینج لگائی اور اس کے بعد میں شیشے کی چمک پر شست لینے ہی لگا تھا کہ اچانک مجھے شعلہ دکھائی دیا۔ یقیناً فائر کیا گیا تھا۔ سیکنڈ کے چوتھائی حصے میں میں نے خود کو نیچے گرایا اور اسی وقت گولی ٹیلی سکوپ سائیٹ کے اگلے عدسے کو توڑتی ہوئی آئی گلاس سے گزر گئی۔ اور ساتھ ہی گولی چلنے کا ہلکا سا دھما کا سنائی دیا۔ گولی کی رفتار آواز سے تیز ہوتی ہے۔ اگر مجھے آئی گلاس سے آنکھ ہٹانے میں آدھے سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو سنائپر رائفل کی طاقت ور گولی میری آدھی کھوپڑی اڑا کر لے جاتی۔

”ذیشان بھائی، آپ ٹھیک تو ہیں۔“ اکرم گھبراتے ہوئے اٹھ کر میری طرف متوجہ ہوا۔ اسے لگا تھا کہ شاید گولی مجھے لگ گئی ہے۔

”لیٹ جاؤ بے وقوف۔“ میں اسی طرح اوندھے منھ لیٹے لیٹے چلایا۔ مگر میرا چیخنا بے کار گیا تھا، وہ گولی سے تیز حرکت نہیں کر پایا تھا۔ ایک تیز کراہ کے ساتھ وہ نیچے گرا اور ہاتھ جھٹکنے لگا۔ سر میں لگنے والی گولی جلد ہی اسے خواہشات کی دنیا سے بہت دور لے گئی تھی۔ میرے بار بار محتاط رہنے کی نصیحت بے اثر گئی تھی۔

میں نے وہیں لیٹے لیٹے گردن کو موڑ کر اس کا جائزہ لیا لیکن وہ ہر قسم کی مدد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں خود بھی پھنس گیا تھا۔ایک سنائپر اپنے کام کے معاملے میں بہت ثابت قدم ہوتا ہے وہ اتنی جلدی اپنے ہدف کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔اگر وہ اپنے شکار کو مردہ بھی سمجھ لے تب بھی وہ منتظر رہتا ہے کہ شاید لاش کے اٹھانے کے لیے کوئی وہاں آ جائے اور اسے ایک نیا ہدف مل جائے۔

اگر میں لیٹے لیٹے بھی پیچھے کی طرف سرکتا پھر بھی پتھر سے ذرا دور ہٹتے ہی میرا جسم نظر آنا شروع ہو جاتا اور پھر ایک ماہر نشانہ باز کے لیے مجھے نشانہ بنانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ایک دفعہ میں نے بھی قبیل خان کے کمانڈر روشن خان کو اسی طرف پتھر کے عقب میں گھیرا تھا۔اور آج میں خود گھیرے میں آیا ہوا تھا۔

دوپہر بارہ ایک بجے کا وقت تھا اور مجھے پکا یقین تھا کہ روشنی ختم ہونے تک تو نک سٹیورٹ نے وہاں سے شست نہیں ہٹانا تھی۔کیوں اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔مگر یوں اپنے دشمن سے دبک کر مسلسل وہاں پڑے رہنا میرے لیے نہایت ذلت آمیز تھا۔ایک سنائپر ہونے کے ناطے مجھے مخالف سنائپر کے حربوں کا توڑ آنا چاہیے تھا۔اس کے سامنے چار پانچ گھنٹے مسلسل دبکے رہنے سے بہتر تھا میں گولی کھا لیتا۔

اپنے غصے کو پس پشت ڈال کر میں نے ٹھنڈے دماغ سے اس حالت سے نکلنے کی ترکیب سوچی اور اس پر عمل کرنے کے لیے میں نے ہاتھ بڑھا کر اکرم کی کلاشن کوف سے میگزین اتاری اور اس کے سر پر بندھی چادر کھول کر میگزین پر لپیٹنے لگا۔چادر کو میں نے اس طرح لپیٹا تھا جیسے انسان کی کھوپڑی ہوتی ہے۔چادر لپٹی میگزین کو میں نے بالکل دھیرے سے یوں بلند کیا جیسے کوئی آدمی سر اٹھا کر آگے کا جائزہ لینا چاہتا ہو۔میگزین کے چادر لپٹے ہوئے گول حصے کے آڑ سے باہر آنے کی دیر تھی کہ ایک دم میرے ہاتھ کو جھٹکا لگا اور میگزین اڑ کر دور جا گری تھی۔اس کے ساتھ ہی میں نے عقب کی طرف موجود ڈھلان کی طرف زقند بھری اور دوسری چھلانگ کے ساتھ میں ڈھلان کی پناہ حاصل کر چکا تھا۔ایک سنائپر ہونے کی وجہ سے میں جانتا تھا کہ نک کو فائر کرنے کے بعد رائفل دوبارہ کاک کرنا ہو گی۔اس کے بعد دوبارہ شست قائم کرتے ہوئے دو اڑھائی سیکنڈ لگ جانا تھے۔اور اتنی مہلت میرے لیے کافی تھی۔

(یہاں قارئین کے دماغ میں یہ سوال آ سکتا ہے کہ کچھ سنائپر رائفلز آٹو میٹک بھی ہوتی ہیں۔اور ممکن تھا کہ

اس وقت نک سٹیورٹ کے پاس کوئی ایسی ہی رائفل ہوتی ۔ایسی صورت میں میرا مارا جانا یقینی تھا۔تو مجھے کم از کم اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے تھا۔جن قارئین کے دماغ میں یہ سوال اٹھا یقیناً وہ چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کو نظر انداز نہ کرنے والے قاری ہوں گے۔بہ ہر حال ان کے سوال کا میں پوچھے بغیر ہی جواب دے دیتا ہوں ۔سنائپنگ میں استعمال ہونے والی تمام اٹو میٹک رائفلوں کا زیادہ سے زیادہ رینج ہزار میٹر یعنی ایک کلو میٹر تک ہوتا ہے ۔اس سے زیادہ علاقے تک مار کرنے والی یعنی ہیوی سنائپر رائفلز آٹو میٹک نہیں ہوتیں ۔کیونکہ اتنی بڑی رائفل کو اگر آٹو میٹک بنایا جایا تو یقیناً وہ فائر کرنے والے آدمی کے کندھے کو توڑ دے گی ۔اور اس وقت نک سٹیورٹ ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے سے پر موجود تھا۔یقیناً وہ ہیوی سنائپر رائفل ہی استعمال کر رہا تھا)

ڈھلان کی آڑ میں لیٹ کر میں اندھیرا چھانے کا انتظار کرنے لگا۔کیوں کہ اپنے ساتھی کی لاش اور اپنے ہتھیاروں کو پھینک کر بھاگ جانا مجھے کسی صورت زیب نہیں دیتا تھا۔اکرم کی کلاشن کوف اور میری رینج ماسٹر پتھر کے پیچھے ہی پڑی رہ گئی تھیں۔ان تک رسائی اندھیرا ہونے کے بعد ہی ممکن تھی۔

یوں ہی لیٹے لیٹے میرا دل دکھ اور نا امیدی سے بھر گیا تھا۔نک سٹیورٹ مجھ سے کئی گنا بہتر ثابت ہوا تھا۔وہ اس وقت جنوب مغرب کی جانب اور میں اس سے شمال مشرق کی جانب موجود تھا۔سورج اس کے دائیں ہاتھ اور میرے بائیں جانب چمک رہا تھا۔اس طرح کہ ہماری ٹیلی سکوپ سائیٹوں کے سامنے والا عدسے (آبجیکٹ لینز) پر سورج کی روشنی یکساں پڑ رہی تھی۔جس طرح مجھے اس کی ٹیلی سکوپ سائیٹ کے عدسے کی چمک نظر آ گئی تھی ،اسی طرح اس نے بھی میرے عدسے ہی کی چمک سے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔اور اسے میری خوش نصیبی ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ٹریگر دباتے وقت میں اسی کی جانب متوجہ تھا۔اور فائر سے ہونے والے شعلے کو دیکھ کر حفاظتی اقدام کر گزرا۔

اس مایوسی کے عالم میں مجھے اپنے پیاروں کی یاد بہت شدت سے آنے لگی۔پگلی پلوشہ جس کے نزدیک دنیا میں مجھ سے بہتر نشانے باز پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔اگر اسے میں کہہ دیتا کہ ایک نشانے باز کے ہاتھوں میں مرتے مرتے بچا ہوں۔تو یقیناً وہ میری جان کو آ جاتی۔مجھے جھوٹا،فراڈی اور جانے کیا کیا کہتی۔میرا یار سردار خان جس کے ہونے سے میری ہمت کئی گنا بڑھ جایا کرتی تھی۔میری پیٹھ پر تھپکی دے کر لازماً یہی کہتا۔

''راجے صاحب، اس فرنگی بے چارے کو کیا پتا کہ اس نے کس کے ساتھ پنگا لیا ہے۔ چل اب بوتھے پر ہنسی لا اور اٹھ جا۔''

محترم استاد راؤ تصور صاحب جن کی گالیاں بھی دعائیں محسوس ہوا کرتیں۔ فائر کراتے ہوئے وہ غلط فائر کرنے والے کو اپنے مخصوص انداز میں یوں ڈانٹا کرتے۔''اوئے بے غیرتا، اوے بے شرما، بہت مہنگی گولی ہے جو تم نے ہوا میں اڑا دی۔ اگر تم میں تھوڑی عقل بھی ہوتی تو ٹریگر کو یوں نہ دباتے جیسے کسی کا گلا دبایا جاتا ہے۔'' یقیناً اس موقع پر انھوں نے مجھے یہی کہنا تھا کہ ''لڑکے جب تمھیں معلوم ہے کہ مخالف ایک اچھا سنائپر ہے اور ٹیلی سکوپ سائیٹ کے شیشے کی چمک دور سے نظر آجایا کرتی ہے تو تم نے پاپ اپ کور (ٹیلی سکوپ سائیٹ کے شیشے پر چڑھانے والا پلاسٹک کا کور) کو ذرا سا جھکا کر کیوں نہ رکھا تاکہ اس کے سائے سے شیشے کی چمک چھپ جاتی۔ خبردار دوبارہ ایسی غلطی کی تو۔ جاؤ دوبارہ کوشش کرو اور گولی ضائع نہ کرنا۔''

یا پھر استاد عمر دراز جنھوں نے یہی کہنا تھا۔''بیٹا اپنے سے کم تر سے مقابلہ کرنا کون سا مشکل ہے، مزہ تو تب ہے کہ خود سے بہتر کا سامنا کرو۔ اور کبھی بھی خود کو کمتر خیال نہ کرنا۔ ہوسکتا ہے تمھاری حکمت عملی میں کوئی غلطی ہو۔''

اپنے تمام بہی خواہ اور ہمدرد آج مجھ سے کوسوں میل دور تھے۔ بس ان کی یادیں اور محبتیں ہی میرا سہارا تھیں۔ کمانڈر عبدالحق بھی ایک اچھا دوست تھا، مگر سردار جیسے جگری کا متبادل تو وہ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں کافی دیر یونھی لیٹا رہا۔ اچانک میرے کانوں میں وائرلیس پر ہونے والی بات چیت کی آواز آئی۔ جس کے پاس بھی وائرلیس سیٹ موجود تھا اس نے آواز کو مکمل کھولا ہوا تھا، تبھی تو کافی دور سے وہ آواز میرے کانوں پر میں پڑ گئی تھی۔

ایک دم چوکنا ہوتے ہوئے میں قریبی جھاڑی میں گھس گیا۔ ساتھ ہی میں نے کمر سے بندھے ہولسٹر سے بریٹا نکال لیا۔ یہ قیمتی پستول بھی مجھے ضلع خان ہی سے ملا تھا۔ وہ آدمی ڈھلان کے اوپر چلتے ہوئے آرہے تھے۔ لمحہ بھر بعد ہی مجھے دو آدمی دکھائی دے گئے تھے۔ ان کی حتمی تعداد کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ وائرلیس سے اٹھتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پہنچ رہی تھی مگر بات چیت میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

وہ میری نظروں کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھے، ان کے عقب میں ایک اور مسلح آدمی بھی موجود تھا

تینوں بریٹا پستول کی رینج میں تھے۔مگر جب تک ان کی تعداد کا اندازہ نہ ہو جاتا میں کوئی کارروائی نہیں کر سکتا تھا ۔میں بے حس و حرکت جھاڑی میں دبکا رہا۔

”یہاں پر ایک لاش اور دو ہتھیار پڑے ہیں۔اوور......“اس دفعہ میرے کانوں میں بولنے والے کی واضح آواز آئی تھی۔

”نک تو دو لاشوں کا بتا رہا تھا۔اور تم جانتے ہو اس بارے اس کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا۔ اوور......“وائرلیس سیٹ سے ابھرنے والی آواز تک بھی میری سماعتوں کی رسائی ہو گئی تھی۔

”شاید دوسری لاش ان کا کوئی ساتھی اٹھا کر لے گیا ہو۔اوور......“اس نے اندازہ ظاہر کیا۔

”نہیں یہ جگہ نک کی نگرانی میں تھی،ایک شخص یہاں سے فرار ضرور ہوا ہے مگر وہ اپنے کسی ساتھی کو اٹھا کر ساتھ نہیں لے گیا۔اوور......“

”یہاں پر ایک میگزین کے ساتھ گول چادر لپٹی ہوئی ہے اور اس میں گولی پیوست ہے۔یہاں سے بھاگنے والے نے یقیناً نک کو بے وقوف بنایا ہے۔اوور......“اس نے کافی باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔

”خیال کرو،کہیں آس پاس ہی نہ چھپا ہو۔اوور......“فوراً ہی اسے احتیاط کا مشورہ دیا گیا۔

”اگر اسے مرنے کا شوق ہوا تبھی مرجان سے پنگا لے گا۔اوور......“اس کا متکبرانہ انداز ظاہر کر رہا تھا کہ وہ خود کو کوئی توپ چیز سمجھتا تھا۔اس کا ڈیل ڈول اور جسامت بھی اس کے کہے ہوئے الفاظ کے مطابق ہی تھی۔موٹا تازہ لمبا تڑنگا دیو نما انسان تھا۔

”لاش کو وہیں چھوڑ دو اور ہتھیار لے کے آجاؤ۔اوور اینڈ آل۔“انھیں آخری پیغام موصول ہوا۔

”چلو ہتھیار اٹھاؤ۔“اس نے اپنے ساتھیوں کو ہتھیار اٹھانے کا اشارہ کیا۔اس کی نظریں گھومتے ہوئے چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ایک دفعہ اس کی اچٹتی ہوئی نظر اس جھاڑی پر بھی پڑی تھی جس میں، میں چھپا ہوا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی کلاشن کوفوں کو کندھے سے لٹکا کر وہاں بکھرا سامان سمیٹنے لگے۔دوربین، کمپاس، لیزر رینج فائینڈر، ونڈ میٹر، فالتو ایمونیشن وغیرہ۔میرے لیے وہ سنہری موقع تھا کہ ہتھیار صرف ایک آدمی کے ہاتھوں

میں تھا۔ اسے سر میں گولی مار کر میں بڑی آسانی سے باقی دونوں کو ہاتھ اوپر کروا سکتا تھا۔ لیکن کمانڈر ہونے کے ناتے اس سے مجھے زیادہ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ اس لیے اس کے سر کا نشانہ سادھنے کے بجائے میں نے اس کے دائیں ہاتھ کو نشانہ بنایا۔ جس میں اس نے کلاشن کوف پکڑی ہوئی تھی۔ بریٹا کی نال پر سائیلنسر چڑھا ہوا تھا اس لیے گولی چلنے کی آواز کے بجائے، وہ مرجان کی چیخ سن کر ہڑبڑائے تھے۔ کلاشن پر مرجان کی گرفت ختم ہوئی اور کلاشن کوف نیچے گر گئی۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے اپنے مضروب ہاتھ کو تھام لیا تھا۔

اس کے ساتھیوں نے ہاتھوں میں پکڑا سامان پھینکتے ہوئے کندھوں سے لٹکی ہوئی کلاشن کوفیں اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی کوشش اتنی ہی ناکام ہوئی تھی جتنی ہوائی جہاز سے بغیر پیراشوٹ کے چھلانگ لگانے والے کی اڑنے کی کوشش ناکام ہوتی ہے۔ ان کے سر میں لگنے والی بریٹا کی ایک ایک گولی کافی رہی تھی۔ ان کے تڑپنے کے نظارے سے بے نیاز ہو کر میں مرجان کی طرف متوجہ رہا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے نیچے گری کلاشن کوف اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں جھاڑی سے باہر آتا ہوا بولا۔ ''اگر بائیں ہاتھ کو ضائع کرانے کا شوق ہے تو بے شک کلاشن کوف اٹھا سکتے ہو۔''

مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی کلاشن کوف نیچے گرا دی۔ ''ہمارے ساتھی آتے ہی ہوں گے، تم بچ نہیں پاؤ گے۔'' وہ مجھے دھمکی دینے سے باز نہیں آیا تھا۔

''تم اپنے بائیں ہاتھ سے ایک ایک کر کے تمام ہتھیار اور بکھرا ہوا سامان نشیب کی طرف لے آؤ۔'' ایک پتھریلی چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر میں نے اس پر پستول تان لیا۔ گو ان کے وہاں پہنچنے کا مطلب یہی تھا کہ نک سٹیورٹ نے وہاں اپنی نگرانی ختم کر دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

''بہتر ہوگا کہ مجھے جانے دو۔'' وہ میرے حکم پر عمل کرنے پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ ''مرجان خان، بہتر تو یہی ہوگا کہ تم دونوں ٹانگوں اور بائیں ہاتھ کو سلامت رکھتے ہوئے یہ کام سر انجام دو۔ اگر ایک ٹانگ زخمی کرا کے تم زیادہ بہتر کام کر سکتے ہو تو یقیناً مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔''

اس مرتبہ اس کی سمجھ میں میری بات آ گئی تھی۔تھوڑی دیر بعد چار کلاشن کوفیں، رینج ماسٹر اور سنائپنگ کا دوسرا سامان وہ میرے قریب لا کر ڈھیر کر چکا تھا۔

آڑ میں کر کے میں نے اس کی جامہ تلاشی لی اور پھر اسی کی چادر سے پٹی پھاڑ کر اس کے ہاتھ پر باندھ دی۔

تھوڑی دیر بعد اکرم کی لاش کو اس کے کندھوں پر لاد کر میں اسے اپنے آگے چلا کر مخصوص ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔اپنی پیٹھ پر میں نے رینج ماسٹر کا تھیلا اٹھایا ہوا تھا جبکہ کلاشن میں نے ہاتھوں میں تیاری حالت میں پکڑی ہوئی تھی۔باقی کلاشن کوفیں میں نے وہیں ایک جھاڑی میں چھپا دی تھیں۔

سہ پہر ڈھلنے والی تھی اور سورج ڈوبنے سے پہلے میں کسی محفوظ جگہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

مرجان خان زخمی ہاتھ کے باوجود بڑی آسانی سے اکرم کی لاش اٹھا کر چل رہا تھا۔یقیناً وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھا جب وہ مجھ پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا۔لیکن اس بے وقوف کو یہ پتا نہیں تھا کہ اس وقت وہ پاک آرمی کے ایک تربیت یافتہ سنائپر کے قبضے میں تھا۔میں اس بارے ذرا سا بھی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔میں ایک مخصوص فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چل رہا تھا، یوں کہ نہ تو بھاگ کر مجھ سے دور جا سکتا تھا اور نہ اکرم کی لاش کو مجھ پر پھینک کر کوئی فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔کلاشن کوف کی ایک سلنگ اکرم کی کمر سے باندھ کر دوسری سلنگ کا پھندا بنا کر میں نے اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔اور دونوں سلنگوں کو آپس میں جوڑ دیا تھا۔اس طرح اکرم کی لاش کو پھینک کر وہ بھاگنے کی قطعاً نہیں سوچ سکتا تھا۔

میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے وائرلیس سیٹ پر اسے پکارا جانے لگا۔

''مرجان خان، تم کہاں پہنچے ہو؟ اوور......''

''اسے بتا دو تم رستے میں ہو۔''مرجان کے قریب پہنچ کر میں نے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے وائرلیس اس کے منھ کے قریب پکڑ لیا۔

''ہمیں قریباً آدھا گھنٹا مزید لگے گا۔اوور......''اس نے بڑی شرافت سے میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔

''ٹھیک ہے احتیاط سے آنا۔اوور اینڈ آل۔''اس کا ساتھی مطمئن ہو کر خاموش ہو گیا تھا۔

واپسی کے سفر میں ہمیں چڑھائیوں سے زیادہ اترائیوں کا سامنا رہا اس لیے مطلوبہ فاصلہ ہم نے بہت جلد

طے کر لیا تھا۔شام کا اندھیر گہرا ہونے سے پہلے میں مرجان خان کے ساتھ اس پہاڑی کی بنیاد میں موجود جس کے قریباً درمیان میں مجاہدوں کا ٹھکانہ تھا۔ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔میں نے مرجان کو غلط حرکت سے روکنے کے لیے اس کے مزید نزدیک ہو گیا تھا۔

''رکو۔''اسے رکنے کا کہہ کر میں نے سامنے جا کر دیکھا۔وہ پھندے کی گرہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔کلاشن کوف کی نال اس کی ٹھوڑی سے لگا کر میں نے دوسرے ہاتھ سے گرہ کو ٹھیک کر کے باندھ دیا۔اتنی سردی کے باوجود اس کے چہرے اور گردن پر پسینہ بہہ رہا تھا۔رستے میں میں نے اسے دو تین منٹ سے زیادہ سستانے کا موقع نہیں دیا تھا۔

''چلو۔''اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے میں نے ٹارچ نکالی اور مخصوص انداز میں جلانے بجھانے لگا۔فوراً ہی روشنی کا اشارہ موصول ہو گیا تھا۔اور پھر توقع کے مطابق دس منٹ بعد تین چار مجاہد نیچے اترتے ہوئے ہمارے قریب پہنچ گئے تھے۔

اپنی شناخت بتا کر میں نے انھیں مزید قریب بلا لیا۔ایک نے میری پیٹھ سے رینج ماسٹر کا تھیلا اتار کر خود پہن لیا۔اسی نے تشویش بھرے انداز میں اکرم کی بابت پوچھا۔

میں دکھی دل سے بولا۔''اکرم ہم میں نہیں رہا۔''

''یہ کون ہے؟''اس نے آہستہ روی سے آگے بڑھتے مرجان کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ دشمن ہے اور اس کے کندھوں پر اکرم کی لاش ہے۔''

مزید کوئی بات کیے وہ خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ٹھکانے پر پہنچتے ہی وائرلیس سیٹ سے مرجان پارٹی کو پکارنے کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔میں نے سیٹ کو آف کر دیا۔اکرم کی لاش کو اس کے کندھوں سے اتار ضلع خان کے آدمیوں نے مرجان کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک غار میں بند کر دیا تھا۔

کھانا کھا کر میں انھیں کارگزاری سنا رہا تھا۔

''اکرم کو جلد بازی نہیں کرنا چاہیے تھی۔''میری بات کے اختتام پر کمانڈ عبدالحق نے زبان کھولی۔

''جب وقت پورا ہو جائے تو پھر کوئی احتیاط کام نہیں آتی۔''ضلع خان نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

عبدالحق نے پوچھا۔ ’’تو اب کیا ارادہ ہے؟‘‘

گہرا سانس لے کر میں خاموش ہو گیا تھا۔ عبدالحق نے ایک دو منٹ میرے جواب کا انتظار کیا۔ مستقل خاموش پا کر وہ مجھے تسلی دینے لگا۔

’’اس میں آپ کی غلطی نہیں ہے ذیشان بھائی، بلکہ آپ نے تو ایک کے بدلے دو کو موت کے گھاٹ اتارا اور ایک کو قیدی بنا کر بھی لے آئے ہیں۔‘‘

’’میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ اس مرتبہ بھی عبدالحق کی بات کا جواب دیے بغیر میں قہوے کی خالی پیالی دستر خوان پر رکھ کر اٹھ گیا۔

بستر میں گھستے ہی مجھے مایوسی اور اداسی نے گھیرے میں لے لیا تھا۔ سیر کو سوا سیر ٹکرا جائے تو یہی ہوا کرتا ہے۔ میں اپنی خامیوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت مجھے کسی اپنے کی ضرورت بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اگر پلوشہ میرے ساتھ ہوتی تو اب تک میں اپنی شکست کا غم بھول کر نئے عزم کی جوت جگا چکا ہوتا۔ مگر جانے وہ کہاں گم ہو گئی تھی۔ میری ہمراز، میری محافظ، میری ساتھی، میری بیوی، میرے کندھے سے کندھا ملا کر ہر مشکل میں کود پڑنے والی، میری روکھی پھیکی زندگی میں خوشیاں اور سکون بھرنے والی جانے کہاں غائب تھی۔ اب تو یوں لگنے لگا تھا جیسے اس کے ساتھ بیتا وقت ایک سہانا سپنا ہی تو تھا۔ اس کی مدُھر آواز سننے کو میرے کان ترس گئے تھے، اس کی موہنی صورت کے دیدار کے لیے آنکھوں کی پیاس بڑھ گئی تھی۔ ہاتھوں کو اس کے لمس کی چاہ تھی تو ناک اس کی خوشبو سونگھنے کو بے تاب۔ اپنی شکست کو بھلا کر میں اسی کو سوچتا گیا اور اسی سوچوں نے مجھے نیند کی وادیوں میں دھکیل دیا جہاں اب تک وہ مجھ سے بچھڑی نہیں تھی۔ اس کے جاندار قہقہے میری سماعتوں کو رونق بخش رہے تھے ،اس کی شرارتیں میرے ہونٹوں کو ہنسنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اور اس کی موہنی صورت میری آنکھوں کی پیاس بجھا رہی تھی۔ مجھ سے اٹھکیلیاں کرتے کرتے وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اور میری گود میں سر رکھے ہوئے اس نے اپنی روشن آنکھیں میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے پوچھا۔

’’راجو، کیا کبھی آپ نے خود سے بہتر نشانے باز دیکھا ہے؟‘‘

’’نک سٹیورٹ مجھ سے بہتر ہے نا گڑیا۔‘‘ اس کے چہرے پر جھکتے ہوئے میں نے صاف گوئی سے اقرار کیا

''آپ کیسے پتا چلا، کیا کبھی آمنا سامنا ہوا ہے۔''

''ہاں......''میں اسے گزشتہ روز ہونے والے جھڑپ کی تفصیل سنانے لگا۔

وہ بحث کرتے ہوئے بولی۔''تو اس کے پہلے گولی چلانے کی وجہ سے وہ بہتر ہو گیا۔ ہو سکتا ہے اس نے آپ کو پہلے دیکھ لیا ہو اور آپ کی نظر اس پر بعد میں پڑی ہو۔''

''اس نے میری ٹیلی سکوپ سائیٹ کے شیشے میں گولی مار کر مجھے مار ہی دیا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی جو میں نے بروقت سر ہٹا لیا تھا۔''

وہ وثوق سے بولی۔''قسمت کے بارے تو میں کچھ نہیں کہنا چاہتی، لیکن یہ آپ کی مہارت ہی تھی جس کی وجہ سے آپ اس کی گولی کا شکار ہونے سے بچ گئے۔ اور اگر اسے ایک لمحے کی دیر ہو گئی ہوتی تو یقیناً وہ اپنا سر پیچھے نہ ہٹا پاتا۔''

میں نے منھ بنایا۔''تم بس مجھے جھوٹی تسلیاں دے رہی ہو۔''

''راجو، میری آنکھوں میں دیکھو۔''اس کی ہلکی نیلی آنکھیں جھیل سیف الملوک سے بھی گہری تھیں۔ میں ان کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔''راجو، میں جھوٹ نہیں کہتی......اور کبھی مجھے مایوس نہ کرنا۔ مجھے آپ پر بہت مان، بہت بھروسا اور بہت یقین ہے۔ کبھی کسی ہار نہ ماننا۔ ورنہ آپ کی پلوشے نہیں رہے گی، غم سے مر جائے گی۔''

اس کا مایوس لہجہ مجھ سے برداشت نہیں ہوا تھا۔ میں فوراً بولا۔''پگلی، ایسی باتیں نہیں کرتے۔ نک سٹیورٹ تو میرے بائیں ہاتھ کی مار ہے، میں تو بس مذاق کر رہا تھا۔''

''جانتی ہوں۔''اس کے چہرے پر سکون پھیل گیا تھا۔''اب بس جلدی سے اس کانٹنا ختم کرو اور میرے پاس پہنچو۔ میرا ایک ایک پل سال بن کر گزر رہا ہے۔''اسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ اور پھر میں کوشش کے باوجود سو نہیں سکا تھا۔ صبح کی نماز پڑھ کر میں نے ناشتا کیا اور طلوع آفتاب کے ساتھ نئی لیوپولڈ سائیٹ نکال کر اسے صفر کرنے کے لیے غار سے باہر نکل آیا۔ رینج ماسٹر کا پورا تھیلا ہی میں اٹھا کر لے آیا تھا کہ صفر رنگ میں فاصلہ ناپنے والے آلے اور ونڈ میٹر وغیرہ کی بھی ضرورت تھی۔ کمانڈر عبدالحق نے مجھے رائفل کے ساتھ غار سے باہر

جاتے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی میرے پیچھے چلا آیا تھا۔ اس کی آمد سے پہلے میں چند فائر کر چکا تھا۔

''ذیشان بھائی، لگتا ہے تیاری شروع کر دی ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔'' کل صبح سویرے دوبارہ جا رہا ہوں۔ میرے لیے کسی سمجھ دار ساتھی کا انتخاب کر لو۔''

وہ مسکرایا۔'' یہاں پر مجھ سے سمجھ دار کوئی بھی نہیں ہے۔''

''تو پھر خود ہی تیار ہو جانا۔'' میں نے ایلی ویشن اور ڈیفلیکشن ناب میں مناسب تبدیلی کرتے ہوئے کہا۔

اس نے منہ بنایا۔'' میں تو پچھلی بار بھی تیار تھا۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔'' آپ کی زندگی کے کچھ دن بقایا تھے نا تبھی آپ ساتھ نہ جا سکے۔''

اس کا قہقہہ مجھ سے بھی بلند تھا۔

''اچھا قیدی سے کس وقت پوچھ گچھ کرو گے؟''

''آخری گولی فائر کر لوں پھر چلتے ہیں۔'' میں رائفل کے پیچھے لیٹ کر صفر نگ کو پرکھنے کے لیے تیار تھا۔ کوئی مناسب پتھر ڈھونڈنے کے لیے میں نے سائیٹ میں دیکھتے ہوئے بیرل کو گھمایا۔ میں نزدیکی پہاڑی پر کوئی ہدف تلاش کر رہا تھا۔ اچانک مجھے دور ایک پہاڑی پر حرکت نظر آئی۔ یہ وہی پہاڑی تھی جس پر کل اکرم شہید ہوا تھا ۔ مذکورہ پہاڑی کا زمینی فاصلہ تو زیادہ تھا مگر ہوائی فاصلہ دو کلومیٹر ہی کے بہ قدر ہو گا۔ وہ پہاڑی ہمارے ٹھکانے سے زیادہ بلندی پر واقع تھی۔ میں نے فوراً لیزر رینج فائیڈر سے فاصلہ ناپا اکیس سو میٹر بن رہا تھا۔ بلندی کا زاویہ ناپ کر میں نے حساب لگایا۔ ساڑھے انیس سو میٹر کی رینج نکلی۔ میں نے فوراً مطلوبہ رینج لگائی اور آئی گلاس سے مخصوص فاصلہ رکھ کر اپنا گال بٹ پر ٹیک دیا۔

میری تیزی دیکھتے ہوئے کمانڈر عبدالحق کو بھی شک گزرا تھا۔'' خیر تو ہے بڑی تیزی کا مظاہرہ کر رہے ہو ۔'' خوش گوار حیرت کے اظہار کے ساتھ اس نے تھیلے سے دوربین اٹھا کر آنکھوں سے لگا لی۔

''کل ہم جس پہاڑی پر گئے تھے وہاں حرکت نظر آ رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے سائیٹ میں جھانکتے ہوئے کہا۔'' چھ...... نہیں سات آدمی ہیں۔''

''آٹھ، نو، دس......تین ڈھلان پر ہیں۔'' کمانڈر نے پرجوش لہجے میں تصحیح کی۔''مگر فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔''

اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے میں نے ایک ساکن آدمی پر شست باندھی جو شاید وائرلیس پر بات کر رہا تھا۔لبلبی دباتے ہی۔ہلکی سی ''ٹھک۔'' ہوئی اور مذکورہ شخص اچھل کر نیچے گر گیا تھا۔اسے تڑپتے دیکھ کر دائیں بائیں موجود افراد اسے سنبھالنے کے لیے اس کی طرف بڑھے مزید دو کے گرتے ہی باقیوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ تڑپنے والوں کو سنبھالنے سے زیادہ اپنے جسم کو آڑ میں رکھنا اہم ہوگا۔تین آدمی مخالف جانب کی ڈھلان میں اتر کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے،جبکہ ایک میری طرف موجود ڈھلان میں اترنے کی حماقت کر بیٹھا۔اس کے تین ساتھی اور بھی اس طرف موجود تھے اور اپنے ساتھیوں کی چیخ و پکار سن کر وہ بھی اوپر کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ڈھلان پر موجود آدمیوں کا اپنے مرنے والے ساتھیوں سے اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا کہ مجھے رینج میں کوئی تبدیلی کرنا پڑتی۔میں نے جلدی سے میگزین تبدیل کی کہ پہلے والی میگزین میں صرف تین ہی گولیاں موجود تھیں۔نئی میزین لگاتے ہی میں نے رائفل کاک کی اور اگلی گولی پناہ کے لیے غلط سمت کا چناؤ کرنے والے کو لے ڈوبی۔ڈھلان پر پہلے سے موجود تینوں آدمی آڑ کی تلاش میں اوپر کی طرف بھاگے کیونکہ انھیں گولیاں چلنے کی سمت معلوم ہوگئی تھی۔چند گز چڑھائی چڑھنا اتنا مشکل نہیں تھا،لیکن ایسی چڑھائی پر بھاگ کر نہیں چڑھا جا سکتا تھا۔اگلی دو گولیوں نے مزید دو کو جدوجہد سے بے نیاز کر دیا تھا۔تیسرا ایک جھاڑی میں دبک گیا۔لیکن اس کی بدقسمتی کہ جھاڑی صرف نظری آڑ دے سکتی ہے گولی کے لیے کوئی حفاظت مہیا نہیں کرتی۔اس کے ساتھ ہی مجھے دور سے فائر کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔یقیناً وہ اندھا دھند فائر کر کے ایمونیشن کو ضائع کر رہے تھے۔دو تین لمحے جھاڑی پر شست باندھنے کے بعد مجھے اس کا ہیولا نظر آنے لگا تھا۔اس کے سر وغیرہ کا تو کوئی خاص اندازہ نہیں ہو رہا تھا اس لیے میں نے اندازے ہی سے گولی فائر کر دی۔جھاڑی میں ہونے والی ہلچل نے مجھے کامیاب فائر کی نوید سنا دی تھی۔

''یار سنائپر واقعی بہت خطرناک ہوتے ہیں۔'' میرے ساتھ لیٹا عبدالحق پتا نہیں میری تعریف کر رہا تھا یا مذمت۔

میں نے اپنی شست بلندی پر پڑی لاشوں کی طرف منتقل کرتے ہوئے کہا۔ ''فوراً کمانڈر ضلع خان کو کہو کہ ایک پارٹی تیار کرے۔ میں یہیں لیٹے ہوئے دشمن کو لاشیں اٹھانے سے روکوں گا وہ روشنی ختم ہونے سے پہلے کسی لاش کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ کمانڈر کے آدمی چھپتے ہوئے مناسب جگہوں پر مورچے سنبھال لیں وہ اندھیرا چھاتے ہی اپنے ساتھیوں کی لاشیں اٹھانے آئیں گے۔ اور اس وقت کسی کو واپس نہیں جانا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کہتے ہوئے وہ غار کے اندر کی طرف بھاگ پڑا۔ میں سنائپرز کی ازلی ہٹ دھرمی اور ضد کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی طرف متوجہ رہا۔ ہمیں تربیت کے دنوں میں کئی کئی گھنٹوں تک ایک ہی جانب شست باندھ کر لیٹنا پڑتا تھا۔ پورے دن میں ہدف نے صرف تیس سیکنڈ کے لیے نمودار ہونا ہوتا تھا۔ فائر کرنے کے لیے ایک ہی گولی ہوتی تھی اور ناکامی کی صورت میں استاد راؤ تصور صاحب کا سامنا کرنے کے خیال ہی سے ہماری روح فنا ہونے لگتی۔ سردار خان تو کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی ہدف پر گولی نہ مار سکے تو اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اس گولی کو اپنے سر میں مار کر عزت کی موت قبول کر لے۔ ورنہ راؤ تصور صاحب کی جلی کٹی باتیں سن کر اس نے بعد میں ویسے ہی خودکشی کر لینا ہے۔ ہم سب تصور صاحب سے اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا کوا غلیل، چوہا بلی اور ہرن شیر سے ڈرتا ہے۔ لیکن تربیت کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ بہ ظاہر نہایت سخت دل اور بے رحم نظر آنے والے راؤ تصور صاحب دل کے کتنے نرم اور ہمدرد انسان ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جذباتی ہو کر آنکھیں نم کرنے والے ہمارے شفیق استاد نے بس تربیت کے دنوں میں جلاد کا روپ اختیار کیے رکھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے جتنے بھی استاد تھے اگر ان کی مار اور پھٹکار نہ ہوتی تو ہم کبھی بھی اتنی سخت مشقوں سے نہ گزر سکتے۔ بعد میں سردار خان اکثر راؤ صاحب کے بے عزتی بھرے وعظ کو سننے کے لیے کافی الٹی سیدھی حرکتیں کر جایا کرتا تھا، مگر تربیت کے دنوں والی بات پھر کبھی میسر نہ ہوئی۔ ہمارے ایک دوست کہا کرتے تھے کہ اصل مزہ آتا ہی اس بے عزتی کا ہے جو حقیقتاً بے عزتی محسوس ہو۔ اور جب بے عزتی پند و نصیحت محسوس ہونے لگے تب اس میں وہ مزہ نہیں رہتا۔

دس پندرہ منٹ کے اندر ہی ضلع خان اپنے دس آدمیوں کے ہمراہ تیار ہو کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ خود اپنے آدمیوں کے ہمراہ جا رہا تھا۔ ہدف سے شست ہٹائے بغیر میں نے انھیں مخالف سنائپر کی گولی سے بچنے کے لیے ضروری ہدایات کیں۔ کمانڈر عبدالحق نے انھیں مطلوبہ پہاڑی کی نشان دہی کرائی اور اس کے ساتھ ہی انھیں

مخصوص جگہیں بتائیں جہاں وہ چھپ کر دشمن کا انتظار کر سکتے تھے۔

''اگر انھیں ذرا سی حرکت بھی نظر آ گئی تو دشمن کبھی بھی وہاں آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پوری پہاڑی کو گھیر کر شکاریوں ہی کو شکار کر ڈالے۔ اس لیے بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے جانا ہے اور فکر نہ کرو اندھیرا چھانے تک وہ اپنے ساتھیوں کی لاشوں کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ اور یاد رکھنا مخالف سنائپر کی طرف سے کسی کو بھی نشانہ بنانے کی کوشش کی جائے تو وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا صاف مطلب یہی ہوگا کہ وہ تمھاری موجودی سے واقف ہو گئے ہیں۔ ایسی صورت میں لوٹنے کی کرنا۔'' میں نے انھیں آخری ہدایت کی۔

ضلع خان خوشگوار لہجے میں۔ ''ٹھیک ہے کمانڈر۔'' کہتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نشیب میں اترنے لگا۔

کمانڈر عبدالحق نے خواہش ظاہر کی۔ ''مجھے بھی جانا چاہیے۔''

''آپ کی یہاں زیادہ ضرورت ہے۔ فی الحال خالی میگزین میں گولیاں بھر دو۔ اور پھر دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا ہوگی۔''

وہ میرے ساتھ بیٹھ کر میگزین میں گولیاں بھرنے لگا۔ میں مسلسل ہدف کے علاقے کا جائزہ لے رہا تھا، لیکن لگتا یہی تھا کہ انھیں سختی سے حرکت نہ کرنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔

ایک دم خیال آنے پر میں نے عبدالحق کو کہا۔ ''کمانڈر، اندر سے ان کا وائرلیس سیٹ تو اٹھا لاؤ۔''

وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھ میں دشمن سے چھینا ہوا وائرلیس تھا۔ میرے ساتھ بیٹھ کر اس نے وائرلیس آن کیا اور چینل تبدیل کرنے لگا۔ جلد ہی اس نے مطلوبہ چینل ڈھونڈ لیا تھا۔

ایک بھاری سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ''کوئی حرکت بھی نظر نہیں آ رہی کمانڈر۔ اوور......''

''ایک آدمی کو اوپر بھیجو مگر احتیاط سے۔ اور تمام لاشیں کو اپنی جانب کی ڈھلان پر اکٹھا کر لو، یہاں سے بیس آدمیوں کی ایک پارٹی بھیج دی ہے۔ اوور......'' دوسری آواز تھوڑی مدھم آ رہی تھی، یقیناً فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے اس آواز مدھم اور کٹ کٹ کر آ رہی تھی۔

پہلی سنائی دینے والی آواز نے کہا۔ ''پرلی ڈھلان پر بھی ہمارے چار ساتھی موجود تھے، ان کی آواز سنائی

نہیں دے رہی۔اوور......"

"پہلے اوپر والی لاشیں اکھٹی کرلو، اگر گولی وغیرہ نہیں چلتی تو وہ بھی اٹھالانا۔اوور......"

"ٹھیک ہے کمانڈر۔اوور......"

اور کمانڈر کے۔"اوور اینڈ آل۔" کہنے کے بعد خاموشی چھا گئی۔

چند لمحوں بعد ہی قربانی کا ایک بکرا محتاط انداز میں عقبی ڈھلان سے نمودار ہوا۔چونکہ میں انھیں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ جونہی وہ سامنے آئیں گے مارے جائے گے تبھی اس کے سامنے آتے ہی میں نے ٹریگر دبا کر اس کے ناتواں کندھوں سے ساتھیوں کی لاشیں اکٹھی کرنے کا بار ہٹا دیا۔اب اس کی لاش کی فکر بھی دوسروں نے کرنا تھی ۔اس کا تڑپنا نہیں رکا تھا کہ وائرلیس جاگ اٹھا۔وہی پہلے والا شخص گھبرائی ہوئی آواز میں پکار رہا تھا۔

"احتشام فار مبین اوور......"

"سنیڈ یوور میسج اوور......" مبین کی مدہم آواز ابھری۔

احتشام نے کہا۔"کمانڈر، شامل خان کو بھیجا تھا وہ بھی باقی نہیں رہا۔اوور......"

کمانڈر مبین نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔"ٹھیک ہے اب حرکت نہیں کرنا اور آنے والوں کو بھی اندھیرا چھانے کا انتظار کرنے کو کہنا ہے۔اوور اینڈ آل۔" اس کے لہجے میں شامل جھلاہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ کسی نامعلوم سنائپر پر اسے کتنا غصہ آیا ہوا تھا۔

اچانک وائرلیس سے ایک نسوانی آواز ابھری وہ انگریزی میں بات کر رہی تھی ۔"موبن، جب منع کیا گیا ہے تو پھر اپنے آدمی کو کیوں سامنے آنے دیا ہے۔اوور......" اس نے مبین نام کی مٹی پلید کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا تھا۔

مبین نے نادم لہجے میں کہا۔"سوری میڈیم، میں نے سوچا شاید وہ خبیث دفع ہو گیا ہو۔اوور......"

"نکی، نے کل بتا دیا تھا نا کہ کوئی پیشہ ور سنائپر ہے۔اوور......" اندازے کے مطابق میں لورا براؤن کی آواز سننے کی سعادت حاصل کر رہا تھا۔

مبین نے کہا۔"اب احتیاط کریں گے میڈم۔اوور......"

میں اورنکی اس کی تلاش میں جارہے ہیں، تم اندھیرا ہونے سے پہلے لاشیں نہ اٹھوانا۔شاہ اور کاریم ہمارے ساتھ ہیں۔اوور اینڈ آل۔" کاریم یقیناً وہ کریم کو کہہ رہی تھی۔

میں نے فوراً اُٹھ بیٹھا۔کمانڈر عبدالحق انگلش نہیں جانتا تھا، پوچھنے لگا۔

"یہ شاید لورا براؤن تھی، کیا کہہ رہی تھی؟"

"ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔"میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"وہ میری تلاش میں نکل رہے ہیں۔اور میرے اندازے کے مطابق انھیں اس رستے سے آنا چاہیے۔"میں نے شمال مغرب کی پہاڑیوں کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔"کیوں کہ جنوب کی جانب سے انھیں ایک تو طویل چکر کاٹنا پڑے گا اور دوسرا اس طرف سے آتے وقت وہ میری نظر میں آسکتے ہیں۔اورنک جیسا سنائپر کبھی بھی ایسی غلطی نہیں کرے گا۔"

"تو......؟"اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

"اگر ہم ان سے تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بلندی پر پہنچ گئے تو شاید کوئی کامیابی ہاتھ لگ جائے۔"میں نے شمال کی جانب موجود ایک اونچی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا تھا۔

عبدالحق بولا۔"اگر ہم چلے گئے تو وہ لاشیں اٹھانے کی کوشش کر سکتے ہیں اور ابھی تک ضلع خان اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں نہیں پہنچ سکا ہے۔"

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا"اب وہ حرکت نہیں کریں گے۔لورا براؤن اسی متعلق بات کرتے ہوئے اسے ڈانٹ رہی تھی۔"

"چلو پھر۔"اس نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی تھی۔اپنا سامان سمیٹتے ہوئے ہم چل پڑے۔وہاں موجود آدمیوں کو ہم نے اپنے جانے کی سمت کا بتاتے ہوئے ضلع خان تک بھی فوراً یہ اطلاع پہنچانے کا کہا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں نے انھیں تاکید کی تھی کہ وہ غار سے باہر نہ نکلیں۔کیوں کہ نک سٹیورٹ کا نشانہ وہی پہاڑی اور اس کے دائیں بائیں موجود دو پہاڑیوں نے بننا تھا۔جہاں پر اس کے ساتھی میرا نشانہ بنے تھے، وہاں انھیں نشانہ بنانے کے لیے انھی تین بلندیوں سے فائر کیا جا سکتا تھا۔اورنک جیسے تجربہ کار سنائپر سے بعید تھا کہ وہ یہ اندازہ نہ لگا پاتا۔اب مجھے اس پر صرف اتنی فوقیت حاصل تھی کہ اس کے ارادے کا پتا چل گیا تھا۔

رینج ماسٹر کا جھولا میری پیٹھ پر لدا تھا۔ کمانڈر عبدالحق نے ہاتھوں میں کلاشن کوف تھامی ہوئی تھی۔ ہم تیز رفتاری سے چلتے ہوئے اپنے ٹھکانے کی مشرقی جانب اترے اور پھر نالے میں بے فکری سے چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ نالہ فرلانگ بھر مشرق کی طرف جا کر شمال کی جانب مڑ رہا تھا۔ میرے پاس چونکہ وزن زیادہ تھا اس لیے کمانڈر عبدالحق مجھ سے دو تین قدم آگے چل رہا تھا۔ رینج ماسٹر کا وزن تقریباً سترہ کلوگرام ہے۔ گویا یہ ایک رائفل چار پانچ کلاشن کوفوں کے بہ قدر وزنی ہوگی۔ سنائپنگ کا بقیہ سامان البتہ کمانڈر عبدالحق نے اپنے جھولے میں ڈالا ہوا تھا۔

میری کوشش تھی کہ جلد از جلد ہم اس بلندی پر پہنچ جائیں۔ نالے میں ہونے کی وجہ سے دشمن کی وائرلیس سیٹ پر کی گئی گفتگو ہمیں سنائی نہیں دی رہی تھی۔

تیز رفتاری سے چلنے کی وجہ ہمارے سانس پھول گئے تھے۔ اب نالہ بتدریج بلند ہو رہا تھا۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے مجھے پلوشہ کی یاد آ گئی وہ بہت تیز رفتاری سے پہاڑوں پر چڑھتی تھی۔ سر ہلا کر میں نے اس کی یادوں کو دور جھٹکا کیوں کہ اس وقت مجھے ایک شاطر سنائپر سے لڑنے کی حکمت عملی سوچنا تھی۔ اور پلوشہ کی یاد مجھے ہر چیز سے غافل کر دیا کرتی۔

ایک چھوٹی پہاڑی عبور کر کے ہم دوسری جانب اترے۔ نشیب میں جاتے ہوئے ہمارے قدموں کی رفتار تیز تھی۔ نالے میں پہنچتے ہی اونچائی کا سفر شروع ہو گیا۔ کمانڈر عبدالحق نے بااصرار مجھ سے رینج ماسٹر کا تھیلا لے لیا تھا۔ اب ہم مطلوبہ پہاڑی کی بلندی طے کر رہے تھے۔ اوپر چڑھتے ہوئے ہم نے مشرقی جانب کا انتخاب کیا تھا اور یوں ہم نک سٹیورٹ کی نظروں میں آئے بغیر اوپر پہنچ سکتے تھے۔ ہمارا ٹھکانہ اس پہاڑی کے جنوبی سمت میں پڑ رہا تھا۔ اس ٹھکانے سے نک سٹیورٹ کی جگہ شمال مغرب میں بن رہی تھی جبکہ یہاں سے اس کا مقام جنوب مغرب کی جانب بن رہا تھا۔ ہمیں اس بلندی پر پہنچتے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا تھا۔ اوپر پہنچتے ہی ہم نے دو منٹ سستا کر اپنے سانس بحال کیے اور پھر میں فوراً رائفل کو جوڑنے لگا۔ سب سے آخر میں ٹیلی سکوپ سائیٹ جوڑ رہا تھا۔ اس دوران کمانڈر عبدالحق دوربین نکال کر علاقے کا جائزہ لینے لگا۔

رائفل جوڑ کر میں نے سب سے پہلے فائر کرنے کے لیے مناسب جگہ تلاش کی اور پھر اس پہاڑی کا ٹیلی

سکوپ کی مدد سے جائزہ لینے لگا جس پر میرے خیال میں نک سٹیورٹ نے پہنچنا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا وہ کسی دوسری پہاڑی کا انتخاب کرتا لیکن ایک سنائپر ہونے کے ناتے اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو اسی پہاڑی کا انتخاب کرتا۔اور پھر وہ مجھے نظر آ گئے۔ میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔وہ اس پہاڑی کے شمال مغربی کونے سے اوپر چڑھے تھے ۔ان کی تعداد چار تھی۔لیکن سب بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے نک سٹیورٹ کی پہچان نہیں تھی۔ بلکہ نک تو کیا اس فاصلے سے لورا براؤن کا امتیاز بھی نہیں ہو رہا تھا۔تمام نے سروں پر گرم ٹوپیاں اوڑھی ہوئی تھیں۔فاصلہ ناپنے پر مجھے انیس سو میٹر معلوم ہوا تھا۔ان کا رخ پتھر کی ایک بڑی چٹان کی طرف تھا اور مجھے شک تھا کہ اس چٹان کے جنوبی جانب مورچہ سنبھال کر وہ میری نظر سے اوجھل ہو جاتے۔اس سے پہلے مجھے اندازے سے نک سٹیورٹ کو پہچان کر کے نشانہ بنانا تھا۔

ایک آدمی پیٹھ پر جھولا اٹھایا ہوا تھا، لامحالہ اس جھولے میں سنائپر رائفل نے ہونا تھا۔اور اس کے ساتھ یہ بھی طے شدہ بات تھی کہ رائفل کو اٹھانے والا نک سٹیورٹ نہیں ہو سکتا تھا۔باقی تینوں میں سے اندازے سے درمیان میں چلنے والے پر نشانہ سادھتے ہوئے میں نے گولی داغ دی۔ دیر کرنے کی صورت میں انھوں نے بڑی چٹان کی آڑ میں پہنچ کر میری نظر سے غائب ہو جانا تھا۔گولی کھا کر وہ اچھل کر مخالف سمت میں گرا تھا، اس کے دائیں بائیں چلنے والے دونوں افراد نے اتنی تیزی سے زمین پر گر کر لڑھکتے ہوئے پتھروں کے عقب میں پناہ لی تھی کہ میں انھیں نشانہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کر سکا تھا۔البتہ سامان اٹھانے والا پہلے تو شاک کی کیفیت میں کھڑا رہ گیا تھا اور پھر شاید کسی کے کہنے پر اس نے حرکت میں آنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے دیر ہو گئی تھی۔ یقیناً اس کا زمین پر لیٹنے کا سو فیصد ارادہ تھا، مگر اس کے ارادے کو عملی جامہ میری گولی نے پہنایا تھا۔غریب اپنی پیٹھ پر لدا تھیلا بھی نہ اتار سکا۔وزنی تھیلے نے اسے سکون سے تڑپنے بھی نہیں دیا تھا۔

رائفل کو دوبارہ کاک کرتے ہوئے میں نے ان دو پتھروں کو اپنی نظر میں رکھ لیا تھا جس کے پیچھے بقیہ دو آدمی چھپے تھے۔ان کی تیزی دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دونوں ہی میرا اصلی ہدف تھے۔

''میرا خیال ہے اصلی آدمی بچ گیا ہے۔'' کمانڈر عبدالحق میرے ساتھ ہی لیٹ کر دوربین سے جائزہ لے رہا تھا۔

”یہ بھی آدمی ہی تھے یار۔“میں ہنسا۔”کیا آپ کو روبوٹ دکھائی دے رہے تھے۔“

”میرا مطلب تھا کہ نک سٹیورٹ بچ گیا۔“اس نے خوش دلی سے وضاحت کی۔

اسی وقت وائرلیس سیٹ پرنسوانی آواز ابھری۔ یہ وہی آواز تھی جو ہم پہلے بھی سن کر اسے لورا براؤن سمجھ چکے تھے۔

”ون ون فار ٹو ون اوور......“

”لیس میڈیم......“مبین نامی کمانڈر کی آواز ابھری یقیناً اسی کا کوڈ نام ٹو ون تھا۔

”موبن، ہم پر حملہ ہوا ہے، شاہ اور کاریم مارے جا چکے ہیں۔ یہاں کچھ آدمی بھیجو۔ اوور......“اس کی بات سن کر ہمیں نک کے بچنے کی تصدیق ہو گئی تھی۔

”میڈم، بیس آدمی لاشیں اٹھانے کے لیے بھیجے ہیں، یہاں پر دس بارہ آدمی ہی بچے ہیں۔ اور کیمپ سے شام تک مزید نفری نہیں پہنچ سکتی۔ اوور......“

”کیا وہ اب تک وہاں نہیں پہنچے۔ اوور......“لورا براؤن کی آواز میں شامل جھلاہٹ اس کے غصے کو ظاہر کر رہی تھی۔

”پہنچ تو گئے ہیں، لیکن اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اوور......“

لورا براؤن نے کہا۔”انھیں کہو لاشیں اٹھائیں اور واپس آ جائیں۔ اوور......“

”مگر سنائپر کا خطرہ تو اب تک موجود ہے نا۔ اوور......“مبین نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”نہیں، وہ خبیث شاید ہماری ٹرانسمشن سن رہا تھا اس لیے وہ ہمارے خلاف گھات لگانے پہنچ گیا۔ اوور......“یوں لگ رہا تھا جیسے وہ یہ سب دانت پیستے ہوئے کہہ رہی ہو۔ پچھلے چند ماہ سے وہ مسلسل کامیابیاں سمیٹ رہے تھے۔ اب انھیں خاطر خواہ جواب ملا تھا تو غصہ تو انھیں آنا تھا۔

”مگر اسے کیسے معلوم کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔“مبین نے حیرانی ظاہر کی۔”یہ نہ ہو آپ پر حملہ کرنے والا کوئی دوسرا شخص ہو۔ اوور......“

”موبن، یہ بحث کا وقت نہیں ہے، دیے گئے حکم پر عمل کرو...... جب کہہ دیا کہ وہ وہاں نہیں ہے تو بس نہیں

ہے۔اوور اینڈ آل۔'' لورا براؤن نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

میں ساتھ ساتھ کمانڈر عبدالحق کو بھی لورا براؤن اور مبین کی بات چیت سے آگاہ کرتا گیا۔اسی وقت مبین اپنے انتظار کرنے والے ساتھیوں کو لاشیں اٹھانے کا حکم بھی دہرانے لگ گیا تھا۔اس بار وہ پشتو میں بولا تھا اس لیے کمانڈر عبدالحق کو اس کی بات سمجھ میں آ گئی تھی۔اس کے آدمیوں کا فاصلہ ہم سے زیادہ تھا اس کے باوجود ان کا جواب سنائی دے گیا تھا۔

عبدالحق دعائیہ لہجے میں بولا۔''اللہ کرے ضلع خان تک ہمارا پیغام پہنچ گیا ہو۔''

میں نے مشورہ چاہنے والے انداز میں کہا۔''میرا خیال ہے لورا براؤن کے ساتھ تھوڑی گپ شپ کرتے ہیں۔''

عبدالحق نے نفی میں سر ہلایا۔''اس طرح تو انھیں پتا چل جائے گا کہ ہم ان کی ٹرانسمشن سن رہے ہیں۔''

''انھیں پہلے ہی سے پتا ہے، لورا براؤن اس بارے مبین کو اشارہ دے چکی ہے۔''

''بات چیت کا فائدہ؟'' عبدالحق بات چیت کے حق میں نہیں تھا۔''اور پہلے اگر شک تھا تو آپ اسے یقین میں بدل دیں گے۔''

''دشمن کو نفسیاتی طور پر اس کی شکست کا احساس دلانے سے وہ بدحواس ہو کر غلطیاں کرتا ہے، غصے میں آ کر مواقع فراہم کرتا ہے۔باقی جہاں تک اس سیٹ کا تعلق ہے تو چند گھنٹوں تک اس کی بیٹری جواب دے جائے گی اور ہمارے پاس نہ تو اس کی فالتو بیٹری ہے اور نہ اس بیٹری کو چارج کرنے کے لیے اس کے مخصوص برانڈ کا چارجر۔بہتر ہوگا کہ انھیں اپنے پاس وائرلیس کی موجودی کا یقین دلا کر ان پر نفسیاتی دباؤ بڑھا دیں، اس طرح وہ کھل کر بات چیت نہیں کر سکیں گے۔''

''بڑا دور تک سوچتے ہو یار۔'' اس کا تحسین آمیز لہجہ مجھے بات چیت کی اجازت دینے کے لیے تھا۔

میرے بات کرنے سے پہلے ہی دور کہیں مسلسل فائر کی آوازیں آنے لگیں۔

عبدالحق نے خیال ظاہر کیا۔''لگتا ہے کمانڈر ضلع خان نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔''

اسی وقت لورا براؤن مبین کو پکار کر فائرنگ کی وجہ پوچھنے لگی۔

’’میڈم،لگتا ہے دشمنوں سے ٹاکرا ہو گیا ہے، میں پوچھ کر بتاتا ہوں۔ویٹ......‘‘لورا کوانتظار کرنے کا کہہ کر وہ بار بار اپنے آدمی کو پکارنے لگا۔’’احتشام فار مبین اوور......‘‘

تین چار بار پکارنے کے بعد احتشام کی سہمی ہوئی آواز آئی۔’’کمانڈر،ہم دشمن کے گھیرے میں ہیں۔جتنے آدمی بھی لاشیں اٹھانے اوپر پہنچے تھے ان میں سے کوئی نہیں بچا۔میں اور ضیاء ایک چٹان کے پیچھے چھپے ہیں ہمیں کمک بھیجو اوور......‘‘

’’تمھارے پاس بیس آدمی بھیجے تھے۔اوور......‘‘مبین چیخ ہی تو پڑا تھا۔

’’میرے خیال میں تو ہم دو بچے ہیں۔اوور......‘‘احتشام کی سہمی ہوئی آواز اس کے خوفزدہ ہونے کو ظاہر کر رہی تھی۔یقیناً ضلع خان نے ایک دم ہلہ بول کر ان کا صفایا کیا تھا۔

مبین اسے جواب دیے بغیر لورا براؤن کو صورت حال بتانے لگا۔نک سٹیورٹ کی آواز اب تک میں نہیں سن پایا تھا۔شاید وائرلیس سیٹ لورا کے ہاتھ تھا اس لیے وہی بات چیت کرتی تھی۔

’’فوراً کیمپ میں بات کر کے ہیلی منگواؤ۔اوور اینڈ آل۔‘‘صورت حال دیکھتے ہی لورا نے چیختے ہوئے حکم پاس کیا تھا۔پیچھے کیمپ سے مبین نے لانگ رینج وائرلیس ہی پر بات کرنا تھی اور وہ ٹرانسمشن ہم نہیں سن سکتے تھے۔گردیز شہر میں موبائل فون سروس کام کرتی تھی۔مگر ان پہاڑوں میں سگنل نہیں آتے تھے۔یا اگر آتے بھی تھے تو انھیں جام کر دیا گیا تھا تاکہ مجاہدین کے رابطے میں رکاوٹ ڈالی جا سکے۔

’’لورا بے بی، بہت پریشان لگ رہی ہو۔اوور......‘‘وائرلیس سیٹ پر خاموشی چھاتے ہی میں بول پڑا تھا۔

’’Who is here‘‘اس نے چونکتے ہوئے پوچھا تھا۔

’’شاید دوست نہ کہہ سکو اور دشمن کے نام سے کیا لینا کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔اوور......‘‘

’’تمھارا انجام بہت برا ہو گا۔‘‘اس نے نفرت بھرے لہجے میں دھمکی دی۔

’’اتنا غصہ صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا لورا بے بی،اور تمھیں اس احمق نک نے بھی نہیں بتایا کہ سنائپر تب ہی اپنے شکار کا پیچھا چھوڑتا ہے جب اس کا متبادل بندوبست کر لے۔خواہ مخواہ اتنے آدمیوں کو مروا دیا۔اوور......‘‘

”وعدہ کرتی ہوں تم زیادہ عرصہ زمین پر چلتے نظر نہیں آؤ گے۔اوور......“غصے کی زیادتی کی وجہ سے اسے دھمکی دینے کے علاوہ کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔

میں نے اسے چڑایا۔”اگر تم آڑ سے اپنا ہاتھ بھی باہر نکال کر دکھا دو تو میں سمجھوں گا تم واقعی کچھ کر سکتی ہو۔ اوور......“

”اگر اتنے ہی سورما ہو تو مجھے سنائپر رائفل اٹھانے دو، پھر میں دیکھ لیتی ہوں تم کتنے پانی میں ہو۔ اوور......“اس مرتبہ اس کے لہجے میں غصے کے بجائے دلچسپی چھپی تھی۔

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔”کیا دشمن کو بھی ہتھیار دیے جاتے ہیں لورا بے بی۔اوور......“

اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔”نہتے آدمیوں پر ہتھیار تان کر بڑھکیں مارنے والا کوئی نامرد ہی ہو سکتا ہے۔ اوور......“

میں نے ایک اور قہقہہ لگایا۔”تو تم کون سا مرد ہو۔اوور......“

”تمھارا نام کیا ہے۔اوور......“

میں عاشقانہ انداز میں بولا۔”حسن والے جس نام سے پکاریں مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔اوور......“

اس نے دلچسپی بھرے لہجے میں پوچھا۔”کیا تم نے مجھے دیکھا ہے؟اوور......“

”تعریف تو کافی سنی ہے۔اوور......“میں نے ہوا میں تیر چھوڑا۔

اس نے تاؤ دلانے والے انداز میں کہا۔”اگر اتنی ہی خوب صورت لگتی ہوں تو مجھے جانے دو۔اوور......“

میں نے پوچھا۔”کیا اپنے ساتھی کو یہیں چھوڑ جاؤ گی؟اوور......“

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔”پہلے اپنی جان کی فکر کرنا چاہیے۔اوور......“

”اگر جانے دوں تو بدلے میں مجھے کیا ملے گا۔اوور......“

”کیا چاہیے۔اوور......“

میں نے کہا۔”ڈیٹ پر چلو گی۔اوور......“

”اگر میرا جواب اثبات میں ہوا تو۔اوور......“اس کا شوخی بھرا لہجہ اس کی تہذیب و ثقافت کو ظاہر کر رہا تھا

۔وہ کوئی مشرقی لڑکی نہیں تھی کہ ایسی باتوں پر شرماتی ۔جس تہذیب میں شوہر کی آنکھوں کے سامنے اس کے دوست سے لپٹ کر بوسا دیا جاسکتا ہو ان کے لیے شرم وحیا کوئی معنی نہیں رکھتے ۔

''ٹھیک ہے، تم اپنے سر سے ٹوپی اتار کر اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ دو تا کہ میں پہچان کی تصدیق کرسکوں ۔ایسا نہ ہو دھوکے میں تمھارا نامراد عاشق نک بھاگ جائے ۔اوور......''

''اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم مجھے جانے دو گے ۔اوور......''یقیناً وہ مجھ پر اعتبار نہیں کرسکتی تھی ۔بس تھوڑی مہلت لے کر ہیلی کاپٹرز کی آمد کا انتظار کر رہی تھی ۔

''جب اعتبار نہیں ہے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔اوور......''

''ایک پاکستانی سنائپر کا نام سنا تھا، جسے ہمارے کچھ دوست ایس ایس کہہ کر پکارتے تھے ۔کیا تم وہی ہو۔ اوور......''اس مرتبہ وہ مطلب کی بات پر آ گئی تھی ۔یقیناً میری نشانہ بازی سے ساتھ جو مبالغہ آمیز کہانیاں مشہور تھیں ان تک بھی یہ شہرت پہنچی ہو گی ۔یوں بھی ہم پیشہ ہونے کی حیثیت سے میرا نام اس تک پہنچنا کوئی حیرت نہیں رکھتا تھا۔مجھ تک بھی تو کافی عرصہ پہلے اس کا نام پہنچ گیا تھا۔

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔''پتا نہیں یہ ایس ایس کیا بلا ہے۔اس کی تعریفیں میرے کانوں تک بھی پہنچی ہیں ۔اوور......''

وہ پر اعتماد لہجے میں بولی ۔''اگر تم وہ نہیں ہو تو پھر ہم یونھی تم سے ڈر رہے ہیں ۔یقیناً تم ہمیں روک نہیں پاؤ گے ۔اوور......''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔بہ ہر حال تم آڑ سے سر باہر نکال کر میرا امتحان لے سکتی ہو۔اوور''

اسی وقت ایک پتھر کے پیچھے سے کوئی چیز بلند ہوئی ۔یقیناً وہ انسانی سر نہیں تھا۔غور کرنے وہ مجھے کلاشن کوف کے بٹ جیسی نظر آئی تھی ۔یقیناً اس نے کلاشن کوف کو الٹا کر کے اس کا بٹ پتھر کی آڑ سے اوپر اٹھایا تھا۔وہاں گولی کو ضائع کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔مگر دشمن کے دل میں ہیبت بٹھانے کا اچھا موقع تھا۔یا شاید میں نک سٹیورٹ کو اپنی مہارت دکھانا چاہتا تھا۔بہ ہر حال کچھ بھی تھا، میں نے کلاشن کوف کے بٹ کے پتھر کی آڑ سے بلند ہونے کے ایک سیکنڈ بعد ہی ٹریگر دبا دیا تھا۔رینج ماسٹر کی گولی نشانہ ڈھونڈنے میں ناکام نہیں ہوئی تھی ۔

رائفل کاک کر کے میں نے فوراً وائرلیس سیٹ کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ ”سوری بے بی، یقیناً تمھارے نازک ہاتھوں کو جھٹکا لگنے کی تکلیف اٹھانا پڑی ہوگی۔اوور......“

”تمھیں مارنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوگا۔اوور......“ اس مرتبہ رسیور سے مردانہ آواز ابھری تھی۔

”چچ چچ......ویسے ایک سناپر کے لیے شرم کا مقام ہے کہ اتنی دیر سے اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت نہیں کر سکا۔اوور......“ میں نے اسے غیرت دلائی، مگر وہاں غیرت کرنا اپنی گردن کٹوانے کے مساوی تھا۔ اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو بھی وہاں سے ہلنے کی کوشش نہ کرتا۔ گزشتہ روز میرے عقب میں موجود ڈھلان قریب تھی اس لیے میں انھیں دھوکا دینے میں کامیاب رہا تھا۔ آج انھیں کم از کم دس بارہ قدم لینے کے بعد آڑ مل سکتی تھی اور اس اتنے قدم لینے کی اجازت انھیں رینج ماسٹر کی گولی نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اکٹھے بھاگتے تو یقینی تو نہیں البتہ شاید ایک آدمی کی جان بچ جاتی۔ اور اتنا بڑا خطرہ وہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

وعدہ رہا، جلد ہی تمھارا ادھار سود سمیت واپس کروں گا۔اوور......“ نک سٹیورٹ کے لہجے میں شامل اعتماد ظاہر کر رہا تھا کہ اسے اپنی نشانہ بازی پر کتنا بھروسا تھا۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”اگر بچ گئے تو۔ یوں بھی تھوڑی دیر تک تمھارے گرد میرے آدمیوں کا گھیرا تنگ ہو جائے گا۔اوور......“

اس مرتبہ اس کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔

عبدالحق نے لمحہ بھر کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زبان کھولی۔ ”بڑی طویل گپ شپ ہو رہی ہے بھئی ہمیں بھی کچھ پتا چلے۔“

میں نے کہا۔ ”بڑی غلطی ہوگئی ہے یار!......آئی کام سیٹ نہیں لایا، اگر ضلع خان کے آدمیوں سے رابطہ ہوتا تو انھیں اس پہاڑی کو گھیرنے کے لیے بلا سکتے تھے۔“

کمانڈر عبدالحق نے کہا۔ ”جلدی کے منصوبے میں اس طرح کی غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔“

میں مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ ”بس یہ غلطی ہمارے جدوجہد کو بڑھا دے گی۔“

وہ پر عزم لہجے میں بولا۔ ”لگتا ہے واپس جانے میں مجھے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا لگے گا۔ تقریباً سارا راستہ

اترائی ہے۔ٹھکانے سے تین چار آدمی ساتھ لے کر میں خود ہی اس پہاڑی کا رخ کروں گا۔“

”بھاگو۔“ میں نے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔

”ہوسکتا ہے ضلع خان پارٹی کے ہاتھوں دشمنوں کا کوئی اور وائرلیس لگ گیا ہو، ایسا ہوا تو اسی پر رابطہ کریں گے۔میں آپ کو کہوں گا عبداللہ کیا حال ہے اور آپ نے فوراً چینل نمبر پندرہ لگا لینا ہے۔“ اس نے سرعت سے منصوبہ سوچتے ہوئے بیان کیا اور میرا جواب سنے بغیر دوڑ لگا دی۔اس دوران میں ایک لمحے کے لیے بھی نک پارٹی کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔

”ون ون فار ٹو ون اوور......“ نک مبین کو پکار رہا تھا۔

”ٹو ون سینڈ یور میسج اوور......“ مبین نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”شاباش۔“ نک نا معلوم اسے کس بات پر شاباش دے رہا تھا۔اس کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی تھی ۔اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ ”شاباش“ فریکونسی تبدیل کرنے کا کوڈ بھی تو ہوسکتا تھا۔تبھی تو ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔میں فوراً ناب گھمانے لگا۔ایک دومنٹ میں مجھے مطلوبہ فریکونسی مل گئی تھی۔واقعی میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔شاباش کا مطلب متبادل فریکونسی لگانا ہی تھا۔مبین اپنی بات ختم کر چکا تھا۔اس وقت نک بول رہا تھا۔

”آٹھ آدمیوں کی پارٹی کو فوراً ہماری طرف روانہ کردو، اگر ہیلی کاپٹر کی آمد سے پہلے دشمن یہاں پہنچ گیا تو ہم بے دست و پا مارے جائیں گے۔اوور......“

مبین خوشامدانہ لہجے میں بولا۔”سر! آپ کے کہنے سے پہلے میں دس آدمی آپ کی طرف روانہ کر چکا ہوں۔اوور......“

”اپنے ذرائع کو بھی حرکت دو، معلوم کرو یہ سنائپر کون ہے؟ اوور......“ نک میرے بارے جاننے کے لیے بے چین تھا۔

”جی سر،کل تک معلوم کرلوں گا۔اوور......“

”اوور اینڈ آل۔“ نک نے جونھی بات ختم کی میں نے فوراً پہلے والا چینل لگا لیا۔کیوں کہ ایک تو اسی پر کمانڈر عبدالحق نے مجھ سے بات کرنا تھی۔دوسرا اگر نک یہ جانچنے کی کوشش کرتا کہ آیا میں اس کی بات سن سکا

ہوں یا نہیں تو لازماً وہ اسی چینل پر مجھے پکارتا۔

میں بہ مشکل مطلوبہ چینل لگا پایا تھا کہ لورا براؤن کی لوچ دار آواز ابھری۔

''شہزادے، کہاں غائب ہو؟''

میں نے لہجے میں خوشی سموتے ہوئے کہا۔''مجھے شہزادہ کہنے کا مطلب ہے ڈیٹ پکی ہوئی۔اوور......''

وہ شوخی سے بولی۔''بالکل، قسم بھی کھا سکتی ہوں۔مگر تم آؤ گے نہیں۔اوور......''

میں اسی کے انداز میں بولا۔''تو تم آجاؤ۔ابھی کھڑے ہو کر میری طرف چلنا شروع کر دو۔میری جگہ کے بارے تو تمھیں اندازہ ہو گیا ہوگا۔وعدہ کرتا ہوں گولی نہیں چلاؤں گا۔اوور......''

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔''میں نے ڈیٹ پر جانے کی حامی بھری ہے، قیدی بننے کی نہیں۔اگر میرے ساتھ ڈیٹ پر جانے کا شوق ہے تو کسی شہر میں ملنے کی کوشش کرو۔اوور......''

میں نے قہقہہ لگایا۔''چلو یہ دعوت ادھار رہی۔اوور......''

''اپنا نام نہیں بتاؤ گے۔اوور......''اس نے ایک بار پھر مجھے کریدا۔

''تم مجھے عبداللہ خان کہہ سکتی ہو۔اوور......''میں نے ایسا نام بتایا جو ہر مسلمان خود کو سمجھتا ہے۔

''ایبڈ الا کھان......''اس کے انگریزی لب ولہجے نے اتنے پیارے نام کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

میں جلدی سے بولا۔''خالی خان کہنا کافی ہوگا۔اوور......''

وہ بولی۔''کھان تو یہاں سارے پٹھان ہیں۔اوور......''

''مگر تمھارے ساتھ ڈیٹ کا حق دار تو صرف میں ہوں نا......تو بس تم اسی نسبت سے یاد رکھ لینا کہ وہ خان جس کے ساتھ تم نے ڈیٹ پر جانا ہے۔اوور......''

''ہاہاہا۔''اس نے قہقہہ لگا کر گویا میری حوصلہ افزائی کی تھی۔مگر جب وہ بولی تو اس کا لہجہ خاصا بدلا ہوا تھا۔''تو کھان صاحب، الوداع۔شاید تم زندہ نہ بچ پاؤ۔اوور اینڈ آل۔''

اس کے بدلے ہوئے لہجے نے مجھے چونکا دیا تھا۔لیکن میری حیرانی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ پائی تھی۔ہیلی کاپٹر کے پروں کی پرشور آواز مجھ تک پہنچ گئی تھی۔میں نے فوراً ان کی متبادل فریکونسی لگائی۔وہ مبین کو اس پہاڑی

کی نشاندہی کر رہی تھی جس پر میں موجود تھا۔ ''ایک ہیلی کاپٹر اس پہاڑی پر بھیجنا۔ وہاں کم از کم دو آدمی موجود ہوں گے۔ انھیں زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ پائلٹس سے رابطے میں تو ہو نا؟ اوور......''

''یس میڈم! اور جو آدمی آپ کے پاس آ رہے تھے، انھیں بھی اس پہاڑی کی طرف روانہ کر دیتا ہوں۔ اگر کوبرا کی گن سے بچ بھی گیا تو ہمارے آدمیوں کے ہاتھوں نہیں بچے گا۔ اوور......''

لورا نے پوچھا۔ ''تینوں کوبرا آ رہے ہیں۔ اوور......''

''نہیں، دو کوبرا اور ایک ایم آئی سیونٹین ہے۔ اوور......''

''گڈ، ایک کوبرا اور ایم آئی سیونٹین لاشیں اٹھانے بھیج دو۔ اوور......''

مبین نے پوچھا۔ ''آپ کے پاس نہیں بھیجنا۔ اوور......''

''نہیں، اس خبیث کے پاس جیسے ہی ہیلی پہنچے گا ہم دونوں واپسی کی راہ لیں گے۔ اوور اینڈ آل۔'' لورا براؤن نے گفتگو ختم ہونے کا اعلان کیا۔ خبیث کا لقب اس نے مجھے عطا کیا تھا۔ ہیلی کاپٹروں کی آواز سنتے ہی میں نے رائفل کا بٹ اور دو پائی کلوز کر کے تھیلے میں ڈالی۔ کیوں اتنا وقت میرے پاس نہیں تھا کہ رائفل کو مکمل کھولتا۔ مجھے ہیلی کاپٹروں کی اتنی جلدی آمد کی امید نہیں تھی۔ یقیناً گردیز کیمپ میں ان کے پاس ہیلی کاپٹر موجود تھے تبھی تو اس سرعت سے تین ہیلی یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ ویسے بھی امریکیوں کو ہیلی کاپٹروں کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ ان کی بات کے اختتام تک میں جھولا اپنی پیٹھ پر لاد کر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں چل پڑا تھا۔ دس آدمی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ لیکن کوبرا (گن شپ ہیلی کاپٹر) میرے پرخچے بھی اڑا دیتا۔ یہ خاص جنگ کے لیے تیار کیا گیا ایک تیز رفتار ہیلی کاپٹر ہے۔ مچھلی جس طرح پانی میں حرکت کرتی ہے یہ ہوا میں ایسے ہر طرف سے گھوم کر حملہ کرتا ہے۔ عام ہیلی کاپٹرز میں گن کو چلانے والا گن مین بیٹھا ہوتا ہے، جو کسی بھی ہدف پر فائر کرتا ہے لیکن کوبرا کا پائلٹ آٹو میٹک گن سے ہدف پر تباہی پھیرتا ہے۔ اس میں آٹو میٹک 12.7 ایم ایم کی گنیں فٹ ہوتی ہیں۔ یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ہیوی سنائپر رینج ماسٹر کی گولی بھی 12.7 ایم ایم ہی ہوتی ہے۔ اگر ایک گولی انسان کی کھوپڑی کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر سکتی ہے تو اسی کیلی برکی درجنوں گولیوں نے کیا تباہی مچانا تھی یہ اندازہ کرنا آپ کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔

میرے پاس چل کر یا بھاگ کر فائر کرنے کے لیے لے دے کے بریٹا پستول ہی موجود تھا۔ دس کلاشن کوفوں اور ایک کوبرا ہیلی سے فقط بریٹا کے ساتھ مقابلہ کرنا یقیناً خودکشی کی آسان کوشش کہی جاسکتی ہے۔ دشمن کے دس آدمیوں نے مغربی جانب سے آنا تھا، میرے لیے مشرقی طرف فرار ہونا اتنا مشکل نہیں تھا لیکن اس جانب کوئی ایسی آڑ موجود نہیں تھی جس سے میں کوبرے کے پائلٹ کی نظروں سے بچ پاتا۔ البتہ شمال کی جانب موجود درخت اور جھاڑیاں مجھے نظری آڑ مہیا کرسکتی تھیں۔ سرعت سے فیصلہ کرتے ہوئے میں اسی جانب چل پڑا تھا۔ ہیلی کی آواز لحہ بہ لحہ قریب آتی جارہی تھی۔ اس کی آمد سے پہلے میں جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں گھس کر بے حس وحرکت لیٹ گیا تھا۔ کوبرا بہت نیچی پرواز کرتا ہوا ان جھاڑیوں کے قریب سے گزرا جہاں میں پہلے لیٹا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں ''تڑتڑتڑ'' کی بھیانک آواز گونجی۔ وہ گولیوں کی بوچھاڑ کرتا ہوا آگے گزر گیا۔

میرا دل ہولنے لگا تھا۔ اگر وہ اسی طرح ہر جھنڈ پر گولیوں کے دو تین برسٹ فائر کرتا رہتا تو مجھے نشانہ بنانا اس کے لیے مشکل نہ ہوتا کیوں کہ اس پہاڑی پر جھاڑیوں کے اتنے زیادہ جھنڈ موجود نہیں تھے۔

چکر کاٹ کر کوبرا واپس مڑا اور اس مرتبہ گولیوں کا برسٹ ساتھ والی جھاڑی پر پڑا تھا۔ جو سوچ میرے دماغ میں آئی تھی، پائلٹ بھی اس پر عمل پیرا ہو گیا تھا۔ اور جلد ہی میرا نمبر آجانا تھا۔ کوبرا میرے ساتھ والی جھاڑی پر گولیوں کا برسٹ فائر کرتا ہوا آگے گزر رہا تھا۔ اس وقت میری بچت مغربی سمت کا رخ کرنے میں تھی۔ گو اس طرف سے دشمن اوپر کو آرہے تھے لیکن کوبرے کی گولیوں سے اسی جانب اتر کر بچا جاسکتا تھا۔ لیکن پھر میں نے ایک اور رسک لیا اور کوبرے کے مڑنے سے پہلے، جھاڑی سے نکل کر چند قدم دور موجود اس جھاڑی میں گھس گیا جہاں کوبرا ابھی فائر کر کے آگے گیا تھا۔ اگر پائلٹ مجھے دیکھ لیتا یا وہ غلطی سے دوبارہ اسی جھاڑی پر فائر کر دیتا تو لورا براؤن کا مجھے الوداع کہنا حق سچ ہو جاتا۔

مگر پائلٹ مجھے نہیں دیکھ پایا تھا اور نہ اس نے فائر کرنے میں غلطی کی تھی۔ حالانکہ اس وقت اس کا غلطی کرنا اسے کامیاب کرسکتا تھا۔ اس نے واپسی پر تھوڑی دیر پہلے میرا ٹھکانہ بننے والی جھاڑی پر گولیوں کا چھڑکاؤ کیا اور آگے گزرتا چلا گیا۔ اس سیدھ میں جتنی جھاڑیاں آئی تھیں ان تمام پر کوبرے کی گولیاں لگی تھیں۔ کوبرے کے سر

پر سے گزرتے ہی میں مزید جنوب کی طرف بڑھا۔اگلی جھاڑی پندرہ بیس قدم دور تھی لیکن کوبرے کے مڑنے سے پہلے میں جھاڑی میں داخل ہو چکا تھا۔پائلٹ گولیاں برساتے ہوئے ترتیب سے تمام جھاڑیوں کی چھان بین کر رہا تھا۔یہ بھی ممکن تھا کہ ایک دفعہ فائر کر چکنے کے بعد پائلٹ دوبارہ ایک ایک برسٹ تمام جھاڑیوں پر برسانا شروع کر دیتا۔

میں جس جھاڑی میں گھسا ہوا تھا اسی سے کوبرے نے فائرنگ کی ابتدا کی تھی۔اس کے بعد جنوب کی طرف جھاڑیوں کے جھنڈ موجود نہیں تھے۔اکا دکا درخت بلاشبہ موجود تھے لیکن درختوں کے نیچے میں پائلٹ کی نگاہوں سے نہیں چھپ سکتا تھا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے ایک اور تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔جنوب کی جانب میرے چھپنے کی جگہ سے پچاس ساٹھ گز دور ایک پتھریلی چٹان پڑی تھی۔اس کی آڑ لے کر میں پائلٹ کی نظر میں آنے سے بچ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ میں پائلٹ کے ساتھ ساتھ اس چٹان کے دائیں بائیں حرکت کرتا رہتا۔کوبرے کے اگلی جھاڑی پر آگ برسا کر آگے بڑھتے ہی میں آخری جھاڑی سے نکل کر پوری قوت سے دوڑا۔میری پیٹھ پر لدا رینج ماسٹر کا جھولا مجھے زیادہ رفتار سے بھاگنے نہیں دے رہا تھا لیکن اس وقت زندگی اور موت کی بازی شروع تھی اور یہ بازی کوئی بھی نہیں ہارنا چاہتا۔یوں بھی پائلٹ کی توجہ ان جھاڑیوں کی طرف مبذول تھی جہاں وہ گولیاں برسا رہا تھا۔

چٹان کے جنوبی جانب آڑ لیتے ہی میں چڑھے ہوئے سانسوں کو اعتدال پر لانے لگا۔اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے اس حالت سے نکلنے کی تجویز سوچ رہا تھا۔اگر پیدل دشمن اوپر پہنچ جاتا تو یقیناً وہ مجھے چوہے کی طرح گھیر کر ہلاک کر دیتے۔کوبرے کی وجہ سے میں کسی آڑ میں رہ کر بھی ان کا مقابلہ نہ کر پاتا کہ کوبرا سر پر پہنچ کر مجھے بڑی آسانی سے ہلاک کر دیتا۔بچاؤ کا ایک ہی طریقہ تھا کہ کوبرا وہاں سے چلا جاتا۔جبکہ پائلٹ کا فی الحال ایسا ارادہ نظر نہیں آ رہا تھا۔اور پھر تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق میں نے ایسا فیصلہ کیا جسے عام حالات میں خود کشی ہی کا نام دیا جا سکتا تھا۔

رینج ماسٹر کا جھولا پیٹھ سے اتار کر میں نے رائفل باہر نکالی۔اور اس پر سائیٹ لگانے لگا۔چند سیکنڈ بعد میں

دوسو میٹر رینج لگا کر رائفل کے پیچھے لیٹ چکا تھا۔اس وقت اگر پائلٹ اس طرف دیکھ لیتا تو میرا بچنا محال تھا ۔بھری ہوئی میگزین رائفل سے جوڑتے ہوئے میں نے رائفل کاک کی اور پیچھے لیٹ کر پائلٹ پر نشانہ سادھ لیا ۔کوبرے کی تیز رفتاری میرے لیے نہایت مشکل پیدا کر رہی تھی ،اگر میں سیدھی گولی فائر کرتا تو پائلٹ کو کبھی بھی نشانہ نہ بنا سکتا۔مناسب لیڈ لے کر ہی میں کامیاب فائر کر سکتا تھا۔گو کسی بھی متحرک ہدف کو نشانہ بنانے کے لیے لیڈ کا فارمولا موجود ہے،مگر مسئلہ یہ تھا ایسا تبھی ممکن ہے جب متحرک چیز کی رفتار معلوم ہو۔اور کوبرے کی رفتار مجھے معلوم نہیں تھی ۔اس لیے مذکورہ فارمولا میرے کسی کام کا نہیں تھا ۔البتہ پیشہ ور سنائپرز کے دماغ میں ایک اپنا اندازے کا میٹر لگا ہوتا ہے۔اوراس وقت میرا ذاتی اندازہ ہی کام آ سکتا تھا۔ہیلی کی بائیں کھڑکی کا شیشہ کھلا تھا اس لیے میں اس کے مغرب کی طرف مڑنے کا انتظار کرنے لگا۔میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا کیوں کہ کوبرا جھاڑیوں کے آخری جھنڈوں کو نمٹانے والا تھا۔پائلٹ کے چکر کاٹ کر مغرب کی طرف مڑتے ہی میں نے پائلٹ کے سر پر شست لی اوراس کے اپنی رائفل کے متوازی آنے سے پہلے میں نے بیرل کو اندازے سے مناسب لیڈ دے کر دل دل ہی میں اپنے پاک پروردگار کو مدد کے لیے پکارتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔یہ میری زندگی کا سب سے خطرناک فائر تھا۔ٹریگر دباتے ہی میں نے جلدی سے رائفل کو دوبارہ کاک کیا مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی ۔اللہ پاک نے میری مناجات کو قبول فرما لیا تھا۔ایک دم ہیلی کاپٹر گھوما اور پھر درختوں سے ٹکراتا ہوا زمین بوس ہو گیا۔ڈھلان میں گرنے کی وجہ سے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔لیکن اس کے گرنے سے پیدا ہونے والا دھماکا کافی زوردار تھا۔ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔اس سے پہلے میں مجھے ایسا موقع نہیں ملا تھا کہ میں ہیلی کا نشانہ بنانے کی کوشش ہی کر سکتا۔

میں نے سرعت سے رائفل کے بٹ اور دو پائی کو کلوز کر کے جھولے میں ڈالا اور جھولے کو پیٹھ پر لاد کر مشرقی ڈھلان اترنے لگا۔میری رفتار اتنی ہی تیز تھی جتنی کسی نشیب میں اترنے والے ایسے شخص کی ہو سکتی ہے جس کے پیچھے موت لگی ہو۔اترائی میں دوڑتے وقت سب سے زیادہ مشکل اپنے جسم کو سنبھالنا ہوتا ہے کیونکہ ذرا سا توازن بگڑنے سے انسان کا تھوبڑا اگڑنے میں دیر نہیں لگتی۔اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ آدمی کو سیدھے کے بجائے ترچھا ہو کر دوڑنا پڑتا ہے۔یوں کہ پاؤں کا ٹخنے والا حصہ آگے رکھا جاتا ہے اور عام دوڑ کے برعکس ایک ہی پاؤں

مسلسل آگے رہتا ہے۔ میرے دماغ میں دوسرے کوبرے کی آمد کا خطرہ بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے والے کو تو میں نے اس کی بے خبری میں مار گرایا تھا اور اس کے عبرت ناک انجام کے بعد دوسرا پائلٹ کبھی بھی ایسی غلطی نہ کرتا۔

اچانک میرے ذہن میں ان کی ٹرانسمشن سننے کا داعیہ پیدا ہوا۔ وائرلیس سیٹ کافی دیر سے بند کر کے میں نے جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ کوٹ کی جیب سے وائرلیس نکال کر میں نے آن کیا۔ لورا براؤن بڑے غصے میں کسی کو لتاڑ رہی تھی۔

"تمھارے سورما اب تک نہیں پہنچے۔ انھیں کہو جلدی وہاں پہنچ کر معلوم کریں پائلٹ کو کیسے حادثہ پیش آیا ہے۔ اوور......"

"جی میڈم! وہ بس پہنچنے ہی والے ہیں۔ اصل میں مغربی جانب سے چڑھائی بالکل سیدھی ہے اس لیے انھیں دیر ہو رہی ہے۔ اوور......" کمانڈر مبین کی صفائی دیتی آواز ابھری۔

"تمام ہیلی کے گرد نہ اکٹھے ہو جائیں، کچھ کو کہو اوپر پہنچ کر دیکھیں ہوسکتا ہے گرنے سے پہلے پائلٹ اس خبیث کو نشانہ بنا چکا ہو۔ اوور......"

"ٹھیک ہے میڈم۔ اوور......"

"اوور اینڈ آل۔" کہہ کر لورا براؤن نے بات ختم کی۔

میں نے پرانی فریکونسی لگائی۔ دو تین منٹ بعد ہی میرے کانوں میں کمانڈر عبدالحق کی آواز آئی۔

"عبداللہ کیا حال ہے۔" وہ شاید وقفے وقفے سے مجھے پکار رہا تھا۔

"معذرت خواہ ہوں دوست میں ذرا مصروف ہوں بعد میں بات ہوتی ہے۔ فی الحال خدا حافظ۔" میں پھولے سانسوں کے ساتھ کہا اور اس کے ساتھ ہی پندرہ نمبر چینل لگا دیا۔ اس دوران میری رفتار ذرا سی دھیمی ہوئی تھی لیکن میں نے رکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آدھے سے زیادہ اترائی میں طے کر چکا تھا۔ اور اب تو چھدری چھدری جھاڑیاں شروع ہو گئی تھیں جو مجھے اچھی خاصی آڑ مہیا کر رہی تھیں۔ اگر دشمن نشیب میں جھانک بھی لیتا تو مجھے اتنی آسانی سے نہ ڈھونڈ سکتا۔ نیچے نالے میں کوبرے کے فائر سے بچنے کے لیے بھی کافی جگہیں مل جاتیں۔

"شکر ہے عبداللہ بھائی آپ کی آواز سنی۔" کمانڈر عبدالحق کی اطمینان بھری آواز ابھری تھی۔

(یہاں ایک بات قارئین کے گوش گزار کردوں کہ وائرلیس سیٹ (ریڈیو سیٹ) پر جب ایک آدمی بات کر رہا ہو تو دوسرا صرف سن سکتا ہے اگر دوسرا بھی بٹن دبا کر بات کرنے کی کوشش کرے گا تو دونوں ایک دوسرے کی بات نہیں سن سکیں گے۔اس لیے تربیت یافتہ افواج میں یہ طریقہ رائج ہے کہ جب ایک آدمی اپنی بات مکمل کر لیتا ہے تو ''اوور'' کہہ کر بات کی تکمیل کا بتاتا بھی ہے تاکہ دوسرا اپنی بات کر سکے۔عام لوگ ''اوور'' وغیرہ کا کھٹ راگ نہیں پھیلاتے وہ بس اندازے ہی سے جان لیتے ہیں کہ مخالف کی بات مکمل ہوگئی ہے۔دہشت گردوں کی گفتگو ایسے ہی بغیر ''اوور'' کہے چلتی رہتی ہے۔اسی طرح مجاہدین کو بھی میں نے اسی طرح گفتگو کرتے سنا ہے۔یہاں یہ وضاحت اس لیے کرنا پڑی کہ جن لوگوں کا کبھی ریڈیو سیٹ پر بات چیت کرنے کا اتفاق نہیں ہوا کہیں یہ بات انھیں الجھن میں نہ ڈال دے کہ اسی وائرلیس سیٹ پر بات کرتے ہوئے امریکن وغیرہ ہر بات کے اختتام پر اوور کر رہے تھے اور میں کمانڈر عبدالحق کے ساتھ بغیر ''اوور'' کہے کیسے گفتگو کرتا رہا)

''باقی گپ بعد میں ہوگی یہ بتاؤ اس وقت کہاں پر ہو؟''میں نے پوچھا۔

''ہم طے شدہ جگہ پر جانے کے لیے نکل چکے تھے،مگر ہیلی کی آمد کی وجہ سے رستے میں رک گئے ہیں۔''

''واپس ٹھکانے پر پہنچو۔وہیں آ کر بات کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''اس کی اطمینان بھری آواز ابھری۔وائرلیس سیٹ جیب میں ڈال کر میں نے دوبارہ اپنی رفتار بڑھا دی۔نالے میں اترتے ہی میرے کانوں میں کلاشن کوف کی تڑتڑاہٹ گونجی۔چار پانچ کلاشن کوفیں اکھٹی ہی گرج رہی تھیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا دشمن بلندی پر پہنچ چکا تھا اور وہیں سے وہ نالے میں فائر کر رہے تھے۔کلاشن کوف کی کارگر رینج اتنی نہیں تھی کہ وہ مجھے وہاں سے نشانہ بنا سکتے۔البتہ تعاقب کر کے مجھے نقصان پہنچانا مشکل نہیں تھا۔ایک بڑے پتھر کی آڑ میں رک کر میں ان کا جائزہ لینے لگا۔وہ میرے تعاقب کے لیے نشیب میں اترنے لگ گئے تھے۔نزدیک پہنچنے پر میں ان کا مقابلہ نہ کر پاتا کیوں کہ سنائپر رائفل دور کی لڑائی کے لیے زیادہ موثر ہے نزدیکی اور دوبدو لڑائی میں تو آٹومیٹک اور ہلکی رائفل ہی زیادہ کارآمد ہوتی ہیں۔ان پیش قدمی میں رکاوٹ ڈالنا ضروری تھا۔رینج ماسٹر کو جھولے سے نکال کر میں نے پتھر پر لگایا فاصلہ ناپ کر ان کی بلندی کا زاویہ ناپا،کیوں کہ

درست فائر کرنے کے لیے مجھے ان تمام معلومات کی ضرورت تھی۔ البتہ اب میرا اتنا تجربہ ہو چکا تھا کہ ایک منٹ کے قلیل وقت میں میں رینج لگا چکا تھا۔

پہلا فائر میں نے اس پر کیا جو سب سے آگے تھا۔ اس کی تیز رفتاری گولی لگنے کے بعد بھی برقرار رہی تھی۔ چونکہ میں نے بیرل پر سائیلنسر چڑھایا ہوا تھا اس لیے باقیوں نے اپنے ساتھی کے گرنے کو ٹھوکر لگنے پر محمول کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد گرنے والے دو آدمیوں نے ایک دم ان کے قدموں میں رکاوٹ ڈال دی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو آڑ لینے کا کہنے لگے۔ لیکن یہ ضروری تو نہیں تھا کہ تمام کو فوراً ہی مضبوط آڑ مل جاتی۔ ان کے چھپنے تک دو اور آدمی باقی نہیں رہے تھے۔ باقی تین پتھروں کے پیچھے لیٹ کر اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔ ان کی تعداد دس تھی جبکہ میرے تعاقب میں آٹھ آرہے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ دو ہیلی کاپٹر کے ساتھ رک گئے تھے۔ میں وائرلیس سیٹ نکال کر ان کا مخصوص چینل لگالیا۔ کیوں کہ انھوں نے اس حادثے کی اطلاع تو کسی کو دینا تھی۔

”وہیں لیٹے رہو آڑ سے باہر نہ نکلنا، میں تم لوگوں سے بات کرتا ہوں۔“ میرے کانوں میں مبین کی آواز پڑی۔ یقیناً وہ مبین کو اطلاع دے چکے تھے اور اب مبین انھیں حکمت عملی بتا رہا تھا۔

انھیں انتظار کا کہہ کر وہ لورا براؤن کو پکارنے لگا۔ ”ٹو ون فار ون ون اوور......“

”سینڈ یور میسج اوور......“ لورا کی آواز ابھری۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نک سے زیادہ وہ احکام پاس کرتی تھی۔ شاید وہ نک سے سینئر تھی یا پھر اسے کمانڈ کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔

مبین اسے پانچ آدمیوں کی ہلاکت کا بتانے لگا۔

”یہ الو کے پٹھے اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتے، ایک حرامی ان کے قابو میں نہیں آرہا۔ اوور......“ غصے میں مبتلا ہو کر وہ گالیاں بکنے پر اتر آئی تھی۔

مبین نے کہا۔ ”میڈم، میرا خیال ہے وہاں کوبرا بھیج دیتے ہیں۔ اب بڑے ہیلی کی حفاظت کے لیے کوبرے کی ضرورت نہیں رہی۔ تمام لاشیں ایک جال میں باندھ کر ایم آئی سیونٹین روانہ ہو چکا ہے۔ اوور......“

”ٹھیک ہے اس کے پائلٹ کو بھی پہلے والے حرامی کا انجام بتا دو۔ خالی بھونکنے والے سورا کھٹے ہو گئے ہیں

۔اوور اینڈ آل۔‘‘ لورا براؤن کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

’’ہائے بے بی ،اتنے پیارے ہونٹوں سے اتنی گندی گندی گالیاں بکنا کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا۔ اوور......‘‘ میں اسے مزید سلگانے سے باز نہیں آیا تھا۔

’’تم ....‘‘ اس نے تم کے بعد ایسے الفاظ استعمال کیے تھے جو یہاں لکھنے کی کم از کم مجھے ہمت نہیں ہے۔شاید انگریزی زبان کی ساری معروف اور غیر معروف گالیاں اسے ازبر تھیں۔ہمارے ہاں جو انگلش گالیاں زبان زدِ عام ہیں انھیں ہم اردو گالیوں کے مقابلے میں کم برا سمجھتے ہیں۔یہ حکمران زبان کا اعجاز ہی ہے کہ گالیاں سننے والا بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔

لگتی ہیں گالیاں بھی تیرے منھ سے کیا بھلی

قربان ترے پھر سے مجھے کہہ دے اس طرح

مگر اس نے جو الفاظ منھ سے نکالے تھے،مرد ہونے کے باوجود مجھے پہلی بار وہ سب سننے کا اتفاق ہوا تھا۔کسی گالیاں بکنے والے کے جواب میں ویسے ہی الفاظ منھ سے نکالنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ بھی اس کی سطح پر آ گئے ہیں۔اور اس میں کوئی شک نہیں کہ گالیاں بکنا اپنی کمزوری اور بے بسی کا اظہار کرنا ہے۔لورا براؤن بھی کچھ نہ کر سکنے پر یوں بے ہودگی پر اتر آئی تھی۔

میں نے قہقہہ لگا کر اسے مزید سلگایا۔وہ مزید مغلظات بکنے لگی۔اس کی زبان رکنے پر میں نے پریشان لہجے میں کہا۔

’’یہ گالیاں بکنا کہیں اپنے ڈیٹ کے وعدے سے انحراف کی چال تو نہیں ہے۔اوور......‘‘

’’مسٹر،میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ تمھاری موت بہت بری ہو گی۔‘‘ اس کا غصہ دیکھ کر لگ رہا تھا کہ اگر میں اس کے سامنے ہوتا تو وہ مجھے کچا ہی چبا ڈالتی۔

’’مطلب میرا اندازہ ٹھیک ہے،تمھارے ساتھ ڈیٹ پر جانے کی خواہش خواب ہی بنی رہے گی۔اوور......‘‘ میں نے یوں دکھ کا اظہار کیا گویا سچ میں وہ میری محبوبہ ہی ہو۔

’’اگر میرے سامنے ہوتے تو تمھیں بتا دیتی کہ تم کتنے کچھ دلیر ہو۔‘‘

اس سے باتیں کرتے ہوئے میں پتھروں کی آڑ میں لیٹے ہوئے دشمنوں سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ان کی موسلا دھار فائرنگ اب گاہے گاہے کی ٹھ ٹھ میں تبدیل ہو چکی تھی۔میری ہمیشہ سے عادت رہی ہے کہ میں فضول ٹریگر دبانے سے پرہیز ہی کرتا ہوں۔استادوں نے ہمیشہ بلا مقصد کی فائرنگ سے روکا تھا اور میں اس اصول پر سختی سے کاربند رہتا ہوں۔اسی وجہ سے تو دوران تربیت کبھی غلط گولی چلانے کی پاداش میں استاد محترم راؤ تصور صاحب کے تادیبی وعظ سے بہرہ مند نہیں ہوسکا تھا۔اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں ہمیشہ ہی بے عزتی کرانے سے محفوظ رہا۔نشانہ بازی سے ہٹ کر خیر سے مجھے بھی درجنوں بار بے عزت ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔لیکن یہ موقع تفصیل بتانے کا نہیں ہے۔

لورا براؤن سیدھے منہ بات کرنے پر آمادہ نہیں تھی اور مجھے بھی خواہ مخواہ بے ہودہ الفاظ سننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔اس لیے میں مزید کچھ کہے بغیر دائیں بائیں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا جہاں میں ہیلی کی فائرنگ سے اپنا بچاؤ کرسکتا۔یوں بھی نالے میں جا بہ جا ایسی چٹانیں بکھری پڑی تھیں جن کے نیچے گھس کر میں اپنا بچاؤ کرسکتا تھا۔اس لیے مجھے ہیلی کا اب پہلے جتنا خوف نہیں رہا تھا۔بلکہ ایک ہیلی کو گرا لینے کے بعد میرا حوصلہ بلند تھا۔میں چھپ کر ہیلی پر نشانہ سادھ سکتا تھا۔یوں بھی سائیلنسر کی وجہ سے میری رائفل سے نکلنے والی گولی کی آواز ہی نہیں آتی تھی۔

پچاس ساٹھ قدم دور مجھے ایک مناسب چٹان نظر آئی جس کے ساتھ کھوہ جیسی بنی تھی۔میں رائفل کو اسی طرح کندھے پر رکھ کر اس جانب بڑھ گیا۔دشمن مجھ سے چھے سات سو گز دور تھا اور اتنے فاصلے پر سے کلاشن کوف کی گولی سے مجھے نشانہ نہیں بنایا جاسکتا تھا۔مطلوبہ چٹان کے پاس جا کر میں نے رائفل کندھے سے اتار کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔تین آدمی بڑی تیزی سے اوپر چڑھ رہے تھے۔جس وقت ان پر نظر پڑی وہ ایسی جگہ پر پہنچ چکے تھے کہ میرے نشانہ سادھنے سے پہلے ہی وہ نظر سے اوجھل ہو جاتے۔اس لیے کسی ایسی کوشش سے گریز کرتے ہوئے میں ان کی طرف متوجہ رہا۔مجھے لورا براؤن کے ساتھ مصروف گفتگو پا کر کمانڈر مبین نے کسی اور چینل پر انھیں واپس لوٹنے کا حکم دے دیا تھا۔ہیلی کی آواز بھی اب تک میرے کانوں میں نہیں پڑی تھی۔اور اس کا ایک ہی مطلب ہوسکتا تھا کہ ان کا منصوبہ تبدیل ہو چکا تھا۔ویسے ہیلی کاپٹر کے نہ آنے کی ایک ٹیکنیکل وجہ تو یہ

بھی ہوسکتی تھی کہ ہیلی کا فیول کم رہ گیا ہو۔ یوں بھی ہیلی کاپٹر ایک ایسی سواری ہے جسے بار بار ایندھن ڈلوانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے ہیلی پر مسلسل لمبا سفر نہیں کیا جا سکتا۔ ہر تین چار گھنٹوں کے بعد ہیلی کو فیول ٹینک بھروانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

دشمن کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی میں نے رینج ماسٹر کو جھولے میں ڈالا اور اپنے رستے ہو لیا۔ چلتے ہوئے میں وائرلیس سیٹ کے چینل بھی تبدیل کرتا گیا تاکہ کسی جگہ دشمن کی گفتگو سننے کو ملے، مگر مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ سارے چینلز کھنگالنے کے بعد میں نے پندرہ نمبر چینل لگا کر عبدالحق کو پکارنا شروع کر دیا۔ فوراً ہی اس کا جواب موصول ہوا تھا۔ وہ اس وقت اپنے ٹھکانے والی پہاڑی کی بلندی پر چڑھا تھا۔ صورت حال پوچھنے پر اس نے بتا دیا کہ دونوں ہیلی کاپٹرز کو واپس جاتے ہوئے اس نے خود دیکھا ہے۔ اور اس کے علاوہ بھی کوئی خاص حرکت نظر نہیں آ رہی تھی۔

ٹھکانے والی پہاڑی کے نالے میں پہنچتے ہی مجھے تین مسلح آدمی اپنا انتظار کرتے ملے۔ میرے منع کرنے کے باوجود عبدالحق نے ان آدمیوں کو نیچے بھیج دیا تھا۔ انھوں فوراً ہی رینج ماسٹر کا جھولا مجھ سے لے لیا تھا۔ مسلسل بھاگ دوڑ اور جان بچانے کی کوشش میں میرے کپڑے نہایت گندے ہو چکے تھے۔ پسینہ، جھاڑیوں کے پتے اور مٹی وغیرہ لگنے کی وجہ سے میں پورا بھوت بنا ہوا تھا۔ گو ایک سنائپر کو دشمن کی نظر سے چھپنے کے لیے اپنی شکل اور لباس کو خود ہی خراب کرنا پڑتا ہے، لیکن میری اس وقت کی حالت کے ذمہ دار حالات تھے۔

ٹھکانے پر پہنچتے ہی سب سے پہلے تو میں نے گرم پانی سے غسل کر کے کپڑے تبدیل کیے۔ اس کے بعد کھانے کے لیے بیٹھ گیا کہ بھوک سے برا حال تھا۔ شام کی نماز پڑھ کر تمام میری کارگزاری سن رہے تھے۔ کمانڈر ضلع خان بہت خوش تھا۔ دشمن کو کافی عرصے بعد اتنا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”ویسے اس پہاڑی پر ہیلی کاپٹر کے اترنے جگہ تو نہیں تھی پھر انھوں نے لاشیں کس طرح اکٹھی کیں۔“

ضلع خان بتانے لگا۔ ”انھوں نے ایک جال نیچے پھینکا اور اس کے ہمراہ چار پانچ آدمی رسی کی سیڑھی سے نیچے اتر گئے۔ تمام لاشوں اکٹھی کر کے انھوں نے جال میں ڈالیں اور پھر جال کے چاروں کونوں میں لگے کنڈوں

میں رسی گزار کر ہیلی کاپٹر کے نیچے باندھ دیا۔ان کے لاشیں اکھٹا کرنے تک دونوں ہیلی ہوا میں چکراتے رہے تھے۔''

میں نے پوچھا۔''آپ کہاں سے دیکھ رہے تھے۔''

ضلع خان نے جواب دیا۔''ہم بالکل قریب تھے۔لیکن اس وقت فائر کرنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔چھوٹے والا ہیلی کاپٹر بہت خطرناک ہے۔ایک گولی فائر ہونے کے بعد شاید ہم میں سے کوئی نہ بچ پاتا۔''

میں نے کہا۔''اچھا اب عشاء کے بعد اگلے مرحلے کے لیے تیار رہنا۔''

''کیا مطلب؟''کمانڈر عبدالحق اور ضلع خان نے بیک وقت پوچھا تھا۔باقی بھی میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

ان کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے ضلع خان سے پوچھا۔''آپ کے پاس 12.7 گنیں کتنی تعداد میں موجود ہیں۔''

اس نے کہا۔''صرف دو ہیں۔''

میں نے پنڈلی سے بندھا خنجر نکال کر غار کے فرش پر لکیریں کھینچنے لگا۔دائیں بائیں کی پہاڑیوں کی نشاندہی کر کے میں انھیں تفصیل سے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔میرے منصوبے کا لب لباب یہ تھا کہ میں ایک اونچی پہاڑی پر مورچہ پکڑ کر دشمن کے آدمیوں کو چن چن کر نشانہ بناتا۔اس دوران ضلع خان کے آدمی اس پہاڑی کو گھیرے میں لے کر مجھے حفاظت مہیا کرتے رہتے تاکہ دشمن وہاں اپنے آدمی بھیج کر مجھے نقصان نہ پہنچا سکتا۔اسی طرح ہیلی کاپٹرز کے خلاف وہ ساتھ والی پہاڑی پر 12.7 گنیں لگا کر ان کی مدد سے ہیلی کے خلاف کارروائی کر سکتے تھے

ضلع خان بولا۔''منصوبہ تو بہت اچھا ہے مگر اس طرح ہم میں سے ایک بھی نہیں بچے گا۔اگر دشمن کو ہماری پوزیشن واضح ہو گئی تو بمباری کر کے تمام پہاڑی کو سرمہ بنا ڈالے گا۔اور پھر تین چار کوبرا ہیلی کاپٹرز کو دو گنوں سے تباہ نہیں کیا جا سکتا۔وہ یہاں ڈرون بھی مار سکتے ہیں،جنگی جہاز بھی بھیج سکتے ہیں،اس لیے یہ منصوبہ قابل عمل نہیں ہے۔ہم بس چھاپہ مار کارروائیاں کر سکتے ہیں۔ایک جگہ پوزیشن سنبھال کر مقابلہ کرنے میں ہمارا سراسر نقصان ہے کیونکہ دشمن کے پاس بہت زیادہ وسائل موجود ہیں۔''

وہ کافی عرصے سے وہاں برسرپیکار تھے اور انھیں مجھ سے کئی گنا زیادہ تجربہ تھا۔اس لیے میں بحث میں پڑے بغیر بولا۔''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

ضلع خان بولا۔''آپ اس سناپئر کا بندوبست کردیں اس سے جان چھوٹنے کے بعد ہم اپنے طریقے سے کارروائیاں کرتے رہیں گے۔''

''تو نک سٹیورٹ کوئی اکیلا سناپئر تو نہیں ہے۔''

ضلع خان اطمینان سے بولا۔''صحیح کہا،مگر اس جیسا اچھا نشانے باز اتنی آسانی سے انھیں دوسرا نہیں ملے گا۔باقی تربیتی کیمپ میں ہم نے اپنے مخصوص آدمیوں کو نشانہ بازی کی تربیت دینا شروع کردی ہے جلد ہی ہمیں بھی اچھے سناپئر مل جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔''میں فوراً اس سے متفق ہوگیا تھا۔یوں بھی میں خواہ مخواہ ہی اس بکھیڑے میں پھنس گیا تھا۔مجھے واپس جا کر بہت سارے کام نبٹانا تھے اور میں افغانستان میں کسی اور کے مسائل میں الجھا تھا۔یہاں جتنے کام میں کر چکا تھا سارے غیر قانونی تھے۔پاک آرمی کا قانون مجھے کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔اب بھی میں جو کچھ کر رہا تھا چوری چھپے ہی کر رہا تھا۔اگر کسی سینئر کو معلوم ہو جاتا تو مجھے سزا ملتے دیر نہ لگتی۔

رات کو بستر پر لیٹتے وقت میں عبدالحق سے اگلے دن کے لائحہ عمل کے بارے بات چیت کرتا رہا۔تھکے ہونے کی وجہ سے ہم زیادہ دیر گپ شپ نہیں لگا سکے تھے۔صبح ناشتے کے بعد میں اس کے ہمراہ اس مخصوص پہاڑی کی جانب روانہ تھا جسے میں نے کل چنا تھا۔ضلع خان کے ہاتھوں دشمنوں کے دو ریڈیو سیٹ لگے تھے ایک کی بیٹری نکال کر ہم نے اضافی بیٹری کے طور پر ساتھ لے لی تھی۔ضلع خان کے آدمیوں سے رابطے کے لیے ہمارے پاس آئی کام بھی موجود تھا۔کل جس پہاڑی پر میں نے نک سٹیورٹ اور لورا براؤن کو پھنسایا تھا وہ ہمارے رستے ہی میں پڑ رہی تھی۔اپنے ساتھیوں کی لاشیں تو وہ اٹھا کر لے گئے تھے،البتہ گاڑھا خون اب تک بکھرا تھا۔میں نے عبدالحق کو وہ دو پتھر بھی دکھائے تھے جس کے عقب میں لورا براؤن اور نک سٹیورٹ نے آڑ لیے رکھی تھی۔

اس پہاڑی کو عبور کرنے کے بعد میں نے کمانڈر عبدالحق کو محتاط رہنے کا مشورہ دے دیا تھا۔دشمنوں کے ٹھکانے اور ہمارے درمیان ایک اور اونچی پہاڑی حائل تھی لیکن پھر بھی احتیاط بہت ضروری تھی،کیوں کہ وہ جگہ

دشمن کے ٹھکانے سے دیکھی جا سکتی تھی اور پھر نک سٹیورٹ جیسا نشانے باز بھی دشمن کی صفوں میں موجود تھا۔ چھپتے چھپاتے درختوں کے تنوں، جھاڑیوں اور پتھریلی چٹانوں کی آڑ لیتے ہم آخر کار پہاڑ کی بلندی پر پہنچ ہی گئے تھے ۔وہاں سے دشمن کے ٹھکانے کا ہوائی فاصلہ بارہ تیرہ سو میٹر تھا۔جس جگہ گزشتہ کل میں نے نک سٹیورٹ کو پھنسایا تھا اس جگہ کا دشمنوں کے ٹھکانے سے فاصلہ انیس سو میٹر کے بہ قدر تھا۔

سب سے پہلے جھاڑیوں کے درمیان ہم نے اپنے لیٹنے کی جگہ بنائی ۔یوں کہ وہاں ہم نہ صرف دشمن کی نظروں سے چھپ سکتے تھے بلکہ سامنے سے ہونے والی فائرنگ سے بھی بچ سکتے تھے۔رائفل کو تیار کر کے ہم بھی وہاں لیٹ گئے ۔دشمن کے ٹھکانے کا جائزہ لینے پر ہمیں کوئی چہل پہل نظر نہیں آ رہی تھی ۔لازمی طور پر نک سٹیورٹ اور لورا براؤن نے انھیں آڑ میں رہنے کی سختی سے احکامات دیے ہوں گے۔ریڈیو سیٹ پر بھی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

عبدالحق نے پوچھا۔’’ہم کب تک یہاں چھپے رہیں گے۔‘‘

میں مسکرایا۔’’اب وقت کی گنتی بھول جاؤ، یہاں سے مر کر یا مار کر ہی واپسی ہوگی۔‘‘

کمانڈر عبدالحق فلسفیانہ لہجے میں بولا۔’’مجھے لگتا ہے ایک سنائپر کا ساتھ چن کر میں نے اپنے لیے خواری دیکھ لی ہے۔‘‘

میرے کھل کھلانے پر وہ دوبارہ بولا۔’’جانتے ہو سب سے مشکل کام انتظار کرنا ہوتا ہے۔اور ایسا انتظار جس کا پھل ملنے کی امید کم ہی ہو وہ طبیعت پر اور بھی گراں گزرتا ہے۔‘‘

میں نے کہا۔’’یہی سنائپر کی زندگی ہے۔اور ایسی زندگی ہر کوئی نہیں گزار سکتا۔‘‘

گپ شپ کرتے ہوئے بھی ہماری نظریں ہدف کی تلاش میں سرگرداں رہیں ۔اس دوران ہمیں تھوڑی بہت حرکت بھی نظر آئی لیکن اب میں اپنے ہدف کے علاوہ کسی کو نہیں مارنا چاہتا تھا۔کیوں کہ کسی ایک آدمی کے مرتے ہی نک سٹیورٹ مزید چوکنا ہو جاتا۔

عبدالحق نے پوچھا۔’’ویسے اپنے ہدف کو پہچانیں گے کیسے؟‘‘

’’وہ زیادہ دیر یہاں چھپ کر نہیں لیٹے گا مجھے یقین ہے شکار کی تلاش میں وہ ضرور اپنے ٹھکانے سے نکلے گا

اور اس وقت اس کی پہچان ہو جائے گی۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں نا، جب اس کے ہمراہ اور آدمی بھی موجود ہوں گے تو کیسے اس کی پہچان ہو پائے گی؟"

"جس جگہ بھی وہ فائر کرنے کے لیے لیٹے گا ہمیں اندازہ ہو جائے گا۔"

کمانڈر عبدالحق کی سمجھ میں میرا فلسفہ آیا تھا یا نہیں لیکن اس نے دوبارہ اس متعلق سوال نہ پوچھا۔ دوپہر کو ہم نے ساتھ لایا ہوا کھانا کھایا اور پانی پی کر دوبارہ نگرانی کے لیے لیٹ گئے۔ کھانے کے بعد عبدالحق کو نیند آنے لگی تھی۔ اسے سو جانے کا مشورہ دے کر میں جاگتا رہا۔ یوں بھی ایسے مواقع پر سنائپر نیند کو اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔ میں گاہے گاہے ریڈیو سیٹ آن کر کے مختلف چینلز تبدیل کرتا رہا۔ کھانا کھانے کے بعد ان کی ذرا سی ٹرانسمشن میں سن پایا تھا، مگر وہ ان کے روزمرہ کے کاموں کے متعلق تھی۔ ان کی پانی لانے والی پارٹی کسی نزدیکی چشمے پر جا رہی تھی۔ اس پہاڑی پر صرف ایک ہی جانب اترنے کا راستہ موجود تھا اور وہ راستہ ہماری نظر میں تھا۔ پانی لانے والی پارٹی میری نظروں کے سامنے ہی نیچے گئی تھی اور انھیں میں آسانی سے نشانہ بھی بنا سکتا تھا، لیکن اب میں کسی غیر اہم آدمی کی لاش گرا کر نک سٹیورٹ کو مزید چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سہ پہر کو عبدالحق کی آنکھ کھلی اور اسے میں نے مشرقی جانب کی ڈھلان پر رات گزارنے کی جگہ ڈھونڈنے کے لیے بھیج دیا۔

اندھیرا چھانے سے پہلے ہی اس نے ایک غار ڈھونڈ لیا تھا۔ اور کافی ساری خشک لکڑیاں اس نے غار کے اندر اکٹھی کر دی تھیں۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی میں اس کے ہمراہ غار میں پہنچ گیا۔ چونکہ دشمن ہم سے مغربی جانب کی پہاڑی پر موجود تھا اس لیے ہم نے بے فکری سے آگ جلائے رکھی۔ عبدالحق دن کو اچھی خاصی نیند لے چکا تھا اس لیے اس نے مجھے سو جانے کا مشورہ دیا۔ رات کے دو اڑھائی بجے تک وہ جاگتا رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے جگا کر سو گیا۔

میں اچھی خاصی نیند لے چکا تھا۔ عبدالحق نے قہوہ بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ گرم قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے میرے دماغ میں اسی کی یاد تھی جو کبھی بھولی نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کہاں تھی۔ کبھی کبھی میرے دماغ میں بہت زیادہ ہولناک خیالات جنم لیتے جنھیں جھٹکنا بھی مشکل ہو جاتا۔ اس وقت بھی میرے دماغ میں اس کی گلا کرتی ہوئی

آواز گونج رہی تھی۔

”راجو، کہاں غائب ہو گئے ہو۔ کب آؤ گے میرے پاس۔ میں سختی سے منتظر ہوں راجو جلدی لوٹ آؤ۔“

میں اس کے پاس نک سٹیورٹ والا معاملہ نبٹا کر ہی جا سکتا تھا۔ پلوشے کی حسین یادوں کو زبردستی دور جھٹک کر میں موجودہ صورت حال سے نبٹنے کا طریقہ سوچنے لگا۔ صبح تک میں ایک قابل عمل منصوبہ سوچ چکا تھا۔ پانی کا چشمہ غار سے ذرا ہی نیچے تھا۔ ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے میں نے ہموار جگہ پر چادر بچھا کر نماز پڑھی۔ میرے سلام پھیرنے تک عبدالحق بھی وضو کر کے پہنچ گیا تھا۔ میں غار کی طرف بڑھ گیا۔ سورج طلوع ہونے میں تھوڑی دیر تھی لیکن اردگرد کے مناظر صاف ہو گئے تھے۔ میں جھولے سے لیزر رینج فائینڈر نکال کر بلندی پر پہنچ گیا۔ اور جو منصوبہ بنایا تھا اس کے مطابق پہاڑیوں کا فاصلہ ناپنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں کمانڈر عبدالحق کو تمام منصوبہ سمجھا رہا تھا۔

”آپ نے اس سرخ پہاڑی پر پہنچنا ہے۔“ اس پہاڑی کی مٹی کا رنگ سرخی مائل تھا اس لیے وہ دور سے سرخ ہی نظر آتی تھی اور تمام اسے سرخ پہاڑی ہی کہتے تھے۔ ”سرخ پہاڑی سے دشمن کا ٹھکانہ تو دو کلومیٹر سے زیادہ دور ہے لیکن جہاں سے وہ پینے کا پانی بھرتے ہیں وہ جگہ پانچ چھے سو میٹر سرخ پہاڑی کی طرف واقع ہے اور نشیب میں بھی ہے۔ اس لیے سرخ پہاڑی سے آپ ان کے پانی بھرنے والوں کو نشانہ بنا سکتے ہیں۔ اگر چشمے کا فاصلہ سرخ پہاڑی سے دو کلومیٹر سے زیادہ بھی ہوا تب بھی اپ ہل، ڈاؤن ہل فارمولے کے تحت آپ آسانی سے وہاں سے فائر کر سکیں گے۔ اب آپ کی سرکوبی کے لیے نک کو لازماً اس اونٹ کی کوہان نما پہاڑی پر جانا پڑے گا کہ اس سے ایک تو سرخ پہاڑی اس کی رینج میں ہو گی دوسرا کوہان شکل کی پہاڑی پر جانے کے لیے اسے رستے میں کوئی خاص خطرہ بھی درپیش نہیں ہو سکتا۔ سب سے بڑھ کر دونوں پہاڑیوں کی بلندی برابر ہے جو نک کو مزید مذکورہ پہاڑی کی طرف مائل کرے گی۔“

عبدالحق صاف گوئی سے بولا۔ ”میرے دماغ میں کافی سوال اٹھ رہے ہیں۔“

میں اطمینان سے بولا۔ ”باری باری پوچھنا شروع کر دو۔“

”آپ کا کیا خیال ہے میں سنائپر رائفل سے اتنا کامیاب فائر کر لوں گا۔“

''کامیاب فائر کی ضرورت ہی نہیں ہے، بس وہاں پر اپنی موجودی کو ظاہر کرنا ہے۔ پانی بھرنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی گولی لگ گئی یا انھیں اتنا ہی معلوم ہو گیا کہ ان پر گولیاں چلائی جا رہی ہیں تو سمجھو کام بن گیا ۔باقی آپ نے سنائپر رائفل کے متعلق پچھلے دنوں مجھ سے کافی کچھ سیکھا ہے، سات آٹھ سو میٹر تک ہدف کو بھی نشانہ بنایا ہے اب آپ کو بلندی سے نشیب میں فائر کرنے کا فارمولا سمجھا دوں گا یہ اتنا مشکل نہیں ہے۔''جن دنوں مجھے گولی لگی تھی تب گردیز کیمپ سے چار آدمی صغیر، احسان، اسلم اور مبین سنائپر رائفل کے متعلق سیکھنے آئے تھے۔وہ چاروں بعد میں نک کا شکار بن کر شہید ہو گئے تھے۔انھی کے ساتھ کمانڈر عبدالحق بھی رینج ماسٹر کے متعلق سیکھتا رہا تھا۔

اس نے اگلا سوال پوچھا۔''نک اِس پہاڑی پر بھی تو آ سکتا ہے۔''

''اس طرح تو میرا کام اور آسان ہو جائے گا، مگر وہ یہاں آئے گا نہیں کیوں کہ یہاں سے سرخ پہاڑی کا فاصلہ زیادہ بنتا ہے۔اسی طرح نک، چشمے والی جگہ سے بھی فائر کر سکتا ہے۔اور کوئی بے وقوف سنائپر ہی ہو گا جو بلندی پر موجود سنائپر کے ساتھ نشیب میں مورچہ بنا کر لڑائی کرے، جبکہ میرے خیال کے مطابق وہ بے وقوف نہیں ہے۔اور بالفرض وہ چشمے والی جگہ ہی سے فائر کرتا ہے تب بھی میرے لیے زیادہ فائدہ ہے۔''

''اس ساری تگ و دو کا مطلب؟''اس کے سوال جاری تھے۔

''اسے بل سے نکالنا۔یونھی لیٹے لیٹے ہم کب تک اس کا انتظار کریں گے۔اور دشمن کو منصوبہ بنانے کا موقع دینے کے بجائے اسے اپنی مرضی کے میدان میں لانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔''

''یہاں سے کوہان کی شکل والی پہاڑی کا فاصلہ کتنا ہے؟''

میں نے کہا۔''پچیس سو میٹر۔''

''تو وہاں پر انھیں کیسے نشانہ بناؤ گے؟''اس نے حیرانی ظاہر کی۔

''وہاں پہنچنے سے پہلے وہ اس نالے میں میرا نشانہ بنیں گے جہاں وہ بھاگ کر کہیں پناہ نہیں لے سکتے۔میرا مطلب میں انھیں آڑ پکڑنے سے پہلے قتل کر دوں گا۔''

''اس نالے سے تو وہ پہاڑی زیادہ نزدیک ہے۔''اس نے نک سٹیورٹ کے گزشتہ روز والے ٹھکانے کا

ذکر کیا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔''ہاں مگر اس بحث کو رہنے دو۔''

''واپس ٹھکانے پر پہنچنا اور وہاں سے دوسری سنا ئپر رائفل اٹھا کر سرخ پہاڑی پر دشمن کے پانی لانے والی پارٹی سے پہلے پہنچنا ذرا مشکل دکھائی دیتا ہے۔''

''وہ ضلع خان کے آدمی اپنے ٹھکانے سے اٹھا کر سرخ پہاڑی پر پہنچیں گے۔آپ یہیں سے سرخ پہاڑی کا رخ کریں گے۔آپ کو وہاں پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ تین، ساڑھے تین گھنٹے لگیں گے۔یعنی دن کے دس بجے سے پہلے آپ وہاں ہوں گے۔اور دشمن کی پانی پارٹی قریباً گیارہ بارہ بجے چشمے کا رخ کرتی ہے۔''

''میں تیار ہوں۔''اس نے انگوٹھا اٹھا کر اشارہ کیا۔

رینج ماسٹر کے متعلق اسے یوں بھی کافی کچھ پتا تھا۔اپ ہل، ڈاؤن ہل فائر کے متعلق ضروری باتیں بتا کر میں نے اسے رائفل کی بیرل کے ساتھ زاویہ پیما لٹکا کر بلندی سے نشیب کا زاویہ ناپنے کا طریقہ سمجھا دیا۔اس کے بعد میں اسے ضروری احتیاطوں کے بارے ایک بار پھر ہدایات دیں اور جانے کا اشارہ کر دیا۔آئی کام سیٹ ہمارے پاس ایک ہی تھا اس لیے وہ میں نے اپنے پاس رکھ چھوڑا تھا۔کمانڈر عبدالحق کے لیے ضلع خان کے آدمیوں نے دوسرا آئی کام سیٹ لانا تھا۔

اسے روانہ کر کے میں نے ضلع خان سے رابطہ کر کے پوچھا۔

''کمانڈر، آپ کے پاس ڈریگنو رائفل موجود ہے نا۔''

''موجود ہے۔''اس کا اثباتی جواب سن کر میں نے کہا۔''ایک ڈریگنو رائفل اور ایک رینج ماسٹر..........''میں اسے مختصر الفاظ میں ضروری ہدایات دینے لگا۔اس سب سے فارغ ہو کر میں بہتر فائر کرنے کے لیے اپنے مورچے میں مناسب تبدیلیاں کرنے لگا۔گھنٹے ڈیڑھ بعد میں رینج ماسٹر کے پیچھے لیٹ کر علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔نا معلوم میرا منصوبہ کامیاب ہوتا بھی تھا یا نہیں۔لیکن یونھی ہاتھ پیر ہلائے بغیر لیٹا رہنا بھی تو مناسب نہیں تھا۔

پونے دس بجے کمانڈر عبدالحق نے مجھے اپنی جگہ پر پہنچ جانے کا مژدہ سنا دیا تھا۔اس کے ساتھ ہی ضلع خان

کے بہروز نامی آدمی نے بھی اپنے جگہ پر پہنچ جانے کی اطلاع دی تھی۔اب ہمیں دشمن کی پانی والی پارٹی کا انتظار کرنا تھا۔

میں ٹیلی سکوپ سائیٹ میں دشمن کے ٹھکانے کا جائزہ لیتا رہا۔ساڑھے دس بجے کے قریب مجھے پانچ آدمی نیچے اترتے دکھائی دیے۔یہ پانی والی پارٹی تو اس لیے نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ ایک جیپ میں نیچے جاتے تھے اور یہ پانچوں پیدل جارہے تھے۔دو آدمیوں نے اپنی پیٹھ پر جھولے بھی لادے ہوئے تھے۔مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ نک سٹیورٹ اس پارٹی کا حصہ ہے۔ان کے ریڈیو سیٹ پر کوئی ٹرانسمشن نہیں ہورہی تھی۔میں مختلف چینل تبدیل کر کے ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتا رہا۔

ان کے ٹھکانے تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا۔لیکن پہاڑی کی نصف بلندی پر ایک ہموار پہاڑی تھی جہاں سے مختلف اطراف میں جایا جاسکتا تھا۔اسے ان کے ٹھکانے کا بیس کہا جاسکتا ہے۔بیس سے پانی کا چشمہ شمال کی جانب نشیب میں موجود تھا۔ان کا رخ جنوب کی طرف ہوگیا تھا۔نشیب میں اتر کر وہ ایک نالے میں پہنچ جاتے ۔وہ نالہ کافی چوڑا اور کھلا تھا۔اگر مجھے مکمل یقین ہوتا کہ وہ نک سٹیورٹ ہی کی پارٹی ہے تو انھیں نالے میں گھیرا جا سکتا تھا۔اور یقیناً اس دن میری قسمت عروج پر تھی کہ اچانک ایک فریکونسی پر مجھے لورا براؤن کی آواز سنائی دے گئی۔وہ کمانڈر مبین کو مخاطب تھی لیکن آج وہ صاف گفتگو کے بجائے کوڈ ورڈز میں بات کر رہی تھی۔اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ ہمیں اپنی بات نہیں سمجھنے دینا چاہتے تھے۔

وہ مبین سے پوچھ رہی تھی۔”ٹو ون بات ہوگئی ہے۔اوور......“

مبین نے جواب دیا۔”یس میڈم، تین تھرماس بھیج دیں گے۔اوور......“اب پتا نہیں وہ تھرماس کیا بلا تھی۔ کیونکہ وہ چائے والے تھرماس تو ہو نہیں سکتے تھے۔

”کافی ہیں، میں اپنی جگہ پہنچتے ہی تمھیں مطلع کر دوں گی۔اوور......“

”میڈم، انڈے دو درجن ہی ملیں گے۔اوور......“

”گزارا ہو جائے گا، اتنے ہی پرانے انڈے بھی تو موجود ہوں گے۔اوور......“شاید وہ ہینڈ گرنیڈ کو انڈے کہہ رہے تھے۔یہ بھی ممکن تھا انڈوں سے مراد کوئی مخصوص ہتھیار ہو۔وہ آدمی بھی ہوسکتے تھے۔میرا ذہن مختلف

اندازے لگاتا رہا۔نالے میں اتر کر وہ پانچوں بڑے آرام سے ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھنے لگے۔لورا براؤن،مبین کو بتا رہی تھی کہ وہ نالے میں پہنچ گئے ہیں۔ان کے جانے کا انداز دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا۔یقیناً وہ نک سٹیورٹ کی پارٹی نہیں تھی۔وہ اصل میں میرے لیے پھینکا گیا چارہ تھا۔کیونکہ لورا براؤن مختلف انداز میں بار بار ریڈیو سیٹ پر یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ نالے میں آگے بڑھ رہے ہیں اور انھیں کوئی حرکت دکھائی نہیں دے رہی۔

میں خاموشی سے ان کی بات چیت سنتا رہا۔آدھا پون گھنٹا نالے میں پھرنے کے بعد وہ پارٹی واپس لوٹ آئی تھی۔وہ لوگ بیس سے اوپر کا رخ کر رہے تھے۔اوپر سے پانی والی جیپ اترتی دکھائی دی۔دس منٹ بعد جیپ چشمے پر پہنچ گئی تھی۔اور پھر جیپ کے وہاں پہنچنے کے دو منٹ بعد سرخ پہاڑی کی جانب سے فائر کرنے کی ہلکی سی آواز آئی۔میں اگر پوری طرح اس طرف متوجہ نہ ہوتا تو شاید وہ آواز نہ سن پاتا۔عبدالحق کے پاس موجود رینج ماسٹر پر سائیلنسر نہیں لگایا تھا کیوں کہ ہمارا مطمح نظر ہی دشمن کو اپنی جگہ سے آگاہ کرنے کا تھا۔فائر کے ساتھ ہی چشمے والی جگہ پر ہل چل مچ گئی تھی۔میں مسلسل مختلف چینل تبدیل کر کے ان کی بات چیت سننے کی کوشش میں تھا۔میری کوشش جلد ہی کامیاب ہو گئی تھی۔چشمے پر موجود دشمن کے آدمی اپنے زخمی ہونے والے آدمی کی رپورٹ دے رہے تھے۔

''فوراً پتھروں کی آڑ لے کر اندازہ لگاؤ کہ فائر کس طرف سے آیا ہے۔اوور......'' کمانڈر مبین نے انھیں ایسا حکم دیا جس پر وہ پہلے سے عمل پیرا ہو چکے تھے۔

''ہم آڑ میں ہیں کمانڈر اور فائر سامنے سرخ پہاڑی پر سے آ رہا ہے۔اوور......''

''ٹھیک ہے وہیں آڑ میں پڑے رہو۔اگلے حکم تک کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔اوور اینڈ آل۔'' ریڈیو سیٹ پر خاموشی چھا گئی تھی۔

اسی وقت فائر کے دو ہلکے ہلکے دھماکے ہوئے۔یقیناً عبدالحق ابھی تک فائر کرنے میں لگا ہوا تھا۔میں دشمن کے ٹھکانے کی طرف متوجہ رہا۔ایک تیز رفتار جیپ اوپر سے اترتی نظر آئی۔بیس پر آ کر جیپ رک گئی تھی۔چار آدمی جیپ سے باہر نکلے وہ جگہ ایسی تھی کہ میں صرف ایک آدمی کو کامیابی سے نشانہ بنا پاتا اور باقیوں کو چھپنے کا

موقع مل جاتا۔

دو آدمیوں نے اپنی پیٹھ پر جھولے لادے اور چاروں بیس کے غربی اور ان کے اپنے ٹھکانے کے شرقی جانب موجود ڈھلان میں اتر کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ میرے اندازے کے مطابق انھوں نے اس نالے میں چلتے ہوئے چشمے والی جگہ کو پیچھے چھوڑ کر اگلے نالے میں نمودار ہونا تھا۔ وہ بھی کافی وسیع نالہ تھا لیکن وہ جگہ سرخ پہاڑی سے نظر نہیں آتی تھی۔ مجھ سے اس جگہ کا فاصلہ اپ ہل، ڈاؤن ہل فارمولے کے مطابق انیس سو میٹر بنتا تھا اور گزشتہ روز جس جگہ نک سٹیورٹ نے ٹھکانہ بنایا تھا اس پہاڑی سے وہ مقام چودہ پندرہ سو میٹر سے زیادہ نہیں بن رہا تھا۔ اگر میں اس جگہ ہوتا تو زیادہ آسانی انھیں نشانہ بنا سکتا تھا، مگر میں نے جان بوجھ کر اس پہاڑی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اور کیوں نظر انداز کیا تھا اس متعلق آپ لوگوں کو بعد میں معلوم ہو جائے گا۔ اگر وہ اس نالے کو عبور کر کے کوہان کی شکل والی پہاڑی کے دامن میں پہنچ جاتے تب بھی میری رینج سے باہر نکل جاتے۔

جلد ہی مجھے اپنا اندازہ درست ہوتا نظر آیا، وہ چاروں بغلی نالے سے نکل کر اس وسیع نالے میں نمودار ہوئے۔ چاروں ایک سیدھی قطار میں چلنے کے بجائے پھیل کر آگے بڑھ رہے تھے اور اس طرح میرا کام اور زیادہ آسان ہو گیا تھا۔ اتنی دور سے بھی ایک آدمی کے کندھوں سے نیچے تک پھیلے ہوئے بال ظاہر کر رہے تھے کہ وہ لورا براؤن ہے۔ دو آدمیوں کی پیٹھ پر جھولے لدے تھے یقیناً وہ معمولی آدمی تھے۔ اب پیچھے صرف ایک آدمی بچ رہا تھا۔ اور کوئی شک نہیں کہ وہی نک سٹیورٹ تھا۔ یوں بھی اس وقت میں چاروں کو باری باری نشانہ بنا سکتا تھا۔ سر میں گولی مارنے کے بہ جائے میں نے اس کی ٹانگ پر نشانہ سادھا اور ٹریگر دبا دیا۔ وہ فوراً منھ کے بل گرا تھا۔ لمبے بالوں والی یقیناً لورا تھی وہ اسے سنبھالنے کے لیے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس کے ہاتھ میں مجھے ریڈ سیٹ نظر آیا اور اگلے ہی لمحے اس کی گھبرائی ہوئی آواز مجھے سنائی دی۔ ”موبن، نک کو ٹانگ میں گولی لگ گئی ہے۔ اوور......“

”ہائے بے بی۔“ مبین سے پہلے میں نے بٹن دبا کر اسے پکارا۔ ”ذرا نک سے تو بات کراؤ، کہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی۔“

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”تت......تم کہاں پر ہو۔“

''کم از کم سرخ پہاڑی پر نہیں ہوں......اور اگر مجھے ملنا چاہتی ہو تو ٹھیک جس جگہ بیٹھی ہو وہاں سے ناک کی سیدھ میں چلتی آؤ مجھ سے ملاقات ہو جائے گی۔اوور......''

وہ گڑگڑائی۔''پپ......پلیز نک کو چھوڑ دو۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔''رقیب کو کون زندہ چھوڑتا ہے بے بی۔باقی اس احمق نک کو کہو کہ کیا میں اتنا گیا گزرا ہوں جو چشمے پر موجود شخص کے سر میں گولی نہ مار سکتا۔اس وقت بھی میں نے جان بوجھ کر اسے ٹانگ میں گولی ماری ہے تاکہ اسے تڑپا سکوں۔اوور......''

اس کی شکست خوردہ آواز ابھری۔''کھان، میں ہار تسلیم کرتی ہوں واقعی میں تم نے بہت خوب صورتی سے ہمیں گھیرا۔اوور......''

''کوشش تو تم لوگوں نے بھی کی تھی، مگر نہایت ہی بھونڈے طریقے سے۔اوور......''

اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔''کیا مجھے زندہ چھوڑ دو گے۔''

میں بے نیازی سے بولا۔''کیا کہہ سکتا ہوں، ویسے پہلے نک کا تو بندوبست کر دوں نا۔اوور......''

''تت......تم مجھے نظر نہیں آ رہے۔میں مرنے سے پہلے تمھیں دیکھنا چاہتی ہوں۔اوور......''

میں ہنسا۔''اتنی دور سے کیسے دیکھو گی؟اوور......''

''تم بس اپنی جگہ پر ایک بار اٹھ کر دکھا دو، مرنے سے پہلے میں اپنی آخری حسرت پوری کرنا چاہتی ہوں۔اوور......''

اس کی حسرت بھری آواز سن کر میں نے کہا۔''اچھا، اپنی آنکھوں سے دوربین لگا کر دیکھو، میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو رہا۔اوور......''یہ کہتے ہوئے میں نے آئی کام سیٹ اپنے قریب کر لیا تھا۔

ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد میں نے پوچھا۔''دیکھ لیا۔''

''ہاں دیکھ لیا۔''اس مرتبہ لورا کے بجائے نک سٹیورٹ کی آواز ابھری تھی۔''اور جانتے ہو اب تم میرے نشانے پر ہو۔میں واقعی اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ اپنے آدمی کی ٹانگ میں لگنے والی گولی کو تم سے منسوب کرتا۔اور اب تم اپنی جگہ سے ہل کر دکھاؤ تاکہ میں تمھیں اپنا نشانہ دکھا سکوں۔اوور......''

میں نے کہا۔ ’’تم دونوں اب بھی میرے نشانے پر ہو۔اوور......‘‘

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ’’بے وقوف نہ وہ لورا ہے اور نہ مجھے گولی لگی ہے......اب یہیں لیٹ کر تھر ماس، میرا مطلب کوبروں کا انتظار کرو۔اتنا تو تمھیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ کتنے تھر ماس آرہے ہیں۔اوور......‘‘

’’تت......تم جھوٹ بول رہے ہو۔‘‘ میں ہکلا گیا تھا۔

اس نے قہقہہ لگایا۔’’اس بات کی تصدیق تم اپنا سر آڑ سے نکال کر کر سکتے ہو۔اوور......‘‘

میں ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔نالے میں موجود زخمی کو لمبے بالوں والا سہارا دے کر آڑ کی طرف لے جا رہا تھا۔میں نے انھیں یونھی جانے دیا تھا۔

مجھے چپ دیکھ کر وہ دوبارہ بولا۔ ’’تم ایشیائی لوگ بس لڑکی کے ذرا سا توجہ دینے پر احمقوں کی طرح ردعمل ظاہر کرنا شروع کر دیتے ہو۔بہ ہر حال تمھیں مرنے سے پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمھاری نشانہ بازی نے مجھے متاثر کیا ہے۔اور تم پہلے نشانہ باز ہو جس سے مجھے ڈر لگنے لگا تھا۔بہ ہر حال اب چناؤ تمھارے ہاتھ میں ہے ،کوبروں کی گنوں سے مرنا چاہتے ہو یا مجھے یہ موقع دو گے۔اوور......‘‘

میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔’’لورا کہاں ہے؟‘‘

’’نک کے ساتھ ہی ہوں بے بی۔‘‘ وہ ہنسی۔’’سوری کہ اب تم میری ڈیٹ والی آفر سے فائدہ نہیں اٹھا سکو گے۔اوور......‘‘

’’اگر میں کہوں کہ اب میں تمھیں مرنے سے پہلے دیکھنا چاہتا ہوں تو۔اوور......‘‘ میرے لہجے میں شامل حسرت یقیناً اس کے لیے انوکھی نہیں تھی۔

’’اس نے قہقہہ لگایا۔’’ہاں تاکہ تم فوراً مجھے گولی مار سکو، میں جانتی ہوں کہ میں تمھاری رینج میں ہوں ۔اوور......‘‘

میں نے فوراً کہا۔’’وعدہ کرتا ہوں تمھیں گولی نہیں ماروں گا۔اوور......‘‘

وہ بے یقینی سے بولی۔’’میں تم پر کیوں اعتبار کروں۔اوور......‘‘

’’تم جانتی ہو ہم مسلمان اللہ پاک کا نام لے کر جھوٹ نہیں بولتے۔تم اپنے سر سے ٹوپی اتار کر کھڑے ہو کر

اپنے زلفوں کی جھلک دکھا دو۔ اللہ پاک کی قسم تمھیں گولی نہیں ماروں گا۔ اوور......‘‘

اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ’’میری زلفیں دیکھ کر کیا کرو گے۔ اوور......‘‘

’’ایک حسرت تھی دل میں اگر پوری کر دو، باقی دوبارہ قسم کھاتا ہوں تمھیں گولی نہیں ماروں گا، میرا مقابلہ تو نک کے ساتھ ہے نا۔ تھوڑی دیر پہلے جو نقلی لورا مجھے نظر آئی تھی اس پر بھی میں نے گولی نہیں چلائی تھی۔ اوور......‘‘

’’میں جانتی ہوں کہ میرا کھڑا ہونا حماقت ہے، لیکن میں تم پر اعتبار کر کے کھڑی ہو رہی ہوں۔‘‘ اس کے ساتھ ہی اپنے سر سے ٹوپی اتار کر وہ زلفیں بکھرائے کھڑی ہو گئی۔

’’بس اسی طرح کھڑی رہو میں تھوڑی دیر تمھیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر گولی چلانا ہوتی تو اب تک چلا چکا ہوتا، تم جانتی تو ہو نا میں کتنا تیز فائرر ہوں۔ اس کے ساتھ میں نک سٹیورٹ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں بھی تم متاثر ہوں دوست۔ اور مرنے سے پہلے جان لو کہ تم نے ایس ایس سے پنگا لینے کی کوشش کی تھی۔ گڈ بائی......‘‘ اتنا کہتے ہی میں نے ٹریگر دبا دیا۔ رینج ماسٹر کی گولی کا تیرہ سو میٹر کے فاصلے پر ضائع ہونے کا مطلب سنائپر کی نالائقی ہی ہو سکتی ہے اور میرے استادوں کے خیال میں میں نالائق نہیں ہوں۔ نک سٹیورٹ کی کھوپڑی کا دایاں حصہ اڑ گیا تھا۔

شاید قارئین کی سمجھ میں یہ کہانی نہ آئی ہو۔ میں وضاحت کر دیتا ہوں۔ کمانڈر عبدالحق کو بھیجتے وقت مجھے یقین تھا کہ اس کا فائر اتنا پختہ نہیں ہے کہ وہ لمبے فاصلے پر کسی کے سر میں گولی مار سکے۔ اور یقیناً اگر اس کی گولی خطا جاتی یا مضروب کو جسم کے کسی اور حصے میں لگتی تو اس بات پر نک سٹیورٹ چونک سکتا تھا۔ کیوں کہ اتنا تو اسے بھی معلوم تھا کہ اس کے مقابل کوئی ٹٹ پونجیا سنائپر نہیں تھا۔ اب یہاں دو احتمال تھے یا تو وہ اس بات کو خاطر میں نہ لاتا اور کوہان کی شکل کی والی پہاڑی کی طرف دوڑ پڑتا۔ کیوں وہیں سے وہ سرخ پہاڑی پر موجود سنائپر کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں میں اسے نالے ہی میں گھیر لیتا بالکل اس طرح جیسے نقلی نک اور لورا کو گھیرا تھا۔ دوسرا احتمال یہ تھا کہ شک پڑ جانے پر وہ مجھے گھیرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ اس نے کی۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اس کی نگاہ اسی پہاڑی پر پڑنا تھی جہاں وہ گزشتہ روز پہنچا تھا۔ کیوں اسی جگہ سے کوہان کی شکل والی پہاڑی کے نالے کو بہت اچھی طرح سے رینج میں لایا جا سکتا تھا۔ اور ایک بار اسے میرے مورچے کی جگہ معلوم ہو جاتی اس کے

بعد وہ بڑی آسانی سے مجھے گھیر سکتا تھا۔اس مقصد کے لیے اس کے پاس کو براہیلی کاپٹر منگوانے کی سہولت بھی موجود تھی۔اب میں جس پہاڑی پر موجود تھا اس جگہ سے اپ ہل، ڈاؤن ہل کے فارمولے کے تحت تونالے میں کارگر فائر گرایا جاسکتا تھا ویسے نہیں۔اور یقیناً جس نے سو فیصد درست فائر کرنا ہوتا وہ اس کے بجائے اول الذکر پہاڑی کا انتخاب کرتا۔مگر میں نے ایسا جان بوجھ کر نہ کیا اور ضلع خان کو کہہ کر دوسری پہاڑی پر دو آدمی ڈریگنو و رائفل کے ساتھ بھجوا دیے۔اور ضلع خان کو بتا دیا کہ ان کے پاس آئی کام سیٹ بھی ہونا چاہیے۔انھیں جس جگہ مورچہ بنانا تھا یہ انھیں میں نے یہیں سے بتا دیا تھا۔نقلی نک کو گولی لگتے ہی جب لورا نے میری جگہ کے بارے استفسار شروع کیا تبھی میں جان گیا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔اس کے استفسار نے میرا کام اور زیادہ آسان کر دیا تھا۔میں نے آئی کام پر ضلع خان کے آدمی بہروز کو بتایا کہ وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہو کر ہاتھ لہرائے اور پھر لیٹ جائے۔اس نے یونہی کیا اور نک سٹیورٹ کھل کر سامنے آ گیا۔اب جس جگہ بہروز موجود تھا وہ پہاڑی میرے شمالی جانب واقع تھی۔جبکہ نک کو وہ پہاڑی جنوب مشرق میں پڑتی تھی۔نک سٹیورٹ نے اس کے خلاف جب مورچہ سنبھالا تو وہ میرے مغربی جانب موجود تھا۔اس نے بہروز والی پہاڑی کی جانب سے اپنے سامنے آڑ پکڑی تھی میرے جانب اس کا دایاں بازو آرہا تھا۔اور جس جگہ میں موجود تھا وہاں سے وہ آسانی سے دکھائی بھی دے گیا تھا۔لیکن مسئلہ یہ آرہا تھا کہ لورا براؤن اس کے دائیں جانب بہ طور مددگار بیٹھی تھی۔اور اس کی وجہ سے میں نک کو براہ راست نشانہ نہیں بنا پارہا تھا۔تبھی میں نے لورا براؤن کو کھڑا ہونے پر اکسایا اور جونہی وہ کھڑی ہوئی نک سٹیورٹ کی کھوپڑی میرے نشانے پر آ گئی تھی۔

''ہیلو بے بی۔''میں نے دو تین دفعہ لورا براؤن کو پکارا جو، نک کی کھوپڑی اڑتے ہی ایک دم بیٹھ گئی تھی۔مگر نک اس کی ہر قسم کی مدد سے دور جا چکا تھا۔

''تم جیت گئے ایس ایس۔''خلاف توقع اس نے گالیاں نہیں بکیں تھیں۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''آج گالیوں کا برسٹ نہیں چلایا بے بی۔اوور......''

اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔''ایس ایس تم مجھے بھی مار سکتے تھے۔اوور......''

میں نے قہقہہ لگایا۔''ہاں مگر پھر ڈیٹ پر کس کے ساتھ جاتا۔اوور......''اب میں کیا بتاتا، کہ اسے مارنے کی

صورت میں نک سٹیورٹ نے کبھی ہاتھ نہیں آنا تھا۔اور میرا اصل شکار نک سٹیورٹ تھا وہ نہیں۔اسی وجہ سے تو مجھے قسم کھا کر اسے اٹھنے پر مجبور کرنا پڑا تھا۔البتہ نک کو قتل کرنے کے بعد میں اسے بھی گولی مار سکتا تھا،مگر مسلمان ہونے کے ناطے مجھے یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ میں اللہ پاک کی قسم کھا کر اس کے خلاف کرتا۔ایسا کم از کم مجھ سے نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ پھیکے سے لہجے میں بولی۔"سمجھ نہیں آتا شکریہ کہوں یا اپنے ساتھی کی موت کے غم تمھیں کوسوں۔"

"اگر میرا مشورہ مانتی ہو تو کل تک یہاں سے غائب ہو جانا۔شاید اس کے بعد سامنا ہونے پر مجھے ڈیٹ کا لالچ بھی نہ روک سکے۔باقی میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو رہا ہوں،تم مجھے دیکھ سکتی ہو۔پہلے میرا آدمی کھڑا ہوا تھا۔اور ہاں میں دوربین سے تم پر نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔اور جانتا ہوں کہ تم بھی سنائپر ہو اس لیے بدلہ لینے کو کسی اور وقت کے لیے مؤخر کر دو۔اور......" یہ کہہ کر میں اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا تھا۔وہ بھی کھڑی ہو کر میرے جانب ہی دیکھ رہی تھی۔اب اتنی دور سے مجھے اس کے چہرے پر چھائے تاثرات تو نظر نہیں آ رہے تھے کہ وہ غصے میں ہے یا خوش دکھائی دے رہی ہے۔نیچے جھک کر میں نے رینج ماسٹر کو اٹھا کر کندھے پر رکھا اور عقبی ڈھلان کی طرف بڑھ گیا۔اس کے پاس اتنا موقع نہیں تھا کہ وہ فاصلہ ناپ کر رینج لگاتی اور مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرتی۔یوں بھی وہ مجھ سے خوف زدہ تھی۔اس لیے اپنی جگہ پر کھڑی میری جانب گھورتی رہی۔

ڈھلان میں اترتے ہی میں نے جلدی جلدی رینج ماسٹر کو جھولے میں ڈالا اور بہروز اور عبدالحق کو کال کر کے انھیں فوراً ٹھکانے پر پہنچنے کا کہنے لگا۔کیونکہ کوبرے کسی وقت بھی پہنچ کر ہماری فتح کو شکست سے دوچار کر سکتے تھے۔چلتے ہوئے میں ان کے ریڈیو سیٹ کے چینل بھی تبدیل کرتا گیا۔ایک فریکونسی پر مبین پانی والی پارٹی کو واپس بلا رہا تھا۔اس کی تھکی تھکی آواز سن کر معلوم ہو رہا تھا کہ اسے نک سٹیورٹ کی موت کا کافی دکھ ہوا تھا۔لورا براؤن کی آواز مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

ساری کہانی کی ضلع خان اور عبدالحق کو سمجھ تو آ گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ بہت حیران بھی ہو رہے تھے۔ عبدالحق نے کہا۔

”یار، میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ آپ کو پہلے سے کیسے پتا چل گیا کہ وہ آپ کو سرخ پہاڑی کے بجائے کسی اور جگہ خیال کرے گا۔“

”کیوں کہ وہ سنائپر تھا۔اور اسے معلوم تھا کہ میرا نشانہ کیسا ہے۔تیسری بات یہ کہ وہ خود مجھے گھیرنے کی کوشش کر چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں ایسی کوشش کروں گا۔بس ایک جگہ پر وہ مار کھا گیا کہ اس نے یقینی طور پر مجھے اسی پہاڑی پر موجود سمجھ لیا تھا جہاں بہروز موجود تھا۔اور وہی پہاڑی ایسی تھی جہاں سے کوہان کی شکل والی پہاڑی کے نالے میں موجود کسی بھی آدمی کو بہت آسانی سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ورنہ جہاں میں موجود تھا اس کا فاصلہ بہ ظاہر اس نالے سے دو کلومیٹر سے زیادہ تھا۔میں تو بس اپ ہل ڈاؤن ہل کے فارمولے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کام کر گزرا۔باقی دشمن کا ٹھکانہ مسلسل میری نظر میں تھا اور میں منتظر تھا کہ کوئی مورچے میں بیٹھ کر اپنا سنائپر ہونا ظاہر کرے۔“

وہ تعریفی لہجے میں بولا۔”یار اتنی گہری چال، یقین کرو میرا تو سر چکرا گیا ہے۔“

میں نے کہا۔”بہ ہرحال، میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے اور اب میں واپس چلوں گا۔“

ضلع خان نے کہا۔”دوست آپ جب کہیں روانگی کا بندوبست ہو جائے گا۔البتہ چند دن خدمت کا موقع دیتے تو ہمیں خوشی ہوتی۔“

”کمانڈر، میں نے اب تک غیر قانونی طور پر آپ لوگوں کی مدد کی ہے، جبکہ پاک آرمی کا قانون مجھے قطعاً اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔میری افغانستان آمد کا مقصد اپنی بے گناہی کے ثبوتوں کی تلاش تھی نہ کہ امریکن آرمی یا افغانستان آرمی کے خلاف کوئی کارروائی کرنا۔باقی آپ لوگوں ہی کی وجہ سے مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ملی ہے اور اتنی سہولتیں ملی ہیں کہ میں با آسانی کامیاب ہو پایا ہوں۔اس لیے آپ تمام کا بہت بہت شکریہ۔البتہ معذرت چاہوں گا، کہ یہاں مزید کچھ وقت گزارنا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔“

ضلع خان مسکرایا۔”آج کی رات گزارو گے یا ابھی رخصت لو گے۔“

میں نے جواب دیا۔”ان شاء اللہ صبح سویرے نکلوں گا۔“

رات کو انھوں نے میرے لیے خصوصی دعوت کا بندوبست کیا تھا۔غار کے اندر ہی انھوں نے سالم دنبہ

لکڑیوں کے انبار پر بھونا تھا۔دنبے کے پیٹ سے آلائشیں نکال کرانھوں نے چاول بھر دیے تھے۔بہت ہی اعلا کھانا تیار ہوا تھا۔میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کھا گیا تھا۔صبح سویرے نماز کے بعد ناشتے سے فارغ ہو کر میں اور کمانڈر عبدالحق جانے کے لیے تیار تھے۔

سڑک تک جانے میں ہمیں دو تین گھنٹے لگے تھے وہاں سے ہمیں ارگون اور سار وبی تک گاڑی مل گئی تھی۔وہ گاڑی مجاہدین ہی کی تھی۔آگے کا راستہ پیدل طے کرتے ہوئے ہم پکتیکا پہنچے،کیونکہ میرا ارادہ کچھ خریداری کرنے کا تھا۔قریباً دو ہفتے پہلے میں چچا شمریز کے گھر تحائف بھجوا چکا تھا۔لیکن خود اسی رستے سے جانے کا ارادہ تھا تو خالی ہاتھ جانا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔رات ہم نے شہر میں گزارنے کے بجائے آگے جانے کو ترجیح دی تھی ۔صبح کے قریب ہم اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔ناشتا وغیرہ کر کے ہم آرام کرنے لیٹ گئے۔ظہر کی نماز پڑھ کر میں جانے کے لیے تیار تھا۔کمانڈر عبدالحق نے بھی چھٹی جانا تھا اس لیے وہ بھی میرے ساتھ چل پڑا۔جن رستوں کو میں نے پچھلی بار جان بچا کر بھاگتے ہوئے طے کیا تھا ان رستوں کو پیدل عبور کرتے ہوئے اچھا لگا تھا۔عشاء کے قریب ہم غزنی خیل گاؤں کے مضافات سے گزر رہے تھے۔رات گزارنے کے لیے سردار سیلاب خان کی بیٹھک ایک بہترین چناؤ تھا۔میں کمانڈر عبدالحق کو ساتھ لے کر اسی جانب بڑھ گیا۔

سیلاب خان مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا تھا۔اس نے فوراً ہی ہمارے لیے خصوصی کھانا تیار کرنے کا حکم دے دیا۔کمانڈر رشید جان،الفت بادشاہ،مشر خان،نوشاد گل،گل ریز وغیرہ وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ان سے رخصت ہونے کے بعد میرا شلوبر قبیلے سے جو ٹکراہوا تھا اور اس کے نتیجے میں شلوبروں کے زخمی اور قتل ہونے والے افراد کی خبر ان تک بھی پہنچ گئی تھی۔میرے ساتھ ان کے رویے میں پہلے سے زیادہ عقیدت جھلک رہی تھی ۔میں نے سردار سیلاب کو بتایا کہ ان کے قبیلے میں کوئی غدار موجود ہے کہ جس نے میرے بارے شلوبروں کو اطلاع فراہم کی تھی۔

سردار سیلاب خان نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔”ایک نہیں دو تھے۔دونوں کے سر کاٹ کر شلوبر قبیلے کو بھجوا دیے تھے۔البتہ ان کے دھڑ یہیں دفن کرنے پڑے۔اور سر کے بغیر جنازہ ہو سکتا ہے یا نہیں اس مسئلے کے بارے چونکہ ہمیں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں اس لیے ہم جنازہ نہیں پڑھ سکے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”دھڑ کے بغیر جنازہ ہوتا ہے یا نہیں یقیناً یہ مسئلہ شلوبروں کو بھی معلوم نہیں ہوگا اور انھوں نے بھی یہی حل سوچا ہوگا جو آپ لوگوں کو سوجھا۔“

کمانڈر عبدالحق نے لقمہ دیا۔ ”غداروں کا یہی انجام ہوا کرتا ہے کہ انھیں نہ تو اپنے ، اپنا تسلیم کرتے ہیں اور نہ غیر ہی اپنانے کو تیار ہوتے ہیں ، وہ کیا بھلی سی کہاوت ہے۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔“

اسی گپ شپ کے دوران کھانا تیار ہو گیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد بھی سیلاب خان اور باقیوں نے ہمیں اتنی جلدی سونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ان کی شلوبروں کے ساتھ ابھی تک صلح نہیں ہوئی تھی۔ اس ضمن میں دو تین جرگے ہو چکے تھے۔ اب آخری اور حتمی جرگہ ایک ہفتے بعد ہونا تھا۔ میرے اپنے اتنے مسائل تھے کہ میں دوسروں کے معاملات کی جانب متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے کی لڑکی کو پھانسی دیتے ، اس کا سر قلم کرتے یا اس کے علاوہ ان کا کوئی اور منصوبہ تھا مجھے اس بارے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے ان کی لڑائی کے بارے اجمالاً پوچھ کر میں نے گفتگو کا رخ تبدیل کر دیا تھا۔

رات کو دیر سے سونے کے باوجود ہم صبح کی نماز اور ناشتے سے فارغ ہو کر جانے کے لیے تیار تھے۔ سردار سیلاب خان نے اپنے قبیلے کے درجن بھر آدمی میری حفاظت کے پیش نظر میرے ساتھ روانہ کر دینا چاہے مگر میں نے منع کر دیا۔ یوں بھی کمانڈر عبدالحق ، شلوبر قبیلے کے ساتھ میری صلح کی بات کر چکا تھا۔ سب سے بڑھ کر وہ میری واپسی سے بھی ناواقف تھے تو مجھے نقصان پہنچانے کا کیا سوچتے۔ اور اتنا تو وہ بھی جانتے تھے کہ میرے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا مطلب بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف تھا۔ مجاہدین اتنے بھی کمزور نہیں تھے کہ ایک گاؤں پر قابو نہ پا سکتے۔

آتے وقت رستے پر برف پڑی تھی جبکہ اب اپریل کا اختتام تھا برف بالکل ختم ہو گئی تھی۔ سردی کی شدت میں بھی پہلے جتنا زور باقی نہیں رہا تھا۔ سہ پہر ڈھلے میں اس جگہ سے گزر رہا تھا جہاں میری گلگارے سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی باتیں اس وقت بھی میری یادداشت میں تازہ تھیں۔ اس کا گلہ کرنا ، میری جیب میں چوری پیسے ڈالنا ، مجھے واپس اسی رستے سے آنے کی تلقین کرنا ، پلوشہ سے ملنے کی خواہش کرنا وغیرہ۔ کوئی بھی بات مجھے بھولی نہیں تھی۔ صبح سیلاب خان کی بیٹھک سے نکلنے سے پہلے میں نے اسی کے بھیجے ہوئے کپڑے اور سوئیٹر

پہن لی تھی ۔رنڑا گڑیا کی بھیجی ہوئی ٹوپی میرے سر پر تھی۔جس وقت میں وہاں سے گزر کر آگے گیا تھا تب وہاں خوب برف پڑی تھی اب نالہ میں پانی کی مقدار پہلے سے تھوڑی زیادہ ہوگئی تھی۔سورج غروب ہونے سے پہلے ہم چچا شمریز کے گھر کے قریب پہنچ گئے تھے۔دور ہی سے انگھیٹی کا دھواں دیکھ کر میرا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا، یقیناً وہ گھر میں موجود تھے۔مجھے یوں محسوس ہور ہا تھا جیسے میں اپنے ہی گھر میں واپس جار ہا ہوں ۔کبھی کبھی سرِ راہ ملنے والے مسافر ایسے ہی دل و دماغ کے قریب ہو جاتے ہیں کہ ان میں اور خون کے رشتوں میں تمیز کرنا محال ہو جاتا ہے۔پلوشہ بھی تو مجھے یونھی ملی تھی کہ آج اس سے زیادہ میرے دل کے کوئی بھی قریب نہیں تھا۔یہی حال شمریز چچا اوراس کے بچوں کا تھا۔اگر میں برف باری میں نہ پھنستا تو شاید میں اس کے گھر کے باہر ہی سے یہ جانے بغیر آگے بڑھ گیا ہوتا کہ اس کے مکین کتنے مخلص، محبت کرنے والے اور مہمان نواز ہیں۔

دروازے پر دستک دیتے ہوئے میرے احساسات عجیب سے ہو رہے تھے۔نہ جانے انھوں نے مجھے دیکھ کر کیا ردعمل ظاہر کرنا تھا۔دستک دینے کے چند لمحوں بعد قدموں کی چاپ ابھری اور پھر دروازے میں لگی ذیلی کھڑکی کھول کر شمریز چچا کا شفقت بھرا چہرہ نمودار ہوا۔مجھ پر نظر پڑتے ہی ایک لمحے کے لیے تو وہ گنگ رہ گئے تھے اوراس کے بعد۔''ذیشان بیٹا!'' کہتے ہوئے بڑی گرم جوشی سے مجھے لپٹ گئے تھے۔مجھے زوردار انداز میں بازوؤں میں بھینچ کر اس نے میرے ماتھے پر بوسا دیا اور پھر علیحدہ ہو کر کمانڈر عبدالحق سے ہاتھ ملانے لگے۔

''اچھا میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں ۔'' گھر میں دوبارہ گھس کر اس نے گھر کے کونے میں بنی ہوئی بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔مجھے ہلکی سی سبکی کا احساس ہوا تھا لیکن میں نے چہرے پر مسکراہٹ ہی طاری رکھی تھی ۔لیکن بیٹھک میں داخل ہوتے چچا شمریز نے میری حیرانی دور کر دی تھی۔

''اچھا بیٹا، میں مہمان کے ساتھ بیٹھا ہوں تم باقیوں کو مل لو، ثمر خان کو کہو کہ مہمان کے لیے گرم پانی کا لوٹا لے آئے۔''

''جی چچا جان۔'' میں اثبات میں سر ہلاتا ہوا بیگ سمیت بیٹھک میں لگے بغلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ جونھی میں اندر داخل ہوا رنڑا گڑیا مجھے صحن ہی نظر آ گئی تھی اور اسی طرف متوجہ تھی۔ملگجی روشنی میں بھی اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

''لالا جان!'' وہ چیختے ہوئے میرے طرف بھاگی۔اس کی چیخ سن کر باورچی خانے میں بیٹھی گلگارے بھی سرعت سے باہر نکلی تھی۔ثمر خان اندرونی کمرے سے بھاگ کر نکلا۔رنڑا چھوٹی بہنوں ہی کی طرح قریب آ کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

''کیسی ہے میری چھوٹی سی بہادر بہن۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''لالا جان، میں آپ کو روز یاد کرتی تھی۔اور آپ کی سلامتی سے لوٹ آنے کی دعائیں بھی مانگا کرتی تھی۔''

میں مسکرایا۔''دیکھ لو اللہ پاک نے میری گڑیا کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخشا ہے۔''

ثمر خان بھی قریب آ کر مجھ سے چمٹ گیا تھا۔میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر زمین سے اوپر اٹھا کر اپنے برابر کیا۔

''تم تو میرے جتنے لمبے ہو گئے ہو یار۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔

وہ فوراً بولا۔''رنڑا سے تو لمبا ہوں نا۔''

اسے نیچے اتارتے ہوئے میں نے کہا۔''شرم کرو یار، بہنوں سے مقابلہ کرتے ہیں کیا۔''

اسی وقت گلگارے کی دھیمی آواز میرے کانوں میں پڑی۔''اکیلے آئے ہیں آپ۔''

''نہیں ایک دوسرا مہمان بھی ہے۔'' میں نے اس کے روشن چہرے پر نگاہ ڈالی۔اس کی شوخ نیلی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

اس نے فوراً وضاحت کی۔''میرا مطلب پلوشہ بہن سے ہے۔''

میں گہرا سانس لے کر خاموش رہا تھا۔ایک دم میرے چہرے پر اداس نے ڈیرا جما لیا تھا۔

میری اداسی اس حساس لڑکی سے اوجھل نہیں رہ پائی تھی، میرا ذہن بٹاتے ہوئے وہ فوراً بولی۔''اچھا پتا ہے ابھی دستک سن کر میں نے دعا کی تھی کہ یا اللہ یہ آپ ہوں۔اب اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ قبولیت کا وقت ہے تو ساتھ کچھ اور بھی مانگ لیتی۔''

میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔''بالکل، اگر میرے ساتھ تم نے پلوشہ کے آنے کی دعا کر لی ہوتی تو کیا ہی بات تھی۔''

”اچھا آپ کیسے ہیں؟“اس نے موضوع تبدیل کیا۔

”بالکل ٹھیک ہوں۔“

”اندر چلیں نا۔“اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

اس کے ہمراہ قدم بڑھاتے ہوئے میں ثمر خان کو بولا۔”جوان، مہمان کے لیے گرم پانی کا لوٹا لے جاؤ۔“

”جی لالاجی!“ کہہ کر وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔جبکہ رنڑا اور گلگارے میرے ساتھ انگھیٹی کے سامنے آ بیٹھی تھیں۔

”آپ کا بھیجا ہوا سامان مل گیا تھا،شکریہ اور یہ کپڑے پہننے پر بھی بہت بہت مہربانی۔البتہ یہ فضول ٹوپی سر پر رکھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔“ وہ ٹوپی مجھے رنڑا نے بھیجی تھی اس لیے وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

”فضول کیوں ہے لالاجی میری ٹوپی تو ہر وقت پہن کر رکھیں گے۔ہیں نا لالاجی!“

میں فوراً بولا۔”بالکل،اپنی بہادر بہن کا اتنا قیمتی تحفہ میں سر سے اتار سکتا ہوں۔“

رنڑا نے منھ بسورا۔”باجی کہتی ہیں کہ آپ نے جو میرے لیے چیزیں بھیجی تھیں وہ نقلی ہیں اور باجی کے لیے جو سامان بھیجا تھا وہ ان سے اچھا ہے۔“

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔”اس کی اپنی چیزیں نقلی تھیں اس لیے تمھیں تنگ کرتی ہے پگلی۔اور پتا ہے میں تمھارے لیے اور تحفے بھی لایا ہوں۔“

اس نے سرعت سے پوچھا۔”باجی کے لیے تو نہیں لائے نا۔“

”مجھے یاد نہیں آرہا،شاید کوئی چھوٹی موٹی چیز لے لی ہو،آخر میری چھوٹی سی بہن کی باجی تو ہے نا۔“

گلگارے متبسم ہو کر ہماری باتیں سن رہی تھی۔کہنے لگی۔”اگر میرے لیے کچھ نہیں لائے تو آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں۔میں نے آپ کو گھر میں نہیں رہنے دینا۔“

”یہ میرا بھی گھر ہے اور لالاجی یہیں رہیں گے۔“رنڑا نے میری طرف داری کرنے میں ذرا بھی تساہل نہیں برتا تھا۔

”تمھارا گھر ہے تو تمھیں رہنے دے رہی ہوں نا۔“گلگارے نے سنجیدہ منھ بنا کر کہا۔

”میں بابا جان سے بات کرتی ہوں۔“ رنڑا غصے میں کہتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

”ایسے چھیڑ رہی تھیں، یہ کون ہوتی ہے مجھے نکالنے والی جاؤ وضو کے لیے گرم پانی لے آؤ۔“ میں نے جلدی سے اسے روکا ورنہ وہ بیٹھک کا رخ کرنے والی تھی۔

”ابھی لائی لالا جان۔“ وہ باورچی خانے کی طرف بھاگ گئی۔

اس کے جاتے ہی میں نے کہا۔”کیوں اسے تنگ کرتی ہو۔“

وہ منھ بناتے ہوئے بولی۔”تو کیا کروں، پندرہ سال کی ہوگئی ہے، میرے برابر قد ہوگیا ہے اور اب تک بچپنا نہیں گیا اس کا۔“

میں ہنسا۔”وہ تو تمھارا ابھی نہیں گیا۔“

”اچھا آپ نے میری بہن پلوشہ کے بارے کچھ نہیں بتایا۔“

”وہ اب تک نہیں ملی۔“ میں دوبارہ اداس ہوگیا تھا۔

اس نے اشتیاق سے پوچھا۔”ساری تفصیل بتاؤ نا؟“

میں نے رنڑا کو گرم پانی کی بالٹی غسل خانے میں لے جاتے دیکھ کر کہا۔”رات کو گپ شپ کریں گے فی الحال نماز پڑھ لوں۔“

”نماز تو میں نے بھی پڑھنا ہے۔“ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

☆......☆......☆

کھانا میں نے عبدالحق کے ساتھ بیٹھ کر کھایا تھا اور قہوہ پیتے ہی ثمر خان مجھے بلانے آگیا تھا۔

”لالا جان، باجی آپ کو بلا رہی ہے۔“

عبدالحق نے کہا۔”ذیشان بھائی، میری فکر نہ کرو میں عشاء کی نماز پڑھ کر لیٹ رہا ہوں، آپ بچوں کو وقت دیں، صبح تو یوں بھی چلے جانا ہے۔“

”شکریہ کمانڈر۔“ میں گھر کے اندر گھس گیا۔ ثمر خان مجھ سے پہلے بھاگ کر بہنوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اور جاتے ہی یہ راز بھی فاش کر دیا کہ لالا جان صبح چلے جائیں گے۔

''آپ صبح نہیں جا رہے۔'' میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی گلوگیر لہجے میں بولی تھی۔

میں نے اسے ناراض نظروں سے گھورا۔ ''گویا میں نے اس رستے سے آکر غلطی کی ہے۔'' اس نے نظریں چرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گہری نیلی آنکھیں میں برہمی بھرتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''بالکل غلطی تو کی ہے نا، آخر یہاں کون آپ کا منتظر تھا۔ کون سا کسی نے آپ کے سلامتی سے لوٹ آنے کی دعائیں مانگیں، کون سا کسی کے لیے آپ بہت اہم ہیں۔ آپ کی ضرورت ہی یہاں کس کو ہے۔''

''اس بکواس کا مطلب۔'' میں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا۔

''کچھ نہیں۔'' بے رخی سے کہہ کر اٹھتے ہوئے وہ چھوٹی بہن کو مخاطب ہوئی۔ ''رنڑا بابا جان میرا پوچھیں ہیں تو کہہ دینا نیند آرہی تھی سو گئی ہے۔''

اس نے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ میں نے فوراً اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو اور مذاق رنڑا کا اڑاتی ہو۔''

وہ بے رخی سے بولی۔ ''ہاتھ چھوڑیں، میں نے سونے جانا ہے۔''

میں اسے خوش کرتے ہوئے بولا۔ ''اچھا صبح نہیں جاؤں گا، بس۔''

اس نے میری طرف رخ پھیرا، گہری نیلی آنکھوں کی تہہ میں پانی جمع ہو چکا تھا۔ لمحہ بھر مجھے گھورنے کے بعد وہ آہستہ سے بولی۔ ''کم از کم ایک ہفتہ۔''

میں زچ ہوتے ہوئے بولا۔ ''پاگلوں والی بات نہ کرو۔''

''ایک ہفتہ، یا ابھی سے خدا حافظ۔'' وہ ڈٹ گئی۔

میں بے بسی سے بولا۔ ''تمھیں میرے حالات کا پتا نہیں ہے۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''ہاں، مگر اپنی حالت کا تو پتا ہے نا۔''

''اچھا اس بارے بعد میں بات کریں گے، تم فی الحال بیٹھ تو جاؤ۔'' میں نے اسے چارپائی کی جانب کھینچا۔ رنڑا اور ثمر خان خاموشی سے ہماری بحث سن رہے تھے۔

گہرا سانس لے کر وہ رنڑا کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر اب بھی ناراضی نظر آرہی تھی۔

رنڑا معصومیت بھرے لہجے میں بولی۔ ’’لالا جی، آپ باجی کی بات مان جائیں نا۔‘‘

’’تم کچھ نہیں جانتیں، تم چھوٹی سی بچی ہو گڑیا۔‘‘ میں نے اسے ہلکے جھڑکا۔

گلگارے نے منھ بنایا۔ ’’ہاں بڑے تو صرف آپ ہیں باقی سب بچے ہیں۔‘‘

’’مطلب تم نے مار کھانے کا پورا منصوبہ بنایا ہوا ہے۔‘‘ میں نے اسے دھمکایا۔

اسی وقت شمریز چچا اندر داخل ہوئے۔ ’’کس کی پٹائی کی بات ہو رہی ہے بھئی۔‘‘

’’کسی کی نہیں چچا جان، آپ سنائیں مہمان سو گیا ہے۔‘‘ وہ شام سے مسلسل کمانڈر عبدالحق کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔

’’ہاں سو گیا ہے اور سنا ہے ایس ایس افغانستان میں بڑی دھوم مچا کر آرہا ہے۔‘‘

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ ’’پتا نہیں کمانڈر نے کون کون سے کارنامے مجھ سے منسوب کر کے آپ کو سنا دیے ہیں۔‘‘

’’چلو آپ سے سچ سن لیتے ہیں۔‘‘ وہ اپنی رضائی میں گھس کر بیٹھ گیا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود گلگارے نے میرا بستر بھی وہیں پر لگا دیا تھا۔ میں نے بھی نچلے دھڑ پر رضائی لیتے ہوئے ثمر خان اور رنڑا کو اپنے کمرے میں جا کر سونے کا کہا مگر دونوں نے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔

رنڑا بولی۔ ’’ہم بھی آپ کی باتیں سنیں گے، کیا پتا آپ کل چلے جائیں۔‘‘

چچا شمریز نے منت بھرے لہجے میں کہا۔ ’’ویسے یہ تو زیادتی ہے ذیشان میاں، ایک دن تو قیام کر لیتے۔‘‘

’’آپ فکر نہ کریں ابا جان یہ ایک ہفتہ کہیں نہیں جانے والے۔‘‘ پر اعتماد لہجے میں کہتے ہوئے وہ مجھے مخاطب ہوئی۔ ’’آپ ہمیں یہاں سے جانے کے بعد کے حالات بتائیں۔ آپ زخمی کیسے ہوئے تھے اور باقی سب کچھ بھی۔‘‘

میں اس کی ہفتے والی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں غزنی خیل اور شلوبر گاؤں کی لڑائی کے بارے تفصیل سے بتانے لگا۔ جس کا اختتام نک سٹیورٹ کی موت پر ہوا۔

گلگارے نے پوچھا۔ ’’پلوشہ بہن کی تلاش میں مجاہدین نے کیا پیش رفت دکھائی ہے؟‘‘

میں نے نفی میں سر ہلایا۔''فی الحال تو کچھ پتا نہیں چلا۔''

''اچھا اب آرام کر لیں۔''اس نے رنڑا اور ثمر خان کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

صبح نماز پڑھ کر میں نے کمانڈر عبدالحق کو مزید ایک دو دن رکنے کا عندیہ دیا۔

وہ صاف گوئی سے بولا۔''میں زیادہ سے زیادہ آج کا دن رک سکتا ہوں۔''

میں بے بسی سے بولا۔''ٹھیک ہے یار میں کوشش کرتا ہوں، مگر بچے ضد کر رہے ہیں۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔''بچوں کی تو خیر ہے کوئی بڑا ضد نہ کر رہا ہو۔اور اگر ایسا ہے تو آپ کو ضرور رکنا چاہیے۔''

''اچھا میں ناشتا لے کر آتا ہوں۔''اس کی بات کا جواب دیے بغیر میں گھر کی طرف بڑھ گیا۔

گلگارے نماز پڑھ کر باورچی خانے میں گھسی تھی۔میں بھی لکڑی کی چوکی لے کر وہیں بیٹھ گیا۔مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ جھلملانے لگے تھے۔

وہ پوچھنے لگی۔''ناشتا مہمان کے ساتھ کریں گے۔''

''ہاں، وہ بس جانے کے لیے تیار ہے۔میرے کہنے پر ایک دن کے لیے رک گیا ہے۔''

وہ بے نیازی سے بولی۔''آپ کو ساتھ لے جانے کے لیے رکا ہے تو اسے ہفتہ رکنا پڑے گا۔''

''گل، پتا ہے میں پلوشے کے لیے کتنا پریشان ہوں، پہلے بھی اتنی دیر ہو گئی ہے۔''میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

انڈہ فرائی کر دوں یا آملیٹ بنا دوں۔''اس نے گویا میری بات سنی ہی نہیں تھی۔

میں نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔''میری بات نہیں مانو گی۔''

وہ نیازی سے بولی۔''تو آپ کی مرضی ہی پوچھ رہی ہوں نا، آملیٹ، ابلا ہوا یا انڈہ فرائی کھائیں گے۔''

میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔''جو مرضی ہے بنا دو۔''

''یہ دودھ پی لیں۔''اس نے جست کا کٹورا میرے سامنے رکھا جو گائے کے نیم گرم دودھ سے بھرا ہوا تھا ''یہ شہد بھی ڈال لیں۔میں نے خود اتارا تھا۔''اس نے ایک کھلے منہ والی خالص شہد کی بوتل بھی میری طرف

بڑھا دی تھی۔

”شکریہ۔“ دودھ میں شہد ملا کر میں نیم گرم دودھ سے لطف اندوز ہونے لگا۔

”اب گھر جائیں گے یا، وزیرستان سے پلوشہ کی تلاش شروع کردیں گے۔“

”ایک بار گھر تو جاؤں گا، کیونکہ اپنی بے گناہی کے ثبوت میں نے بھجوا دیے تھے اور اس کے بعد میرے یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔

”ہونہہ!“ ہنکارا ابھرتے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگی۔ چند لمحوں بعد اس کی آواز ابھری۔”ویسے پلوشہ کس رستے سے افغانستان میں داخل ہوئی تھی؟“

”نصراللہ خوجل خیل نے انھیں بھی اسی رستے کے متعلق ہدایات دی تھیں۔لیکن یہ معلوم نہیں کہ وہ اس رستے سے افغانستان میں داخل ہوئے یا کسی اور رستے سے۔“

”اگر اس رستے سے گئے ہوتے تو یقیناً کہیں نہ کہیں سے ان کی سن گن مل جاتی۔انگور اڈے سے آنے والے لوگ عموماً خواگا ابو میں ضرور قیام کرتے ہیں۔اور ہمارا گھر ایسی جگہ پر ہے کہ یہاں اکثر مہمانوں کی آمدورفت رہتی ہے۔اس کے علاوہ بھی آپ اس پورے رستے پر سفر کر چکے ہیں اگر وہ اس رستے سے افغانستان میں داخل ہوئے ہوتے تو ان کی کہیں نہ کہیں سے سن گن آپ کو ضرور ملتی۔سب سے بڑھ کر افغانستان میں سرگرم تنظیموں میں سے انھیں کسی نہ کسی کے ساتھ رابطہ ضرور کرنا چاہیے تھا کیونکہ امریکنز کے خلاف کام کرنے کے لیے ان تنظیموں کا سہارا لینا انسان کی مجبوری بن جاتی ہے۔اور اگر وہاں کام کرنے والے دو تین گروپوں کے افراد سے پوچھنے کے باوجود ان کا پتا نہیں چل سکا، بلکہ آپ کی ایک امریکن دوست نے بھی ان کے بارے لاعلمی کا اظہار کیا ہے حالانکہ وہ کافی بڑی عہدہ دار ہے۔“اس نے معنی خیز انداز میں جینیفر کا ذکر کر کے مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ میرے جینی سے تعلق کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔”تمھاری اس ساری کہانی سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔“

”یہی کہ انھیں افغانستان داخل ہونے سے پہلے ہی کوئی حادثہ پیش آگیا ہو یا وہ اپنا ارادہ مؤخر کر کے واپس لوٹ گئے ہوں۔اور اللہ کرے میرا آخری اندازہ ہی صحیح ہو۔“

بات چیت کے دوران اس کے ہاتھ نہیں رکے تھے دیسی گھی میں پراٹھے بنا کر اس نے چار انڈے فرائی کیے اور گائے کے تازہ دودھ کی گاڑھی چائے بنا کر اس نے خالص دیہاتی اور گھر کا ناشتا تیار کر دیا تھا۔

''بعد میں بات کرتے ہیں۔''میں ناشتے کے برتن اٹھا کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔چچا شمریز خان، کمانڈر عبدالحق کے ساتھ بیٹھا تھا۔ناشتا کر کے میں نے برتن اٹھائے اور گھر میں گھس گیا۔یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرا اپنا ہی گھر ہو۔رنڑا اور ثمر خان جاگ گئے تھے۔میں ان کے لائے ہوئے تحائف ان کے حوالے کرنے لگا ۔اس میں شک نہیں کہ تحائف کو محبت بڑھانے میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔تحفہ پانے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ تحفہ لانے والے کے لیے کتنا اہم اور خاص ہے۔اور یہ کہ تحفہ لانے والے نے اسے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی یاد رکھا ہے۔گلگارے اور شمریز چچا کے لیے بھی میں نے تحائف خریدے تھے ۔گلگارے کے بدن پر مجھے وہی لباس نظر آرہا تھا جو دو ہفتے پہلے میں نے کسی اور کے ہاتھ بھجوایا تھا۔

دن کا زیادہ وقت میں نے گلگارے، رنڑا اور ثمر خان کے ساتھ ہی گزارا تھا۔گلگارے نے مجھے یہ خوش خبری بھی سنائی تھی کہ شاید مہینے ڈیڑھ تک ان کے گاؤں میں بھی موبائل فون کے سگنل آنے لگ جائیں۔اس نے میرا موبائل فون نمبر بھی اپنے پاس لکھ لیا تھا۔البتہ اس کی ناراضی کے خوف سے اس کے بعد میں نے جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔رات کو رنڑا اور ثمر خان کے سونے کے بعد بھی میں چچا شمریز اور گلگارے کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا۔گلگارے چائے بنا کر لے آئی۔دوران گفتگو چچا شمریز پوچھنے لگا۔

''صبح جانے کا ارادہ ہے یا نہیں۔''

میں نے گہرا سانس لے کر گلگارے کی طرف دیکھا جو بہ ظاہر بے نیازی سے چمڑے کے بوٹوں کو گھور رہی تھی جو میں اس کے لیے لے آیا تھا۔میں دھیمے لہجے میں بولا۔

''فی الحال تو اجازت نہیں ملی۔''

''اجازت۔''چچا شمریز حیران رہ گیا تھا۔

میں مسکرایا۔''گل سے پوچھ لیں۔''

وہ اطمینان سے بولی۔''ابا جان یہ چند دن تو یہیں رکیں گے نا۔''

''مگر بیٹی، اسے کافی کام کرنے ہیں۔'' چچا شمریز اسے سمجھانے لگا۔

''تو......'' اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

''اسے چھوڑو ذیشان بیٹا، صبح جانے کی تیاری کرو۔ آپ کا یہاں رہنا مجھے بھی پسند ہے لیکن پہلے آپ کے اپنے کام ہیں۔ البتہ پلوشہ بیٹی کے ملنے کے بعد میں درخواست کروں گا کہ چند دن کے لیے ہمیں خدمت کا موقع ضرور دینا۔''

وہ ضدی لہجے میں بولی۔ ''یہ نہیں جائیں گے۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''چچا شمریز آپ ہمیں تنگ نہ کریں، جب ایک بار طے ہو گیا کہ میں نہیں جاؤں گا تو بس بات ختم۔''

میرا انداز دیکھتے ہوئے وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ''سن لیا ابو جان۔''

''جو مرضی آئے کرو۔'' چچا شمریز نے ناراض لہجے میں کہتے ہوئے اپنا سر رضائی میں کر لیا۔

''آپ بھی آرام کریں۔'' ایک گہری نگاہ مجھ پر ڈال کر وہ چائے کی پیالیاں سمیٹتے ہوئے باہر نکل گئی۔

صبح نماز پڑھ کر میں نے باورچی خانے میں جا کر شہد ملا نیم گرم دودھ پیا اور ناشتا تیار کر کے میرے حوالے کرتے ہوئے اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''رستے کے لیے دال کے پراٹھے بنا دوں یا سالن تیار کر دوں۔''

میں مسکرایا۔ ''خوشی سے کہہ رہی ہو۔''

''اگر پلوشہ بہن کی فکر نہ ہوتی تو ہرگز اجازت نہ دیتی۔ اور شکریہ آپ نے میرا مان رکھا۔''

''اگر پلوشہ کی فکر نہ ہوتی تو کم از کم یہ شہد کی بوتل ختم ہونے تک میں ضرور ٹھہرتا۔''

وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''دیکھ لیں، کہیں یہ نہ ہو آپ کی اگلی بار کی آمد سے پہلے میں اتنا شہد اکٹھا کر لوں کہ آپ سے وہ شہد ختم ہی نہ ہو پائے۔''

''ان شاء اللہ، اگلی بار تمھاری بہن پلوشے میرے ساتھ ہو گی اور یقیناً وہ شہد ختم کرانے میں میری مدد کرے گی۔''

''ان شاءاللہ۔''اس نے خلوص بھرے لہجے میں کہا اور میں ناشتے کے برتنوں کے ساتھ بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا ارادہ ہے؟''ناشتا شروع کرنے سے پہلے ہی عبدالحق مستفسر ہوا۔

میں نے کہا۔''بس راستے کے لیے کھانا تیار ہو رہا ہے۔''

''اور وہ رات والی گفتگو کا کیا ہوا۔''چچا شمریز مستفسر ہوئے۔

''منا لیا ہے، پلوشہ کی گمشدگی پر وہ بھی پریشان ہے۔بس یونھی اپنی اہمیت جتانا چاہتی تھی۔''

ناشتے کے بعد ہم جانے کے لیے تیار تھے۔گلگارے نے دال کے پراٹھے بنا کر کپڑے میں باندھ دیے تھے۔تمام نے دکھی دل سے مجھے الوداع کہا تھا۔سب سے آخر میں گلگارے میرے قریب آئی۔

''پلوشہ بہن کے ملتے ہی یہاں آنا ہوگا۔''

''ان شاءاللہ کوشش کروں گا۔''

''اکیلے نہیں، ان کے ساتھ۔''اس نے انگلی کھڑی کرتے ہوئے مجھے تنبیہ کی۔

''ہاں اس کے ساتھ گل !......وہ ضرور اس لڑکی کو دیکھنا چاہے گی جس کی وجہ سے اس کے راجو کی جان بچی ہے اور جو اس کے راجو کی مسیحا ہے۔''

''اپنا خیال رکھنا۔اللہ پاک آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''دھیرے سے کہہ کر اس نے مجھے الوداع کہہ دیا۔

☆......☆......☆

میں کمانڈر عبدالحق کے ساتھ اس رستے پر دوبارہ گامزن ہو گیا کہ جس رستے پر میں نے برف کا عذاب جھیلا تھا۔اسے میں نے وہ سارا واقعہ بتایا اور ساتھ ہی یہ کہ گلگارے نے کس طرح میری جان بچائی تھی۔وہ بے ساختہ کہہ اٹھا۔

''واقعی ایسی لڑکی عزت اور احترام کے قابل ہے۔اگر اس کے کہنے پر آپ کو مہینا بھی رکنا پڑ جاتا تو آپ کا احسان نہ ہوتا۔''

''کمانڈر، میں اسے بہن کی طرح پاکیزہ اور قابل احترام سمجھتا ہوں، مگر وہ مجھے بھائی نہیں کہتی، مجبوراً میں بھی اسے نام سے پکارنے لگ گیا۔''

وہ فلسفیانہ لہجے میں بولا۔''کچھ رشتوں کو بے نام اور الجھا ہوا چھوڑ دینے پر دل چاہتا ہے اور ایسی حالت میں دل کی بات مان لینا چاہیے۔باقی زندگی موت کا کیا بھروسا، ہوسکتا ہے اسے بھی آپ کی زندگی میں داخل ہونے کا کوئی راستہ مل جائے۔''

''میرے پاس اسے امید دلانے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے کمانڈر۔میری زندگی میں کئی ایسی لڑکیاں آئی ہیں جنھیں میں پسند کرتا تھا بلکہ اب بھی کرتا ہوں، گل بھی ان میں سے ایک ہے۔خوب صورت، شریف مخلص، سلجھی ہوئی۔لیکن یہ خدا اپلوشہ وہ واحد لڑکی ہے جسے میں نے دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے۔محبت کی ہے اور جو مجھے اتنی ہی ضروری لگتی ہے جتنا کہ سانس لینا ضروری ہوتا ہے۔دو تین بار مجھ پر ایسا وقت بھی بیتا کہ میں اپنے آخری سانس گن رہا تھا، ان لمحات میں بھی وہ مجھے نہ بھولی۔''

وہ مسکرایا۔''پلوخان کی تو کیا ہی بات تھی۔بہت ہی ہونہار اور لائق شاگرد تھا۔ہر چیز کو اتنا جلدی سمجھ جاتا تھا کہ بعض اوقات ہم اساتذہ حیران رہ جاتے۔خالی ہاتھ لڑائی کرنا، ہتھیار چلانا، پڑھائی لکھائی، مختلف زبانیں سیکھنا، چھاپہ مار کارروائی کے منصوبے بنانا، گاڑی چلانا، یہاں تک کہ جسم میں لگی ہوئی گولی کو خنجر کی نوک سے یوں صفائی سے نکال لیتا تھا کہ یقین مانو اس طرح ہم سے یہ کام نہیں ہوتا تھا۔سب استادوں کا چہیتا شاگرد تھا۔اللہ پاک اس پر اپنی رحمت برسائے اور اس کی تمام منازل کو آسان فرمائے۔''

میں معترض ہوا''وہ فوت تو نہیں ہوئی یار کہ اس کی مغفرت کی دعا شروع کر دی۔''

عبدالحق کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی مگر اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

دوپہر کو ایک چشمے کے کنارے بیٹھ کر کھانے کی پوٹلی کھولی۔اس میں ایک تہہ شدہ کاغذ دیکھ کر کمانڈر عبدالحق نے میری طرف بڑھا دیا۔''یقیناً یہ آپ کے لیے ہوگا۔''

وہ گلگارے کا خط تھا۔سلام ودعا کے بعد اس نے لکھا تھا۔

''پتا نہیں زندگی دوبارہ ملنے کا موقع دیتی ہے یا نہیں، لیکن ایک بات جو میں اب مزید چھپا نہیں سکتی اور آپ

کو بتا دینا چاہتی ہوں ۔ میرا ارادہ تھا کہ آپ کا دوبارہ سامنا ہونے پر ضرور معذرت کروں گی، آپ آئے اور چلے بھی گئے لیکن مجھے ہمت نہ ہو سکی ۔ البتہ کاغذ قلم نے مجھے یہ ہمت عطا کر دی ہے ۔ اس دن رات کو مورچے میں میں انجانے میں یا غلطی سے آپ کے قریب نہیں ہوئی تھی ۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا ۔ امید ہے اگلی ملاقات تک آپ یہ بات بھلا چکے ہوں گے اور میری بہن پلوشہ سے بھی اس بات کا ذکر نہیں گے ۔ میں نہیں چاہتی کہ پلوشہ بہن کے دل میں میرے بارے کوئی غلط فہمی جڑ پکڑ لے ۔ پلوشہ مجھے رنڑا کی طرح ہی پیاری ہے ۔ اس کے علاوہ نصیر خان بار بار ابو جان کے پاس اپنے بیٹے کے لیے میرا رشتا مانگنے آ رہے ہیں ۔ اس کا بیٹا فخرالاسلام خان ایک اچھا اور سلجھا ہوا جوان ہے ۔ ابو جان بھی یہ اچھا رشتا گنوانا نہیں چاہتے ۔ میرا خیال ہے ہاں کر دیتی ہوں ۔ کیوں کہ خواہ مخواہ کی امیدیں باندھنا کوئی صحت مندانہ روش نہیں ہے ۔ ہر لڑکی پلوشہ بہن کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتی ۔ اسی طرح کوئی بھی اچھے خاندان کی لڑکی اپنی چھوٹی بہن کا گھر اجاڑ کر یقیناً اپنا گھر نہیں بسانا چاہے گی اور میں بھی اپنے آپ کو اچھے خاندان ہی کا سمجھتی ہوں ۔ باقی مجھے یقین ہے کہ میرے ہاں کرتے ہی وہ ایک ماہ کے اندر اندر شادی پر زور دیں گے ۔ فخرالاسلام خان مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور میں نے سوچ لیا ہے کہ ایک محبت بھرے دل کو توڑنا بالکل ہی غلط ہوگا ۔ آپ کو پہلے سے بتا رہی ہوں ۔ چند دنوں تک میں کسی اور کے نام منسوب ہو جاؤں گی ۔ اگر میری شادی میں پلوشہ بہن کے ساتھ شرکت کی تو میرے دل میں کوئی گلہ نہیں بچے گا ۔ خدا حافظ

آپ کی چھوٹی بہن رنڑا کی باجی گل ۔'' ......

میرے گل کہنے پر وہ خود کو گل ہی کہنے لگ گئی تھی ۔ مجھے خط پڑھتے دیکھ کر کمانڈر عبدالحق آگ جلانے لگ گیا تھا ۔ خط پڑھ کر میں نے آگ میں پھینک دیا ۔ گلگارے کا وہ راز میں نے سینے میں دفن کر دیا تھا ۔ اپنی محسن کی یہ بات کسی کو بیان کر کے میں اس کے کردار کو ہلکا نہیں کر سکتا تھا ۔ یہ اس کی اخلاقی جرٔات تھی کہ اس نے اعتراف کر لیا تھا ۔ باقی اس کی ذو معنی گفتگو آنکھیں میں چھپی التجا اور اس کے انداز دیکھ کر مجھے پہلے سے اس کے دل میں چھپے جذبات معلوم ہو گئے تھے ۔ اور اب تو اس نے خط میں کھل کر اعتراف بھی کر لیا تھا لیکن اس کے اس نے ساتھ اپنے ہوش مندانہ فیصلے سے مجھے خوش بھی کر دیا تھا ۔

کھانے اور گرم قہوے سے لطف اندوز ہونے کے بعد ہم نے ظہر کی نماز پڑھی اور دوبارہ کمر باندھ لی ۔ اور

پھر رات کو بھی رکے بغیر چلتے رہے۔ صبح کی اذان کے وقت ہم انگور اڈے پہنچ گئے تھے۔ کمانڈر نصراللہ خوجل خیل نے ہمیں بڑے خلوص سے خوش آمدید کہا تھا۔ ساری رات چلنے کی وجہ سے ہم تھکن محسوس کر رہے تھے لیکن ہمارا ارادہ آرام کرنے کا بالکل نہیں تھا۔ چچا نصراللہ خوجل خیل کے پاس ناشتا کر کے ہم گپ شپ کرنے لگے۔ ان کے پاس ہمارے لیے کوئی خوش خبری موجود نہیں تھی۔ کمانڈر اسلام کے بارے معلوم ہوا تھا کہ وہ پلوشہ اور سردار کے بارے پوچھ گچھ کرنے کے لیے ان کے پاس آیا تھا۔ اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ البتہ کمانڈر عبدالحق نے مجھے زبردستی ساتھ چلنے کا کہا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں ایک بار اپنے سینئرز سے ملاقات کرلوں۔ مجھ پر لگے الزامات کے ثبوت ملنے کے بعد میرے لیے کیا طے کیا جانا تھا اس کا سامنا کرلوں اس کے بعد میں آرام سے پلوشہ کو تلاش کرسکتا تھا۔ مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ اور ہم چچا نصراللہ سے اجازت لے کر ویگن اڈے کی طرف بڑھ گئے۔ ان سے لی ہوئی کلاشن کوف میں نے ان کے پاس ہی چھوڑ دی تھی کیوں کہ وہ میں اپنے ساتھ آگے تو نہیں لے جاسکتا تھا۔ ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ کر کمانڈر عبدالحق مجھ سے الوداع ہوتے وقت عجیب سے لہجے میں بولا۔

''ذیشان بھائی، مجھے معاف کر دینا یار۔''

''کیا مطلب؟'' میری چہرے پر حیرانی بھری مسکراہٹ ابھری۔

وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''ویسے ہی بس، دانستہ یا نادانستگی میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے نا یار۔''

میں اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''وہ تو ہر کسی سے ہو جاتی ہے، شاید مجھ سے بھی ہوئی ہو۔''

ویگن اڈے سے اس نے پشاور کی گاڑی پکڑی اور میں راولپنڈی روانہ ہو گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ گھر جا کر میں نے پھنس جانا ہے اور گھر والوں نے پلوشہ کے بارے پوچھ پوچھ کر میرے دماغ کی لسی بنا دینا ہے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ میں پہلے اورنگ زیب صاحب سے ملاقات کر لیتا۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے راولپنڈی تک میں اپنی نیند پوری کرتا رہا۔ صبح کی اذان کے وقت میں پیرودھائی موڑ پر اتر رہا تھا۔ میرا موبائل فون وغیرہ چونکہ اورنگ زیب صاحب ہی کے پاس رہ گیا تھا۔ اس لیے مجھے ایک دکان دار سے فون مانگ کر اورنگ زیب صاحب کو کال کرنا پڑی۔ وہ سویا ہوا تھا۔ اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی۔ ''ہیلو'' میرے کانوں میں گونجی۔

میں نے فوراً کہا۔ ’’اسلام علیکم سر میں ذیشان بات کر رہا ہوں اور اس وقت پیرودھائی موڑ پر کھڑا ہوں۔‘‘

’’وعلیکم اسلام، مجھے بیس منٹ لگیں گے۔‘‘ ان کی آواز سے غنودگی غائب ہوگئی تھی۔

میں وہیں پر ان کا انتظار کرنے لگا وہ بتائے گئے وقت سے دو منٹ پہلے پہنچ گئے تھے۔ پر تپاک انداز میں مجھ سے چھاتی ملاتے ہوئے انھوں نے میری پیٹھ تھپکی۔ اور میں ان کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

’’ویسے، وہ ثبوت تمھیں خود لانے چاہیے تھے۔‘‘ کار آگے بڑھاتے ہی انھوں نے سوال کیا۔

’’بس سر، ایک چھوٹے سے کام کے لیے وہیں رہ گیا تھا اس لیے کسی اور کے ہاتھ بھجوانے پڑے۔‘‘

وہ مسکرائے۔ ’’تمھارا چھوٹا کام کسی کے سر میں گولی اتارنا ہی ہوسکتا ہے۔‘‘

’’کچھ ایسا ہی سمجھیں سر۔‘‘ میرے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

’’تمھاری کہانی تو تفصیل سے سنوں گا فی الحال یہ سن لو کہ تم پر لگے الزامات تو صاف ہوگئے ہیں لیکن مجھے بے ہوش کر کے تم نے بھاگنے کی جو غلطی کی ہے اس کا مقدمہ ابھی تک باقی ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ کھل کھلا کر ہنس پڑے تھے۔

میں ترکی بہ ترکی بولا۔ ’’ایک فیلڈ ایجنٹ سے ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں سر۔‘‘

’’ہاں، مگر سزا کا سامنا تو کرنا پڑتا ہے نا۔‘‘ انھوں نے کار اپنے گھر کی طرف موڑ دی تھی۔ ناشتا کرا کر انھوں نے مجھے آرام کا مشورہ دیا۔ آرام دہ بستر پاتے ہی میں سو گیا تھا۔ مسلسل دو راتوں سے مجھے بستر نصیب نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے گیارہ بجے جگا کر انھوں نے مجھے تیار ہونے کا حکم دیا۔ میرے ناپ کی وردی اور بوٹوں وغیرہ کا بندوبست انھوں کر دیا تھا۔ بارہ بجے مجھے کرنل احمد کے سامنے پیش کیا گیا۔ کرنل صاحب کو ساری بات اورنگ زیب صاحب تفصیل سے بتا چکے تھے۔ میرے سابقہ کارناموں کو دیکھتے ہوئے اور میری مجبوری کو مدنظر رکھ کر انھوں نے مجھے خالی وارننگ دینے پر اکتفا کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے مجھے واپس اپنی یونٹ میں بھیجنے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ اتنی آسانی سے جان چھوٹنے پر میں نے اللہ پاک کا شکر ادا کیا تھا۔ البتہ میری اپنی یونٹ کے کرنل صاحب تک بھی یہ تمام باتیں تحریری صورت میں بھجوا دی گئی تھیں۔ نا معلوم ان کا کیا فیصلہ ہوتا۔ اور مجھے لگ بھی یہی رہا تھا کہ کرنل احمد نے میری سزا وغیرہ کا تعین میری یونٹ کے کرنل صاحب کی صواب دید پر چھوڑ دیا

تھا۔(یہاں پر آرمی کے قانون وغیرہ کے متعلق اس لیے کچھ لکھنے سے گریز کر رہا ہوں کہ اس کے نہ جاننے سے نہ تو کہانی پر کوئی اثر پڑتا ہے اور نہ قارئین کے لیے ایسی معلومات جاننا فائدہ مند ہے۔اس لیے یہ سطور میں نے بالکل ہی اجمالاً تحریر کی ہیں۔حالانکہ اپنے مقدمے پر میں کئی صفحات کالے کر سکتا تھا لیکن یہ ایک بوریت بھری کارروائی کا تذکرہ ہوتے)

آرمی میں ایک یونٹ سے دوسری یونٹ میں تبدیلی پر چند دن کی چھٹی ضرور ملتی ہے۔جسے ”Joining time“ کہتے ہیں۔

”سر، مووآرڈر پر جتنی زیادہ چھٹی دے سکتے ہیں دے دینا۔“ کرنل صاحب کے دفتر سے باہر آتے ہی میں اورنگ زیب صاحب کو مخاطب ہوا۔

”دے دوں گا، مگر کیا کرنا ہے لمبی چھٹی کا؟“ وہ مستفسر ہوئے۔

میں صاف گوئی سے بولا۔”سر، میری بیوی پلوشہ کا اب تک پتا نہیں چلا اس کی تلاش میں جانا چاہتا ہوں۔“یوں بھی اورنگ زیب صاحب کا ساتھ میرا تعلق سینئر، جونیئر کے علاوہ بھی کچھ بن چکا تھا۔اس لیے میں ان سے کوئی بات خفیہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

”کیا؟“ان کے چہرے پر حیرانی ابھری۔

”جی سر، سردار خان اور پلوشہ بھی میری بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنے گئے تھے۔شاید سردار خان کو تو بھگوڑا ظاہر کر دیا گیا ہو۔اس کی چھٹی تو کب کی ختم ہو چکی ہوگی۔“

اورنگ زیب صاحب میری بات کا جواب دیے بغیر مجھے ساتھ لے کر اپنے دفتر میں داخل ہوئے۔مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے انھوں نے انٹر کام اٹھا کر کلرک کو میرا یونٹ واپسی کا Move Order تیار کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ Joining Tim انتیس دن بھر دے۔وہ زیادہ سے زیادہ اتنی چھٹی ہی دے سکتے تھے۔

رسیور رکھ کر اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا جس میں میرا سروس کارڈ، شناختی کارڈ اور موبائل فون وغیرہ موجود تھا۔یہ وہ سامان تھا جو میری گرفتاری کے وقت یہاں جمع کیا گیا تھا۔

''شکریہ۔'' میں سامان وردی کی جیبوں میں منتقل کرنے لگا۔

وہ گھمبیر لہجے میں بولے۔'' سردار اپنے گھر میں ہے حادثے میں اس کی دائیں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔اس حادثے کی وجہ سے اسے بھی واپس یونٹ بھیج دیا گیا ہے۔''

''پپ...... پلوشہ......؟'' مجھے اپنی آواز جیسے کھائی سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''اس بارے تمھیں سردار ہی تفصیل بتائے گا۔'' وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہیں تھے۔ان کا دکھ بھرا لہجہ میرا دل ہولائے دے رہا تھا۔

''سر کچھ تو بتائیں۔وہ ٹھیک تو ہے نا۔کیا وہ بھی حادثے کے وقت سردار کے ساتھ تھی۔'' میرا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔کیا سردار کی طرح وہ بھی زخمی تھی۔اگر ایسا تھا تو مجھے گھر والوں نے کیوں نہیں بتایا تھا۔انھیں تو لازماً یہ خبر ہو جانا چاہیے تھی۔یا ممکن تھا کہ جس وقت میں نے گھر فون کیا تھا اس وقت تک سردار وغیرہ کا حادثہ نہ ہوا ہو۔

وہ نپے تلے الفاظ میں بولا۔''ذیشان ،بہت سارے حادثوں کو،اپنے پیاروں کے بچھڑنے کو اور ان کی معذوری وغیرہ کو ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔اب میں نہیں جانتا کہ پلوشہ کے ساتھ کیا ہوا ہے یا کچھ بھی نہیں ہوا۔یہ سردار کو معلوم ہے وہی تمھیں تفصیل سے بتا سکتا ہے۔سچ کہوں تو میں بس ایک بار ہی سرسری انداز میں سردار سے مل پایا ہوں اور تمھاری بیوی چونکہ کوئی سرکاری آدمی نہیں ہے اس لیے نہ میں نے سردار سے اس کے متعلق کچھ پوچھا اور نہ اس نے کچھ بتانے کی زحمت کی۔''

''سر،جھوٹ بول کر مجھے بہلانے کی کوشش نہ کریں۔'' میرے لہجے بدتمیزی کا عنصر نمایاں تھا۔

''مووآرڈر بننے تک اپنی وردی وغیرہ اتار لو۔'' اس نے جیب سے کار کی چابی نکال کر میری طرف پھینک دی۔

میں زچ ہو کر بولا۔''آخر آپ مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ اصل بات کیا ہے۔''

''اگر معلوم ہوتا تو ضرور بتاتا۔'' اس نے کرسی گھما کر اپنا رخ دیوار کی جانب موڑ لیا تھا۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں ان کے دفتر سے نکل آیا۔ان کے گھر پہنچ کر میں نے جلدی جلدی وردی اتار کر کپڑے پہنے اور پھر اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے نکل آیا۔واپسی پر میرا مووآرڈر تیار ہو چکا تھا۔

موو آرڈر مجھے پکڑاتے ہوئے اورنگ زیب صاحب کہنے لگے۔ ’’کار کی چابی اپنے پاس رکھو بعد میں واپس کر دینا۔میں فی الحال سرکاری گاڑی پر گزارا کر لوں گا۔‘‘

شکریہ وغیرہ ادا کرنے کا تکلّف کیے بغیر میں ان سے مصافحہ کر کے کار کی جانب بڑھ گیا۔

میرے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ جھک کر نصیحت کرتا ہوا بولا۔ ’’احتیاط سے جانا۔تیز رفتاری سے ماضی میں ہوا کام تو تبدیل نہیں ہو سکے گا البتہ تم خود ماضی بن جاؤ گے۔‘‘

’’جی سر۔‘‘ کہتے ہوئے میں کار موڑ لی۔موبائل فون کی بیٹری بند پڑے پڑے ختم ہو چکی تھی۔سب سے پہلے میں نے اے ٹی ایم سے ضرورت کے مطابق رقم نکالی اور پھر ایک نیا موبائل فون خرید کر اپنا سم کارڈ اس میں منتقل کر دیا۔ایک ایزی لوڈ کی دکان سے سم کارڈ ریچارج کر کے میں فوراً سردار کو کال کر رہا تھا۔سپیکر سے۔ ’’آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں۔‘‘ کی بے ہودہ خبر سن کر میں ابو جان کا نمبر ملانے لگا۔چونکہ اس بار میں ذاتی نمبر سے کال کر رہا تھا تبھی انھوں نے میرا نام پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

’’اسلام علیکم ذیشان بیٹا!‘‘ گھنٹی وصول کرتے ہی ابو جان کی مشفق آواز میرے کانوں میں پڑی۔

’’وعلیکم اسلام ابو جان! کیسے ہیں آپ؟‘‘

’’بالکل ٹھیک ہوں بیٹا۔باقی تمام بھی خیریت سے ہیں بس تم دونوں کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔‘‘

ان کی بات سن کر میرا سانس رکنے لگا تھا۔آخری کوئی تو بات تھی کہ سردار نے گھر میں پلوشہ کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔اسی طرح اورنگ زیب صاحب بھی کچھ بتانے پر راضی نہیں تھے۔یا شاید سچ مچ انھیں کچھ معلوم نہیں تھا۔

’’چپ کیوں ہو گئے بیٹا؟‘‘ مجھے خاموش پا کر ابو جان مستفسر ہوئے۔

’’بس میں یہ اطلاع دے رہا تھا کہ کل تک ان شاء اللہ میں گھر پہنچ جاؤں گا۔باقی گپ شپ ملنے پر ہو گی۔‘‘

’’پلوشہ بیٹی تمھارے ساتھ ہے۔‘‘ انھوں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’گھر آ کر بات کرتے ہیں ابو جان۔اس وقت میں ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔‘‘ اس وقت میں ہاں ناں کی حالت میں نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا، اپنا خیال رکھنا۔“ انھوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

موبائل فون بند کر کے میں نے ساتھ والی سیٹ پر پھینکا اور خود کو تسلی دینے کے لیے کچھ بہتر سوچنے کی کوشش کرنے لگا، جو اس وقت ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ ہر سوچ میرے دل کو بٹھائے جا رہی تھی۔ ”کیا مجھے معذور پلوشہ منظور تھی۔“ میں نے دل سے پوچھا جس کا جواب نہایت واضح ملا۔ ”دل و جان سے منظور ہے بس وہ زندہ ہونی چاہیے میں ساری زندگی اس کی خدمت کروں گا۔“

اچانک ہی میرے دماغ میں کمانڈر عبدالحق کی ذو معنی گفتگو گونجنے لگی۔ اس نے سرسری انداز میں پلوشہ کے لیے مغفرت کی دعا بھی کر دی تھی۔ پھر گلگارے کے ذکر پر یہ کہنا کہ۔ ”زندگی موت کا کیا بھروسا، ہوسکتا ہے اسے بھی آپ کی زندگی میں داخل ہونے کا کوئی راستہ مل جائے۔“ ڈیرہ اسماعیل خان میں مجھ سے الوداع ہوتے وقت اس نے معافی بھی مانگی تھی۔ رسمی معذرت اور کسی غلطی پر معذرت چاہنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے اور اس وقت اس کا انداز رسمی معذرت والا نہیں تھا۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اسے پلوشہ کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے معلوم تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر مجھے لاعلم رکھا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے میری واپسی پر زور دیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے اس بارے نک سٹیورٹ کی موت سے پہلے ہی پتا چل گیا ہو۔ اور مجھے ذہنی انتشار سے بچانے کے لیے اس نے یہ خبر اپنے تک محدود رکھی ہو۔ اور بعد میں شرمندگی کی وجہ سے اظہار نہ کر سکا ہو۔

ان تمام الجھنوں سے مجھے سردار خان ہی نکال سکتا تھا۔ میں ایک بار سردار کے گھر جا چکا تھا۔ اور اس وقت جو میری دماغی حالت تھی اس کے بعد اورنگ زیب صاحب کی نصیحت پر عمل کرنا ایک مذاق ہی تھا۔ راولپنڈی سے سردار کے گاؤں تک میں اڑھائی تین گھنٹوں میں پہنچ گیا تھا۔ اس کے گھر کے سامنے کار روک کر میں نیچے اترا سہ پہر کے چھے بج رہے تھے۔ دروازے پر دستک دیتے ہی ایک چھوٹا سا لڑکا دروازے پر آیا۔

میں نے پوچھا۔ ”سردار خان گھر پر ہے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں ماموں جان گھر پر ہی ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اندر کی طرف رخ موڑ کر ہانک لگائی۔ ”ماموں جان آپ کا مہمان ہے۔“

دروازے کی طرف کھٹ پٹ کی آواز آئی جیسے کوئی بیساکھیوں پر چل رہا ہو۔ میرا دل جیسے ڈوبنے لگ گیا تھا۔ چھوٹے بچے نے دروازے کا ایک کواڑ کھول لیا تھا اور پھر سردار خان میرے سامنے ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ سن ہو گیا تھا۔ کوئی لفظ منھ سے نکالے بغیر ہم ایک دوسرے کو گھورتے لگے۔ وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گیا تھا۔ دائیں ٹانگ پر گھٹنے سے نیچے پلستر چڑھا ہوا تھا۔ بائیں ٹانگ البتہ محفوظ تھی۔ اس کے چہرے پر اچھی خاصی داڑھی بھی نظر آ رہی تھی۔

''محسن بیٹا، بیٹھک کا دروازہ کھولو۔'' اپنے بھانجے کو کہہ کر وہ میرے قریب ہوا اور پھر وہ میری بانہوں میں تھا۔ چند لمحوں بعد ہم بیٹھک میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں اس سے کوئی سوال پوچھنے کی جرات نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ بھی خاموش بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر اسی خاموشی میں گزر گئی گفتگو کی ابتداء سردار نے کی تھی۔

''لی زونا کی کال آئی تھی، وہ پاکستان آنے کے لیے تیار ہے۔ شاید مہینے ڈیڑھ تک یہاں پہنچ جائے۔'' یہ خوشی کی خبر سناتے ہوئے بھی مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ رو رہا ہو۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔ وہ دوبارہ بولا۔

''اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہے اور اب پاکستان آنے کے لیے کاغذی کارروائی کر رہی ہے۔'' اس کی یہ باتیں ایک ایسی ہی کوشش لگ رہی تھیں جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر کے جان بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی وقت اس کا کم سن بھانجا ٹرے میں شربت کا جگ اور دو خالی گلاس رکھے اندر داخل ہوا بڑی مشکل سے اس نے ٹرے اٹھائی ہوئی تھی۔ ٹرے میز پر رکھ وہ باہر نکل گیا تھا۔ مجھے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی مگر میں نے جگ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

''کیا ہوا تھا؟'' میرے منھ سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔ ابھی تک مجھے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ پلوشہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں کچھ دیر مزید خود کو خوش فہمی میں مبتلا رکھنا چاہتا تھا۔

میری بات سن کر سردار کسی گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔ میری نظریں زمین پر گڑی تھیں۔ اور دل سے دعائیں نکل رہی تھیں کہ سردار کے منھ سے کوئی تسلی آمیز بات نکل جائے۔ وہ کہہ دے کہ بس یار بڑی مشکل سے ہم دونوں

کی جان بچی ہے۔ یا ہم مرتے مرتے بچے ہیں۔ اس طرح کی کوئی بات سننے کے لیے میرا پورا وجود ہمہ تن گوش ہو چکا تھا۔

سردار کی خاموشی طول پکڑنے لگی۔ میں نے بھی اسے بولنے پر نہیں اکسایا تھا بس انتظار کی اذیت کو برداشت کرتا رہا۔

''وہ بہت پرعزم تھی۔ اس مکمل یقین تھا کہ وہ اپنے راجو کی بے گناہی کے ثبوت ضرور حاصل کر لے گی۔ کہتی تھی۔ ''سردار بھائی، جان دے دوں گی مگر ثبوت حاصل کیے بغیر نہیں لوٹوں گی۔''

نصراللہ خان خوجل خیل کے گھر سے ہمیں تمھارے رکھوائے ہوئے ہتھیار مل گئے تھے۔ کمانڈر نصراللہ نے افغانستان کے رستے کی طرف ہماری رہنمائی کر دی تھی انگور اڈے سے ہم سرحد تک پہنچے مگر پھر اس کا ارادہ تبدیل ہو گیا۔ کہنے لگی کہ افغانستان جا کر ٹامک ٹوئیاں مارنے سے بہتر ہے کہ یہاں سے کسی دہشت گرد کے گروپ میں شامل ہو کر وہاں پہنچیں۔ اس طرح البرٹ بروک وغیرہ کو ڈھونڈنے میں آسانی رہے گی۔ اسے سب سے زیادہ امید جینیفر کے ملنے کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جینی اس کی ضرور مدد کرتی۔ سرحد کے قریب جا کر ہم واپس پلٹ آئے تھے۔ اپنی شکل چھپانے کے لیے اس نے ہلکی ہلکی مونچھیں اور داڑھی چہرے پر چپکا کر سر پر پگڑی لپیٹ لی تھی۔ میں نے بال کٹوانے کا مشورہ دیا تو کہنے لگی۔

''بھائی، کیوں اپنے دوست سے پٹوانا چاہتے ہیں۔ راجو نے منع کر دیا ہوا ہے اور آپ جانتے ہیں نا کہ ان کی کسی بات کو ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔''

میرا چہرہ چونکہ دہشت گردوں کے لیے نیا تھا اس لیے میں نے حلیہ تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا منصوبہ شمالی وزیرستان میں دیگان کے ملک گل بدین کے پاس جا کر کام حاصل کرنے کا تھا۔ کیوں کہ اسے معلوم ہوا تھا کہ ملک گل بدین بھی امریکنز کا خاص بندہ تھا۔ اس نے ماموں کے گھر جا کر اپنے دودھ شریک بھائی کے بارے معلومات حاصل کیں کیونکہ اسی کے ذریعے ہم دہشت گردوں میں جگہ بنا سکتے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک ہی دن پہلے تورے خار روانہ ہوا ہے۔ سنائپر رائفل اس کے ماموں کے گھر چھوڑ کر، ہم نے بھی ویگن میں بیٹھ کر تورے خار کا رخ کیا۔ وہ رائفل ہم دہشت گردوں میں جگہ بنانے کے بعد وہاں سے بآسانی لے جا سکتے تھے۔

تورے خار کا ملک فیروز اب صنوبر خان کے بعد دہشت گردوں کا کرتا دھرتا ہے۔لیکن جنوبی وزیرستان میں پلوشہ اور آپ نے بہت کام کیا تھا اس لیے حلیہ تبدیل کرنے کے باوجود وہ ملک فیروز کے پاس کام حاصل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ البتہ اس کی بیٹھک میں ایک بار جا کر اپنے بھائی کا پتا معلوم کرنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ہم دونوں دوپہر کے وقت تورے خار پہنچے تھے۔لیکن اس کی بیٹھک میں گھستے ہی عجیب صورت حال کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔ اسے ایک انوکھا اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ تورے خار کے سردار فیروز خان کے ہمراہ راج پال بیٹھا قہقہے لگا رہا تھا ۔وہی ہندو راج پال جس نے اپنے ساتھ امریکہ میں سنائپر کورس کیا تھا۔جب تک میں اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کرتا اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ پہچانتے ساتھ ہی اس نے فیروز خان سے پوچھا کہ پاکستان آرمی کا جوان اس کی بیٹھک میں کیا کرنے آیا ہے۔

اس کی بات سنتے ہی فیروز خان چونک کر میری طرف متوجہ ہوا اور تب تک میں ایک نتیجے پر پہنچ گیا تھا ۔وہاں گرفتاری دینے کا مطلب خود کو ذبح کرانا ہوتا۔ پلوشہ کو بھی صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔میں نے فوراً کندھے سے لٹکی کلاشن کوف اتار کر سیفٹی لیور برسٹ پر لگاتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔میرا نشانہ راج پال ہی تھا مرنے سے پہلے کم از کم ایک دشمن سے تو جان چھوٹ جاتی۔راج پال چھاتی میں گولی کھا کر تڑپنے لگ گیا تھا ۔فیروز خان کے آدمی ایک لمحے کے لیے ہکا بکا رہ گئے تھے۔اس وقت پلوشہ نے مجھے باہر کی طرف کھینچا اور ہم بھاگ کر بیٹھک سے باہر نکل آئے پیدل بھاگ کر جان بچانا ناممکن تھا اور خوش قسمتی سے وہاں تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ پلوشہ نے فوراً ایک ڈبل کیبن کا شیشہ توڑا اور اندر گھس کر اگنیشن کے تار توڑ کر گاڑی کو سٹارٹ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔اس دوران میں نے بیٹھک کے دروازے سے برآمد ہونے والے دو تین دہشت گردوں کا اپنا شکار بنا چکا تھا۔باقی دروازے کی آڑ ہی سے فائرنگ کا جواب دینے لگے۔پلوشہ نے ڈبل کیبن سٹارٹ کرتے ہی میرے لیے اگلی نشست کا دروازہ کھولا اور میرے بیٹھتے ہی گاڑی بھگا دی۔اس ڈبل کیبن کے ساتھ کھڑی ہوئی دو گاڑیوں کے ٹائر پھاڑ کر میں نے وقتی طور پر ناکارہ کر دیا تھا۔مگر ان کے پاس بیٹھک میں اور گاڑیاں موجود تھیں۔ دشمن کی تین گاڑیاں ہمارے تعاقب میں تھیں۔ پلوشہ بڑی مہارت سے گاڑی بھگائے جا رہی تھی۔میرے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ ہم کسی قابل خان محسود کے پاس وشلام جا رہے ہیں۔تینوں گاڑیاں

پوری کوشش کے باوجود ہمارے قریب نہیں پہنچ پائی تھیں۔وہ بلاشک وشبہ ایک بہترین ڈرائیور تھی۔لیکن پھر ہماری بدقسمتی کا ظہور ہوا۔اس وقت ہم وشلام کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے اور بالکل ٹھیک جارہے تھے کہ اچانک سڑک پر ایک چھوٹا بچہ اچانک ہی ہماری گاڑی کے سامنے آیا، پلوشہ نے اسٹیرنگ کو بائیں جانب کاٹا، گاڑی کچی سڑک کے کنارے ایک بڑے پتھر سے ٹکرائی اور لڑھکیاں کھاتے ہوئے نشیب میں گرنے لگی ۔میرے دماغ میں جو آخری احساس زندہ ہے وہ یہی ہے کہ میں نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگائی تھی۔اس کے بعد میری آنکھ ہسپتال میں کھلی تھی۔میرے سر پر گہری چوٹ لگی تھی اور مجھے قریباً مہینے بعد ہوش آیا تھا۔میں پشاور کے ایک اچھے ہسپتال میں داخل تھا۔مجھے وہاں لے کر آنے والا قابل خان محسود تھا۔وہ پلوشہ کا منہ بولا بھائی تھا۔اسی کی زبانی مجھے باقی کے واقعات معلوم ہوئے۔حادثہ ہوتے ہی وہاں لوگ اکٹھے ہوگئے تھے۔دشمن شاید ہماری موت کی تسلی کر کے ہی وہاں سے ہٹتے مگر میری خوش قسمتی کہہ لو کہ وشلام کے لوگوں نے پلوشہ کو فوراً ہی پہچان لیا تھا۔وہ حادثے کے بعد بھی ہوش میں تھی۔وہ سب سے پہلے ہمیں وانہ لے گئے مگر وہاں کوئی خاص ہسپتال تو موجود نہیں ہے اس لیے ایمبولینس کروا کر بنوں اور پھر وہاں سے صاف جواب ملنے پر پشاور لے آئے تھے۔وہ حادثے کے ہفتہ بعد تک زندہ رہی اور پھر............'' سردار نے آنکھوں میں آئی نمی صاف کی اور گلوگیر لہجے میں بولا۔''اس نے قابل خان کو بتا دیا تھا کہ وہ اپنی بہن سپوگمائے کے پہلو میں دفن ہونا چاہتی ہے۔ہوش میں آتے ہی مجھے قابل خان نے ساری بات تفصیل سے بتلائی۔اس نے شناختی کارڈ کے ذریعے میرے گھر والوں کا پتا معلوم کرنے کی کوشش کی تھی مگر میری جیب میں تو نقلی شناختی کارڈ تھا اس لیے اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔پلوشہ بھی حادثے کے بعد تھوڑی دیر تو ہوش میں تھی لیکن اس کے بعد وہ مسلسل بے ہوش رہی تھی۔بس ہمیں چھوڑنے کے فیصلے پر عمل کرتے وقت اسے چند لمحوں کے لیے ہوش آیا اور قابل خان کے سامنے اپنے دفن کی وصیت کر کے وہ چلی گئی۔کبھی نہ آنے کے لیے۔میں نے ہوش میں آتے ہی اورنگ زیب صاحب سے بات کی وہ میرے واپس نہ آنے کی وجہ سے پریشان تھے۔اس کے حکم پر مجھے فوراً ہی سی ایم ایچ پشاور میں منتقل کر دیا گیا تھا۔میں نے قابل خان کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کیا۔میری ٹانگ وغیرہ پر تو سول ہسپتال والوں نے پلستر چڑھا دیا تھا۔سی ایم ایچ والوں نے مجھے چند دن رکھ کر سک لیو (فوج میں کسی بڑی بیماری یا حادثے وغیرہ کا شکار

ہونے والے شخص کو ملنے والی چھٹی) پر گھر بھیج دیا۔ اور تب سے میں یہیں ہوں۔‘‘

سردار کی بات ختم ہو چکی تھی۔ میں کہیں دور خلا میں دیکھ رہا تھا۔ نہ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور نہ دماغ کسی سوچ پر مرتکز، جانے میں کیا سوچ رہا تھا۔

’’راجے!‘‘ سردار نے مجھے آواز دی۔

میں نے غائب دماغی سے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی، مگر منھ سے کچھ نہ بولا۔

’’راجے وہ چلی گئی ہے یار، میری چنارے کی طرح تمھاری پلوشہ بھی چلی گئی ہے۔ پتا نہیں یہ عورتیں ایسا کیوں کرتی ہیں۔ جب انھیں پتا چل جاتا ہے کہ ان کے بغیر شوہر کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا تو اپنی اہمیت جتانے کے لیے یہ مرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔‘‘

میں کچھ نہیں بولا تھا۔ سردار بتانے لگا......’’اس نے اپنی موت کی خبر ماں اور آپ کے گھر والوں تک پہنچانے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے واضح انداز میں بتا دیا تھا کہ سب سے پہلے اس کی موت کی بابت تمھیں اطلاع دی جائے اور پھر باقی تمام کو آپ خود ہی بتا دیں گے۔ جب قابل خان محسود نے تمھارا پتا کرایا تو اسے معلوم ہوا کہ تم دو تین دن پہلے ہی افغانستان چلے گئے ہو۔ وہ تمھارے گھر جا کر پلوشہ کی ماں کو ملا تھا۔ بہانہ اس نے یہ بنایا تھا کہ پلوشہ اس کے پاس تھوڑا سامان چھوڑ کر آگے افغانستان چلی گئی ہے۔ تبھی پلوشہ کی ماں نے اسے تمھارے افغانستان جانے کے بارے بتا دیا۔ اس کے بعد اسے تو ہمت نہ ہوئی تمھارے گھر والوں کو اطلاع دینے کی اور نہ مجھے ہمت ہوئی۔ کیونکہ جب مجھے ہوش آیا تو وہ کب کی دفن ہو چکی تھی۔‘‘

میرے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا تھا۔ میرے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ ایک دفعہ پہلے بھی وہ مجھے چھوڑ چکی تھی اور اب دوبارہ اس نے وہی کیا تھا۔ پہلے بھی وہ اپنی ماں اور بھائی کی وجہ سے مجبور تھی اور اب اس کے پاس مہلت ختم ہو چکی تھی۔

مجھے مسلسل چپ دیکھ کر سردار خان نے کہا۔’’یار کچھ تو بولو خاموش کیوں ہو؟‘‘

لیکن میرے پاس الفاظ ختم ہو چکے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سردار کو کیا کہوں، گلہ کروں یا تسلی دوں۔ کوسوں یا نظر انداز کر دوں۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن انسان کو دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کوئی ہدف تو

چاہیے ہوتا ہے۔اپنے نقصان کا ذمہ دار کسی کو تو ٹھہرانا ہوتا ہے۔موت ایک اٹل حقیقت ہے،لیکن دل و دماغ تو موت سے بچنے کے کئی بہانے تراشتے ہیں،اگر یوں نہ کیا ہوتا تو یوں ہو جاتا اور وہاں نہ گیا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔یہ کر لیا ہوتا تو جان بچ سکتی تھی وغیرہ۔حالانکہ یہ سب بس پچھتاوے کو بڑھانے والی باتیں ہیں۔

''میں بے قصور ہوں راجا۔میں بے بس ہو گیا تھا،میں اسے کبھی مرنے نہ دیتا دنیا کی ہر طاقت سے ٹکرا جاتا مگر افسوس عزائیلؑ سے تو مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔''

میں چپ چاپ اٹھ کر بیٹھک کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔سردار نے مجھے پکار کر روکنے کی کوشش کی مگر میں دروازے سے باہر نکل کر کار میں بیٹھ گیا۔اس کے بیٹھک کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے میں کار آگے بڑھا چکا تھا۔اور پھر مجھے معلوم نہ ہوا کہ کیسے میں بغیر کسی حادثے کے گھر تک پہنچا تھا۔منتشر سوچیں،بکھرے خیال ،اذیت بھرے احساسات ،آنکھوں سے بہتا پانی اور درد و غم سے بوجھل دل کے ساتھ ڈرائیونگ کرنا اتنا بھی آسان نہیں تھا۔گھر کا دروازہ بند تھا دستک کے جواب میں ابو جان نے دروازہ کھولا تھا اور ان کی شفقت بھری آغوش میں سر چھپاتے ہی میرے بند ہونٹوں سے درد بھری سسکیاں برآمد ہوئیں۔ابو جان گھبرا گئے تھے۔

''کیا ہوا بیٹا۔''ابو جان کی آواز میں چھپے اندیشے غیر متوقع نہیں تھے۔

''وہ چلی گئی ہے ابو جان،وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔اس کے ساتھ نبھانے کے سارے وعدے اور قسمیں جھوٹی تھیں۔تمام عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔''

ابو جان نے مجھے زور سے اپنے ساتھ بھینچتے ہوئے پوچھا۔''کہاں چلی گئی ہے،بیٹا کس کے ساتھ گئی ہے؟''

میں نے اذیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔''اکیلی ہی گئی ہے ابو جان،ایسی جگہ جہاں سے کوئی لوٹا نہیں کرتا۔''

ہم دروازے کے سامنے ہی کھڑے تھے۔موسم ایسا تھا کہ گھر والوں نے چارپائیاں صحن میں بچھائی ہوئی تھیں۔ابو جان مجھے ساتھ لپٹائے ہوئے چارپائیوں کی طرف بڑھ گئے۔اگلے دو تین لمحوں میں پلوشہ کی ماں اور پھوپھو جان کو پلوشہ کی موت کے بارے معلوم ہو چکا تھا۔پھوپھو جان دھاڑیں مارتی ہوئی مجھ سے آن لپٹی تھی ۔آن کی آن میں تمام ماحول ماتم زدہ ہو گیا تھا۔صرف پلوشہ کا معصوم بھائی عدیل بے خبر پڑا سو رہا تھا۔اس کے

علاوہ رات بھر کوئی بھی نہیں سویا تھا۔ میں گھٹنوں پر سر ٹیکے بند آنکھوں سے اس کے ساتھ گزرے لمحات کو فلم کی طرح دیکھتا رہا۔ کوئی پل بھی تو مجھے نہیں بھولا تھا۔ جس وقت وہ پہلی بار میرے سامنے آئی اور جب میں نے آخری بار اسے گلے سے لگاتے ہوئے اس کی کشادہ جبیں پر آخری بار مہر محبت ثبت کی۔ ان لمحات کے درمیان میں موجود ہر لمحہ، ہر پل اور ہر گھڑی میری یادداشت میں محفوظ تھی۔ اس کے پیارے ہاتھوں نے میرے جسم کو جس جس جگہ پر چھوا تھا اس لمس کی گرمی اب تک تازہ تھی۔ اس کے سانسوں کی مہکتی خوشبو اس وقت بھی میری قوت شامہ محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی مدھر آواز میری سماعتوں میں زندہ تھی۔ اس کا چاند سا روشن مکھڑا میری بصارتوں کے سامنے تھا ۔اس کی شوخیاں، شرارتیں، محبت بھرے گلے شکوے، ناز و ادا کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا۔ اور بھول بھی کیسے سکتا تھا ،کوئی سانس لینا بھی بھول سکتا ہے کیا......

میں ایک پل بھی جو بھولوں تجھے تو مر جاؤں

تمھاری یاد کا پہرہ ہے میرے سانسوں پر

صبح کی اذان سن کر ابو جان نے میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

’’نماز پڑھ لو بیٹا۔‘‘ اور میں خاموشی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ وضو کر کے ہم مسجد کی طرف بڑھ گئے تھے۔ واپسی پر عدیل جاگ گیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ خوشی سے چہکتا ہوا میرے ساتھ لپٹ گیا تھا۔ وہ پلوشہ کو بہت پیارا تھا۔ اس کے سرخ و سفید ملائم گالوں کو پلوشہ کے حیات آفریں لبوں سے اتصال کی سعادت ہزاروں بار حاصل ہو چکی تھی۔ میں بے ساختہ اسے چومنے لگا۔ اس معصوم کو کچھ پتا نہیں تھا کہ گھر پر کیا قیامت بیت چکی تھی ۔اس نے چھوٹتے ہی اپنی باجی کا پوچھا تھا۔ میں اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

’’میرا بیٹا اسکول جاتا ہے یا نہیں۔‘‘

’’ہاں لالا جان، اسکول تو جاتا ہوں اور اب مجھے پنجابی میں بات کرنا بھی آ گیا ہے۔‘‘ اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

’’تو کس کلاس میں ہو۔‘‘ میں اس کا ذہن بٹانے کے لیے مسلسل سوال کرنے لگا تا کہ اسے سوال کا موقع نہ ملے۔ اسی دوران پھوپھو جان اس کے لیے ناشتا لے آئی تھی۔ پلوشہ کی ماں گھٹنوں میں سر دیے گم سم بیٹھی تھی

۔پلوشہ اس کی بیٹی نہیں بیٹا تھی۔وہ بہت، ہمت، جرات اور حوصلے والی تھی۔اس نے ہمیشہ ماں اور چھوٹے بھائی کی حفاظت کی تھی۔اور اب وہ نہیں رہی تھی یقیناً مستقبل کے اندیشے بھی اس کے ذہن میں موجود ہونا تھے کہ پلوشہ کے جانے کے بعد اس کا ہمارے گھر میں رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔یہ اور بات کہ میں انھیں کسی صورت گھر سے دور جانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔پلوشہ اپنے چھوٹے بھائی کو اعلا تعلیم دلانے کی خواہش مند تھی اور اس کی یہ خواہش میں ہر صورت میں پوری کرنا چاہتا تھا۔

پھوپھو جان سے ناشتا لے کر میں عدیل کو ناشتا کرانے لگا۔اس نے ایک بار پھر اپنی باجی کے بارے میں پوچھا، جسے میں آئیں بائیں میں ٹال گیا۔اسے تیار کرا کے میں نے اسکول بھیج دیا۔دوپہر تک پلوشہ کی موت کی خبر پورے محلے میں پھیل گئی تھی۔مرد بیٹھک میں آ کر تعزیت کرنے لگے جبکہ عورتوں کی آمد سے ہمارا صحن بھر گیا تھا ۔میں کمرے میں گھسا رہا۔یہ وہی کمرہ تھا جہاں میں نے اسے آخری بار گلے لگایا تھا۔اس وقت وہ دلھن کے روپ میں قیامت ڈھا رہی تھی۔اس کی ریشمی کلائیوں میں کنگن پہنا کر میں نے اسے تسلی دی تھی۔وہ میرے ساتھ چلنے پر بہ ضد تھی۔

میں نے حسرت بھرے لہجے میں سوچا۔''میں اسے ساتھ لے گیا ہوتا تو شاید وہ بچ جاتی۔''

حجلہ عروسی کو پھوپھو جان نے خوب سجایا تھا۔اور اب تک وہ سجاوٹ اسی طرح موجود تھی۔میرے جانے کے بعد پلوشہ نے گھر میں چند دن سے زیادہ نہیں گزارے تھے۔اس کے باوجود وہ بیڈ اس کے بدن کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔سہ پہر کو اویس اپنی بیوی ارم کے ساتھ میرے کمرے میں آ گیا۔میاں بیوی نے دکھی دل کے ساتھ تعزیت کی، مجھے حوصلہ دیا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر ہمدردی بھرے کلمات سے مجھے تسلی دے کر رخصت ہو گئے۔

☆......☆......☆

غم جتنا بھی بڑا ہو، سدا نہیں رہتا، دکھ کتنا ہی زیادہ ہو وقت کی گرد اسے اپنی لپیٹ میں لے کر بھولا بسرا کر دیتی ہے۔اذیت کی انتہا اگر وقت بیتنے کے ساتھ راحت میں نہیں بھی ڈھلتی تب بھی اذیت میں پہلے جتنا دم خم باقی نہیں رہتا۔بچھڑنے والا جتنا بھی پیارا ہو اس کے دور جانے کی حقیقت کو تسلیم کر لینا پڑتا ہے۔آہستہ آہستہ ہم لوگوں کو بھی پلوشہ کی جدائی کا دکھ جھیلنے کی عادت ہو گئی تھی۔میری چھٹی پوری ہو گئی تھی مگر میں واپس جانے پر تیار

نہیں تھا۔راؤ تصور صاحب نے کمانڈنگ آفیسر سے بات کر کے مجھے یونٹ کی طرف سے دو ماہ کی مزید چھٹی دلوا دی تھی ۔دوست احباب مجھے ملنے اور تسلی دینے آئے تھے۔اورنگ زیب صاحب نے بھی آ کر تعزیت کی تھی ۔واپس جاتے ہوئے میں نے کار کی چابی شکریے کے ساتھ ان کے حوالے کر دی تھی۔

ایک دن پلوشہ کی ماں گل ناز مجھ سے واپس جانے کی اجازت مانگ رہی تھی۔

”بیٹا، میں چاہتی ہوں اپنے بھائی کے پاس انگور اڈے پر چلی جاؤں۔“

میں نے پوچھا۔”یہاں کوئی تکلیف ہے ماں جی؟“

وہ دکھی لہجے میں بولی۔”تکلیف تو کوئی نہیں ہے بیٹا، مگر اب ہم کس رشتے سے یہاں رہیں گے۔“

میں زخمی لہجے میں بولا۔”تو آپ کا کیا خیال ہے اس بے وفا کے جانے سے ہمارے سارے رشتے ٹوٹ گئے ماں جی۔“

”پھر بھی بیٹا......؟“انھوں نے کچھ کہنے کے لیے منھ کھولنا چاہا میں فوراً قطع کلامی کرتا ہوا بولا۔

”ماں جی، آج کے بعد اگر کچھ ایسا کہا تو سچ میں خفا ہو جاؤں گا۔اور آپ یقیناً نہیں جانتیں کہ ہم دونوں بہت پہلے شادی کر چکے تھے۔بعد والی شادی تو بس آپ، ابو جان اور پھوپھو جان کی خاطر کر رہے تھے۔اور پتا ہے اس نے اپنے علاقے کے رواج کے مطابق کتنی رقم کا مطالبہ کیا تھا۔“پلوشہ کی بات ذہن میں آتے ہی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی تھی۔”پورے پچاس لاکھ۔اور وہ رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع ہے۔اس کی ساری رقم آپ کی اور عدیل ہی کی تو ہے۔اور یہ رقم آپ کی ضروریات کے لیے کافی سے بھی کچھ زیادہ ہے۔وہ عدیل کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی تھی۔کیا آپ چاہتی ہیں کہ میں عدیل کو واپس انگور اڈے بھیج کر اس کی روح کے سامنے شرمندہ ہو جاؤں۔“

”بیٹا میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ان کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی تھی۔

ان کا ہاتھ پکڑ کر میں لبوں سے لگاتا ہوا بولا۔”آپ پلوشے کی ماں ہیں اور اس کی ہر چیز سے مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی اس سے تھی۔آپ میری بھی ماں ہیں۔کبھی دل میں ایسی ویسی بات کو جگہ نہ دینا۔اس گھر پر آپ کا اتنا ہی حق ہے جتنا میرا یا ابو جان کا ہے۔یہ پلوشہ کا گھر ہے۔وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے میں نے اسے نہیں

چھوڑا۔‘‘

’’جیتے رہو بیٹا۔‘‘اس نے دستِ شفقت میرے سر پر رکھ دیا تھا۔

یہ مقدس ہاتھ جانے کتنی بار انھوں نے میری پلوشے کے سر پر بھی رکھا ہوگا۔سکون اور اطمینان میرے رگ و پے میں اتر گیا تھا۔میں ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔’’یہ شفقت بھرا ہاتھ کبھی بھی میرے سر سے نہ ہٹانا ماں جی۔‘‘

☆......☆......☆

فوجی کی عام دنوں کی چھٹی پر لگا کر گزرتی ہے۔مگر اب پلوشہ کی جدائی میں میرا ہر دن صدیوں کی مسافت پر مشتمل ہوگیا تھا اس کے باوجود چھٹی کے تین ماہ بیت چکے تھے۔میں واپس یونٹ پہنچا۔دوست احباب ایک بار پھر تسلی دینے اور حوصلہ بڑھانے میرے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔سردار بھی یونٹ واپس پہنچ گیا تھا۔ایک بار وہ میرے گھر بھی آچکا تھا لیکن نا معلوم کیوں میں نے اس سے بات چیت کرنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔وہ کئی بار اپنے ناکردہ جرم کی معافی مانگ چکا تھا،مگر میں خاموش رہ کر اس کی ہر کوشش کو نظر انداز کر دیتا تھا۔اس کی ٹانگ کا پلستر اتر چکا تھا لیکن ابھی تک وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو سکا تھا۔یونٹ واپسی کے دو تین دنوں تک مجھے کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ایک رات مجھے حکم ملا کہ اگلے دن میری کمانڈنگ آفیسر کے سامنے پیشگی ہے۔

صبح نو بجے میں کمانڈنگ آفیسر کے دفتر میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے سب سے پہلے پلوشہ کی موت کی تعزیت کی اور اس کے بعد بتایا کہ چونکہ انھیں ہائی کمانڈ کی طرف سے سختی سے مجھے سزا سنانے کا حکم ملا تھا اس وجہ سے انھوں نے میرا حوالداری کا رینک توڑ کر مجھے دوبارہ سپاہی بنا دیا تھا۔مجھے نہ تو رینک کا شوق تھا اور نہ میں مزید نوکری کرنا چاہتا تھا۔اس لیے میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

’’سر،میں ڈسچارج ہونا چاہتا ہوں۔کیوں کہ اب میں خود کو مزید پاک آرمی کی خدمت کے قابل نہیں سمجھتا۔‘‘

’’شاید تم رینک ٹوٹنے کی وجہ سے دل گرفتہ ہو۔‘‘انھوں نے خیال ظاہر کیا۔’’اگر ایسا ہے تو فکر نہ کرو ایک سال کے اندر میں تمھیں دوبارہ حوالدار بنا دوں گا۔لیکن فی الحال تمھارا رینک توڑنا ضروری تھا کیوں کہ نادانستگی

ہی میں سہی تم آرمی کا قانون توڑنے کے مجرم ہو۔“

”نہ تو مجھے اپنے جرم سے انکار ہے اور نہ میں مجھے رینک ہی کا شوق ہے۔بس اب میں خود کو نوکری کرنے کے قابل نہیں سمجھتا اس لیے بہتر ہوگا کہ مجھے باعزت ڈسچارج کر دیا جائے۔“میں نوکری چھوڑنے پر مصر تھا۔

”جاؤ، فی الحال آرام کرو اور جتنی چھٹی کی ضرورت ہو لے لو۔اس بارے بعد میں بات کریں گے۔“انھوں نے میری خواہش پر ذرا بھر دلچسپی کا اظہار کیے بغیر مجھے جانے کا اشارہ کیا۔اور میں سیلوٹ کر کے ان کے دفتر سے نکل آیا۔

گھنٹے ڈیڑھ بعد ہی استاد راؤ تصور صاحب، استاد فیاض، استاد بدرالدین اعوان، استاد اشفاق تنولی اور میرے دوسرے استادوں نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔تمام نے کھل کر میرے فیصلے کو رد کیا۔اور بجائے منت کے یہ حکم دیا کہ اگر میں نے ڈسچارج ہونے کی باقاعدہ درخواست دی تو وہ درخواست فوج سے ڈسچارج ہونے کی نہیں ان سے تعلق توڑنے کی درخواست ہوگی۔اپنے ان استادوں سے میرا تعلق ایسا نہیں تھا کہ میں ان کا حکم ٹال سکتا۔انھیں مجھ پر کوئی مان تھا تو انھوں نے منت کے بجائے دھونس دھمکی سے کام لیا تھا۔میں نے ان کے حکم کے آگے خاموشی سے سر جھکا دیا تھا۔

شام کو حوالدار میجر نے مہینا چھٹی کی راہداری میرے حوالے کی۔جو میں نے شکریے کے ساتھ واپس لوٹا دی تھی۔گھر جا کر میں پلوشہ کی یادوں سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔جبکہ وہاں تمام دن اور رات کا بیشتر حصہ دوست احباب کی معیت میں گزرتا تھا اس لیے دشمن جاں کی یادوں سے کچھ افاقہ رہتا۔ورنہ تو وہ ہر لمحہ میرے پاس ہی موجود رہتی۔اسے ہمیشہ مجھ سے بچھڑنے کا خوف ستاتا رہتا تھا۔مجھ سے دور جانے کے خیال سے وہ اکثر رات کو اٹھ کر مجھ سے لپٹ جاتی۔اور اس وقت ساتھ نبھانے کی ساری قسمیں اور وعدے مجھے دہرانا پڑتے۔یوں گویا اسے میں نے ہی چھوڑ کر جانا ہے وہ کبھی ایسا کام نہیں کرے گی۔اور جب وقت آیا تو خود ہی سارے وعدے اور قسموں کو پاؤں کی ٹھوکر میں اڑا کر اتنی دور چلی گئی جہاں تک میری سوچ کی رسائی بھی ممکن نہیں تھی۔ایک بار اس نے میری گود میں سر رکھ کر ایک نظم گنگنائی تھی۔اس کی مدھر آواز میں سنائی ہوئی نظم مجھے آج بھی ایسے ہی یاد تھی جیسے گھڑی بھر پہلے کی بات ہو......

اگر کبھی میری یاد آئے

تو چاند راتوں کی نرم رنگین روشنی میں،

کسی ستارے کو دیکھ لینا

اگر وہ نخلِ فلک سے اڑ کر تمہارے قدموں میں آگرے تو

یہ جان لینا وہ میرا دل تھا

اگر نہ آئے؟

مگر یہ ممکن ہی کس طرح ہے

کہ تم کسی پر نگاہ ڈالو اور اس کی دیوارِ جاں نہ ٹوٹے

وہ اپنی ہستی نہ بھول جائے

گریز کرتی ہوا کی لہروں پہ ہاتھ رکھنا

میں جنبشوں میں تمھیں ملوں گی

تم اوس قطرے کے آنسوؤں میں تلاش کرنا

میں وسعتوں میں تمھیں ملوں گی

اگر اوس قطرے کے آنسوؤں میں نہ پاؤ مجھ کو

تو اپنے قدموں میں دیکھ لینا

کہیں پہ روشن چراغ دیکھو تو جان لینا

ہر اک پتنگے کے ساتھ میں بھی بکھر چکی ہوں

تم اپنے ہاتھوں سے ان پتنگوں کی راکھ دریا میں ڈال دینا

میں، سمندروں میں سفر کروں گی

کسی نہ دیکھے ہوئے جزیرے پہ رک کے تم کو صدائیں دوں گی

سمندروں کے سفر پہ نکلو تو اس جزیرے پہ بھی اترنا۔

نہ جانے وہ کس جزیرے پر رک کر مجھے صدائیں دے رہی تھی کہ اس کی صدائیں میری سماعتوں تک ہی نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔

☆......☆......☆

تربیتی مشقیں فوج کی روزمرہ ہے۔ذہن بٹانے کے لیے میں بھی تربیتی مشقوں میں حصہ لینے لگا تھا۔نئے سنائپرز کو تربیت دے کر میں گویا استاد کے درجے پر ترقی پا گیا تھا۔میرے عملی تجربات ایسے تھے کہ استاد تصور بھی مجھ سے مشورہ لے کر میری عزت افزائی کرتے رہتے۔دن بھر کی سخت تربیتی مشقوں کے بعد راتوں کو اچھی خاصی نیند آتی۔البتہ کبھی کبھار پلوشہ میرے خوابوں کو رونق بخشنے آجاتی۔ایک رات وہ میرے خواب میں آئی تو خفا خفا سی تھی۔

کیا ہوا چندا؟''اس کی ناراضی بھری نگاہوں کی تاب لانا میرے لیے کہاں ممکن تھا۔

''آپ میرے سردار بھائی سے خفا کیوں ہیں؟''

''تمھیں نہیں معلوم۔''

''اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔''

''اگر اس نے تمھیں گھر واپس بھیج دیا ہوتا اور اکیلا میری بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنے جاتا تو کبھی بھی یہ حادثہ پیش نہ آتا۔''

اس نے منھ بنایا۔''آپ کے خیال میں میں نے ان کی بات فوراً مان جانی تھی ہے نا......اور یہ آپ کو کس نے کہا انھوں نے مجھے واپس بھیجنے کی کوشش نہیں کی۔''

''مگر......''

''چھوڑیں اگر مگر کو اور ابھی اٹھ کر ان سے خفگی دور کریں۔''اس کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی تھی۔کمرے میں چلنے والے پنکھے اور رائیر کولر اگست کی گرمی سے لڑنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔میں نے اٹھ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی سردار کی چارپائی مجھ سے تین چار پائیوں کے فاصلے پر پڑی تھی۔کروٹوں کا تسلسل اس کے جاگنے کو ظاہر کر رہا تھا۔ہاتھ والا پنکھا تکیے کے نیچے سے نکال کر میں اس کی چارپائی کی طرف بڑھ گیا

۔دیوار سے ٹنگی گھڑی رات کے دو بجنے کا اعلان کر رہی تھی۔اس کی چارپائی کے سامنے رکتے ہوئے میں دھیمے لہجے میں بولا۔''اگر نیند نہیں آرہی تو باہر چلتے ہیں۔''

میرے اندازے کے مطابق وہ جاگ ہی رہا تھا۔فوراً اٹھ بیٹھا۔پاؤں میں چپل ڈالتے ہوئے وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔''اچھا مشورہ ہے۔''

ہم دونوں لان میں لگے سنگی بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔سردار میرے ماضی کے رویے کا ذکر کیے بغیر یوں گپ شپ کرنے لگا جیسے ہمارے درمیان کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''تمھارا بھتیجا سلطان بہت شرارتی ہو گیا ہے یار!......اور اب اسے نئی ماں کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگی ہے۔''

''اس دن تم لی زونا بہن کے بارے کچھ کہہ رہے تھے۔''

اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔''پرسوں آرہی ہے،میں بھی کل چھٹی لے کر جارہا ہوں۔''

میں نے پوچھا۔''شادی کے بارے کیا سوچا ہے؟''

وہ ہنسا۔''دس دنوں کی چھٹی جارہا ہوں،کوشش یہی ہوگی کہ کوئی دن ضائع نہ جائے۔''

''کیوں ائیرپورٹ پر نکاح خواں کو بھی ساتھ لے جارہے ہو؟''

''نہیں وہ گھر میں بیٹھ کر ہمارے آنے کا انتظار کریں گے۔''

میں نے کہا۔''اس کا مطلب مجھے بھی اپنی چھٹی کا بتادینا چاہیے۔''

وہ اطمینان سے بولا۔''میں بتا چکا ہوں۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔''کب؟''

''آج ہی حوالدار میجر کو بتایا ہے۔کیوں کہ میں جانتا تھا کہ لی زونا کی آمد کا سن کر تم ضرور میرے ساتھ چلو گے۔''

''صحیح کہا۔''میں نے اثبات میں سرہلا دیا تھا۔ہم گھنٹا ڈیڑھ وہیں بیٹھے گپیں ہانکتے رہے۔اور پھر مچھروں کی مسلسل یلغار سے تنگ آکر وہ بارک میں گھس گیا۔جبکہ میں وہیں بیٹھا رہا۔سردار خان ایک مخلص دوست تھا

۔اس نے میرے پچھلے دنوں کے رویے کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اچانک میرے دماغ میں جینی کا خیال ابھرا۔ میں نے کلائی سے بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی صبح کے چار بج رہے تھے۔ گویا ان کے پاس شام کے چھے سات بجے کا وقت ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ نیویارک کا وقت ہم سے قریباً نو گھنٹے پیچھے ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنی یادداشت کھنگالی ذرا سی کوشش سے اس کا نمبر مجھے یاد ہو گیا تھا۔ موبائل فون نکال کر میں اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد کال وصول کر لی گئی تھی۔ میں نے اس کی حیرانی بھری۔ ''ہیلو۔'' کے جواب میں پوچھا۔

''جینی کیسی ہو؟''

''زی......'' اس نے مجھے پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگایا تھا۔ ''شکر ہے تمھیں میری یاد بھی آ گئی۔ جانے کب سے تمھاری کال کا انتظار کر رہی ہوں۔ تمھیں اپنی شادی پر بلانا تھا مگر تمھاری کال ہی نہ آئی مجبوراً مجھے تمھارے بغیر ہی شادی کرنا پڑی۔ مہینا ہو گیا ہے میری شادی کو۔'' وہ پرجوش لہجے میں بولتی گئی۔

میں نے اس کے نام کو مزید مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ''مبارک ہو جی!''

''شکریہ زی!......''

''اچھا کیسا ہے؟''

''بہت محبت کرتا ہے۔ اتنا خیال رکھتا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ اس وقت بھی باورچی خانے میں گھسا رات کا کھانا بنا رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اسی لیے تو کہتا تھا کہ کسی ہم مذہب اور ہم تہذیب سے شادی کر لو مزے کرو گی۔''

''زی! میں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی۔ اور اتنا تو تم جانتے ہو کہ میں کیا چاہتی تھی۔ اور سچ کہوں تو میری دلی تمنا اب بھی وہی ہے۔''

''اگر باورچی خانے میں کھانا بنانے والے شوہر صاحب نے تمھاری بے ہودہ بات سن لی تو دیگچہ تمھارے سر میں دے مارے گا۔''

''اسے میں تمھارے بارے سب کچھ بتا چکی ہوں وہ تمھاری اس آفت کی پرکالہ کی طرح نہیں ہے۔'' اس

نے پلوشہ کا ذکر کرتے ہوئے گویا میرے دل کے زخم کریدے۔" ویسے کیسی ہے اور کیا اسے معلوم ہے کہ تم مجھ سے بات کر رہے ہو؟"

میں اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے پایا تھا۔ مجھے خاموش پا کر اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"زی، کیا ہوا خیریت تو ہے نا؟" نہ جانے کیسے اسے میری خاموشی سے کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔

"جینی!......وہ نہیں رہی۔" یہ مشکل مختصر سا فقرہ میرے حلق سے برآمد ہوا۔

"کیا مطلب نہیں رہی۔" وہ حیرانی سے چیخ پڑی تھی۔

"تمھیں بتایا تھا نا کہ وہ میری بے گناہی کے ثبوتوں کے حصول کے لیے مجھ سے پہلے نکلی تھی۔ بس اسی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ اور جانتی ہو مرنے سے دو تین دن پہلے وہ تمھیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ تم اس کی مدد ضرور کرو گی۔"

"میں اس کی مدد ضرور کرتی زی، وہ بہت پیاری تھی۔ سچ کہوں تو مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اس قابل تھی کہ اسے چاہا جاتا۔" جینی کی آواز میں شامل دکھ مصنوعی نہیں تھا۔

"اچھا چھوڑو اس کے ذکر کو۔ کوئی اور بات کرو۔"

وہ خلوص بھرے لہجے میں بولی۔" زی اگر کہو تو میں تمھارے پاس آ جاتی ہوں یا تمھیں امریکہ بلوا لیتی ہوں۔ اور یقیناً میں اب بھی اپنے شوہر کو طلاق دے سکتی ہوں۔"

"جینی میں جانتا ہوں کہ تم مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہو اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مجھے بھی تم اتنی ہی پیاری ہو۔ لیکن اپنے تعلق کے بارے میں تمھیں پہلے بھی تفصیل سے بتلا چکا ہوں۔ تم ہمیشہ میری بہت اچھی دوست رہو گی ایسی دوست جسے میں بہت زیادہ محبت کرتا تھا اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔"

اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔" زی، تم اس کے لیے بہت زیادہ روتے ہو نا؟"

میں پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔" نہیں، بس کبھی کبھی۔"

"اچھا یاد آیا تم نے بے چارے نک سٹیورٹ کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔" اس نے ایک دم موضوع تبدیل کر دیا۔

”تم تک یہ بات پہنچ گئی تھی۔“

”جب اسے گولی لگنے کی بات مجھ تک پہنچی میں سمجھ گئی تھی کہ یہ زی کا کام ہے۔ بعد میں لورا براؤن سے بھی ملاقات ہوئی تھی اور اس نے تصدیق کر دی کہ نک سٹیورٹ، ایس ایس کی گولی کا نشانہ بنا ہے۔ وہ تم سے بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔ جب اسے میرے اور تمھارے تعلق کے بارے معلوم ہوا تو کافی دیر تمھارے بارے گپ شپ کرتی رہی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔”ویسے اسے کس خوشی میں زندہ چھوڑ دیا تھا؟“

میں نے اجمالاً اسے زندہ چھوڑنے کی وجہ بیان کر دی۔

بہر حال وہ کسی اور خوش فہمی میں تھی۔“

میں نے شرارتی لہجے میں پوچھا۔”ویسے دکھنے میں کیسی ہے؟“

وہ فوراً بولی۔”مجھ سے خوب صورت ہے۔“

میں اعتماد سے بولا۔”یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔“

اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔”کیوں، مجھ سے کوئی لڑکی خوب صورت نہیں ہو سکتی۔“

”ہاں۔“

”کیا پیلا وشہ بھی نہیں۔“

”اس کا ذکر کرنا ضروری تھا۔“ میں نے ناراض لہجے میں اسے جھڑکا۔

وہ فوراً بولی ۔”معافی چاہتی ہوں ۔اور لورا کا فون نمبر میرے پاس موجود ہے اگر بات آگے بڑھانا ہو ۔“یقیناً مزاحیہ انداز اپنا کر وہ پلوشہ کے دل فگار تذکرے کا کفارہ کرنا چاہ رہی تھی۔

میں اطمینان سے بولا۔”تمھارا فون نمبر میرے پاس موجود ہے۔ اور میرا خیال ہے اس کے علاوہ مجھے کسی کے فون نمبر کی ضرورت نہیں۔“

”آئی لو یو زی!“

”می ٹو اور اب نماز کا وقت ہو گیا ہے، میرا یہ نمبر محفوظ کر لینا اس پر جب چاہو کال کر سکتی ہو۔“

”ٹھیک ہے زی، گڈ بائی اپنا بہت بہت خیال کرنا اور ہو سکے تو تم بھی شادی کر لو یقیناً تمھیں سنبھلنے کے لیے

ایک عورت کی ضرورت ہے۔''

''اتنے قیمتی مشورے پر شکر گزار ہوں۔'' طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اذان کافی دیر کی ہو چکی تھی۔ میں اٹھ کر مسجد کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

لی زونا کے سر سے لپٹے ہوئے دوپٹے نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ سردار کی طرف سے پاکستان آنے کی دعوت ملتے ہی اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان دونوں کا ملاپ دیکھ کر جانے کیوں میرا دل غم سے بھر گیا تھا۔ سردار خان کو تو چنارے بیگم کا متبادل مل گیا تھا، کیا مجھے بھی پلوشہ جیسا کوئی مل پاتا۔ یہ سوچ آتے ہی میرے دماغ میں نیلی آنکھوں والی گلگارے کا خوب صورت چہرہ لہرایا۔ سر جھٹکتے ہوئے میں نے اس واہیات سوچ کو دماغ سے نکال دیا تھا۔ کہ پلوشہ کی جگہ کوئی لڑکی نہیں لے سکتی تھی۔ اور پھر گلگارے یقیناً کب کی کسی کی دلھن بن چکی ہوگی۔ اس نے اپنے آخری خط میں واضح طور پر بتا دیا تھا کہ وہ مہینے کے اندر اندر شادی کر لے گی کیوں کہ وہ پلوشہ کو چھوٹی بہن سمجھتی تھی اور چھوٹی بہن کا گھر اجاڑنا اسے کسی طور گوارا نہیں تھا۔

لی زونا کے سر پر ہاتھ رکھ کر میں نے اسے خوش آمدید کہا۔ ائر پورٹ سے ہم ٹیکسی کرا کر مردان روانہ ہو گئے۔ وہ رات میں اور سردار بیٹھک میں رہے تھے جبکہ لی زونا اس کی بڑی بہن کے ساتھ گھر میں تھی۔ اگلے دن دونوں کا نکاح پڑھا دیا گیا۔ سہ پہر کو مجھے دلھن سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ سردار کی بہن نے اسے روایتی دلھن کی طرح اسے سجایا تھا۔ لی زونا کا معصوم چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک قیمتی ہار کا تحفہ اسے دیا۔

وہ پوچھنے لگی۔ ''ایک بات کہوں ذیشان بھائی۔''

''کہو۔''

''آپ پریشان ہیں یا مجھے ہی ایسا لگ رہا ہے۔''

''میں واقعی پریشان ہوں میری بہن۔'' میں دکھی لہجے میں بولا۔ ''تھوڑے دن پہلے ہی میری بیوی کا حادثے میں انتقال ہو گیا ہے۔'' پلوشہ کو مرے ہوئے ساتھ آٹھ ماہ ہو گئے تھے لیکن یہ کل ہی کی بات لگتی تھی۔

’’بہت افسوس ہوا بھائی۔‘‘ وہ بھی دکھی ہوگئی تھی۔

’’چھوڑو اس دل دکھانے والے موضوع کو۔‘‘ میں ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔’’اگر سردار کوئی گڑبڑ کرنے کی کوشش کرے تو پریشان نہ ہونا تمھارا بھائی یہاں موجود ہے، فوراً ہی مجھے کال کرنا۔‘‘

’’جانتی ہوں بھائی! اور مجھے اپنے بھائی پر فخر ہے۔ البتہ سردار پر مجھے بھروسا ہے تو سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئی ہوں، ورنہ اتنا بڑا اقدم کوئی یونھی تو نہیں اٹھالیتا۔‘‘

وہ سچ کہہ رہی تھی۔ سردار ایک مخلص اور اچھا انسان تھا۔ اس کے ساتھ وہ لی زونا کو دل سے چاہتا تھا یقیناً ان کی شادی شدہ زندگی نہایت کامیاب ہوتی۔

’’ویسے مریم بہت پیارا نام ہے۔ اور تمھارے ساتھ بہت جچتا ہے۔‘‘ میں نے اس کے اسلامی نام کو سراہا۔

وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔’’یہ نام مجھے کلمہ پڑھانے والے مولوی صاحب نے رکھا ہے۔‘‘

’’اچھا چلتا ہوں، اللہ پاک آپ کے رشتے کو خوشیوں بھری طوالت دے۔ باقی گپ شپ بعد میں ہوتی رہے گی۔‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں سردار سے اجازت لے کر وہاں سے نکل آیا تھا۔ گو سردار نے مجھے روکنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن میری موجودی میں وہ اپنی نئی نویلی دلھن کو پورا وقت نہ دے پاتا۔ وہاں مزید ٹھہر کر میں رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہاں سے میں نے صوابی کا رخ کیا تھا۔ رات کا کھانا میں استاد عمر دراز کے ساتھ کھا رہا تھا۔ باقی کی رات میں انھیں پلوشہ کی کہانی سنا تا رہا۔ ان کے سامنے روتے ہوئے مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔

’’بیٹا!......تم پہلے آدمی تو نہیں ہو جس سے محبوب چھن گیا ہو۔ دنیا بھری پڑی ہے ایسوں سے البتہ عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ماضی میں جھانکنے کے بجائے مستقبل پر نظر رکھو۔ اور بہتر یہی ہوگا کہ شادی کرلو اگر کوئی عورت تمھیں پلوشہ کے دکھ سے نجات نہ بھی دے پائی تو اس سے ہونے والے بچے یقیناً یہ کام کرلیں گے۔ اور اس کی زندہ مثال خود میں ہوں۔ ایک موذی مرض نے مجھ سے بھی جینے کا سہارا چھین لیا تھا، مگر پھر امی جان کی کوشش سے وشمہ میری زندگی میں آئی، مجھے دو خوب صورت بچیوں کا تحفہ دیا اور سمیرا کے بچھڑنے کا دردناک غم نہ

ہونے کے برابر رہ گیا۔‘‘

میں صاف گوئی سے بولا۔’’فی الحال تو ہمت نہیں ہے استاد جی، البتہ کچھ عرصہ بعد کوشش کروں گا کہ آپ کے حکم پر عمل کر پاؤں۔‘‘ وہ ہنس کر خاموش ہو گئے تھے۔رات کافی بیت چکی تھی انھوں نے مجھے سونے کا مشورہ دیا اور چپ سادھ لی۔

پلوشہ کا متبادل کوئی لڑکی بھی نہیں ہو سکتی تھی البتہ گلگارے ایک ایسی لڑکی تھی جس سے شادی کرنے کا سوچا جا سکتا تھا، مگر وہ بہت پہلے اپنی شادی کا بتا چکی تھی۔جینیفر بھی ایک بہترین انتخاب تھا لیکن وہ بھی کسی اور کی بن چکی تھی اور جس سے اس نے شادی کی تھی وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔یوں کسی سے اس کی محبت چھیننا یقیناً خود غرضی اور بے حسی کی انتہا ہوتی۔بلکہ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ گلگارے نے بھی اپنے ہونے والے شوہر کے بارے یہی بتایا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتا ہے۔ان دونوں کے علاوہ بھی ایک لڑکی میری زندگی کا حصہ بن چکی تھی۔کشمیری چرواہن رومانہ جو میری زندگی میں آنے والی تمام لڑکیوں سے زیادہ خوب صورت تھی۔گو پلوشہ مجھے بہت عزیز تھی اور بہت زیادہ پیاری بھی تھی لیکن یہ حقیقت جھٹلائے جانے کے قابل نہیں تھی کہ رومانہ، پلوشہ سے بھی زیادہ پرکشش اور خوب صورت تھی۔اور وہ میری زندگی میں پلوشہ سے پہلے آئی تھی۔یہ اور بات کہ جب وہ مجھے ملی تو اس سے چند ماہ پہلے ہی وہ کسی اور کی بن چکی تھی۔یہ الٹی سیدھی سوچیں نیند آنے تک میرے دماغ میں چکراتی رہیں۔اگلے دو دن میں نے استاد عمر دراز کے پاس ہی گزارے تھے۔وہاں سے میں گھر آ گیا اور بقیہ چھٹی عدیل کے ساتھ گزاری اسے بھی اپنی باجی کی موت کا علم ہو گیا تھا۔اس کے نین نقش پلوشہ سے بہت زیادہ ملتے تھے اس لیے وہ میرے دل کے بہت زیادہ قریب تھا۔میں اس کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی کمی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ابو جان کو بھی وہ بہت زیادہ عزیز تھا۔ایک دن پھوپھو جان رات کے وقت میرے کمرے آئیں۔وہ بہت سنجیدہ لگ رہی تھیں۔چند منٹ دائیں بائیں کی گفتگو کے بعد وہ مطلب کی بات پر آ گئیں۔

’’بیٹا، ایک ضروری بات کرنا تھی۔‘‘

’’جی مجھے بھی کوئی ایسا ہی شک ہو رہا ہے پھوپھو جان!...... بہر حال حکم کریں۔‘‘میں ذہنی طور پر کسی انجان لڑکی کے رشتے کو ٹھکرانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

''دیکھو بیٹا برا نہ منانا مگر سچ تو یہ ہے کہ محلے میں دبی زبان میں گلناز بہن کی یہاں موجودی پر باتیں ہو رہی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''میں حیران رہ گیا تھا۔

''بیٹا،تم جانتے تو ہو کہ ہمارے معاشرے کی کیا ذہنیت ہے۔گلنار بہن چھوٹی لڑکی نہیں ہے نا بھائی جان پر جوانی ٹوٹی پڑ رہی ہے لیکن باتیں کرنے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔''

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا تھا،کوئی اتنی گھٹیا بات سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔لیکن پھوپھو جان بھی تو جھوٹ نہیں کہہ سکتی تھیں۔''پھوپھو جان کوئی کتنی ہی بکواس کیوں نہ کرلے،میں پلوشہ کی ماں کو کہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔بلکہ میں انھیں اپنی سگی ماں ہی کی طرح سمجھتا ہوں۔''

پھوپھو جان جھجکتے ہوئے بولیں۔''جب سگی ماں جیسا سمجھتے ہو تو پھر سچ میں ماں بنا کیوں نہیں لیتے۔''

''مم......مگر پھوپھو جان......''میں ہکلا کر خاموش ہو گیا تھا۔

''بیٹا،میں مولوی صاحب سے پوچھ چکی ہوں،کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔گلناز بہن کو بھی میں راضی کر چکی ہوں،صرف آپ کی مرضی باقی ہے۔''

''اور ابو جان۔''

''انھوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھیں کوئی اعتراض ہے۔''

میں ہنسا۔''مطلب تمام کام مکمل ہے صرف میرا انتظار تھا۔''

''بیٹا،اس طرح گلناز بہن کے دل میں یہاں رہنے کے بارے جو جھجک ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی،معترضین کو بھی اپنی بکواس کا خاطر خواہ جواب مل جائے گا۔''

''پھوپھو جان،آپ نے نہایت خوشی کی خبر سنائی ہے،کل محلے کے چند بزرگوں کی موجودی میں یہ بابرکت کام کر لیتے ہیں۔''

پھوپھو جان میرا ماتھا چوم کر رخصت ہو گئیں۔صبح نماز کے لیے جاتے ہوئے میں نے ابو جان کو شرارتی لہجے میں کہا۔

''ویسے آپ نے انھیں، میرا اماں جی کہنے کا بہت الٹ مطلب لیا ہے، بہر حال کوئی بات نہیں۔''

وہ باپ تھے کہاں ہار ماننے والے تھے، ترکی بہ ترکی بولے۔ ''تو کیا کروں، گھر میں ایک دلھن کی موجودی تو ضروری ہے نا، تم سے تو کچھ ہو نہیں سکتا اب میں بھی نامرد بن جاؤں۔''

میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ ''ویسے بہت بہت شکریہ ابو جان، امی جان کی کمی بہت سختی سے محسوس ہو رہی تھی۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولے۔ ''صحیح کہا، لیکن اس سے زیادہ کمی بہو کی محسوس ہو رہی ہے۔''

''مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا سخت گناہ ہے۔'' میں نے مسجد میں داخل ہونے کا بہانہ کرتے ہوئے ان کی بات کو نظر انداز کر دیا تھا۔

''جب نکاح کی سنت مسجد میں ادا ہو سکتی ہے تو شادی کی بات میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔''

اس مرتبہ ان کی بات کا جواب دیے بغیر میں نے سنتوں کی نیت باندھ لی کہ جان چھڑانے کا اس سے آسان طریقہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسی دن عشاء کی نماز کے بعد مولوی صاحب اور محلے کے چند معززین کی موجودی میں یہ بابرکت کام سر انجام پا گیا تھا۔ پلوشہ کی ماں کو میں پہلے بھی ماں کہتا تھا کہ ساس بھی ماں ہی کا درجہ رکھتی ہے لیکن اب تو وہ سچ میں میری ماں بن گئی تھیں۔ چھٹی کے بقیہ دنوں میں مجھے ابو جان اور امی جان کے چہروں پر چھائی آسودگی، اطمینان اور خوشی دیکھ کر دلی سکون ملا تھا۔ پلوشہ کی ماں اور بھائی کو میں نے صرف ماں اور بھائی سمجھا نہیں بلکہ بنا بھی لیا تھا۔ پلوشہ کی ماں پہلے بھی میری ضروریات کا بہت زیادہ خیال رکھتی تھی لیکن اس کے بعد تو ان کا رویہ سچ مچ امی جان کا سا ہو گیا تھا۔ نہ جانے میری پلوشے زندہ ہوتی تو اس شادی پر کتنا خوشی کا اظہار کرتی۔ یقیناً وہ ہلا گلا کیے بغیر نہ رہتی۔

سردار اور میری چھٹی اکٹھی ہی ختم ہوئی تھی۔ واپسی پر اس کی حالت بالکل ویسی ہی تھی جو کبھی میری ہوا کرتی تھی۔ ہر وقت لی زونا یعنی مریم کی باتیں ہیڈ فون اس کے کانوں سے کم ہی اترا کرتا تھا۔ مریم کے ساتھ مسلسل انگریزی بول کر اس کی انگریزی پہلے سے بہت بہتر ہو گئی تھی۔ مریم بھی پشتو سیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں اس

شادی سے خوش اور مطمئن تھے۔

ایک دن انجان نمبر سے کال وصول کر کے مجھے گلگارے کی آواز سننے کو ملی۔

''شکر ہے تمھیں یاد تو ہوں۔'' پہچان ہوتے ہی میں نے شکوہ کیا تھا۔

وہ دکھی آواز میں بولی۔ ''آپ بھولے کب تھے۔''

''پھر اتنے عرصے بعد گھنٹی کرنے کی توجیہ کیا کرو گی؟''

اس نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔ ''آپ کو را جو کہہ سکتی ہوں؟''

میرے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ایک کہنے والی تو رہی نہیں تم بھی شوق پورا کر لو۔''

وہ تفصیل بتاتے ہوئے بولی۔ ''شادی کے دوسرے ہی دن مجھے پلوشہ بہن کے مرنے کی خبر پہنچی۔ آپ کا دوست کمانڈر عبدالحق چھٹی سے واپسی پر ابو جان کو پلوشہ بہن کے مرنے کی دل فگار خبر بتا کر آگے چلا گیا تھا۔ میں گھر آئی تو رنڑا کی زبانی پتا چلا۔ اس کے بعد ہمت ہی نہ ہوئی کہ خان کلے جا کر آپ سے بات کر سکوں۔ البتہ اب ہمارے گاؤں میں بھی موبائل فون کے سگنل آ گئے ہیں تو ہمت کر ڈالی ہے۔''

''شوہر کیسا ہے؟'' میں نے تکلیف دہ موضوع سے جان چھڑانا چاہی۔

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''بہت اچھا، اتنا کہ شادی کرنے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہو رہا۔''

''میری گڑیا کیسی ہے؟'' میں نے رنڑا کی بابت پوچھا۔

گل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ لیں خود ہی بات کر لیں، موبائل فون لینے کے لیے مسلسل ہی بھیک مانگنے کے انداز میں ہاتھ پکڑا ہوا۔''

''اگلے ہی لمحے میں رنڑا کی پر جوش آواز سن رہا تھا۔ اس کے بعد ثمر خان اور چچا شمریز سے بھی گپ شپ ہوئی۔ آخر میں گل نے چند باتیں کہہ کر مجھے تسلی دی اور ملنے کی درخواست بھی کر دی۔

''کوشش کروں گا کہ جلد ہی آپ کی طرف چکر لگے۔'' اسے اطمینان دلا کر میں نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

جینی بھی ہر دوسرے دن کال ضرور کرتی تھی۔ سردار اور مریم کی شادی کا سن کر وہ مجھ سے کافی خفا بھی ہوئی

تھی۔لیکن رابطہ کرنا نہ چھوڑا۔میں زیادہ وقت تربیتی مشقوں میں گزارتا رہتا۔بھاگ دوڑ، جمنازیم، فائرنگ وغیرہ کے شغل میں دن آسانی سے گزر جاتا۔میری نشانہ بازی پہلے سے بھی نکھر گئی تھی۔وزیرستان جاتے وقت ایس ایس میرا اور سردار دونوں کا کوڈ نام تھا،لیکن اب یونٹ میں مجھے زیادہ تر لوگ ایس ایس ہی کہہ کر بلاتے تھے ۔تعلق رکھنے والے افراد مجھے مختلف ناموں سے پکارتے تھے لیکن راجو صرف پلوشے کہتی تھی۔

زندگی میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔اور پھر اس ٹھہراؤ میں کنکر کمانڈنگ آفیسر کے اردلی نے پھینکا۔اس وقت میں کنٹین میں بیٹھا سردار کو چھیڑ رہا تھا جب وہ مجھے بلانے وہیں آ گیا۔

''ذیشان بھائی، کمانڈنگ آفیسر یاد کر رہے ہیں۔''

''آ رہا ہوں۔''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سردار نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔میں لاعلمی کے انداز میں کندھے اچکاتے ہوئے کھڑا ہو گیا ۔تھوڑی دیر بعد میں کمانڈنگ آفیسر عرفان ملک صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔

''بیٹھو۔''میرے سیلوٹ کا جواب سر کے اشارے سے دیتے ہوئے انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور جلدی جلدی سامنے کھلی فائل پر دستخط کرتے ہوئے کام نبٹانے لگے۔فائل میں موجود آخری کاغذ پر دستخط ثبت کر کے انھوں نے فائل میز پر رکھی کام ختم ہونے کی مخصوص ٹرے میں پھینکی اور میری جانب متوجہ ہو کر مسکرائے۔

''جوان، میرا خیال ہے تم نے کافی آرام کر لیا ہے اب اگر کام کی بات ہو جائے۔''

میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔''سر، یقیناً یہ آپ کا احسان ہو گا۔''

''شاباش۔''وہ دیوار پر ٹنگی گھڑی پر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولے۔''تیاری کرو تمھارے پاس زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے ہیں، چار بجے کی فلائیٹ سے تم رینج ماسٹر اپنے ساتھ لے کر گلگت جا رہے ہو۔ باقی کی تفصیل تمھیں وہیں معلوم ہو جائے گی۔''

☆......☆......☆

گلگت ائرپورٹ پر ہمیں لینے کے لیے ایک یونٹ کی دو گاڑیاں آئی ہوئی تھیں۔ایک فوجی جیپ اور دوسری سنگل کیبن۔گلگت میں رکے بغیر ہم نے آگے جانا تھا۔ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے آنے والوں کو ہمارے کام

کے بارے کچھ معلوم نہیں تھا، اس لیے ہم نے ان سے سر کھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میرے ساتھ دوسرا سنائپر الیاس آیا تھا۔ وہ جہلم سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان سنائپر تھا اور پہلی بار کسی مشن پر یونٹ سے باہر آیا تھا۔ وہ خاصا پر جوش تھا۔

راولپنڈی کی گرمی یہاں نظر نہیں آ رہی تھی۔ گلگت سے ہم نے جگلوٹ کا رخ کیا اور وہاں سے استور روانہ ہوئے۔ نو بجے کے قریب ہم استور پہنچ گئے تھے۔ رات وہیں آرمی کے مہمان خانے میں گزاری اور اگلے دن آٹھ بجے استور سے روانہ ہو گئے۔

استور میں اچھی خاصی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ اور میں جانتا تھا کہ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جاتے سردی میں اضافہ ہوتا جانا تھا۔ سردار کے مشورے پر میں نے گرم کپڑے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ الیاس بھی کوٹ وغیرہ ساتھ لینا نہیں بھولا تھا۔ ائر پورٹ ہی سے میں نے ابو جان کو کال کر کے بتا دیا تھا کہ چند دنوں کے لیے ایسی جگہ جا رہا ہوں جہاں شاید بات نہ ہو سکے۔ امی جان سے بھی بات کر کے میں دعائیں لینے میں سستی نہیں دکھائی دی تھی۔ اس بار یونٹ سے نکلتے وقت راؤ تصور صاحب نے مجھے خصوصی طور پر چند ہدایات کی تھیں۔

استور سے چلم اور وہاں سے برزل ٹاپ کی بلندی کا سفر طے کرتے ہوئے ہمیں دو پہر ہو گئی تھی۔ برزل ٹاپ کے بعد مسلسل اترائی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ اس علاقے میں میں پہلی بار آیا تھا اس لیے دلچسپی سے دائیں بائیں کا جائزہ لے رہا تھا۔ یوں بھی دائیں بائیں کے مناظر دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے۔ پہاڑوں سے میرا تعلق بہت پرانا ہے لیکن یہاں کے پہاڑ کچھ زیادہ ہی بلند تھے۔ نہ جانے کیوں ان بلند پہاڑوں کو دیکھ کر پلوشے کی یادیں زیادہ ہی حملہ آور ہو گئی تھیں۔ یقیناً ہم دونوں نے جتنا وقت اکٹھے گزارا تھا وہ پہاڑی علاقے ہی میں گزارا تھا۔ اسی وجہ سے پہاڑوں کو دیکھتے ہی وہ دھم سے آنکھوں کے سامنے آ کودتی تھی۔

دمبہ باؤ کا طویل میدان طے کر کے ہم شام ڈھلے مطلوبہ یونٹ کے بٹالین ہیڈ کوارٹر میں پہنچ گئے تھے۔ سنا یہی ہے دمبہ باؤ بلندی پر موجود دنیا کا سب سے بڑا میدان ہے۔ رات کا کھانا کھاتے ہی ہمارا بلاوا آ گیا تھا۔ یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر نے ہم دونوں کو اپنے کمرے ہی میں بلوا لیا تھا۔ اردلی کو چائے کا بتا کر اس نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

’’شکریہ۔‘‘ کہہ کر ہم نے نشست سنبھال لی۔

’’تو ذیشان حیدر آپ ہیں۔‘‘ اس نے تصدیقی لہجے میں پوچھا۔

’’جی سر!...... یہ الیاس ہے۔‘‘ میں نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔

’’ملک صاحب کی مہربانی کہ اس نے بہت جلد ہی آپ کو یہاں بھیج دیا ہے۔ کیا کام کا بتایا ہے؟‘‘

’’نہیں سر۔‘‘ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

’’کام کوئی اتنا مشکل نہیں ہے جوان، خاص کر جو تمھاری تعریف سنی ہے ذیشان! تو یقیناً تمھارے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہی ثابت ہوگا۔‘‘ لازماً میرے بارے انھیں ملک عرفان صاحب ہی نے ایسا کچھ بتایا تھا کہ وہ بار بار تعریفی نظروں سے مجھے گھورنے لگتے۔

میں انکساری سے بولا۔’’ کام کے بارے سن کر ہی کچھ اندازہ لگا پائیں گے سر۔‘‘

وہ تفصیل بتلاتے ہوئے بولے۔’’ سردیاں شروع ہونے ہی والی ہیں۔ یہاں پر جولائی، اگست اور ستمبر کے پہلے ہفتے تک ہم اپنی دور دراز پوسٹوں پر سال بھر کا راشن ذخیرہ کروا دیتے ہیں۔ یہ کام ویسے تو ہم سوِل مزدوروں سے لیتے ہیں جو خچروں کے ذریعہ تمام پوسٹوں پر راشن پہنچاتے ہیں۔ لیکن دو پوسٹیں ایسی ہیں جہاں سوِل لوگ راشن پہنچانے سے گھبراتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو دونوں پوسٹیں کافی بلندی پر واقع ہیں۔ یعنی انیس ہزار فٹ کی بلندی کافی معنی رکھتی ہے۔ اور دوسرا یہ وہ پوسٹیں ہیں جو کارگل جنگ میں ہم نے انڈیا سے چھینی تھیں اور معاہدے کے بعد باقی علاقہ تو واپس کر دیا تھا لیکن ان دونوں پوسٹوں کو معاہدے میں شامل نہیں کیا تھا۔ یہ دونوں پوسٹیں چونکہ ہم سے زیادہ انڈیا کی پوسٹوں کے قریب ہیں اس لیے وہ آئے دن ان پوسٹوں کو نشانے پر رکھتے ہیں۔ عام دنوں میں تو ہمیں فائرنگ کے تبادلے میں کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوتا، البتہ راشن کی ترسیل کے دنوں میں ہماری مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ ان دونوں پوسٹوں پر فوجی جوانوں ہی کو راشن چڑھانا پڑتا ہے۔ اور ایک جوان جب کندھوں پر آٹے یا چینی کی بوری اٹھا کر مشکل چڑھائی طے کر رہا ہو تب وہ فائر کا جواب نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس کے لیے تو اپنی جان بچانا بھی کافی دشوار ہو جاتا ہے۔ ان دونوں پوسٹوں میں فہیم پوسٹ پر ہم راشن سٹور کر چکے ہیں البتہ خرم پوسٹ پر آدھے سے بھی کم راشن پہنچا پائے ہیں۔‘‘ یہ تفصیل بتاتے ہوئے کمانڈنگ

آفیسر شہزادا کبر اٹھ کر دیوار کے ساتھ ٹنگے ہوئے نقشے کے پاس پہنچے۔ ”یہ فہیم او پی ہے اور یہ خرم او پی۔“ انھوں نے دو بلندیوں کی نشان دہی کی۔ ”اور یہ انڈیا کی وہ دو پوسٹیں ہیں جہاں سے مسلسل فائر آتا ہے۔ پہلے وہ یہاں آرٹلری کا فائر کرواتے تھے۔ اور سچ کہوں تو آرٹلری کے فائر سے پھر بھی بچت ہو جاتی تھی آج کل انھوں نے اپنی ان دونوں پوسٹوں پر سنائپر بٹھا رکھے ہیں اور جو ہمارے جوانوں کے لیے مسائل کھڑے کیے رکھتے ہیں۔ اس مرتبہ ہم خرم او پی پر چوتھائی سے بھی کم راشن ذخیرہ کر پائے ہیں۔ اور ہمارے پاس بس دس پندرہ دن ہی بچے ہیں اس کے بعد برف باری نے شروع ہو جانا ہے اور تب راشن کی ترسیل ناممکن ہو جائے گی۔“

میں بھی نشست چھوڑ کر ان کے قریب پہنچا اور نقشے پر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ”اس ضمن میں ہم دونوں کیا کر سکتے ہیں؟“

”پرسوں آپ کے کمانڈنگ آفیسر، سر عرفان سے بات ہوئی وہ میرے کورس میٹ ہیں۔ ہم دونوں اکٹھے ہی PMA سے پاسنگ آؤٹ ہوئے تھے۔ دوران گپ شپ میں نے انھیں اپنا مسئلہ بتایا۔ تب انھوں نے کہا کہ وہ اپنا ایک بہترین سنائپر میرے پاس بھیج رہے ہیں جو کسی بھی آدمی کو انیس سو میٹر سے بھی زیادہ فاصلے پر نشانہ بنا سکتا ہے۔“

”گویا آپ ہمیں انڈین سنائپرز کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔“ انھیں کہہ کر میں ان دونوں پوسٹوں کا انڈیا کی پوسٹوں سے فاصلہ ناپنے لگا۔

شہزادا کبر صاحب بتا رہے تھے۔ ”انڈیا کی ایک پوسٹ فارورڈ ون اور دوسری کو ٹرپل سیون کہتے ہیں (اس کی بلندی 17777 فٹ تھی۔ اور ون ٹرپل سیون سیون کو مختصر کر کے ٹرپل سیون کہتے تھے) آپ دونوں میں سے ایک کو خرم او پی اور دوسرے کو فہیم او پی پر جا کر دشمن کے سنائپرز کو منھ توڑ جواب دینا پڑے گا۔“

”میرا خیال ہے یہ کام ہم فہیم او پی پر جا کر بہتر طریقے سے سرانجام دے سکیں گے۔ یوں بھی ہم سنائپرز جوڑی میں کام کرتے ہیں اور میرا ساتھی پہلی مرتبہ عملی میدان میں آیا ہے اسے میں اکیلا نہیں بھیج سکتا۔“

کرنل صاحب معترض ہوئے۔ ”مگر فہیم او پی سے ٹرپل سیون کا فاصلہ دو ہزار سے زیادہ ہے۔“

میں اطمینان سے بولا۔ ”یہ میرا دردسر ہے، آپ ہمیں کل کا دن دیں اور پرسوں ان شاء اللہ آپ اپنی راشن

ذخیرہ کرنے والی پارٹی چلانا شروع کر دیں۔‘‘

انھوں نے پوچھا۔’’اور کل......؟‘‘

میں نے کہا۔’’کل چند جوان خالی جھولے لے کر اوپر چڑھیں گے تاکہ فائر شروع ہونے کے بعد خود کو آڑ میں رکھ کر محفوظ کر سکیں۔ یہ جوان بس دشمن کے سنائپرز کے لیے بہ طور چارہ پیش کیے جائیں گے۔‘‘

’’تم دونوں کس وقت نکلو گے؟‘‘

میں نے پوچھا۔’’یہاں سے فہیم او پی کا فاصلہ کتنا ہے؟‘‘

’’فاصلہ تو کافی ہے، مگر اس کی بنیاد تک آپ کو گاڑی چھوڑ کر آئے گی اور اس سے آگے بھی تین چار گھنٹے لگ ہی جاتے ہیں۔‘‘

’’تو ہم ابھی نکلیں گے۔‘‘

’’کیا۔‘‘ انھوں نے حیرانی ظاہر کی۔’’میرا خیال ہے آج رات آرام کر لیں۔‘‘

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔’’سر، آرام ضرور کرتے، مگر ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جتنا جلدی اپنے کام پر لگیں گے اتنا ہی بہتر ہے۔ یوں بھی مزدور پیشہ لوگ کام ملنے کے بعد آرام کے بجائے کام ختم کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔‘‘

’’یہ سن کر اچھا لگا۔‘‘ انھوں نے تعریفی انداز میں گردن ہلائی۔

چائے پی کر ہم شہزاد صاحب کے کمرے سے نکل آئے تھے۔ انھوں نے بٹالین کے صوبیدار میجر صاحب کو بلا کر ہمارے آگے جانے کے احکامات دے دیے تھے۔

ایک گھنٹے بعد ہم اپنے سامان کے ساتھ جیپ میں بیٹھ چکے تھے۔ گو ہمارے لیے آرام کرنا مناسب تھا، لیکن میں چاہتا تھا کہ الیاس کی تھوڑی تربیت ہو جائے۔ ایک سنائپر کو سخت جان اور پر مشقت زندگی کا عادی ہونا چاہیے۔ طویل پہاڑی سفر کے بعد انسانی جسم آرام کا طلب گار ہوتا۔ مسلسل جاگنے سے انسان چڑچڑا ہو جاتا ہے اور صحیح کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ لیکن سنائپرز کی تربیت میں انھیں مسلسل بے آرام رکھ کر ان کے چڑچڑے پن کو دور کرنا ہوتا ہے۔ ایک زیر تربیت سنائپر کو گھنٹوں نہیں بلکہ دنوں کے حساب سے جگا کر مقصد پورا کرنے کے قابل

بنایا جاتا ہے۔نیند کے بارے کہاوت مشہور ہے کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے،لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ سنائپر کو جب تک وہ خود ہی نہ سونا چاہے اپنی مچان میں نیند نہیں آنا چاہیے۔

ہمارا یہ مشن کافی آسان تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس آسان مشن کی چھاپ الیاس پر ایسی پڑے کہ وہ ہر مشن کو یونھی آسان اور آرام دہ سمجھتا رہے۔گو وقت آنے پر اسے معلوم ہو جاتا،مگر اس وقت شاید وہ ذہنی طور پر تیار نہ ہوتا۔اور ایسا ہونے کی صورت میں یقیناً اپنا نقصان کرا بیٹھتا۔جبکہ اپنے شاگرد کو میں یونھی نقصان اٹھانے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔اپنے پہلے مشن میں میں نے اپنے محترم استاد صادق کو شہید ہوتے دیکھا تھا۔اس نے اپنی جان دے کر میری جان بچائی تھی۔اور اسی مشن کا اثر تھا کہ بعد میں مجھے ہر قسم کے حالات کو برداشت کرنا آ گیا تھا۔گو حالیہ مشن میں جان جانے جیسا تو کوئی معاملہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں الیاس کو بے آرام تو رکھ سکتا تھا تا کہ اسے بھی معلوم ہو کہ عملی زندگی تربیت سے مشکل ہوتی ہے۔

ہم دو گھنٹوں کی ڈرائیونگ کے بعد فہیم او پی کے بیس میں پہنچ گئے تھے۔اس کا بیس بھی سطح سمندر سے چودہ ہزار فٹ بلند تھا۔جبکہ اس کی بلندی انیس ہزار فٹ تھی۔گویا پانچ ہزار فٹ کی بلندی ہم نے پیدل طے کرنا تھی۔رات کا ایک بج رہا تھا جب ہم نے فہیم او پی کے بیس سے اپنا سفر شروع کیا۔سردی ٹھیک ٹھاک طریقے سے حال پوچھ رہی تھی۔تیز ہوا گویا اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھی۔ہمارے ساتھ آنے والے جوانوں نے الیاس سے رینج ماسٹر کا جھولا لینے کی کوشش کی مگر میں نے انھیں۔”یہ وزن اٹھانا ہماری ذمہ داری ہے دوست۔“ کہہ کر منع کر دیا تھا۔

بلندی پر پہنچتے ہوئے ہمیں تین گھنٹے لگ گئے تھے۔میں نے چند منٹ سے زیادہ الیاس کو ستانے نہیں دیا تھا اور فوراً اسے ساتھ لے کر دشمن کی پوسٹوں کا جائزہ لینے باہر نکل آیا اگلا ایک گھنٹا میں نے اس کے ہمراہ ایسی مناسب جگہ ڈھونڈنے میں گزارا جہاں ہم رینج ماسٹر کو لگا کر فائر کر سکتے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ ہندو بنئے نے اتنی سویرے نہیں اٹھنا تھا اس لیے میں زیادہ دیر الیاس کے ساتھ باہر نہ رہا اور رہائشی بینکر میں گھس گیا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنوعی طور پر خود کو کتنی ہی مصیبت اور جوکھم میں مبتلا رکھو وہ حقیقت سے میل نہیں کھاتی۔اب الیاس کی خوش قسمتی تھی یا بد قسمتی لیکن اسے پہلا مشن نہایت ہی آسان مل گیا تھا

رہائشی بینکر میں لکڑی کے تختے زمین سے تھوڑا بلندی پر لگا کر سونے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ہم دونوں قریب قریب پڑے بستروں میں گھس گئے۔

''ایک خاص بات بتاؤں الیاس۔''

میرے طرف کروٹ تبدیل کرتے ہوئے وہ بولا۔''جی استاد جی۔''

''جانتے ہوئے جب میں اپنے پہلے مشن میں گیا تھا،اس وقت استاد صادق میرے ہمراہ تھے۔جاتے ہوئے رستے ہی میں ان کا پاؤں زخمی ہوگیا تھا۔مشن کی تکمیل کے بعد ہم دونوں ایک درخت پر چھپے بیٹھے تھے تبھی استاد صادق نے مجھے اپنے پہلے مشن کی کہانی سنائی جس میں ان کے استاد ہاشم نے اپنی جان پر کھیل کر اپنے شاگرد کو جان بچانے کا موقع دیا تھا۔یہ کہانی سنانے کے اگلے دن استاد صادق نے مجھے پانی لانے کے بہانے بھیجا اور جب میں چھپ کر دشمن کے گھیرے سے نکل گیا تب انھوں نے دشمن پر فائر کھول دیا۔میں چاہ کر بھی ان کی مدد سے قاصر تھا کیوں کہ انھوں نے سنائپر رائفل کی تمام گولیاں میرے جھولے سے نکال لی تھیں۔واپسی پر جب استاد راؤ تصور صاحب کو میں نے یہ واقعہ سنایا،تب انھوں نے بڑی عجیب بات بتائی کہ استاد صادق کے استاد ہاشم کو بھی ان کے استاد نے اپنے پہلے ہی مشن میں اسی طرح دشمن کے نرغے میں آنے سے بچایا تھا۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔''اس بات کا کیا مطلب ہوا استاد جی۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''اس بات کا مطلب یہ ہے کہ روایت کے مطابق میرا اس مشن میں شہید ہو جانا لازمی ہے۔کیوں یہ سلسلہ کافی دور سے چلا آرہا ہے۔لیکن اس مشن کی صورت حال دیکھتے ہوئے تو مجھے نہیں لگتا کہ کچھ ایسا پیش آئے۔''

وہ گھبرا کے بولا۔''اللہ پاک نہ کرے ایسا ہو سر!''

''کیوں یار،شہادت کی موت تو اعلیٰ موت ہے۔''

الیاس نے پوچھا۔''کیا ہر سنائپر کے ساتھ یہی ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے پہلے مشن پر جاتا ہے تو اس کا استاد اس کے لیے جان قربان کر دیتا ہے۔''

''ایسا میں نے کب کہا۔''میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”تو آپ کی بات کا کیا مطلب ہوا۔“ اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

”یار، میری بات کا مطلب تھا کہ خاص سنائپرز کے ساتھ ایسا ہو رہا ہے۔ ایک مخصوص زنجیر ہے، یعنی میرے استاد صادق، ان کے استاد ہاشم، ان کے استاد گل خان ان کے استاد بشیر...... اور اب تمھیں میرے ہمراہ بھیج دیا گیا ہے۔ دورانِ تربیت بھی تم میرے خصوصی شاگرد رہے ہو اور جانتے ہو استاد تصور نے آتے وقت میرے کان میں یہی کہا تھا کہ وہ میرے لیے خصوصی دعا کریں گے۔“

”ان شاء اللہ، اس بار یہ زنجیر ٹوٹ جائے گی۔“ وہ اعتماد سے بولا۔ ”اور یوں بھی آپ کی جان مجھ سے بہت قیمتی ہے۔ آپ ہمارا سرمایہ ہیں استاد جی۔“

”اچھا تھوڑا آرام کر لو۔“ اسے آرام کا مشورہ دیتے ہوئے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوں بھی مجھے موت کا خوف پہلے بھی کبھی نہیں تھا اب تو مرنا ایک مذاق ہی لگتا تھا۔ پلوشہ کی جدائی بہت اذیت ناک اور تکلیف دہ تھی ۔ایک دم جب اس کی سوچیں دماغ پر حملہ آور ہوتیں ہر طرف اندھیر اور ظلمت ہی نظر آتی۔

ہم نے تین چار گھنٹوں سے زیادہ آرام نہیں کیا تھا۔ نو بجے اٹھ کر ہم نے ناشتا کیا اور دن کی روشنی میں دشمن کی پوسٹوں کا جائزہ لینے لگے۔ فائر کرنے کے لیے ہم نے ایسی جگہ کا چناؤ کر لیا تھا جہاں سے ہم دشمن کی دونوں پوسٹوں پر فائر گرا سکتے تھے۔ دشمن کی ٹرپل سیون نامی پوسٹ کا ہوائی فاصلہ بہ ظاہر دو کلو میٹر سے زیادہ تھا۔ لیکن اپ ہل، ڈاؤن ہل فارمولے کے مطابق انیس سو میٹر بنتا تھا۔ جبکہ فارورڈ ون پوسٹ کا فاصلہ سترہ سو میٹر بن رہا تھا۔

ہماری طرف سے تیاری کا اشارہ ملتے ہیں، اس یونٹ کے چند جوان خرم او پی کی بلندی طے کرنے لگے ۔تمام نے بلٹ پروف جیکٹیں پہنی ہوئی تھیں۔ لوہے کی یہ جیکٹیں گردن سے نیچے ناف تک کے جسم کو گولی اور دھماکے وغیرہ سے اڑنے والے شیل سے محفوظ رکھتی ہیں۔ چونکہ ان میں موجود پلیٹوں کا اچھا خاص وزن ہوتا ہے اس لیے اسے پہن کر چلنے والا خاصی تھکن محسوس کرتا ہے۔ خاص کر جب یہ جیکٹ پہن کر خرم پوسٹ کی دشوار ترین بلندی پر چڑھنا ہو۔ اور سونے پہ سہاگا کہ کندھوں پر سامان بھی اٹھایا ہو۔

اسی مشکل کی وجہ سے عام دنوں میں فوجی جوان پوسٹ پر سامان چڑھاتے وقت بلٹ پروف جیکٹیں نہیں

پہنتے تھے۔لیکن آج چونکہ دشمن کو دھوکا دینے کے لیے ان کی پیٹھ پر خالی پٹھو لدے تھے اس لیے انھوں نے بلٹ پروف جیکٹس پہن لی تھیں۔

''سب سے پہلے ہم ٹرپل سیون پر موجود دشمن کے سنائپرز کو نشانہ بنائیں گے، کیوں کہ ایک تو وہ تھوڑا مشکل ہدف ہیں اور دوسرا خرم او پی پر وہیں سے زیادہ فائر آتا ہے۔''

''جی استاد جی۔'' الیاس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔رینج ماسٹر کے پیچھے میں خود لیٹ گیا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں نے الیاس کو فائر کرتے وقت کچھ ضروری احتیاطوں کے بارے سمجھانا شروع کر دیا۔گو تمام چیزیں اسے دورانِ تربیت بھی بتائی جا چکی تھیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ علم کے تکرار ہی سے وہ دل و دماغ میں جڑ پکڑتا ہے۔

الیاس نے ونڈ میٹر سے ہوا کی رفتار ناپ کر ڈیفلیکشن ناب کو مطلوبہ جگہ پر سیٹ کیا۔دشمن کا درست فاصلہ ناپ کر بلندی سے پستی کی جانب فائر کرنے کے فارمولے کے مطابق مخصوص رینج لگائی اور...... ''تیار۔'' کہہ کر سپار ٹر سائیٹ کو آنکھوں سے لگا لیا۔

سائیٹ میں جھانکتے ہی مجھے دشمن کی پوسٹ واضح طور پر نظر آنے لگی تھی۔ہمارے آدمی ابھی تک اس خاص بلندی پر نہیں پہنچے تھے جہاں سے وہ دشمن کی نظروں میں آسکتے۔

ہم دونوں اس وقت فہیم او پی پر موجود تھے۔وہاں سے خرم او پی مغرب کی جانب واقع تھی۔یہ دونوں پوسٹیوں ان مجاہدوں کے نام سے منسوب ہیں جنھوں نے یہاں لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔دشمن کی پوسٹ ٹرپل سیون شمال مغرب کی جانب اور فارورڈ ون شمال کی جانب موجود تھی۔اگست کے گرم مہینے میں بھی فہیم اور خرم او پی کے شمال کی جانب ڈھلان پر برف کی سفیدی نظر آرہی تھی۔اور یہ تازہ برف نہیں تھی۔یہ کئی سال پرانی برف تھی جو پگھل نہیں پائی تھی اور چھوٹے سے گلیشیر کی صورت میں شمال کی جانب موجود ڈھلان پر کافی نیچے تک چلی گئی تھی۔شمالی ڈھلان پوسٹ کے قریب تو بالکل سیدھی تھی۔یعنی اسی ڈگری کا زوایہ ناتی ڈھلان پر برف نہیں ٹھہر سکتی تھی۔لیکن سو ڈیڑھ سو گز کے بعد یہ ڈھلان بتدریج کم ہوتے ہوئے نیچے نالے تک چلی جاتی تھی۔

''ہلچل نظر آرہی ہے۔'' الیاس نے اعلان کیا۔دو بندے مجھے بھی دوڑتے ہوئے نظر آئے تھے۔دونوں دو

مختلف مورچوں میں گھس گئے تھے۔ان مورچوں کے ہول کافی چوڑے تھے۔اور ایک سنائپر کو فائر کرنے کے لیے لازمی بات ہے ہول کی دو اڑھائی فٹ کی چوڑائی کی ضرورت پڑتی ہے تبھی تو وہ سامنے والے علاقے میں اپنی مرضی کے مطابق شست لے سکتا ہے۔اب یہ ان کی بدقسمتی ہی تھی کہ وہاں میں پہنچ گیا تھا اور میرے لیے دو فٹ کے ہول میں شست لے کر فائر کرنا ایسا ہی تھا جیسا مچھلی کے بچے کے لیے تیرنا یا لنگور کے بچے کا درخت پر چڑھنا۔

''پہلے دائیں والا مورچہ۔'' الیاس کو بتا کر میں نے دائیں والے مورچے پر شست سادھ لی۔اس وقت تک دشمن کے سنائپر تین چار فائر کر چکے تھے۔ان کی تیزی کو دیکھ کر مجھے اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ بس نام ہی کے سنائپرز تھے۔ورنہ سنائپرز ہوا میں گولیاں نہیں اڑایا کرتے۔ان کی نالائقی ہی تھی کہ وہ اتنے دنوں تک مسلسل فائر کر کے دشمن کے چار پانچ آدمیوں ہی کو قتل کر پائے تھے۔ایک اور غلطی میں نے یہ جانچی تھی کہ وہ سنائپرز ہوتے ہوئے بھی کھڑے ہو کر فائر کر رہے تھے۔گو ایک سنائپر ہر حالت میں فائر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔لیکن جب اسے چناؤ کا اختیار دیا جائے تو وہ لیٹنے کو ترجیح دیتا ہے کیوں کہ اس طرح وہ زیادہ اطمینان سے ہدف کو نشانہ بنا سکتا ہے۔اب جیسے میں نے وہاں پہنچتے ہی بجائے مورچے کے اندر کھڑے ہو کر فائر کرنے ایک مورچے کی چھت پر فائر کرنے کے لیے جگہ منتخب کی تھی۔اپنے سامنے ایک فٹ بلند پتھر کی آڑ رکھ کر میں نے سامنے سے آنے والے فائر کا سدباب بھی کر لیا تھا۔یوں بھی دشمن کی دونوں پوسٹیں فہیم او پی سے نیچی تھیں۔

مورچے کے اندر چھاؤں تھی اور رائفل کے پیچھے کھڑا ہوا آدمی صاف نظر نہیں آرہا تھا۔لیکن ہول سے باہر نکلی ہوئی بیرل کو دیکھ کر مجھے فائر کی جگہ کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔اتنے سال کے تجربے کے بعد یہ اندازہ لگانا میرے لیے نہایت ہی آسان تھا۔مخصوص جگہ پر شست سادھ کر میں نے ٹریگر دبایا اور فوراً ہی شست دوسرے مورچے پر لے جا کر دوسری مرتبہ ٹریگر دبا دیا۔اس کے بعد بھی میرا کام رکا نہیں تھا۔دونوں سنائپروں کے گرتے ہی رہائشی بینکر سے دو تین آدمی بھاگ کر باہر نکلے تھے۔یقیناً انھیں مورچے میں موجود دوسرے آدمی نے اپنے مرنے والے سنائپرز کے بارے بتا دیا تھا۔پوسٹ کی چار دیواری صرف اتنی تھی کہ آدمی جھک کر ہی فہیم پوسٹ پر موجود سنتری کی نظروں سے اوجھل رہ سکتا تھا۔وہ تینوں تیزی کی کوشش میں جھکے بغیر اس

جانب دوڑتے ہوئے پہنچے تھے اور الحمد اللہ مورچے تک صرف ایک ہی سلامت پہنچ پایا تھا۔دو کے نصیب میں مزید سانس نہیں لکھے تھے۔فہیم پوسٹ پر موجود جوانوں نے زوردار نعرہ لگا کر میری حوصلہ افزائی کی تھی۔وہ دو دوربینوں کی کی مدد سے باری باری یہ نظارہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ ٹرپل سیون والے یہ خبر فارو ڈون تک پہنچاتے میں اپنی شست تبدیل کر کے فارو ڈون کی جانب موڑ چکا تھا۔اس مرتبہ کام پہلے کی نسبت بھی آسان تھا۔الیاس نے جلدی جلدی نئ میگزین بھر کے رائفل کے ساتھ لگائی اور ایلی ویشن سائیٹ پر رینج کم کر دی۔اس جانب دو سنا ئپروں کے نشانہ بنتے ہی باقی آڑ میں ہو گئے تھے۔اور پھر ایک دم تیز فائرنگ شروع ہوگئی۔دشمن بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر بے فائدہ ہی ایمونیشن پھونک رہا تھا۔البتہ اتنی عقل انھیں آ گئی تھی کہ وہ آڑ سے باہر نہیں نکل رہے تھے۔رائفل کے پیچھے سے اٹھ کر میں نے الیاس کو جگہ لینے کا اشارہ کیا اور خود چھت سے نیچے اتر گیا۔گو ٹرپل سیون پر تو وہ کامیاب فائر نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا فاصلہ زیادہ تھا،البتہ فارو ڈون پر موجود آدمیوں کو ضرور نشانہ بنا سکتا تھا۔

فہیم او پی کے پوسٹ کمانڈر نے صوبیدار اکرم نے بے ساختہ مجھے گلے سے لگا کر میرا ماتھا چوم لیا تھا۔

''شاباش جوان، جو تعریف سنی تھی اس سے کچھ زیادہ ہی پایا ہے۔''

''شکریہ سر، اب آپ اپنے جوانوں کو بتا دیں کہ وہ راشن چڑھانا شروع کر دیں۔ان شاء اللہ اب انھیں نشانہ سادھ کر گولی نہیں ماری جا سکے گی۔''

صوبیدار اکرم نے خوش دلی سے کہا۔''یہ بات میں آپ کے کہنے سے پہلے بٹالین میں بتا چکا ہوں۔کمانڈنگ آفیسر بہت خوش ہیں اور خرم او پی بیس تک راشن پہنچانے کے لیے راشن گاڑیوں میں رکھا جا رہا ہے۔''

میں چائے پی کر دوبارہ مورچے کے اوپر چڑھ گیا تھا۔

''استاد جی تین گولیاں چلا ایک آدمی کو جہنم رسید کرنے والے شاگرد کی آپ بے عزتی کریں گے کہ داد دیں گے۔یہ بھی خیال رہے پہلا مشن ہے۔''

''دو گولیوں کے ضیاع پر تھپڑ مارنا تو بنتا ہے۔''

وہ ہنسا۔''تین چار اکٹھے ہی لگا دیں، مجھے تھپڑ مارنے کے لیے کیا بار بار چھت پر چڑھتے رہیں گے۔''

میں سنجیدہ لہجے میں بولا۔''الیاس، یادرکھنا ہمارا حالیہ مشن بالکل پکنک منانے کی مانند ہے۔کیوں کہ ہمیں جان کا کوئی خاص خطرہ نہیں ہے۔جبکہ سنائپر نے عملی زندگی میں فائر کرتے وقت جان ہتھیلی پر رکھی ہوتی ہے۔گولی کے خطا جانے کا سیدھا سادھا مطلب جان سے جانا ہوتا ہے۔چلو میں یہاں تو دو گولیوں کے ضیاع کو برداشت کرلوں گا۔لیکن یہ بھی سوچا ہے کہ مشکل حالات میں پھنسنے پر تمھارا کیا ہوگا۔اس وقت میرے غصہ کرنے کا یا افسوس کرنے سے بات گزر جائے گی۔''

''معافی چاہتا ہوں سر۔''اس کا لہجہ ندامت سے پر تھا۔

''ہمارا کام دشمن کو فائر کی آواز سنانا نہیں، جسم میں گولی گھسنے کی اذیت محسوس کرانا ہے۔خالی ٹخ ٹخ تو اس پوسٹ پر موجود تمھارے بھائی تم سے کئی گنا بہتر کر سکتے تھے۔ایک عام فوجی درجن بھر گولیاں چلا کر بھی دشمن کا ایک آدمی مارلے تو اسے گھاٹے کا سودا نہیں کہا جاتا، لیکن سنائپر کی گولی کبھی بھی خطا نہیں جاتی۔یا تو دشمن کی چھاتی میں گھستی ہے یا لوٹ کر خود سنائپر کو آلگتی ہے۔اب یہ نہ پوچھنا کہ گولی لوٹتی کیسے ہے۔یقین مانو ایک گولی درجنوں گولیوں کی شکل اختیار کر کے لوٹتی ہے۔''

اس مرتبہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔سپاٹر سائیٹ آنکھوں سے لگا کر میں نے دشمن کی ٹرپل سیون پوسٹ کی طرف دیکھا۔ایک مورچے کے ہول سے مجھے دوبارہ رائفل کی بیرل جھلکتی نظر آرہی تھی۔

الیاس کو ہٹا کر میں فوراً رائفل کے پیچھے لیٹ گیا۔دشمن کو یہ باور کرانا ضروری تھا کہ وہ ان مورچوں کے ہولوں کو استعمال نہیں کر سکتے تھے۔اور اسی سے وہ ذہنی طور پر شکست تسلیم کر کے اپنے دفاعی اقدامات پر توجہ دیتے۔دو تین منٹ شست سادھ کر میں نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ایک دم ہول سے جھلکتی رائفل کی بیرل کا غائب ہو جانا ظاہر کر رہا تھا کہ رائفل کے پیچھے کھڑا دشمن تھوڑی دیر پہلے مرنے والے ساتھیوں کے پاس جا پہنچا ہے۔

''کیا کبھی آپ کی گولی خطا بھی گئی ہے۔''میرے ساتھ لیٹے الیاس نے تحسین آمیز لہجے میں پوچھا۔

''میرا خیال ہے اس سوال کا جواب اثبات میں دینا سچ نہیں ہوگا۔''میں نے شست دشمن کی دوسری پوسٹ کی طرف موڑ دی تھی۔اس طرف سے بھی بس فائرنگ کی آواز آرہی تھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔دشمن کو اچھی طرح معلوم ہوگیا تھا کہ وہ آڑ سے سر کی قربانی دے کر ہی سر نکال سکتے تھے۔

دو تین لمحے ٹھہر کر میری ہدایات جاری رہیں۔ ”ایک اور بات ذہن میں رکھنا، جب بھی دشمن پر شست سادھو تو وقت کا دھیان بالکل چھوڑ دو۔ یہ نہ ہو گھنٹا ڈیڑھ چابک دستی سے نشانہ سادھنے کے بعد تم سست ہو کر چند لمحے ستانے کا سوچو اور انھی چند لمحوں کا دشمن فائدہ اٹھا جائے۔“

”جی سر۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”چلو پھر جگہ سنبھالو۔“ میں دوبارہ نیچے اتر گیا تھا۔

اس دن کامیابی سے راشن کی ترسیل جاری رہی۔ شام کو کمانڈنگ آفیسر شہزاد اکبر صاحب نے ٹیلی فون پر بہ ذات خود مجھ سے بات کی تھی۔

”بہت عمدہ ذیشان میاں، تم لوگوں نے تو چند گھنٹوں ہی میں ہمارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔“

میں انکساری سے بولا۔ ”شکریہ سر!“

”اب تمھیں ہفتہ بھر ہمارا مہمان بننا پڑے گا۔ کیوں کہ تمھارے جاتے ہی انھیں دوبارہ سر اٹھانے کا موقع مل جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”ہم خرم او پی پر راشن ذخیرہ ہونے تک کہیں نہیں جا رہے سر۔“

وہ مسکرائے۔ ”بہت مہربانی جوان۔“

”اس میں مہربانی کی کوئی بات نہیں سر!...... یہ میری ذمہ داری اور فرض ہے کہ اپنے ساتھیوں کے لیے مجھ سے کچھ ہو سکتا ہے تو یقیناً میں قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔“

”صحیح کہہ رہے ہو برخوردار!...... پاک آرمی کا ہر جوان چاہے وہ کسی بھی عہدے رینک کا حامل ہو، کسی بھی بیج سے تعلق رکھتا ہو وہ یقیناً ملک کی سلامتی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا۔“

میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے۔ ”جی سر۔“ کہنے پر اکتفا کیا تھا۔

کہنے لگے۔ ”بہر حال میں کوشش کروں گا کہ جتنا جلدی ہو سکے راشن ذخیرہ کر لیا جائے۔ اسی مقصد کے لیے میں نے عارضی طور پر بٹالین کی چھٹی بھی بند کر دی ہے اور پڑوسی یونٹ سے بھی پچاس جوان تین دنوں کے لیے مانگ لیے ہیں۔“

”آپ اطمینان سے راشن ذخیرہ کریں سر، ان شاءاللہ دشمن کے سنائپرز کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔“
اورانھوں نے مجھے شاباش دیتے ہوئے رسیور رکھ دیا۔
الیاس کو سارا دن میں نے رینج ماسٹر کے ساتھ مصروف رکھا تھا۔خود البتہ دن کو چند گھنٹے کی نیند لے لی تھی ۔اس کے بعد دشمن کے سنائپرز کا فائر نہیں آیا تھا۔یقیناً وہاں پوسٹ پر موجود سنائپرز کا صفایا ہم نے کر دیا تھا۔البتہ جو عام فوجی موجود تھے،انھوں نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق دن بھر ”ٹخ ٹخ“ جاری رکھی تھی۔
اگلے دن بھی راشن کی ذخیرہ اندوزی کا کام اطمینان سے جاری رہا۔دن کے ابتدائی تین چار گھنٹے تو میں رائفل کے پیچھے لیٹا رہا مگر اب دشمن چوکنا تھا۔کوئی موقع بھی نہ پا کر میں نے الیاس کو رائفل کے ساتھ یہ اجازت دے کر چھوڑ دیا کہ وہ دس پندرہ گولیاں ضائع کر سکتا ہے۔اس طرح ایک تو دشمن پر فائر کا خوف طاری رہتا اور دوسرا اس کی بھی مشق ہوتی رہتی۔خود میں پوسٹ کمانڈر کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرنے بیٹھ گیا۔
پہاڑ کی چوٹی پر بنی ہوئی اس پوسٹ پر مسلسل وقت گزارنا واقعی جان جوکھم کا کام تھا۔سردی کی شدت، تیز ہوا، پانی کی کمی، گھر سے دوری، تازہ خوراک کی عدم دستیابی، رہائش کا ناقص انتظام، گھر رابطے میں مشکلات اور ان جیسے درجنوں مسائل کے ہوتے ہوئے پاک آرمی کے جوانوں کا وہاں وقت گزارنا ہمت وجرات کا ایک نمونہ ہی ہے۔رہائش کے لیے پتھروں سے بنے ہوئے بینکر جنھیں سیمنٹ اور مٹی وغیرہ کے بغیر ہی ایک دوسرے پر رکھ کر دیوار کی شکل دے دی گئی تھی۔ان کے سوراخوں سے ہوا کی آمد ایسے ہی جاری رہتی تھی جیسے سوراخ زدہ بوری سے غلہ گرتا رہتا ہے۔وہ لوگ جو سردیوں میں ہیٹر اور گرمیوں میں اے سی کے سامنے سے ہل جائیں تو انھیں ہسپتال جانا پڑ جائے۔وہ بھی پاک آرمی پر منھ اٹھا کر یوں بکواس کرتے ہیں جیسے بے نیاز درویش پر آوارہ کتے بھونکتے ہیں۔فوج نے پاکستان کے لیے کیا قربانیاں دی ہیں اور کیا کیا دے رہی ہے یہ بات وہ ایک دم فراموش کر دیتے ہیں۔میں یقین سے کہتا ہوں کہ ایسے کسی آدمی کو اگر گھنٹا بھر بھی فہیم او پی جیسی جگہ پر گزارنا پڑ جائے تو وہ اس کی زندگی کا آخری گھنٹا ثابت ہوگا۔وہ یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کی آرام دہ نیندوں کی عمارت کچھ جیالوں کی بے آرامی اور بے سکونی کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ان کے سیر سپاٹے، بے فکری سے گھومنے پھرنے اور آزادی کی زندگی کے پیچھے ان جوانوں کی ہمت کارفرما ہے جو آزاد ہوتے ہوئے قیدی کی سی زندگی گزار رہے

ہیں، جو بیوی کے ہوتے ہوئے مجرد بنے ہوئے ہیں، جو کبھی اپنے بچوں کی شرارتوں سے دل بھر کے لطف اندوز نہیں ہو پاتے۔ جنھوں نے بوڑھے ماں باپ کی خدمت کا موقع سال میں چند دن ہی ملتا ہے۔ جو ہمیشہ اپنے گاؤں میں مہمان اور اجنبی بنے رہتے ہیں۔ جو کسی خوشی کے موقع پر وقت پر نہیں پہنچ پاتے، جن کے پیاروں کے جنازے ان کے بغیر پڑھ دیے جاتے ہیں۔ جو کبھی کبھار ایسی حالت میں بھی گھر واپس آتے ہیں کہ ان کا پورا یا ادھورا جسم لکڑی کے صندوق میں بند ہوتا ہے۔ بیٹے کے انتظار میں راتوں کو جاگنے والی ماں کو بتا دیا جاتا ہے کہ اب تمھارا انتظار اختتام پذیر ہوا۔ اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ شوہر کی آمد کے لیے نئے کپڑے سلوا کر رکھنے والی بیوی کو بتایا جاتا ہے کہ تمھارے نئے جوڑے کو سراہنے والی آنکھیں باقی نہیں رہیں۔ باپ کی آمد پر نئے کھلونے پانے کے منتظر بچوں کے کانوں میں بس ماں اور دادی کی سسکیاں اور کراہیں ہی گونجتی رہتی ہیں۔ اور ایک گھٹیا بے غیرت کہتا ہے پاک فوج نے آج تک کیا کیا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج اگر پاکستان میں کوئی ایسا ادارہ موجود ہے جس پر پاکستان کے عوام آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکتے ہیں تو وہ پاک آرمی ہے۔ البتہ انسان ہونے کے ناطے پاک آرمی کے جوانوں سے غلطی کا ارتکاب ناممکنات میں سے نہیں ہے۔ دہشت گردی کے خلاف مسلسل آپریشن کرنے والوں سے نادانستگی میں خطا ہو جانے کو ان کا گناہ نہیں گردانا جا سکتا۔ آپ تصور کریں کہ ایک جوان پاک آرمی کی وردی زیب تن کر کے دہشت گردوں کا کھلا ہدف بن کر جب کسی جگہ کا آپریشن کرتا ہے تو وہاں سول کپڑوں میں دکھائی دینے والا ہر آدمی بہ ظاہر نظر اس کا دشمن اور دہشت گرد ہو سکتا ہے۔ ایسے وقت میں اخلاقیات اور نرم خوئی دکھانا ایک سپاہی کے لیے ممکن نہیں رہتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کم فہم لوگوں نے ہمیشہ اپنے ہیروز کی ناقدری کی ہے۔ ایسے لوگ دنیا کو اپنے مطلب کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ چور کو کبھی بھی جاگنے والا چوکیدار اچھا نہیں لگتا۔ ایسے لوگ جو پاکستانی ہوتے ہوئے یہود و ہنود کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہوں انھیں پاک آرمی سے کیسے لگاؤ ہو سکتا ہے۔ بہ ہر حال یہ ایک لمبی بحث ہے میں واپس کہانی کی جانب آتا ہوں۔

باقی کا دن خیریت سے گزرا تھا۔ بس الیاس دشمن کے ایک آدمی کو زخمی کرنے میں کامیاب ہو پایا تھا۔ اور دشمن کو اپنی حدود میں سمٹے رہنے کے لیے اتنا کچھ بھی کافی تھا۔ اگلے دو دن بھی سکون سے گزر گئے تھے۔ سوائے

اس کے کہ دشمن کی ٹرپل سیون پوسٹ پر ایک آدمی نے آڑ سے سر نکال کر دور بین کے ذریعے خرم او پی کا جائزہ لینا چاہا تھا۔ اور اس کی بدبختی کہ اس وقت رینج ماسٹر کے پیچھے میں لیٹا ہوا تھا۔ اور اس کی مزید بدبختی کہ اسی جانب متوجہ تھا۔ بے چارہ اپنے سر کے ساتھ دور بین کا بھی بیڑا غرق کروا گیا تھا۔

ان کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کے آنے جانے کا راستہ عقب میں تھا۔ جہاں سے ان کی آمدورفت بغیر کسی مسئلہ کے جاری رہتی۔ پانچویں دن انڈین آرمی کی آرٹلری گنوں کے دہانے کھل گئے تھے۔ لیکن آرٹلری کو درست فائر کرانے کے لیے ایک ایسے دیدبان کی ضرورت ہوتی ہے جو آگے کسی پوسٹ پر بیٹھ کر ہدف پر درست فائر گرا سکے۔ ورنہ تو آرٹلری گنوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسا اندھے کے ہاتھ میں غلیل دے دی جائے۔ پہلے دن فارورڈ ون پر ایک دیدبان نے اپنی ذمہ داری نبھانے کی کوشش ضرور کی تھی اور اس کوشش کا جواب اسے چھاتی میں لگنے والی گولی کی صورت میں ملا تھا۔ یہ الیاس کا پہلا شکار تھا جس کا مشاہدہ میں نے بہ ذات خود سپارٹر سکوپ میں کیا تھا۔ اس کے بعد گولہ باری تو جاری رہی مگر گولوں کو ہدف پر گرانے والا کوئی دیدبان سامنے نہ آیا۔ گولہ باری کا ہدف چونکہ خرم او پی تھی اس لیے الیاس اپنی جگہ پر ڈٹا رہا۔

سہ پہر ڈھلے میں مورچے کی چھت پر چڑھا تاکہ دن کی آخری روشنی میں دشمن کی پوسٹوں کا جائزہ لے سکوں، دشمن کی گولہ باری وقفے وقفے سے جاری تھی۔ تین چار گولے فہیم او پی کے اطراف میں بھی گرے تھے۔ لیکن فوجی جوان اس گولی باری کے اس لیے بھی عادی ہو جاتے ہیں کہ یہ ان کے لیے کوئی انوکھی اور نئی بات نہیں ہوتی۔ اور یہی چیز ایک تربیت یافتہ فوجی اور ایک عام انسان کے درمیاں فرق کو اجاگر کرتی ہے۔ فوجی کے اعصاب عام لوگوں کی نسبت قوی ہوتے ہیں۔ گولہ بارود کے دھماکے، گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور توپوں کی گھن گرج مسلسل سن کر اس کے کانوں کو یہ آواز نامانوس نہیں لگتی۔ اور اسی وجہ سے اکثر بے ضابطگیاں بھی ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

یقیناً اس وقت میری بدبختی کا سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا جب میں دشمن پر آخری نظر ڈالنے مورچے پر چڑھا۔ الیاس مجھے آتے دیکھ کر رینج ماسٹر کے پیچھے سے ہٹ کر دائیں جانب ہو گیا تھا۔ میں نے لیٹ کر ٹیلی سکوپ سائیٹ سے ٹرپل ون سیون سیون پوسٹ کا جائزہ لیا کیوں کہ الیاس وہاں کامیاب فائر نہیں کر سکتا تھا۔

کسی قسم کی حرکت نہ ہوتی دیکھ کر میں نے رائفل کے عقب سے اٹھ کر الیاس کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔اس وقت میں مورچے کی چھت پر غربی جانب کھڑا تھا جبکہ الیاس میرے دائیں اور مشرقی جانب کھڑا تھا۔اچانک ہی اس مورچے کے پچیس تیس گز نیچے ڈھلان پر آرٹلری گن کا ایک گولہ آ کر زوردار دھماکے سے بلاسٹ ہوا۔پورا مورچہ ہی لرز کر رہ گیا تھا۔ہم دونوں جلدی سے نیچے بیٹھے تا کہ گولے کے پھٹنے سے چاروں جانب اڑنے والے لوہے کے ٹکڑوں بچ سکیں۔

گولے کی دھمک ختم ہوتے ہی میں جلدی سے اٹھ کر چلایا۔"رائفل کو چھوڑ دو الیاس اور نیچے چلو۔"

یہ کہتے ہی میں اٹھا،الیاس میرے جتنی تیزی نہیں دکھا سکا تھا ایک دم مورچے کی شمالی اور شرقی دیوار لڑھک گئی تھی۔وہ مورچہ بالکل فہیم او پی کے شمال مشرقی کونے پر بنا تھا۔الیاس شمالی جانب پھسلا اور اگر وہ اس جانب گر جاتا اور پتھروں کی لپیٹ میں آنے سے بھی بچ جاتا تب بھی خود کو پہاڑی کی بنیاد تک پہنچنے سے پہلے روک نہیں سکتا تھا کیوں کہ اس جانب کھڑی ڈھلان تھی۔اسّی ڈگری پر اٹھی ہوئی ڈھلوان لڑھکنے والے کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا کرتی۔اس وقت میں نے تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا بایاں بازو تھام کر اسے اپنی جانب کھینچا۔ایسا کرتے ہوئے وہ میرے بازوؤں میں آ گیا تھا۔چھت مشرقی اور شمالی جانب بالکل جھک گئی تھی اسے سنبھال کر میں اپنا توازن بھی کھو بیٹھا تھا۔جب مجھے لگا کہ ہم دونوں کسی صورت گرنے سے بچ نہیں سکتے ہیں تبھی میں نے اپنے استاد صادق،اس کے استاد ہاشم اور اس کے استاد گل کی پیروی کرنے میں سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی نہیں لگایا تھا۔الیاس کو جنوب کی جانب زوردار دھکا دیتے ہوئے میں خود شمال کی جانب گر گیا تھا۔نیچے گرتے ہوئے خود کو پتھروں کی لپیٹ میں آنے سے بچانے کے لیے میں نے لاشعوری طور پر مغرب کی طرف کھسکنے کی کوشش کی مگر سیدھی ڈھلان مجھے رکنے کا موقع دینے پر تیار نہیں تھی۔میں جس روایت کی زنجیر میں جکڑا تھا یقیناً اس روایت نے اپنی بھینٹ وصول کر لی تھی۔میری جگہ سنبھالنے کے لیے الیاس پہنچ گیا تھا اور اب میری ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔بہ ظاہر بے ضرر نظر آنے والا مشن میری زندگی کو نگلنے کے لیے تیار تھا۔دور گہرائی میں مجھے پلوشہ دونوں بانہیں کھولے اپنی منتظر نظر آ رہی تھی۔

⯐......⯐......⯐

میرے کانوں میں جو آخری آواز گونجی وہ الیاس کی زوردار چیخ تھی۔اس نے پوری قوت سے مجھے پکارا تھا۔

''استاد ذیشان ن ن ن...........''اس جانب ڈھلان ایسی تھی کہ ایک بار لڑھکنے والا کسی صورت میں سنبھل نہیں سکتا تھا۔ایک بات جو میرے حق میں جاتی تھی کہ اس طرف پتھریلی چٹانوں کے بجائے بھربھری مٹی اور کنکروں وغیرہ کی بہتات تھی۔پتھریلی چٹانیں ہونے کی صورت میں میرے سر کو ٹوٹنے سے بچانا شاید ممکن نہ رہتا۔میں نے اپنے حواس بحال رکھنے کی پوری کوشش کی ہوئی تھی لیکن میرا دماغ کسی پھرکی کی طرح گھوم رہا تھا۔پوسٹ پر شاید چیخ و پکار شروع ہوگئی تھی لیکن مجھے الیاس کی پہلی چیخ کے بعد کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔

ایک تسلسل سے لڑھکنے کی وجہ سے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کئی مستند باکسر میرے جسم پر مسلسل گھونسے برسا رہے ہوں۔اچانک نیچے سے زمین ختم ہوئی اور میرا جسم ہوا میں بلند ہو گیا۔مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرا بچنا محال ہے۔لڑھکتے ہوئے جسم کو چوٹیں ضرور لگ رہی تھیں لیکن وہ چوٹیں برداشت کی جا سکتی تھیں۔یوں ہوا میں بلند ہو کر پتھریلی زمین پر گرنے سے موت نہ بھی آتی کئی ہڈیوں نے ضرور ٹوٹ جانا تھا۔☆

اور پھر میرے جسم کا زمین سے اتصال ہوا، میں گلیشئر پر گرا تھا۔اگست کے مہینے کی آخر تھی۔برف اوپر سے یوریا کھاد کے دانوں کی طرح بھربھری ہوئی پڑی تھی، البتہ اس کی نچلی سطح سخت تھی۔میری ہڈیاں ٹوٹنے سے تو بچ گئی تھیں، لیکن برف پر تھوڑا سے لڑھکتے ہی ایک دم برف کی اوپری سطح ٹوٹی اور میں ایک کریوس میں لڑھکنے لگا۔

(کریوس، سخت برف کے اندر بنے ہوئے غار نما گہرے گڑھوں کو کہتے ہیں۔جو کافی گہرے ہوتے ہیں۔سیاہ چن گلیشئر میں تو کئی کریوسز ایسے ہیں جو ہزاروں سینکڑوں آدمیوں کو نگل چکے ہیں اور اب تک ان کا پیٹ نہیں بھرا۔وہ گلیشئر چھوٹا سا تھا مگر اس کریوس کی گہرائی اچھی خاصی تھی۔میں خود کو مزید لڑھکنے سے روکنے کی کافی کوشش کی مگر کوئی ایسی چیز نہ ملی جسے پکڑ کر میں خود کو لڑھکنے سے روک سکتا۔تہہ میں پہنچ کر میں نے اوپر دیکھا کریوس کا منہ نظر نہیں آ رہا تھا۔یوں بھی شام کا ملگجا اندھیرا چھا گیا تھا۔

مسلسل حرکت کی وجہ سے میرا جسم کافی گرم تھا۔میں نے جسم کی تمام دکھتی ہڈیوں کو ہاتھ لگا کر اچھی طرح جانچا، الحمدللہ کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں تھی۔البتہ تمام جسم میں اچھا خاصا درد ہو رہا تھا۔لیکن اس وقت مجھے درد سے زیادہ

کریوس سے نکلنے کی فکر کرنا تھی۔گو میں نے سردی کی شدت سے محفوظ رہنے کے لیے گرم لباس پہنا ہوا تھا۔کیونکہ فہیم او پی پر چلنے والی تیز ہوا اور سردی وغیرہ سے بچنے کے لیے رہائشی بینکر سے باہر نکلتے ہی گرم لباس کی ضرورت سختی سے محسوس ہوتی تھی۔ٹریک سوٹ کے نیچے گرم پاجامہ، موٹا اوورکوٹ، سر پر اونی ٹوپی، پاؤں میں سپورٹس شوز وغیرہ۔مگر اس گرم لباس کی کریوس کی سردی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ایک بھیانک موت میری منتظر تھی۔میں نے کوٹ کی جیب سے دستانے نکال کر ہاتھوں میں پہن لیے اور باہر نکلنے کی تدبیر سوچنے لگا۔سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ گھپ اندھیرے میں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔میں نے ٹٹول کر کریوس کی دیواروں کا جائزہ لیا اور اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر ٹھوس برف میں بلند ہونا ممکن نہیں تھا۔وہاں میری مدد کو کوئی بھی نہیں آ سکتا تھا۔میں انڈیا کی جانب گرا تھا اور انڈین پوسٹ سے اس گلیشئر کا فاصلہ فہیم او پی سے کم تھا۔شام کا اندھیرا پھیلتے ہی انڈین فوجی شب دید آلات کی مدد سے اس طرف کی دیکھ بھال شروع کر دیتے تھے۔اگر فہیم او پی سے کوئی اتر کر اس جانب کا رخ کرتا تو لازماً وہ فائر کھول دیتے۔ایک مجھے بچانے کے لیے دس مزید آدمیوں کی قربانی دینے کی ہمت کون کر سکتا تھا۔

انڈین اور پاک فوج کے جوانوں کے ساتھ گاہے گاہے اس طرح کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔اور جوانب کے فوجی ایسے گرے ہوئے آدمی کو اٹھانے کے لیے آنے والی پارٹی سے تعرض بھی نہیں کرتے۔مگر اب معاملہ اور تھا۔پچھلے چند دنوں میں ہم اپنے سامنے والی پوسٹوں پر موجود دشمن کو کافی جانی نقصان پہنچا چکے تھے اور ایسی صورت حال میں غصے میں مبتلا دشمن کی پوری کوشش یہی ہونا تھی کہ کسی ایک آدمی کو مار کر وہ دل میں بھڑکنے والی آگ کو تھوڑا سا ٹھنڈا کر لیں۔اور بالفرض انھیں معلوم ہو جاتا کہ گرنے والا آدمی وہی ہے جو براہ راست ان کے آدمیوں کو قتل کرنے کا ذمہ دار ہے تو وہ ہر قیمت پر مجھے قتل کرنے کی کوشش کرتے۔

حقیقت تو یہ تھی کہ اس وقت میرے دماغ میں انڈین فوجیوں کا کوئی خوف نہیں تھا۔مجھے مرنے سے کبھی بھی ڈر نہیں لگا تھا۔خاص کر ان دنوں تو جو میری حالت تھی اس میں موت ایک نعمت ہی لگتی ہے۔پھر شہادت کی موت کا تو اپنا مزہ ہے۔لیکن اس کے باوجود برفانی قبر میں سسک سسک کر ایڑیاں رگڑتے ہوئے جان دینا مجھے گوارا نہیں تھا۔ایسا شخص ان لمحات میں کس اذیت اور تکلف سے گزرتا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی ذہنی ورزش کی

ضرورت نہیں ہے۔

چونکہ کریوس کا منہ اوپر سے کھلا تھا اس لیے مجھے سانس رکنے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔سردی البتہ میری رگوں میں دوڑنے والے خون کو جمانے لگی تھی ۔اس مختصر جگہ میں میں مسلسل حرکت میں تھا۔لیکن وہ حرکت جسم کو گرم کرنے میں کوئی مدد نہیں دے رہی تھی ۔اگر کوئی کھلا میدان ہوتا اور میں مسلسل دوڑ لگا سکتا تو شاید کوئی فرق پڑ جاتا ۔اب اس محدود و مختصر جگہ پر حرکت کرنا بھلا مجھے کیا فائدہ دیتا۔

آہستہ آہستہ میرے ہاتھ پاؤں سن ہونا شروع ہو گئے تھے۔ناک اس طرح ہو گئی تھی جیسے میں اس جگہ برف کا گولا باندھ رکھا ہو۔اس سردی کا مقابلہ کرنا نہ تو کسی سناپر کے بس میں ہے اور نہ کسی کمانڈو وغیرہ کے۔وہ تو اللہ پاک کے عذابوں میں سے ایک عذاب ہے اور جو اس کی لپیٹ میں آجائے دردناک موت اس کا مقدر ہی بنتی ہے۔اس وقت میرے پاس دوا کی کوئی صورت باقی نہیں بچی تھی ۔ایک دعا تھی جو میرے لبوں پر جاری تھی ۔مختلف قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے کم از کم یہ اطمینان تو میسر تھا کہ میری موت حالت اسلام میں ہو رہی تھی ۔اگر موت کی آمد کا یقین ہو جائے تو انسان کو اپنے گناہ بڑے واضح دکھائی دینے لگتے ہیں۔میری آنکھوں میں بھی اپنے گناہ اجاگر ہو گئے تھے۔میں زیر لب اپنے رحیم و کریم رب سے ان گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔پھر میری نگاہوں میں اپنے پیاروں کی صورتیں گھومنے لگیں، مجھے ابوجان کا نوارانی چہرہ نظر آیا۔ان کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ رقصاں تھی، پھر امی جان نظر آئیں جو باہیں کھولے میری منتظر تھیں۔اسی وقت میری دوسری امی جان ،یعنی پلوشہ کی ماں نے میرے بازو کو پکڑ کر مجھے اپنی جانب کھینچ لیا۔شاید وہ مجھے خود سے دور نہیں کرنا چاہتی تھیں ۔پھر مجھے جانِ حیات نظر آئی۔وہ میری دونوں ماؤں سے الگ بازو پھیلائے کھڑی تھی ۔”راجو، میرے پاس آجاؤ نا..........“میں آہستہ سے کریوس میں بیٹھ گیا ہاتھ پاؤں کی حرکت سست پڑنا شروع ہو گئی تھی۔میں نے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ایک سخت قسم کی تکلیف اور اینٹھن میرے بدن میں شروع ہو گئی تھی۔

سیدنا فاروقِ اعظم حضرت عمرؓ نے ایک بار حضرت ابی بن کعبؓ سے پوچھا تھا کہ وقت نزع کی تکلیف کیسی ہوتی ہے۔تو انھوں نے جو جواب دیا اس کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے۔”یا امیر المومنین ایک کانٹے دار جھاڑی کو جسم میں داخل کیا جائے اور اس کے کانٹوں سے جسم کے تمام اندرونی اعضاء کو لپیٹ کر منہ کے رستے ایک جھٹکے

سے باہر کھینچا جائے تو کیسا محسوس ہوگا، نزع کے عالم میں ایسی ہی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔''

وہ تکلیف میرا مقدر تھی۔ کہتے ہیں موت جس جگہ لکھی ہو، وہیں آتی ہے۔ نہ ایک سیکنڈ پہلے نہ بعد میں۔ سیدنا عزرائیلؑ مقرر وقت پر تشریف لے کے آجاتے ہیں۔ اور اس وقت میں انھی کے انتظار میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ اب نا معلوم میرے لیے کتنی گھڑیاں بقایا تھیں۔ اس وقت جو اذیت میرے جسم کو پہنچ رہی تھی اس کے بعد میں یہی دعا کر سکتا تھا کہ وہ جلد از جلد تشریف لے آئیں۔ کبھی کبھی زندگی میں ایسا مرحلہ بھی آتا ہے کہ موت نعمت اور نجات لگنے لگتی ہے۔ ایسی سردی سے ایک بار پہلے بھی میرا پالا پڑ چکا تھا جب میں گہری نیلی آنکھوں والی گلگارے کے دروازے پر زندگی کی بھیک مانگنے پہنچا تھا۔ اس وقت میرے دل میں زندہ رہنے کی خواہش موت سے برسر پیکار تھی، کیوں کہ اس وقت میری پلوشے زندہ تھی، اس وقت مجھے اپنی بے گناہی کے ثبوت ڈھونڈنا تھے، اس وقت مجھے مجاہدین کی مدد کرنا تھی لیکن اب میرے لیے کوئی ایسا کام باقی نہیں تھا جس کی وجہ سے مجھے اپنے زندہ بچ جانے کی امید ہوتی۔ اپنا آخری مشن میں کامیابی سے پورا کر چکا تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو دنوں میں ذخیرہ اندوزی کا کام پایہ تکمیل تک پہنچ جانا تھا۔ میری رائفل میرے پسندیدہ شاگرد تک پہنچ گئی تھی۔ اپنی زندگی کی قربانی دے کر میں نے اس روایتی زنجیر میں شہید ہونے والے اپنے سابقہ استادوں کی روحوں کو مایوس نہیں کیا تھا۔

اچانک میرے کانوں میں تیز فائرنگ کی آواز گونجی۔ انڈین آرمی کی وکرس گن کی تڑتڑاہٹ میں خوب پہچانتا تھا۔ اس حالت میں بھی مجھے ہتھیاروں کے فائر سے ان کی قسم کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ جس کا ساری زندگی ہی مختلف قسم کے ہتھیاروں سے پالا پڑ چکا ہو مرتے وقت بھی اس کا لاشعور ان آوازوں کو اچھی طرح پہچان رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں اس فائرنگ کے ہونے کی وجہ گونجی۔ یقیناً فہیم پوسٹ پر موجود میرے ساتھیوں نے میری تلاش کے لیے نیچے اترنے کی کوشش کی تھی اور اس کا جواب انھیں وکرس کے فائر نے دیا تھا۔ وکرس کا فائر دشمن کی فارورڈ ون سے فہیم او پی تک تو کارگر نہیں تھا البتہ گلیشئر وکرس کی حدود میں آرہا تھا۔

وکرس کے دو تین اور برسٹ میری سماعتوں میں گونجے اور اس کے ساتھ ہی جیسے مجھے الہام ہوا کہ وہ آواز میری سماعتوں اس شدت سے کیسے گونج رہی ہے۔ میں کریوس کی گہرائیوں میں تھا اور وہاں وکرس کے فائر کی اتنی

تیز آواز کا پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ایسا صرف اسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ کریوس کی تہہ میں ایسا سوراخ ہوتا جس سے وہ آواز مجھ تک پہنچ رہی ہوتی۔

میری مردہ رگوں میں جیسے نئی زندگی پڑ گئی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کر فائرنگ کی آواز کو غور سے سنا۔ایک جانب مجھے ہلکی سی روشنی کی جھلک نظر آئی۔یوں جیسے بتی جل رہی ہو۔

روشنی کی جگہ پر میں نے دستانے والے ہاتھ کا مکا رسید کیا اور میرا ہاتھ کلائی تک برف سے باہر نکل گیا۔میرا دل جیسے بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ہاتھ واپس کھینچتے ہی مجھے انڈین پوسٹ پر جلنے والی روشنی نظر آ گئی تھی۔ میں دونوں ہاتھوں سے برف کو دھکیل کر سوراخ کو چوڑا کرنے لگا۔تین چار منٹ میں میں اتنا سوراخ بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا جس سے رینگ کر میں اس برفانی قبر سے باہر نکل سکتا۔دونوں ہاتھ مضبوطی سے سوراخ کے کناروں پر جما کر میں باہر رینگ گیا۔میں گلیشئر کی بالکل تہہ میں پہنچا ہوا تھا۔دو تین کروٹیں لے کر میں برف کی سفیدی سے دور ہوا۔اس کے بعد پتھریلی زمین تھی۔سردی کی شدت میں ایک دم کمی ہو گئی تھی۔گو شام کے اندھیرے میں وہاں سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا تھا،لیکن کریوس کے اندر کی سردی اور باہر کے موسم میں زمین آسمان کا فرق تھا۔کریوس کے اندر منفی بیس پچیس درجے سنٹی گریڈ تو ضرور ہوگا۔جبکہ باہر کا درجہ حرارت منفی دو تین ڈگری سے زیادہ نہیں تھا۔البتہ دسمبر جنوری میں باہر کا درجہ حرارت بھی منفی تیس، پینتیس ڈگری سنٹی گریڈ پر پہنچ جاتا تھا اور اس وقت کریوس کا اندرونی درجہ حرارت اس سے دگنا،تگنا ہو جاتا تھا۔

چند لمحے زمین پر لیٹے لیٹے میں نے جائزہ لیا۔جہاں سے میں گرا تھا وہاں اسی رستے سے پہنچنا ناممکن تھا۔ کیوں کہ ایک تو بلندی بالکل ہی سیدھی تھی دوسرا وہ علاقہ انڈین فوج کے سنتری شب دید آلات سے چھانتے رہتے تھے۔عام حالات میں وہ چڑھائی ایک نعمت ہی محسوس ہوتی کیوں کہ سیدھی ڈھلان کی وجہ سے دشمن کے جسمانی حملے کا خطرہ صفر فیصد بھی نہیں ہوتا تھا۔لیکن اس وقت وہ چڑھائی میری واپسی کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ مجھے اپنے علاقے میں پہنچنے کے لیے ایک لمبا چکر کاٹنا تھا تب جا کر میں پاکستان کی حدود میں داخل ہوسکتا تھا۔اس جگہ سے حرکت کر کے کہیں دائیں بائیں جانا بھی خاصا مشکل تھا کیوں کہ دشمن کی پوسٹ بالکل سامنے تھی اگر ان کی نظر اس طرف اٹھ جاتی تو انھوں نے مجھے گولیوں سے بھون دینا تھا۔اس وقت میری

حالت منیر نیازی کے اس شعر کے مصداق تھی......

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو

میں ایک دریا کے پار پہنچا تو میں نے دیکھا

مگر میں ایک بڑی مصیبت سے جان چھڑا چکا تھا۔ کریوس میں ایڑیاں رگڑنے سے گولی کی موت کہیں آسان تھی۔ یوں بھی میں ساری زندگی گولیوں سے کھیلتا آ رہا تھا اور اب گولی ہی سے مرنا میرا حق بنتا تھا۔
میں کھڑا ہونے کے بجائے گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے نیچے اور بائیں کی جانب ہٹنے لگا۔ وہاں میں دشمن کی پوسٹ کے بالکل سامنے تھا۔ تھوڑا سا ایک جانب ہوتے ہی میں کھڑا ہو کر دائیں جانب موجود نالے میں حرکت کر سکتا تھا۔ کریوس اور کلاشن کوف کا فائر وقفے وقفے سے جاری تھا۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن شبِ دید آلات کی موجودی اس اندھیرے کو بے کار کر دیتی ہے۔ اور انڈین آرمی کے پاس ایسے آلات کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ شب دید آلات میں سب سے خطرناک صوفی تھرمل سائیٹ ہے کیوں کہ یہ گھپ اندھیرے میں ہونے والی معمولی حرکت کو ظاہر کر دیتی ہے۔ بلکہ حرکت نہ کرنے پر بھی یہ جانداروں کی نشان دہی بہت آسانی سے کر دیتی ہے۔ اس کے بلیک اینڈ وائیٹ نظارے میں زندہ اشیاء سفید دھبوں کی طرح نظر آتی ہیں اور بے جان اشیاء کالے دھبوں کی صورت میں اس لیے جہاں بھی سفید دھبہ نظر پڑے سائیٹ میں جھانکنے والے کو فوراً کسی زندہ جسم کی موجودی کا ادراک ہو جاتا ہے۔
حرکت کرنے سے میرا جسم بھی آہستہ آہستہ گرم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ کریوس کی جان لیوا سردی دھیرے دھیرے میرے رگ و پے سے دور ہونے لگی۔ میرے دل میں دیکھ لیے جانے اندیشہ موجود تھا۔ اور اس اندیشے نے جلد ہی حقیقت کا روپ دھار لیا۔ تیز فائرنگ کی آواز کے ساتھ گولیوں کا رخ مجھے اپنی جانب ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہی ایک پتھریلی چٹان کی آڑ لے لی۔ دائیں بائیں لگنے والی گولیوں نے میری نس نس میں بجلی بھر دی تھی۔ میں زیادہ دیر وہیں پڑا دشمن کی کسی تلاشی پارٹی کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ فہیم او پی سے پاکستان کی مایہ ناز گن، ایل ایم جی کی تڑتڑاہٹ ایک تسلسل سے سنائی دینے لگی۔ یہ تڑتڑاہٹ بھی میرے لیے خطرے کا نشان تھی کیوں اس کی کوئی اچٹتی ہوئی گولی میرا مزاج پوچھ سکتی تھی۔ لیکن اس وقت میں اپنے ساتھیوں تک یہ

پریشانی پہنچانے کا کوئی ذریعہ میرے پاس موجود نہیں تھا۔اور نہ دشمن کی کسی پارٹی کا مقابلہ کرنے کے لیے میرے پاس کوئی ہتھیار موجود تھا۔

وکرس کے فائر میں ذرا سا ٹھہراؤ آتے ہی میں بھاگ کر نیچے جانے لگا۔نالے میں جا کر میں دشمن کی چلائی ہوئی گولیوں سے محفوظ ہو سکتا تھا۔فی الحال اندھیرا اتنا گہرا نہیں ہوا تھا۔میری آنکھوں کو دائیں بائیں بکھری بڑی چٹانوں کا ادراک اچھی طرح ہو رہا تھا۔البتہ چھوٹے موٹے پتھر میری نظروں سے اوجھل تھے۔تیزی کے ساتھ میں نے درستی کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔نیچے گرنے کی صورت مجھے کوئی شدید چوٹ بھی لگ سکتی تھی۔

ایک بار پھر فائر کی آواز سنتے ہی میں نے قریب موجود ایک پتھری آڑ لے لی۔میرے لیے سب سے مفید بات یہ تھی کہ وہ شست لے کر فائر نہیں کر سکتے تھے۔صوفی سائیٹ سے وہ میری حرکت تو دیکھ سکتے تھے لیکن وہ سائیٹ وکرس پر نہیں لگائی جا سکتی کہ وہ میرا نشانہ سادھ سکتے۔یقیناً ایک آدمی صوفی نائیٹ سائیٹ میں دیکھ کر فائر کرنے والے کو سیدھائی دے رہا ہوگا۔اور اس طرح کسی کو نشانہ بنانا ممکن نہیں ہوتا۔جبکہ وکرس پر لگائی جانے والی شب دید سائیٹ کی رینج اتنی زیادہ نہیں تھی کہ اس سے پانچ چھے سو میٹر پر کارگر فائر کیا سکتا۔(شبِ دید آلات میں صوفی تھرمل نائیٹ سائیٹ تھرڈ جنریشن ہے اور اس کے متعلق میں کہانی کے ابتداء میں کافی کچھ لکھ چکا ہوں نئے پڑھنے والے وہیں دیکھ لیں)

میں اس پتھر کے پیچھے زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا۔چند گز دور نظر آنے والے دوسرے پتھر کے ہیولے کو نگاہ میں رکھ کر میں سرعت سے وہاں منتقل ہو گیا۔

فہیم او پی اور دشمن کی فارورڈ ون کے علاوہ بھی دور دور سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔پورا سیکٹر ہی فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھا تھا۔سرحدی علاقے میں اس طرح ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔تمام پوسٹیں ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی فائرنگ شروع کر دیتی ہیں۔نالے میں اترتے ہی میں کسی مخصوص سمت کو اختیار کرنے کے بارے متذبذب ہو گیا۔

وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا نہیں تھا۔میں نے نقشے کے ذریعے اس علاقے کا سرسری جائزہ تو لیا تھا،لیکن چونکہ اس علاقے میں کسی مشن کے لیے نہیں جانا تھا اس لیے میں نے زیادہ باریک بینی سے نقشہ پڑھنے کی ضرورت

محسوس نہیں کی تھی۔ میرا کام تو بس دشمن کی دو پوسٹوں پر فائر کرنا تھا۔اور میں نے اپنی پوسٹ سے کہیں بھی نہیں جانا تھا۔اب جبکہ میں اتفاقی طور پر نیچے آگیا تھا تو مجھے اس علاقے سے واقفیت کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ پہاڑی علاقے میں سمت کو برقرار رکھنا یوں بھی نہایت مشکل ہوتا ہے۔تمام رستے بھول بھلیوں کی طرح ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو رہے ہوتے ہیں۔سونے پر سہاگا یہ کہ اس علاقے میں پاکستان،انڈیا کی سرحد بھی کسی ترتیب سے نہیں بنی ہوئی۔ بالکل ٹیڑھی میڑھی سرحد ہے۔کہیں انڈین آرمی،پاکستانی سرحد میں آگے تک چلی آئی ہے اور کہیں پاک آرمی کئی کلومیٹر تک انڈیا میں گھسی ہے۔ان تمام مسائل کو مدنظر رکھ آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں کسی مخصوص سمت کو اختیار کرنے کے لیے کتنا متذبذب ہو سکتا تھا۔مغربی نالے میں اگر سیدھا چلتا جاتا تو آگے بائیں ہاتھ خرم او پی آتی،مگر اس جگہ اس کی بلندی عبور کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔اور پھر اس کے سامنے دشمن کی پوسٹ ٹرپل سیون بھی موجود تھی۔میں جس نالے میں اس وقت موجود تھا گو وہ دونوں ممالک کی افواج نگرانی میں تھا،مگر نالے کے اندر پاکستان سے زیادہ انڈین آرمی کا قبضہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی اس جانب پاک آرمی کے جوان نالے میں اتر نہیں سکتے تھے۔جبکہ انڈین آرمی کے فوجیوں کی وہاں تک رسائی نہایت آسان تھی۔اسی طرح انڈین فوجی نہایت آسانی سے نالے میں موجود افراد کو فائر کا نشانہ بنا سکتے تھے جبکہ پاک آرمی کا کوئی مستند سنائپر تو نالے میں کامیاب فائر کر سکتا تھا عام فائرر کی رینج سے وہ نالہ دور تھا۔

میں نے سرسری طور پر سوچ کر مغرب کی جانب جانے کا فیصلہ کیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی جانب رخ کرنے کے لیے مجھے فارو ڈون کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔

ایک نتیجے پر پہنچتے ہی میں دوڑ پڑا،مگر یہ دوڑنا میدانی علاقے کی طرح سرپٹ نہیں تھا۔اس کی وجہ ایک تو آکسیجن کی کمی تھی،دوسرا دکھاؤ بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔فارو ڈون اور ٹرپل سیون کے درمیان ایک نالہ گزر رہا تھا۔جبکہ خرم او پی اور فہیم او پی کے درمیان کوئی نالہ نہیں پڑتا تھا۔دونوں پوسٹوں کے درمیان ایک دشوار گزار پہاڑی سلسلہ تھا۔جو خرم او پی کے بیس کے پاس جا کر نیچے دب جاتا تھا۔اور وہی جگہ خرم او پی کا بیس تھی۔لیکن اس بیس کی چڑھائی نالے کی طرف سے بالکل سیدھی تھی۔البتہ ون ٹرپل سیون سے گزر کر یقیناً راستہ موجود ہونا چاہیے تھا کیونکہ فہیم او پی کے پوسٹ کمانڈر کے بہ قول دشمن کے قبضے میں جب یہ او پی تھی تب وہ اسی طرف سے

اپنے آدمی اوپر چڑھایا کرتا تھا۔اب مجھے اس جگہ تک پہنچنا تھا۔ٹرپل سیون پوسٹ کی روشنی نظر آتے ہی میں نے اپنی رفتار آہستہ کر لی تھی۔اس جگہ سے مجھے احتیاط سے گزرنا تھا۔اس وقت پوسٹ کے متوازی ہونے میں سو گز کا فاصلہ رہتا ہوگا کہ اچانک ماحول دھماکے کی آواز سے گونج اٹھا۔گولی میرے قریب سے "شوں" کر کے گزری تھی۔میں فوراً منھ کے بل لیٹ گیا۔اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں کسی کی جھلاتی ہوئی آواز آئی۔

"بے وقوف انسان، تمھیں کس الو کے پٹھے نے فائر کرنے کا کہا ہے؟" انھوں نے میرے لیے ناکا بندی کی ہوئی تھی اور میں نے بغیر کسی شک وشبے کے ان کے قابو میں آجانا تھا۔لیکن ایک آدمی کی بے صبری یا اضطراب نے مجھے چوکنا کر دیا تھا۔اسی بات پر سینئر اسے ڈانٹ رہا تھا۔

نیچے لیٹتے ہی میں پیچھے ہٹنے لگا۔ہتھیار کی غیر موجودی مجھے بے دست و پا بنا رہی تھی۔

"اب وہ بھاگ رہا ہے فائر کرو۔" اس مرتبہ سینئر نے تمام کو اجازت دے دی تھی۔ایک دم گولیوں کی تڑتڑاہٹ شروع ہوگئی تھی۔میرے لیٹ جانے کی وجہ سے ہدف انھیں نظر نہیں آرہا تھا وہ بس اندازے سے فائرنگ کر رہے تھے۔

وہ اپنی جگہ پر موجود رہ کر فائر کر رہے تھے۔اس کے بجائے اگر وہ آگے بڑھ کر مجھے گرفتار کرنے کی کوشش کرتے تو کامیاب ہوگئے ہوتے۔محسوس یہی ہو رہا تھا کہ انھیں میرے پاس ہتھیار کی موجودی کا خطرہ تھا۔اور یہی بات انھیں آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھی۔ایک پتھر کی آڑ میں رہتے ہوئے میں پیچھے کھسکتا رہا۔چند گز پیچھے ایک بڑی چٹان تک پہنچ کر میں نے چٹان کی آڑ لی اور ترچھا ہو کے بھاگ پڑا۔جس طرح دشمن نے ٹرپل سیون پوسٹ سے نالے میں اتر کر میرے لیے گھات لگائی تھی، میرے اندازے کے مطابق انھیں فارورڈ ون سے بھی اترنا چاہیے تھا۔اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نالے کے دونوں جانب یعنی مغرب اور مشرق میں دشمن کے مسلح افراد موجود تھے۔جنوب کی طرف کھڑی ڈھلانیں اور شمال کی جانب دشمن کی پوسٹیں تھیں۔اس چوہے دان میں صرف ایک راستہ باقی تھا جہاں سے میرے بھاگ نکلنے کی تھوڑی سی امید بقایا تھی اور وہ فارورڈ ون اور ٹرپل سیون پوسٹ کے درمیان موجود نالہ تھا۔یہ نالہ شمال کی جانب نکل رہا تھا۔اس نالے میں بھی آگے جا کر تو لازماً دشمن کی پوسٹوں نے موجود ہونا تھا۔لیکن اس وقت مرحلہ تھا اس گھیرے سے نکلنے کا۔اگر تو دشمن کے سپاہیوں نے

اس نالے پر بھی اپنے آدمی کھڑے کیے ہوتے تب تو میرا مارا یا پکڑا جانا یقینی تھا۔عقب میں مجھے دشمن کی للکاریں اور چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔دشمن کے ان آدمیوں نے لازماً فارورڈ ون پوسٹ والوں کو میرے بھاگ نکلنے اوران کی جانب رخ کرنے کا بتا دیا ہوگا۔

جلد ہی میں دونوں پوسٹوں کے درمیان موجود نالہ موڑ پر پہنچ گیا تھا۔مشرقی اور مغربی دونوں نالوں کا پانی شمالی نالے ہی میں گر رہا تھا۔گویا شمال کی جانب اترائی تھی۔شمالی نالے میں مڑتے ہی میرے قدموں رفتار میں تیزی آگئی تھی۔ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر میں تیسری مرتبہ گرا اور اٹھ کر پھر بھاگ پڑا۔بھاگتے ہوئے میری نظر دائیں جانب ڈھلان پر پڑی پانچ چھے سو گز دور ٹارچوں کی روشنیاں شمالی نالے کی جانب بڑھتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔وہ شمالی نالے پر بھی ناکا لگانے آ رہے تھے۔لیکن شاید انھیں تھوڑی سی دیر ہوگئی تھی۔اور دیر کی وجہ ان کی غفلت کے بجائے وقت کی کمی تھی۔کیوں کہ میرے فہیم اوپی سے نالے میں گرنے اور دشمن کو اس بارے معلوم ہونے کے بعد اتنا وقت نہیں گزرا تھا۔دشمن نے پہلے ان دو رستوں کی ناکا بندی کی تھی جہاں سے میرا بھاگ نکلنا یقینی تھا۔اور اب جبکہ میں ٹرپل ون پوسٹ کے آدمیوں کی گھات سے بچ نکلا تھا تو انھیں بھی شمالی نالے کا خیال آ گیا تھا۔

ٹارچوں کی روشنی کو دیکھتے ہی میرے قدموں میں تیزی آ گئی تھی۔مسلسل اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے میری آنکھوں کی کارکردگی کافی بڑھ گئی تھی۔گو میں کافی دفعہ ٹھوکر کھا کر گر چکا تھا،لیکن اس وقت احتیاط سے چلنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔میرا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔آکسیجن کی کمی تیز رفتاری کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔اور چونکہ یہی مسئلہ دشمن کو بھی درپیش تھا اس لیے وہ مجھ سے زیادہ تیز رفتاری نہیں دکھا سکتے تھے۔یوں بھی میری مثال اس ہرن کی سی تھی جو جان بچا کر بھاگ رہا ہو۔اور ایسی حالت میں ہرن دنیا کے تیز رفتار جانور چیتے کو بھی مات دے جاتا ہے۔

میں شمالی نالے میں آگے گزرتا چلا گیا۔نالہ بتدریج شمال کی جانب بڑھتا جا رہا تھا۔لیکن اس نالے میں میرا مسلسل بڑھتے رہنا مناسب نہیں تھا۔میری وہاں موجودی کی خبر یقیناً دشمن کی ہر پوسٹ تک پہنچ گئی تھی۔اور ابھی تک میں ایک محدود علاقے ہی میں بھاگ رہا تھا۔اس محدود جگہ کو گھیرنا دشمن کے لیے مشکل نہیں تھا۔مجھے بچنے

کے لیے اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ فاصلہ پیدا کرنا ضروری تھا۔اور اسی بات میں میری نجات تھی۔اس کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ میں ایسے رستے پر حرکت نہ کرتا جو دشمن کو میرے بھاگنے کی سمت سے آگاہ رکھتا۔ یہی سوچ کر نالے میں پانچ چھے سو گز آگے جاتے ہی میں نے بھاگنا موقوف کرتے ہوئے بائیں جانب موجود ڈھلان پر چڑھنا شروع کر دیا۔یوں کہ بلند ہونے ساتھ میرا آگے کا سفر بھی جاری رہا۔

پہاڑ کی بلندی پر تو اگر آدمی تیز قدموں سے چلتا ہوا جائے تب بھی سانس بہت زیادہ چڑھ جاتا ہے۔اس وقت بھی میرا سینہ جیسے پھٹنے کے قریب ہو گیا تھا۔دو منٹ رک کر میں نے سانس بحال کیا اور اس دوران دائیں بائیں کا جائزہ لیتا رہا۔نالہ ملاپ پر ٹارچوں کی روشنی نظر آنا بند ہو گئی تھی۔نامعلوم دشمن وہیں رک گیا تھا یا نالے میں آگے بڑھ رہا تھا۔یہ بھی ممکن تھا کہ ایک پارٹی وہیں رک گئی ہو اور دوسری نالے میں آگے بڑھتی آ رہی ہو۔

اچانک ہی نالہ ملاپ کی جانب زبردست قسم کی فائرنگ کی آواز ابھری۔نامعلوم وہ تلاشی فائر کر رہے تھے یا کوئی بدقسمت جانوران کے آگے چڑھ گیا تھا۔سانس بحال ہوتے ہی میں پھر بلند ہونے لگا۔پہاڑی ڈھلان پر راستہ بنا نہ ہونے کی صورت میں سفر کرنا کتنا مشکل اور دشوار ہے اس کے بارے صرف وہی شخص اندازہ کر سکتا ہے جس کا واسطہ پہاڑوں سے پڑ چکا ہو۔ٹیلی ویژن سکرین کے سامنے بیٹھ کر سر سبز پہاڑوں کے نظارے کرنا اور بات ہے لیکن جب خود انسان کا ان پہاڑوں سے واسطہ پڑتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان سہانوں نظاروں کے پیچھے کیا مصیبت چھپی ہے۔

گرتا سنبھلتا میں آگے بڑھتا رہا۔چند سو گز کے بعد اچانک ہی میں ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں راستہ بنا ہوا تھا۔اور یہ راستہ خطرے کا بہت بڑا نشان تھا۔اس علاقے میں راستہ صرف انڈین فوج کی آمد و رفت ہی سے بن سکتا تھا ۔وہ خالصتاً سرحدی علاقہ تھا وہاں سول آبادی کافی پیچھے تھی۔

میں رستے کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے لگا۔اب میرے قدموں میں تیزی سے زیادہ احتیاط در آئی تھی۔ دشمن کہیں بھی گھات لگا کر بیٹھا ہو سکتا تھا۔اور تیز قدموں سے جہاں میرا سانس پھول رہا تھا اور گہرے سانسوں کی آواز دور تک سنائی دے سکتی تھی وہیں پاؤں کے نیچے آ کر لڑھکنے والے روڑے اور کنکر بھی میرا راز فاش کر سکتے تھے۔

مزید سو ڈیڑھ سو گز چلنے کے بعد مجھے اس احتیاط کا پھل مل گیا۔ایک دم ہی میرے کانوں میں ریڈیو سیٹ کی کھڑ کھڑاتی ہوئی آواز پڑی اور میرے قدم رک گئے۔ پچاس ساٹھ قدموں کے فاصلے پر بیٹھا کوئی ریڈیو سیٹ پر بات کر رہا تھا۔

''یس سر، ہم اپنی جگہ پر پہنچ گئے ہیں۔اوور......''

پوچھا گیا۔''نالے میں اترے ہو یا اوپر بیٹھے ہو؟اوور......''

''قریباً ڈیڑھ سو گز بلندی پر بیٹھے ہیں۔اوور......''

''تمھارے ساتھ کتنے آدمی ہیں اور شب دید عینک موجود ہے اوور......''

''ٹوٹل پانچ آدمی ہیں اور شب دید عینک نہیں ہے۔اوور......''

''کیوں نہیں ہے اوور......''پوچھنے والے کے لہجے میں جھلاہٹ شامل تھی۔

جواباً تفصیل بتاتے ہوئے کہا گیا۔''سر، پوسٹ پر تین شبِ دید عینکیں تھیں۔پوسٹ کمانڈر نے دو تو پوسٹ پر موجود سنتریوں کے حوالے کر دیں اور تیسری ہم سے پہلے نکلنے والی پارٹی لے گئی ہے۔اوور......''

''اندھیرا ہے، احتیاط سے کام لینا۔دشمن غائب ہو چکا ہے اور اندازہ ہے کہ وہ اسی نالے میں موجود ہے اوور اینڈ آل۔''کہہ کر سینئر نے بات چیت ختم کر دی تھی۔اس کے ساتھ ہی وہ کسی دوسری پارٹی کو پکارنے لگا تھا۔ وہاں پر موجود آدمی آپس میں باتیں کرنے لگے۔موضوع میں ہی تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے وہ آگے نکل گیا ہوگا۔''

''دیپ راج، تمھارا دماغ خراب لگتا ہے۔''یہ اسی آدمی آواز تھی جو ریڈیو سیٹ پر بات کر رہا تھا یقیناً وہ ان کا سینئر تھا۔

دیپ راج کی آواز ابھری۔''سر جی، نالہ موڑ سے یہاں تک آدھا کلو میٹر فاصلہ بن رہا ہے، اگر وہ نالے ہی نالے میں بھاگ رہا ہے تو یقیناً وہ آگے نکل گیا ہوگا۔ہمیں یہاں پہنچے ہوئے بہ مشکل پانچ منٹ ہوئے ہیں۔''

''اطلاع ملتے ہی ہم پوسٹ سے اتر آئے تھے اور پوسٹ سے یہاں تک کا فاصلہ کلو میٹر سے کم ہے۔''سینئر نے دیپ راج کو سمجھانے کی کوشش کی۔

ایک اور آواز ابھری۔ ''سر پرتاپ، چھوڑیں اس بے وقوف آدمی کو، اس کی ہر سے نرالی منطق ہوتی ہے۔''

ان کی باتوں کو نظر انداز کر کے میں وہاں سے گزرنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ وہ جس پوسٹ سے اترے تھے وہ قریب ہی تھی۔ کلو میٹر بھر کا فاصلہ پہاڑی علاقے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اگر میرے پاس ہتھیار ہوتا تو ان پانچوں کا صفایا کرنا نہایت آسان تھا۔ لیکن اب خالی ہاتھ پانچ مسلح افراد پر حملہ بولنا ممکن نہیں تھا۔ لازماً پیچھے میں جو راستہ چھوڑ کر آیا تھا وہ ان کی پوسٹ تک ہی جاتا تھا۔ میں بندر چال چلتا ہوا وہاں سے دور ہٹنے لگا۔ (بندر چال ایک فوجی اصطلاح ہے یعنی ایک فوجی کا دشمن کے علاقے میں زمین پر بیٹھ کر اپنے سامنے کے علاقے کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے ہوئے بغیر آواز نکالے حرکت کرنا)

چونکہ وہ نیچے نالے کی طرف متوجہ تھے اس لیے میں مزید بلندی پر چڑھنے لگا۔ مزید سو گز اوپر آ کر میں کھڑے ہو کر وہاں آگے بڑھ گیا۔ اب ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ مگر میرا وہاں سے گزرنا زیادہ دیر چھپا نہیں رہ سکا تھا۔ میرے پاؤں کے نیچے آ کر ایک درمیانی جسامت کا پتھر اپنی جگہ سے کھسکا اور لڑھکتے ہوئے نشیب میں گرنے لگا۔ رات کی خاموشی میں مجھے وہ آواز صورِ اسرافیل سے کم درجہ نہیں لگی تھی۔

پتھر کے لڑھکنے کا جواب چند سیکنڈ کے اندر کلاشن کے کوف کے برسٹ کی صورت میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی دشمن کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی آنے لگی تھیں۔ ایک بات میرے حق میں جاتی تھی کہ اس پارٹی کے پاس شب دید آلہ موجود نہیں تھا۔ کلاشن کوف چلانے والے نے بیرل کا رخ لڑھکنے والے پتھر کی طرف رکھا تھا اس لیے گولیاں میری جانب نہیں آئی تھیں۔ لیکن کسی بھی وقت بیرل کا رخ میری جانب ہو سکتا تھا۔ میں وہاں رک کر کسی پتھر کی آڑ بھی لے سکتا تھا۔ لیکن دشمن پارٹی تلاشی لیتے ہوئے اس جانب کا رخ کرتی تو میں پکڑا جاتا۔ اور وہاں سے آگے بڑھنے کی صورت میں کسی اندھی گولی کا شکار بننے کا خطرہ تھا۔

میں موخّر الذکر خطرہ مول لیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اب میں نے اوپر چڑھنے کا سلسلہ موقوف کرتے ہوئے ڈھلان پر ترچھے ہی آگے قدم بڑھا دیے تھے۔ اس طرح میں اوپر چڑھنے کی نسبت ذرا تیز قدموں سے نالے کے متوازی سفر کر سکتا تھا۔ پینتالیس ڈگری زاویے پر جھکی ہوئی ڈھلان میرے نیچے لڑھکنے کے خطرے کو کم کر رہی تھی۔ گولیاں وقفے وقفے سے چل رہی تھیں۔ چونکہ وہ علاقہ سطحِ سمندر سے چودہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند تھا

اس لیے وہاں جھاڑیاں، درخت وغیرہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ دن کے وقت تو میں دور ہی سے نظر آ جاتا۔ اچانک فائرنگ کی آواز تیز ہوئی۔ میں چند قدم پیچھے ایک پتھریلی چٹان چھوڑ آیا تھا۔ فوراً ہی رکتے ہوئے میں نے اس چٹان کی آڑ لے لی۔ نجانے میں دشمن کو نظر آ گیا تھا یا یونھی انھیں ایمونیشن کو ضائع کرنے کا شوق چرایا تھا۔ عقب میں مجھے دو اڑھائی سو قدم دور دو ٹارچیں روشن نظر آ رہی تھیں۔ آنے والوں کا رخ اسی جانب تھا۔ دو ٹارچوں کو روشن دیکھ کر مجھے خیال آیا شاید ان کے دو آدمی ہی اس طرف آ رہے ہیں اور باقی وہیں بیٹھے ہیں۔ اگر آنے والے واقعی دو تھے تو میں ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ہتھیار کے علاوہ میں بالکل ہی بے دست و پا تھا۔ اس خیال نے مجھے وہیں لیٹنے پر مجبور کیے رکھا۔ اگر وہ پانچوں ہی اس سمت کو آ رہے تھے تب تو میرا بچنا محال ہو جانا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیوں وہ چھوٹے چھوٹے برسٹ چلا کر مسلسل فائر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ یونھی دو، دو، تین، تین گولیاں چلا کر انھوں نے پوری میگزین ختم کر دی تھی۔

وہ رک کر ٹارچ کی روشنی میں نئی میگزین لگانے لگے۔ کلاشن کوفیں دوبارہ کاک کر کے وہ چل پڑے نئی میگزین سے انھوں نے فائر نہیں کیا تھا۔ پچاس ساٹھ قدم دور ہی سے ان کی باتوں کی آواز آنے لگی تھی۔ علاقے کو مد نظر رکھ کر وہ آگے پیچھے ہو کر آگے بڑھ رہے تھے۔ اس علاقے میں پھیل کر آگے بڑھنا کافی مشکل ہے۔ بلکہ زیادہ تر جگہوں پر تو ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور اب مجھے واضح طور پر نظر آ گیا تھا کہ وہ دو ہی تھے۔ میں ذہنی طور پر ان کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

''کوئی لومڑ وغیرہ ہی تھا۔'' پہلی واضح بات میری سماعتوں میں پہنچی۔

''صحیح کہہ رہے ہو یار۔'' دوسرے کی آواز سنائی دی۔

میں جس پتھر کے عقب میں چھپا تھا انھوں نے وہاں چند گز نیچے سے گزرنا تھا۔ اور پھر میری بدقسمتی کہ بیس پچیس گز دور رک کر انھوں نے چاروں طرف ٹارچ کی روشنی پھینکی اور ایک آدمی نے پیچھے مڑ کر زوردار آواز میں پکارا۔

''سر، یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔''

''اچھی طرح تسلی کرلی ہے۔''ان کے سینئر کی آواز ابھری۔

''جی سر۔''پہلی بار آواز دینے والے نے جواب دیا۔اس دوران ٹارچ کی روشنی اسی پتھر پر آکر ٹھہر گئی تھی جس کے عقب میں میں چھپا تھا۔میں اپنے آپ میں مزید سمٹ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے واپس آجاؤ۔''سینئر کی اطمینان بھری آواز گونجی۔

''اس پتھر کے پیچھے دیکھ لیں۔''ایک نے مشورہ چاہنے والے انداز میں پوچھا تھا۔میرے اعصاب ایک بار پھر تن گئے تھے۔

''ضرورت نہیں ہے۔''دوسرا یہ کہہ کر واپس مڑ گیا۔

''راجیش!......ٹھہرو،دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔''پہلے والا مصر ہوا۔

راجیش رکتے ہوئے بولا۔''اچھا دیکھ لو میں یہیں پر تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔''

اگر وہ اس پتھر کو نظر میں رکھ کر ہتھیار تانے ہوئے اس جانب کا رخ کرتا تو میں آسانی سے اس پر قابو نہ پاسکتا خاص کر اس صورت میں جب بیس پچیس قدم دور اس کا مسلح ساتھی بھی موجود ہوتا۔

''رہنے دو۔''راجیش کی بے دلی دیکھتے ہوئے اس نے بھی ارادہ منسوخ کر دیا تھا۔میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔میں وہیں پڑا ان کے دور جانے کا انتظار کرتا رہا۔آہستہ آہستہ ان کی بات چیت کی آواز معدوم ہونے لگی اور میں اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔

دو تین سو قدم چلنے کے بعد میں ایک بار پھر بلند ہونے لگا۔کیونکہ اس نالے میں میرے لیے زیادہ خطرہ تھا۔پہاڑی عبور کر کے میں دوسرے نالے میں اتر کر زیادہ محفوظ ہو جاتا۔اب میں آگے جانے کے بجائے مسلسل بلند ہو رہا تھا۔

جو لوگ پہاڑی علاقے میں رہ چکے ہیں انھیں معلوم ہو گا کہ بلندی کا سفر سیدھی لائن میں طے نہیں کیا جا سکتا۔آدمی کو زگ زیگ میں چل کر اوپر چڑھنا پڑتا ہے۔اس طرح گرنے کا خطرہ بھی کم ہو جاتا ہے اور انسان کو چلنے میں بھی آسانی رہتی ہے۔

آدھے پون گھنٹے بعد میں پہاڑ کی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔دن کا وقت ہوتا تو میں علاقے کا جائزہ لے سکتا تھا

رات کا اندھیرا مجھے ایسی کسی کارروائی کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھا۔اب اگلے نالے میں اتر کر میں واپس جنوب کا رخ بھی کرسکتا تھا، لیکن مجھے سو فیصد یقین تھا کہ اس نالے کے اختتام پر مجھے دشمن ضرور ملتا۔ کیوں کہ دشمن کی پہلی ترجیح یہی تھی کہ میں واپس پاکستان کی سرحد عبور نہ کرسکوں۔اور وہاں پر میرا سرحد عبور کرنا یقیناً ناممکن ہی تھا۔البتہ اس علاقے سے دور جا کر مجھے سرحد عبور کرنے میں اتنا مسئلہ نہ ہوتا۔اور ایک دو دن گزرنے کی وجہ سے میری تلاش میں بھی پہلی جتنی تندی نہ رہتی۔اس سوچ نے مجھے واپس مڑنے سے باز رکھا تھا۔

نالے میں اترنے کے بجائے میں نے بلندی ہی پر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ابھی تک میرا رخ شمال کی جانب تھا۔آسمان پر چمکتا قطبی ستارہ سمت کے تعین کو یقینی بنانے میں اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔دو تین سو گز چلنے کے بعد ڈھلان نیچے کی جانب اترنے لگی۔اسی لائن میں ایک پہاڑی کا ہیولہ سامنے بھی نظر آرہا تھا لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے پہلے مجھے مکمل نالے میں اترنا پڑتا۔مجھے وہ نالہ کافی خطرناک نظر آرہا تھا۔وہ ایسی جگہ تھی جہاں دشمن ناکا لگا سکتا تھا، کیوں کہ وہ دونالوں کو ملانے والا ایک مختصر سے نالہ تھا۔اور دشمن کی نظر میں میں اپنے دائیں ہاتھ موجود نالے سے بائیں یعنی مغربی جانب موجود نالے میں منتقل ہوسکتا تھا۔

ایک لمحہ رک کر میں نے خود کو دشمن کی جگہ رکھ کر سوچا کہ وہاں وہ کس جگہ پر اپنے آدمی بٹھا سکتا تھا۔آیا وہ اس ملاپ والے نالے کو عبور کر کے مغربی نالے میں ناکا لگاتا۔یا میرے دائیں ہاتھ موجود مشرقی نالے میں پارٹی لگاتا۔مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ دشمن کے لیے مشرقی نالے کے سرے پر آدمی بٹھانا زیادہ مناسب تھا کیوں کہ اس طرح ایک تو وہ میرے مغربی نالے میں مڑنے کی نگرانی کرسکتے تھے۔دوسرا بالفرض میں مشرقی نالے ہی میں سفر کرنا مناسب سمجھتا تو مشرقی نالہ بھی ان کی نظر میں ہوتا۔اس کے برعکس مغربی نالے میں میں صرف اس وقت ان کا نشانہ بنتا جب میں مشرقی نالہ چھوڑ کر مغربی نالے میں انتقال کا سوچتا۔اور ایک بات تو یقینی تھی کہ دشمن کی نظر میں میں ابھی تک مشرقی نالے ہی میں چھپا تھا یا سفر کر رہا تھا۔

ایک نتیجے پر پہنچتے ہی میں پچاس قدم پیچھے چل کر مغربی جانب اترنے لگا۔بلندی کے بجائے نیچے اترتے وقت گرنے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے۔اس طرح پاؤں کے نیچے سے کنکر اور پتھر وغیرہ بھی زیادہ لڑھکتے ہیں۔اس لیے میں حتی الوسع آرام اور احتیاط سے اتر رہا تھا کہ کنکر اور پتھر وغیرہ میرے پیروں سے ٹکرا کر نیچے لڑھک کر میرا

رازنہ فاش کرتے رہیں۔دشمن نے مجھے پکڑنے یا مارنے کے لیے چاروں طرف اپنی پارٹیاں پھیلادی تھیں۔اور کسی بھی جگہ پر ان کی پارٹی موجود ہوسکتی تھی۔

نالے کی تہہ میں پہنچنے تک مجھے اتنا ہی وقت لگا تھا جتنا اس پہاڑی کی بلندی پر چڑھتے ہوئے لگا تھا۔ایک بات ذہن میں رہے کہ وزیرستان کے پہاڑ ہیں یا کوئی اور پہاڑی سلسلہ ہے ان میں تمام نالوں کا بہاؤ کسی مخصوص سمت میں نہیں ہے۔بھول بھلیوں کی طرح ہر نالے کا اپنا ہی رخ ہے۔آخر میں آ کر البتہ تمام نالے دریا کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔اور پانی مختلف اطراف میں بہنا شروع کر دیتا ہے۔کچھ نالوں کا پانی کشمیر کا رخ کرتا ہے اور کچھ نالوں کا رخ پاکستان کی طرف ہو جاتا ہے۔

مشرقی نالے میں چلتے ہوئے میں مسلسل نشیب میں جا رہا تھا جبکہ مغربی نالے میں جاتے ہوئے مجھے ہلکی چڑھائی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔اچانک ریڈیو سیٹ کی کھڑکھڑاتی آواز سن کر مجھے رکنا پڑا، میرے اندازے کے بر عکس دشمن اس جانب موجود تھا۔یہ بھی ممکن تھا کہ دشمن نے دونوں جانب اپنے آدمی بٹھائے ہوتے۔ریڈیو سیٹ پر کسی اور پارٹی کو پکار کر ان سے فائرنگ کرنے کی وجہ پوچھی جا رہی تھی۔سر شام جس وقت سے میں بھاگا تھا فائرنگ کی آواز وقفے وقفے سے گونج رہی تھی۔یوں بھی ہندو اس لحاظ سے کافی بہادر ہیں کہ پتے کے کھڑکنے پر بھی میگزین خالی کر دیتے ہیں اور آج تو یقینی طور پر ایک مسلمان فوجی ان کی صفوں میں موجود تھا جس پارٹی کو ذرا شبہ ہو جاتا وہ فائر کھولنے میں ایک سیکنڈ ضائع نہ کرتی۔

قدم دھیمے کر کے میں رک گیا اور پھر زمین پر لیٹ کر انھیں جانچنے لگا کہ آیا وہ کتنے آدمی ہیں۔اور ان کے پاس شب دید آلات موجود ہیں یا نہیں۔میرا وہاں سے گزر کر آگے بڑھنا ناگزیر تھا۔کیوں کہ واپس لوٹنے میں خطرہ کئی گنا بڑھ جاتا۔مجھے وہاں لیٹے ہوئے پندرہ بیس منٹ ہوئے تھے جب وہ کنٹرول کو سب اچھا رپورٹ دینے لگے۔یقیناً وہ ہر گھنٹے بعد سب اچھا رپورٹ دے رہے تھے۔

”تھری ٹو فار کنٹرول اوور......“ ایک آدمی نے اپنے کال سائن کے ساتھ کنٹرول کو پکارا تھا۔

”تھری ٹو، سینڈ یور میسج اوور......“

”آل او کے اوور۔“ اس نے سب اچھا پیش کیا۔

''تھری ٹو محتاط رہنا......دشمن ابھی تک اسی حدود میں ہے۔کیپ لسننگ آؤٹ......'' کنٹرول نے اسے رابطے میں رہنے کا کہہ کر خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

کنٹرول کو دوسری پارٹیوں کی طرف سے بھی پکارے جانے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔مختلف پارٹیوں کے، بیس کال سائن میں نے گنے۔گویا میری تلاش میں بیس پارٹیاں نکلی ہوئی تھیں۔مجھے ٹکرانے والی یہ چوتھی پارٹی تھی۔اس سے پہلے ٹکرانے والی پارٹی میں پانچ افراد تھے۔نامعلوم یہ پارٹی کتنے افراد پر مشتمل تھی۔جہاں تک غالب گمان تھا ان کی تعداد بھی پانچ ہی ہونا چاہیے تھی۔ایک پتھر کی آڑ میں لیٹ کر میں ان کا جائزہ لیتا رہا۔مجھے دو ہیولے ٹہلتے نظر آرہے تھے۔مجھے مسلسل چلتے ہوئے چار پانچ گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔اور اس وقت اندازے کے مطابق ساڑھے دس، گیارہ بجے کا عمل تھا۔انیس بیس کا چاند دس گیارہ بجے نکل آتا ہے اور اس وقت پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگ گئی تھی۔میری کلائی سے گھڑی بندھی ہوئی تھی۔لیکن گھڑی کی اندرونی لائیٹ جلا کر وقت دیکھنا بے وقوفی تھی اس اندھیرے میں ہلکی سی روشنی بھی دور سے دیکھ لیے جانے کا خطرہ تھا۔گھپ اندھیرے میں نظر پہلے سے زیادہ کام کرنے لگی تھی اور اس کی وجہ چاند کا طلوع ہونا تھا۔

''سر راجیو!......کیا اس نرگ واسی کے پکڑے نہ جانے تک ہم تمام یونھی جاگتے رہیں گے؟'' جھلائے ہوئے سنتری نے مجھے جہنمی کہتے ہوئے دل کی بھڑاس نکالی۔

''ایک آدمی جاگتا رہے، باقی دو آرام کرنے لیٹ جاؤ۔'' راجیو نامی سینئر نے فوراً ہی اس کی بات مان لی تھی۔اور اس کی بات سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان تعداد چار تھی۔

ایک اور آواز ابھری۔''یہ بھی خوب کہی، اس سردی میں نیند خاک آئے گی، لکڑیاں بھی موجود نہیں ہیں کہ آگ جلائی جائے۔''

''سر راجیو، ایک مشورہ ہے۔'' یہ اسی کی آواز تھی جس نے مجھے کوسا تھا۔

''بولیے مہاراج۔'' راجیو نے مزاحیہ انداز میں کہا تھا۔

اس نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔''سر، میں اور رنجیت واپس پوسٹ پر چلے جاتے ہیں دو تین کمبل بھی لے آئیں گے اور حلوہ چائے کا بندوبست بھی کر لیں گے۔یوں بھی اب پوری رات یہیں گزارنا پڑے گی۔''

’’یار، کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔‘‘ ان کا سینئر راجیو نیم رضا مند تھا۔

’’کیا گڑبڑ ہو گی سر، نالہ عبور کر کے یہاں تھوڑے ہی فاصلے پر ایک اور پارٹی لگی ہوئی ہے۔ اور اس بے غیرت کے پاس بھی کوئی ہتھیار وغیرہ موجود نہیں ہے۔‘‘ میری وجہ سے وہ خوار ہو رہے تھے اس لیے مجھے کوسنا تو بنتا تھا۔

’’پھر ایسا ہے، رنجیت اور پریم چند چلے جائیں گے تم یہیں میرے ساتھ رہو۔‘‘ راجیو نے رضا مند ہونے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ یقیناً اس سردی میں گرم کمبل اور چائے حلوے کا ملنا ایک نعمت ہی تو تھی۔

’’ٹھیک ہے سر۔‘‘ وہ خوش ہوتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو بولا۔ ’’رنجیت اور پریم چند تم دونوں روانہ ہو جاؤ۔‘‘

’’چلیں رنجیت بھائی۔‘‘ وہ پریم چند کی آواز تھی وہ لہجے سے نوجوان معلوم ہو رہا تھا۔

رنجیت نے کہا۔ ’’چلو۔‘‘ اور دو ہیولے مغرب کی جانب بڑھ گئے۔ چاند کے بلند ہونے کے ساتھ منظر پہلے سے صاف نظر آنے لگ گیا تھا۔ میں پریم چند اور رنجیت کے دور جانے کا انتظار کرنے لگا۔ ان کے ہیولے مغربی جانب جاتے ہوئے نظر آئے تھے۔ اور اسی طرف ان کی پوسٹ نے موجود ہونا تھا۔ میں نے اندازاً آدھا گھنٹا مزید انتظار کیا اور پھر حملے کے لیے تیار ہو کر پتھر کی آڑ سے باہر آ کر بندر چال چلتا ہوا ان کے قریب ہونے لگا۔

ان کا سینئر راجیو ایک پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا جبکہ سنتری کھڑے ہو کر نالہ موڑ کی جانب متوجہ تھا۔ اپنے دونوں ساتھیوں کے جانے کے بعد وہ چند منٹ تو گپ شپ کرتے رہے، مگر اب خاموش تھے۔ میرا رخ راجیو کی طرف تھا کیوں کہ بے فکری سے بیٹھے ہونے کی وجہ سے وہ آسان شکار ثابت ہو سکتا تھا۔

اس تک پہنچنے سے پہلے اگر کوئی آواز وغیرہ پیدا ہو جاتی تو میں نے سخت مشکل میں پھنس جانا تھا۔ سنتری نے ٹارچ جلا کر نالے موڑ کی جانب روشنی پھینکی اور سامنے کے علاقے کی نظری تلاشی لینے لگا۔ اس کا سینئر پتھر سے ٹیک لگا کر سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ سردی بغیر گرم بستر کے سونے کے لیے کہاں چھوڑتی ہے۔ البتہ اس نے گرم لباس پہنا ہوا تھا اس وجہ سے کم از کم وہ آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔ ورنہ تو بغیر حرکت کیے کام نہ بنتا۔

ایک ہاتھ سے پاؤں کے نیچے آنے والے روڑوں، کنکروں کو جانچ کر میں وہاں آہستگی سے پاؤں رکھتا اور

پھر اگلا پاؤں رکھنے کے لیے زمین ٹٹولنا شروع کر دیتا۔ چند قدم کا فاصلہ دو سیکنڈ میں طے کیا جا سکتا تھا مگر مجھے وہ فاصلہ طے کرنے میں کئی منٹ لگ گئے تھے۔

میں راجیو سے دو قدم دور تھا جب سنتری فطری تقاضے سے مغلوب ہو کر چند قدم مزید دور ہوا اور کھڑے کھڑے ٹینکی خالی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ اس نے میرا کام اور بھی آسان کر دیا تھا۔ میں نے ایک دم اٹھ کر راجیو نامی سینئر پر ہلہ بول دیا۔ شاید اس کی چیخ کی آواز اپنی پوسٹ تک چلی جاتی مگر میں نے سب سے پہلے ایک ہاتھ اس کے ہونٹوں اور ناک پر رکھ اس کی چیخ کا سدباب کر لیا تھا۔ ہونٹوں پر سختی سے جمائے ہوئے دائیں ہاتھ کو میں نے دائیں جانب کھینچا اور بایاں ہاتھ اس کے سر پر جما کر میں نے بائیں اور نیچے کی جانب زوردار جھٹکا دیا۔ یہ مخصوص جھٹکا گردن توڑنے کا سب سے آسان نسخہ ہے۔ اس نے بے اختیار ہاتھ پاؤں جھٹکنا شروع کر دیے تھے۔

میں نے اس کی گردن سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے اس کے ساتھ پڑی کلاشن کوف اٹھائی اور سنتری کی طرف بڑھ گیا۔ وہ فارغ ہو کر پتلون کے بٹن بند کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بھدی آواز میں......

''سندیسے آتے ہیں، ہمیں تڑپاتے ہیں ......'' گنگنا رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے تمام احتیاط بالائے طاق رکھ دی تھی۔ اس نے بھی میرے قدموں کی آواز کو اپنے سینئر کے قدموں کی آواز سمجھا تھا۔ گولی چلانے سے آواز دور تک جا سکتی تھی، میں نے کلاشن کوف کو بیرل کی جانب سے پکڑ کر اس کے بٹ سے گنگنانے والے سنتری کے سر کی سختی کا اندازہ کیا۔ ''اوغ۔'' کی آواز نکال کر وہ لہراتا ہوا نیچے گر گیا تھا۔ ایک بار اور اس کے سر کو بٹ سے بجاتے ہوئے میں نے اسے اپنے سینئر کے پاس بھیج دیا تاکہ اکٹھے مل کر اپنی غفلت کا سوگ منا سکیں۔ سر کی چوٹ زیادہ دیر تڑپنے کے لیے نہیں چھوڑتی۔ وہ بھی چند بار ہاتھ پاؤں جھٹک کر ہمیشہ کے لیے ہر قسم کی حرکت سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

میں جلدی جلدی ان دونوں کی تلاشی لینے لگا۔ وہاں دو جھولے بھی پڑے ہوئے تھے جن میں پانی کی بوتلیں اور کلاشن کوف کی اضافی میگزینیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک جھولے میں پانچ فالتو میگزین ڈال کر میں نے اپنی پشت پر لٹکا لیا۔ راجیو کی جیب سے سگریٹ اور لائیٹر بھی برآمد ہوا تھا۔ سگریٹ کی ڈبی کو پھینک کر لائیٹر میں نے جیب

میں ڈال لیا تھا۔چونکہ ابھی تک وہاں برف باری شروع نہیں ہوئی تھی اس لیے ان دونوں کے پاؤں میں عام فوجی بوٹ تھے۔میرے اپنے پاؤں میں موجود سپورٹس شوز ان کے جوتوں سے بہتر تھے اس لیے میں نے ان کے جوتے اتارنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔البتہ راجیو کے ہاتھوں پر چڑھے چمڑے کے دستانے مجھے اپنے کپڑے کے دستانوں سے بہتر لگے تھے۔اپنے دستانے جیب میں ڈال کر میں نے اس کے ہاتھوں سے دستانے نکال کر پہن لیے تھے۔سنتری کی جیب سے مجھے ایک چاقو بھی مل گیا تھا۔ایسی چیزیں چونکہ بہت کارآمد ہوتی ہیں اس لیے میں نے چاقو اپنے پاس سنبھال لیا تھا۔

اس ساری کارروائی میں مجھے دس منٹ سے زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔سب سے آخر میں میں نے ریڈیو سیٹ جیب میں ڈالا اور آگے بڑھ گیا۔ریڈیو سیٹ کی آواز میں نے بالکل ہی مدہم کر دی تھی۔ وہ سیٹ دشمن کی Transmission سننے کے لیے میرا مددگار ہوتا۔ہتھیار ہاتھ میں آنے کے بعد میرا حوصلہ بلند ہو گیا تھا۔اب میں اس قابل تھا کہ دشمن کو منہ توڑ جواب دے سکتا۔کلاشن کوف پہلے سے کاک تھی۔لیکن میں نے دوبارہ کاک کر کے اپنی تسلی ضرور کر لی تھی۔

ایک تربیت یافتہ فوجی کے پاس جب بھی ہتھیار آتا ہے وہ سب سے پہلے ہتھیار کے لوڈ ان لوڈ ہونے کا جائزہ لیتا ہے۔ایک بار ہتھیار کی میگزین اتار کر ہتھیار کو خالی کاک کر کے ٹریگر دباتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہتھیار فائر کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ یہ ساری کارروائی ہر تربیت یافتہ فوجی کا روزمرہ ہوتی ہے۔اور میں تو اس لحاظ سے خاص پرزہ تھا کہ سنائپر تھا۔اور سنائپر حضرات کا نہ صرف ہتھیاروں سے لگاؤ زیادہ ہوتا ہے بلکہ ان کا تجربہ بھی عام فوجیوں سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔

میں کلاشن کوف کو کندھے سے لٹکا کر آگے بڑھ گیا۔مشرقی اور مغربی نالوں کو ملانے والے نالے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک نظر مشرقی نالے میں ڈالی مگر اندھیرے کی وجہ سے دوسرے کنارے پر کوئی حرکت نظر نہیں آسکی تھی۔شمال کی جانب وہ نالہ بتدریج بلند ہو رہا تھا۔تھوڑا سا آگے جاتے ہی ایک راستہ بھی نظر آ گیا جو اوپر کو جا رہا تھا۔رستے کی موجودگی کا واضح مطلب یہی تھا کہ اس طرف بلندی پر انڈیا کی کوئی پوسٹ موجود تھی۔میں نے نالے ہی نالے میں آگے بڑھنا مناسب سمجھا تھا کہ رستے پر چلنا زیادہ خطرناک ہو سکتا تھا۔

پہاڑی نالوں میں ویسے تو چڑھائی یا اترائی بہت ہموار اور دھیمی ہوتی ہے۔لیکن پہاڑی کے قریب پہنچنے پر یہ ایک دم کھڑی ڈھلان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اوپر جانے والا راستہ نالے کے بائیں جانب پڑ رہا تھا جبکہ میں نے نالے کے دائیں کنارے کو سفر کے لیے اختیار کیا ہوا تھا۔نالہ غیر محسوس انداز میں مشرق کی جانب مڑ رہا تھا۔ اب قطبی ستارہ مجھے بائیں جانب چمکتا دکھائی دینے لگا تھا۔

نالے کی ہموار ڈھلان، مشکل ڈھلان میں تبدیل ہونے لگی تھی۔بائیں جانب چونکہ کسی پوسٹ کا ہونا یقینی تھا اس وجہ سے میں دوبارہ مشرقی جانب بلند ہونے لگا۔تھوڑا سا اوپر جاتے ہی مجھے تھوڑے فاصلے پر ایک پوسٹ کی روشنیاں نظر آنے لگ گئی تھیں۔گو اس پوسٹ سے میرا ہوائی فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا، مگر مجھ تک پہنچنے کے لیے انھیں درمیانی نالہ عبور کرنا پڑتا۔

ترچھا بلند ہوتے ہوئے میں آہستہ آہستہ نالے سے دور ہو گیا تھا۔اونچائی پر پہنچتے ہی میں دوسری جانب اترنے لگا۔اس طرف اترائی کافی آسان تھی۔چاند کی روشنی میرے سفر کو مزید آسان کر رہی تھی۔اچانک میرے کانوں میں تیز فائرنگ کی آواز گونجی جو میرے عقب میں ہو رہی تھی۔میرا رخ شمال مشرق کی جانب تھا۔ریڈیو سیٹ کی آواز بلند کرنے پر مجھے کنٹرول کی سخت آواز سنائی دے رہی تھی۔یقیناً انھیں مرنے والوں کی خبر پہنچ چکی تھی۔

”تم کہاں دفع ہو گئے تھے اوور......“

کنٹرول کے سوال پر ایک سہمی ہوئی آواز ابھری جو لازماً رنجیت کی تھی۔”سر، مجھے اور پریم چند کو حوالدار راجیو نے چائے لینے بھیجا تھا۔اوور......“یقیناً انھوں نے واپسی پر اپنے دونوں ساتھیوں کو مردہ پا کر کنٹرول تک یہ بات پہنچائی تھی۔اور اس مقصد کے لیے انھیں نالہ عبور کر کے اپنی دوسری پارٹی کے پاس جانا پڑا ہوگا کیوں کہ ان کا ریڈیو سیٹ میں اٹھا لایا تھا۔

کنٹرول نے پوچھا۔”اندازہ ہے دشمن کا رخ کس سمت کو ہوگا؟اوور......“

رنجیت نے کہا۔”کوئی خاص اندازہ نہیں ہے سر، البتہ وہ اپنے ساتھ کلاشن کوف اور اضافی میگزینیں اٹھا کر لے گیا ہے اوور......“

''احمق انسان، تم لوگوں کی غلطی کی وجہ سے اب وہ مسلح ہو گیا ہے۔ بہر حال انکوائری تو بعد میں ہوتی رہے گی ۔وائرلیس سیٹ حوالدار سدھو کو دو۔اوور......''

''جی سر۔'' اگلے ہی لمحے ایک نئی آواز آئی جو لامحالہ حوالدار سدھو کی تھی۔

''سدھو، تم اپنی پارٹی اور ان دونوں کے ساتھ مل کر راجیو اور مہیش کی لاش کو ان کی پوسٹ تک پہنچا دو۔دشمن آگے نکل گیا ہے اب یہاں پہرہ دینا بے فائدہ ہی ہوگا۔اوور......''

''راجر۔'' سدھو نے سمجھ جانے کا عندیہ دیا۔

''ٹھیک ہے، تم لوگ بتایا گیا کام کرو اور اب یہ ذہن میں رہے کہ دشمن کے پاس ہتھیار موجود ہے۔کیپ لسننگ آؤٹ۔'' اسے بتا کر کنٹرول نے دوسری دو پارٹیوں کو یہ کہہ کر خبردار رہنے کا حکم دیا کہ میرا رخ اسی جانب ہے۔اس کے علاوہ اس نے تین مختلف پارٹیوں کو کسی روبن پوسٹ والے نالے میں پہنچنے کا حکم دیا۔اب روبن پوسٹ کا علاقہ میری سمجھ سے باہر تھا۔

مجھے اس نالے میں آگے بڑھنا بھی مناسب نہ لگا اور میں بائیں طرف کی بلندی سر کرنے لگا۔اس کے ساتھ ہی میں نے پہاڑی کی چوٹی کا بہ غور جائزہ لے لیا تھا کہ کہیں اس پر کوئی پوسٹ نہ بنی ہو۔مگر مجھے کوئی روشنی وغیرہ نظر نہیں آئی تھی۔اس کے باوجود جب میں بلندی کے قریب پہنچا تو اپنی رفتار آہستہ کر لی۔لیکن اندازے کے مطابق وہاں کوئی پوسٹ موجود نہیں تھی۔اگلا نالہ بھی عبور کر کے میں اس سے اگلی پہاڑی پر چڑھ گیا تھا۔اور اس دوران ملگجا اجالا پھیلنے لگا تھا۔مجھے دن گزارنے کے لیے فوراً ہی کوئی ٹھکانہ ڈھونڈنا تھا۔پہاڑی کی بلندی پر میں دور سے نظر آ سکتا تھا اس لیے میں اگلی ڈھلان پر ہو گیا۔اس جانب مجھے کسی پوسٹ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔البتہ میرے بائیں یعنی مغرب کی جانب دور بلندی پر روشنی جھلک رہی تھی۔

نالے کی تہہ میں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے ایک مناسب دراڑ نظر آ گئی تھی وہ ایسی جگہ تھی کہ دشمن میرے سر پر پہنچ کر ہی مجھے ڈھونڈ پاتا۔گو میرے لیے بہتر تو یہی تھا کہ میں جنوبی ڈھلان پر کوئی ٹھکانہ ڈھونڈتا کیوں کہ اس جانب سورج کی روشنی مجھے خاطر خواہ گرمی پہنچا سکتی تھی۔اس کے برعکس شمال کی جانب پہاڑی کے سایے نے مجھے ٹھنڈک ہی میں مبتلا رکھنا تھا۔لیکن ایک سنائپر کے لیے جسمانی آرام و تسکین سے زیادہ چھپنے اور دشمن سے محفوظ

رہنے کی ضرورت اہم ہوتی ہے۔
دشمن سے حاصل کی ہوئی ٹارچ کی روشنی میں میں نے اس دراڑ کا جائزہ لیا اور پھر اندر گھس کر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔کلاشن کوف میں نے گود میں رکھ لی تھی۔ ریڈیو سیٹ کی آواز ذرا بلند کر کے میں دشمن کی بات چیت سننے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلے والی فریکونسی پر خاموشی چھائی تھی۔ ناب گھما کر میں نے جلد ہی نیا چینل ڈھونڈ لیا تھا۔ کنٹرول پارٹیوں کو مختلف مقامات پر تعینات کر رہا تھا۔وہ زیادہ تر جن مقامات کے نام لے رہا تھا وہ میرے لیے نئے اور انجان تھے۔ میں صرف فارورڈ ون اور ٹرپل سیون پوسٹ کے نام سے واقف تھا۔اس کے علاوہ وہ مکمل علاقہ میرے لیے بالکل ہی نیا تھا۔مجھے نہیں معلوم تھا کہ روبن پوسٹ کون سی ہے، ڈبلیو نالہ کس جگہ واقع ہے یا برہما ٹاپ کس چوٹی کا نام ہے۔ میرے لیے تو ان مقامات کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔
عام طور پر جب کوئی سنائپر، کمانڈو یا جاسوس وغیرہ کسی مشن کے لیے سرحد عبور کرتا ہے تو جس علاقے میں وہ جا رہا ہوتا ہے اس کے متعلق نقشوں کے ذریعے اسے مکمل طور پر واقفیت دلائی جاتی ہے۔لیکن اس دفعہ میرا آنا کسی منصوبے کے تحت تو تھا نہیں اسی لیے میری مشکلات اتنی بڑھ گئی تھیں۔
میں نے زیادہ دیر وائرلیس سے سر کھپانے کے بجائے آرام کو ترجیح دی اور وائرلیس بند کر کے پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔سخت تھکن، سردی اور بھوک کی وجہ سے نیند آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی سونا میرے لیے نقصان دہ تھا۔جھولے میں پڑی پانی کی بوتل سے پیاس بجھا کر میں جسم کو آرام دینے لگا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سردی کی شدت میں تو کمی آنے لگی مگر بھوک میں اضافہ ہوتا گیا۔سرد موسم میں یوں بھی بھوک کچھ زیادہ ہی لگا کرتی ہے۔کل صبح ناشتے کے بعد سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔
دوپہر ڈھلے میرے کانوں میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آواز پڑی وہ نیچے نالے میں جا رہے تھے۔ پہلے تو میں نے انھیں تلاشی پارٹی سمجھا مگر ان کی بات چیت سے پتا چلا کہ وہ ٹیلی فون کی تار ٹھیک کرنے والی پارٹی تھی۔ اس علاقے میں اکثر ہوا کی شدت یا کسی جانور وغیرہ کے پاؤں سے اٹکنے کی وجہ سے ٹیلی فون کی تار کٹ جاتی ہے۔اور رابطے کی بحالی کے لیے پارٹی چلانا پڑتی ہے۔ آوازوں کے آگے بڑھ جانے پر میں نے احتیاط سے جھانک کر دیکھا، ان کی تعداد آٹھ تھی۔ حالات کے پیش نظر تمام کے ہاتھوں میں ہتھیار نظر آ رہے تھے۔ وہ راستے

میں بچھی ہوئی فون کی تار کا معائنہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دو تین گھنٹوں بعد وہ اسی رستے سے واپس لوٹے تھے۔

شام کا اندھیرا پھیلتے ہی میں اپنی کمین گاہ سے نکل کر محتاط انداز میں آگے بڑھ گیا۔ اگر میں وہیں پر مزید دو دن گزار لیتا تو میری تلاش میں وہ تیزی نہ رہتی مگر اس طرح بھوک مجھے اتنا کمزور کر دیتی کہ میں صحیح طرح سے چلنے کے قابل بھی نہ رہتا۔ وہاں جھاڑیاں وغیرہ بھی موجود نہیں تھیں کہ ان کے پتے چبا کر میں پیٹ میں لگی آگ پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا۔ گو بھوک پیاس برداشت کرنا ایک سنائپر کا خاصا ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلسل بھوکا رہنے سے جسم بھی کمزوری کا شکار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور ایسی کمزوری جسمانی کارکردگی پر اثر انداز ہونے کے ساتھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔

گو عام حالات میں نالے کے اندر سفر کرنا مناسب رہتا ہے لیکن دشمن کے ناکا لگانے والوں کی نظر بھی عموماً نالے کی گزرگاہ ہی پر ہوتی ہے اس لیے میں نالے میں آگے بڑھنے کے بجائے مخالف سمت کی ڈھلان پر چڑھ کر آگے بڑھنے لگا۔ وہ نالہ آگے جا کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ چونکہ میرا مطمح نظر وہاں سے دور ہٹنا تھا اس لیے میں نے بائیں طرف مڑنے والے نالے کو اختیار کیا۔ اب میرا سفر بتدریج اترائی میں جاری تھا۔ گویا میں مسلسل نشیب میں جا رہا تھا۔ وہ نالا آگے جا کر شمال کی جانب مڑا، میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ نالہ موڑ اور نالہ ملاپ وغیرہ کی جگہ کو میں دائیں بائیں کی ڈھلان پر چڑھ کر عبور کروں۔ کیونکہ دشمن نے ایسی ہی جگہوں پر ناکے لگائے ہوتے ہیں۔ لیکن میری یہ احتیاط کام نہ آئی۔ نالہ موڑ سے سو میٹر پہلے ہی میں نے بلند ہونا شروع کر دیا تھا تاکہ اوپر ہی اوپر سے وہ جگہ عبور کروں بلندی پر پہنچنے سے پہلے ہی اچانک فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیوں کا رخ میری ہی جانب تھا۔ فائر کرنے والے مشرقی جانب نشیب میں تھے۔ جبکہ میں ان سے شمال کی جانب نالے سے دو اڑھائی سو فٹ بلندی پر تھا۔ انھوں نے مجھے شبِ دید آلے سے دیکھا تھا۔

(یہاں ایک بات قارئین کے گوش گزار کر دوں کہ شب دید آلات کی مختلف اقسام ہیں۔ ان میں سے کچھ تو دوربین کی طرح فقط دکھاؤ مہیا کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو مخصوص ہتھیاروں پر لگا کر ان کی مدد سے رات کو بھی فائر کیا جا سکتا ہے۔ عام طور پر انڈین آرمی اور پاک آرمی کے پاس دونوں قسم کے شب دید آلات

موجود ہیں۔لیکن رائفل پر لگا کر فائر کرنے والے آلات زیادہ تر سپیشل گروپس یعنی کمانڈوز وغیرہ کے پاس ہوتے ہیں۔یہ آلات ہر بٹالین کو مہیا نہیں کیے جاتے۔عام فوج کے پاس شب دید عینکیں ہوتی ہیں جس سے وہ رات کے وقت علاقے کی دیکھ بھال تو کر سکتے ہیں انھیں رائفل پر لگا کر فائر نہیں کر سکتے۔اور جو شب دید آلات رائفل اوپر لگائے جاتے ہیں ان سے بھی زیادہ سے زیادہ سو ڈیڑھ سو میٹر تک کارگر فائر گرایا جا سکتا ہے)

پہلی گولی چلتے ہی میں اپنی جگہ پر دبک گیا تھا۔چند قدم نیچے ایک ابھری ہوئی چٹان تھی میں نے فوراً لڑھکتے ہوئے اس کے پیچھے پناہ لے لی۔

''وہ مارا۔'' میرا لڑھکنا کسی کو غلط فہمی میں مبتلا کر گیا تھا۔اس نے سوچا شاید میں گولی لگنے کی وجہ سے لڑھکا ہوں۔اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ ختم ہوئی۔اور پھر تین ٹارچوں کی روشنی اس طرف بڑھنے لگی۔ٹارچ جلا کر دشمن کی طرف حرکت کرنا یقیناً انتہائی درجے کی حماقت تھی۔اس کا نتیجہ انھیں فوراً ہی بھگتنا پڑ گیا تھا۔اس جانب کلاشن کوف سیدھی کرتے ہوئے میں نے مسلسل پانچ چھے دفعہ ٹریگر دبایا تھا۔پہلی گولی فائر ہوتے ہی میرے کانوں میں مضروب کی چیخ پہنچی تھی باقی دو نے ٹارچیں بجھانے کی کوشش کی مگر میں انھیں یہ موقع کب دینا چاہتا تھا۔کلاشن کوف جیسے آٹومیٹک ہتھیار سے تیزی سے فائر کرنا ایک سنائپر کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔میری چلائی ہوئی تیسری گولی کی گونج ختم ہونے سے پہلے چار پانچ کلاشن کوفیں اکٹھی آگ اگلنے لگیں۔میں نے اپنا سر آڑ میں کر لیا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں نے ریڈیو سیٹ کی آواز تھوڑی سی بڑھائی۔کنٹرول ان سے فائرنگ کی وجہ پوچھ رہا تھا۔وہاں موجود آنند گپتا نامی سینئر اسے ٹاکرا ہونے کی بابت اطلاع دینے لگا۔

کنٹرول نے پوچھا۔''تمھاری پارٹی ڈبلیو نالے کے جنوبی سرے پر لگی ہے نا۔اوور......''

''جی سر۔اوور......'' آنند نے فوراً اثباتی جواب دیا۔

''روبن پوسٹ اور چشمہ والی پارٹیاں میں تمھاری طرف بھجوا رہا ہوں،اسے وہیں گھیرے میں لیے رہو،بچ کر نہیں جانا چاہیے۔آؤٹ......'' اسے خاموش رہنے کا کہہ کر وہ دوسری پارٹیوں کو پکارنے لگا۔''روبن پوسٹ اوور......''

''روبن پوسٹ فار کنٹرول پیغام نقل کر لیا ہے۔اوور......'' روبن پوسٹ سے فوراً ہی جواب آ گیا تھا۔

''حوالدار روہیت فار کنٹرول، پیغام نقل کر لیا ہے۔اوور......''اس مرتبہ غالباً چشمہ پارٹی نے جواب دیا تھا۔

''کیپ لسننگ آؤٹ۔'' کہہ کر کنٹرول مزید پارٹی کمانڈروں سے رابطہ کر کے انھیں وہاں پہنچنے کے احکامات جاری کرنے لگا۔

میرا وہاں پڑا رہنا سراسر موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا اور پتھر کی آڑ سے نکلنا بھی نہایت خطرناک تھا۔اچانک مجھے لگا کہ سامنے گرجنے والی چار پانچ کلاشن کوف میں صرف ایک فائر کر رہی تھی باقی خاموش ہو گئی تھیں۔اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے گھیرنے کی کوشش میں تھے۔میں نے آڑ سے سر نکال کر فائر کرنے والے کی سمت نگاہ دوڑائی۔اس کے مسلسل فائر کرنے سے اس کی گن کی بیرل سے بار بار چمک پیدا ہو رہی تھی۔کیوں گولی چلنے سے بیرل سے شعلہ سا لپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔فی الوقت میرے دوڑنے کی راہ میں وہی کلاشن کوف حائل تھی۔شست سادھنا ممکن نہیں تھا کیوں کہ فرنٹ سائیٹ کی ٹپ کے نظر نہ آنے کی وجہ سے درست فائر کرنا ممکن نہیں رہتا۔پہلے والے تین آدمیوں پر بھی میں نے اندازے سے فائر کیا تھا۔یہ علیحدہ بات کہ ایک سنائپر کے اور عام فوجی کے اندازے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔سلیکٹو لیور کو برسٹ پر لگاتے ہوئے میں نے ٹریگر دبا دیا۔سامنے والا فائر فوراً ہی رک گیا تھا۔میں فوراً اٹھ کر بلند ہونے لگا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میرے بائیں جانب سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز آئی،فائر کرنے والے نے بیرل کو آدھے چاند کی شکل میں گھمایا تھا،جس کا صاف مطلب یہی تھا کہ اسے میری جگہ کے بارے معلوم نہیں تھا۔گولیوں کی آواز پر میں ایک لمحہ کے لیے قدم روک کر زمین سے چمٹ گیا تھا۔اور جیسے ہی فائر،رکا اٹھ کر دوبارہ چڑھنا شروع کر دیا۔گو اس ڈھلان پر بھاگ کر چڑھنا تو ممکن نہیں تھا البتہ تیز چل کر اوپر پہنچا جا سکتا تھا۔اور میں یہی کر رہا تھا۔میرا سانس دھونکنی کی مانند چلنا شروع ہو گیا تھا۔میرے دائیں ہاتھ سے بھی گولیاں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ دشمن میرے تین اطراف میں موجود تھا اور اب صرف سامنے کی سمت بقایا تھی۔اور اس سمت میں یوں بھی پہاڑ کی بلندی حائل تھی۔

اوپر پہنچتے ہی ایک لمحے کے لیے میں نے جانے کی سمت کے بارے سوچا اور پھر مخالف سمت میں اترنا شروع کر دیا۔گو میں جانتا تھا کہ ایک دشمن نالہ موڑ مڑ کر سامنے موجود ہے،لیکن کسی اور سمت جانے پر میرے پھنسنے کے

خطرات زیادہ تھے۔ جبکہ اس ایک دشمن کو دھوکا دے کر میں ان کے گھیرے سے نکل کر آگے بڑھ سکتا تھا۔

آدھی اترائی میں نے بھاگ کر طے کی تھی اس کے بعد محتاط انداز میں چلنا شروع کر دیا۔ سامنے چھپا دشمن خاموش تھا۔ اور میرے اندازے کے مطابق اسے مشرقی جانب ہونا چاہیے تھا۔ وہاں مغرب اور شمال سے آنے والے دونالے مل رہے تھے۔ میں پہلے بھی مغرب سے چل کر مشرق کی طرف آ رہا تھا۔ وہ بلندی عبور کر کے میں پھر ایک ایسے نالے میں پہنچنے والا تھا جس کا بہاؤ مغرب سے مشرق کی طرف تھا۔ پہلا نالہ اس ناکے کی جگہ سے شمال کی طرف مڑ کر آگے نکلتا چلا گیا تھا دوسرا نالہ بھی اس جگہ پر پہلے والے نالے سے مل کر شمال کی طرف مڑ کر ایک بڑے نالے کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ ان دونوں نالوں میں پانی بھی بہہ رہا تھا۔ اور جیسا کہ دشمن اس نالے کو ڈبلیو نالہ کہہ رہے تھے اس نسبت سے شمال کی جانب آگے چل کر ایک اور نالے کو اس میں شامل ضرور ہونا چاہیے تھا، اسی طرح ہی اس کی شکل انگریزی کے حرف ڈبلیو کی طرح بنتی۔

دشمن کا خاموش رہ کر گھات میں بیٹھنا میرے لیے نقصان دہ تھا۔ تھوڑا سا مزید نیچے آتے ہی مجھے دو بڑے پتھر پڑے نظر آئے جن کے درمیان چند گز کا فاصلہ تھا۔ اپنے دائیں ہاتھ موجود پتھر کے اوپر ٹارچ رکھ کر میں اس کا رخ شمال مشرق کی جانب موڑا اور ٹارچ جلا کر سرعت سے بائیں ہاتھ موجود پتھر کے پیچھے سے گھوم کر مغرب کی جانب نیچے اترنے لگا۔ چار پانچ سیکنڈ بعد ہی کلاشن کی تڑتڑاہٹ گونجی، فائر کرنے والا سوڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے ٹارچ پر گولیاں برسا رہا تھا۔ دو تین برسٹ کے ساتھ ہی ٹارچ ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ لیکن ٹوٹنے سے پہلے مجھے دشمن کی جگہ کے بارے مطلع کر گئی تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو یقیناً میں نے صرف ایک گولی ہی فائر کرنا تھی۔ لیکن اس وقت اندھیرے کی وجہ سے میرے لیے شست لینا ممکن نہیں تھا۔ سلیکٹو لیور کو برسٹ پر لگا کر میں نے بیرل کا رخ مطلوبہ سمت میں کرتے ہوئے ایک دم ٹریگر دبا دیا۔ ایک سنائپر کو یوں بے دردی سے گولیاں اڑانا بالکل بھی زیب نہیں دیتا تھا، استاد محترم راؤ تصور نے اس موقع پر لازماً یہی کہنا تھا۔ ”اوے بے وقوف، گولیاں بے شک دشمن سے چھینی ہوئی ہیں، مگر ان پر قبضہ تو اپنا ہے نا۔“

مگر وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ میں استاد کے مشوروں پر عمل کر سکتا۔ ٹریگر سے انگلی ہٹانے سے پہلے ہی مجھے دشمن کی چیخ سنائی دے گئی تھی۔

”ٹرنچ۔“ کی آواز نے میگزین خالی ہونے کا اعلان کیا۔خالی میگزین اتار کر زمین پر پھینک کر میں نے بھاگتے ہوئے پشت پر لدے جھولے سے بھری ہوئی میگزین نکالی اور کلاشن کوف پر چڑھاتے ہوئے گن کاک کر لی۔نالے میں پہنچتے ہی میں نے وائرلیس سیٹ کی آواز بڑھادی تھی۔البتہ قدموں کی رفتار میں بھی میں نے کمی نہیں آنے دی تھی۔دشمن کی بات چیت سے اندازہ ہورہا تھا کہ چشمہ اور روبن پوسٹ کی پارٹیاں ٹاکرے والی جگہ کے بالکل قریب پہنچ گئی تھیں۔کنٹرول چیخ چیخ کر صورت حال کے بارے پوچھ رہا تھا۔اسے وہاں پہلے سے موجود پارٹی کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہورہا تھا۔وہاں موجود سینئر آنند گپتا شاید میری گولی کا شکار ہو چکا تھا۔میرے اندازے کے مطابق وہاں صرف ایک ہی آدمی بچا تھا جو مجھے گھیرے میں لینے کے لیے مغربی نالے کی طرف گیا تھا۔

اسی وقت حوالدار روہیت کنٹرول کر پکار کر بتانے لگا۔”سر، یہاں صرف ایک آدمی زندہ بچا ہوا ہے باقی تمام سورگ باشی ہوگئے ہیں۔اوور......“

”یہ تمام الو کے پٹھے سوئے رہتے ہیں اور وہ انھیں آرام سے مار کر آگے بڑھ جاتا ہے۔اوور......“ کنٹرول کا غصہ دیدنی تھا۔

”سر ہم ڈبلیو نالے میں آگے بڑھ کر اس کا پیچھا کرتے ہیں۔اوور......“ روہیت نے اجازت مانگنے کے انداز میں پوچھا۔

”روہیت، ابھی تک تم لوگوں کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ نالے میں سفر نہیں کرتا، وہ نرگ واسی مسلسل ڈھلان پر سفر کررہا ہے۔اوور......“

”تو پھر کیا کریں سر؟ اوور......“

کنٹرول نے کہا۔”روبن پوسٹ سے آنے والی پارٹی کو بھی اپنے ساتھ ملا کر ڈبلیو نالے میں آگے بڑھو۔ اپنے کچھ آدمی دائیں بائیں بلندی پر چڑھا کر آگے کا رخ کرنا نالے ہی میں نہ بھاگتے جانا۔اوور......“

”راجر سر......“

”روہیت، بہت احتیاط سے۔مجھے شک ہے اس آدمی کا فہیم اوپی سے گرنا حادثہ نہیں ہے۔یہ کسی منصوبے

کے تحت ہی نیچے اترا ہے۔کوئی عام فوجی اتنا چالاک اور تیز نہیں ہوسکتا۔یہ ایک تربیت یافتہ کمانڈو لگ رہا ہے۔اوور......"

"آپ چنتا نہ کریں سر میں محتاط رہوں گا۔اوور......"

"میں مزید نفری بھی بھجوا رہا ہوں، کیپ لسننگ آؤٹ۔" کنٹرول آخری حکم بتا کر خاموش ہو گیا تھا۔

نالہ مسلسل نشیب میں اتر رہا تھا۔اب تو مجھے کہیں کہیں جھاڑیوں وغیرہ کے ہیولے بھی نظر آنے لگ گئے تھے۔اندازے کے مطابق جلد ہی میں ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں مغرب سے آنے والا ایک اور نالہ وہاں شامل ہو رہا تھا۔میں شمالی نالے ہی میں آگے بڑھتا گیا۔پچاس ساٹھ قدم آگے آکر ایک تنگ سا راستہ مشرق کی طرف نکل رہا تھا۔مشرق کی جانب موجود پہاڑی وہاں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔میں نے شمالی نالہ چھوڑ کر تھوڑی سی بلندی طے کی اور مشرقی نالے میں گھس گیا۔وہ نالہ کافی تنگ تھا اور عام نالوں کے برعکس اس کی اترائی کسی ڈھلان کی طرح تھی۔پانچ چھے سو گز آگے جا کر نالہ وسیع ہونے لگا۔مشکل اترائی بھی بتدریج آسان اور ہموار ہو گئی تھی۔وائرلیس سیٹ کی بیٹری ختم ہو گئی تھی۔اب وہ سیٹ میرے کسی کام کا نہیں تھا۔اس فالتو بوجھ کو بھی میں نے ایک طرف اچھال دیا تھا۔

مجھے امید تھی کہ میں دشمن کے گھیرے سے نکل آیا ہوں۔ڈبلیو نالے سے مختلف راستے دائیں بائیں نکل رہے تھے۔دشمن اتنی آسانی میرے جانے کی سمت کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔یوں بھی میں کسی قائدے قانون کے تحت سفر نہیں کر رہا تھا کہ کسی متعین سمت کا رخ کرتا۔میرا مطمح نظر تو دشمن کے گھیرے سے نکل کر واپس پاکستان کی سرحد کو عبور کرنا تھا۔فی الحال تو میں دشمن کے گھیرے سے نکل آیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ عقب میں دشمن کی پوسٹیں موجود نہیں تھیں۔ممکن تھا کہ انھوں نے عقبی پوسٹوں کو بھی مختلف رستوں پر تعینات کر دیا ہو۔اور اب تک میں دشمن کو کافی نقصان بھی پہنچا چکا تھا۔ایسی صورت میں میری تلاش اور زیادہ ضروری ہو گئی تھی۔وہاں سے زیادہ سے زیادہ دور جانے کی غرض سے میں ہلکے قدموں سے دوڑ کر جا رہا تھا۔وہاں سے جتنا زیادہ فاصلہ ہوتا اتنا ہی بچت کے امکان بڑھ جاتے۔بیس کا چاند طلوع ہو کر گھپ اندھیرے سے نبرد آزما ہو گیا تھا۔

عقب میں چند کلومیٹر دور تیز فائرنگ کی آواز گونجنے لگی۔شاید کسی بے زبان جانور کی شامت آگئی تھی۔دشمن کی بات چیت سننا اب میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔

مسلسل پر مشقت بھاگ دوڑ اور بھوک کی وجہ سے میں نقاہت محسوس کرنے لگا تھا۔سخت سے سخت جان آدمی کو بھی بھوک توڑ کر رکھ دیتی ہے۔بغیر کچھ کھائے مجھے چالیس گھنٹے سے بھی زیادہ وقت ہو گیا تھا۔اگر کسی جگہ بغیر حرکت کیے بیٹھنا ہوتا تو بھوک برداشت کرنا اتنا مشکل نہ ہوتا لیکن ایسی حالت میں پہاڑی علاقے کا دشوار گزار سفر نہایت ہی مشکل تھا۔

آگے جا کر اس نالے میں اور نالے بھی شامل ہوئے،دو تین جگہ سے وہ نالہ تقسیم ہو کر دائیں بائیں بھی مڑا مگر میں سیدھا چلتا رہا۔خوش قسمتی سے مجھے ابھی تک دشمن کی کوئی پارٹی نہیں ٹکرائی تھی۔یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ عقب میں آنے والا دشمن کون سی سمت اختیار کیے ہوئے تھا۔خود مجھ سے بھی کسی مخصوص سمت کا تعین نہیں ہو پا رہا تھا۔میرے ذہن میں بس ہلکا سا جو منصوبہ تھا وہ اس سرحد سے دور جا کر بارڈر پار کرنے کا تھا۔یقیناً وہاں نزدیک کے علاقے میں دشمن بارڈر سیل کر چکا ہوگا۔اور جب تک میری تلاش کی سرگرمی مانند نہ پڑتی دشمن نے رستوں کی ناکا بندی سے احتراز نہیں برتنا تھا۔دوسرا نمبر سردی کا تھا۔کارگل کی ان پہاڑیوں میں سردی شدید نوعیت کی تھی۔اور نا کافی لباس میں میں نے موسم ہی سے ہار جانا تھا۔اس لیے میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں کم اونچے علاقے کا رخ کرتا۔اس طرح ایک تو حادثے کی جگہ سے زیادہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے میری حفاظت کا امکان زیادہ ہوتا۔دوسرا موسم اتنا سرد نہ ہوتا کہ مجھے بھاری برفانی لباس کی ضرورت پڑتی۔

وہ نالہ ایک چھوٹی سی وادی میں نکلا۔اس کے ساتھ ہی مجھے تھوڑے فاصلے پر روشنیوں کی جھلک نظر آئی۔وہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ایسی آبادیوں میں چھپ کر وقت گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے کیوں کہ ایسی آبادیوں پر ایک تو فوج بہت گہری نگاہ رکھتی ہے دوسرا وہاں ایسے سول بھی موجود ہوتے ہیں جو فوج کے لیے جاسوسی کا کام کرتے ہیں اور کسی بھی اجنبی کی آمد کی اطلاع متعلقہ فوج تک پہنچانے میں ایک لمحہ نہیں لگاتے۔البتہ کسی قابل بھروسا آدمی کے گھر کے کسی اندرونی کمرے میں چھپ کر پڑا رہنے کی صورت میں بچنے کی امید پیدا ہو جاتی ہے میں نے بغیر کسی شک وشبے کے اس آبادی کو نظر انداز کر کے آگے نکل جانا تھا،اگر بھوک سے میرا برا حال نہ

ہوتا۔اب تو کسی گھر سے مانگ کر کھانا کھانا میری مجبوری تھی۔انسان کے جسم کی بنیادی ضروریات میں بھوک اور پیاس ایسی ضرورتیں ہیں جن سے زیادہ دیر مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔اور اس وقت میرا ابھی بھوک سے لڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

آبادی میں گھسنے سے پہلے ہی چند آوارہ کتے قریب آ کر مجھے خوش آمدید کہنے لگے۔ان کے استقبال کے لیے میں نے پہلے ہی سے ایک چھڑی کا بندوبست کیا ہوا تھا۔چونکہ ان کتوں کا کام ہی کسی اجنبی آدمی اور گیدڑ ،لومڑ وغیرہ کو دیکھ کر بھونکنا ہوتا ہے اور رات کے بیش تر حصے میں ان کا بھونکنا جاری رہتا ہے اس لیے ان کی آواز پر کم ہی کان دھرا جاتا ہے۔کتوں کو لاٹھی سے ڈرا کر میں ایک قریبی مکان کی چار دیواری میں داخل ہو گیا۔پہاڑی علاقے میں موجود چھوٹی آبادیوں میں عموماً گلیوں وغیرہ کا تصور ناپید ہوتا ہے۔اسی طرح مکانات کی چار دیواری بھی خال خال بنی ہوتی ہے۔یہ ثقافت میں نے کشمیر والے علاقے کی بیان کی ہے،وزیرستان میں تو مکانات کی چار دیواری کمروں سے بھی اونچی بنی ہوتی ہے۔

جس مکان میں میں گھسا اس کی چار دیواری چار پانچ فٹ ہی بلند تھی۔میرے مکان میں گھستے ہی کتوں کا بھونکنا ذرا کم ہو گیا تھا۔چھوٹا سا صحن عبور کر کے میں دروازے کے قریب پہنچا۔متوقع طور پر دروازہ اندر سے بند تھا۔میں نے ہلکے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

تھوڑی دیر بعد ہی نامانوس لہجے میں کچھ پوچھا گیا۔

”دروازہ کھولو۔“میں نے یوں درشت لہجہ اپنایا جیسے انڈین فوج اس کے دروازے پر آئی ہو۔یوں بھی اتنا تو میں جانتا تھا کہ انڈین آرمی گاہے گاہے ان آبادیوں کو تنگ کرتی رہتی ہو گی۔

فوراً ہی چٹخنی اترنے کی آواز آئی دروازے کا پٹ وا ہوا،ایک درمیانی عمر کا مرد دروازے پر کھڑا تھا۔اس نے ہاتھ میں لالٹین تھامی ہوئی تھی۔کلاشن کوف کی نال اس کے پیٹ میں چبھوتے ہوئے میں نے اندر دھکیلا اور دروازہ کنڈی کر دیا۔

”جج......جی آپ کون؟“اس نے ہکلاتے ہوئے سوال کیا۔اس مرتبہ اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں بات کی تھی۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔" دشمن نہیں ہوں، میں نے بس کھانا کھانا ہے اور آگے نکل جاؤں گا۔"

"مم......مگر آپ ہیں کون؟" وہ سخت خوف زدہ تھا۔

"بتایا تو ہے مہمان ہوں۔ اور اب آگے چلو۔" میں نے اسے کلاشن کوف سے ٹہوکا دیا۔

وہ مرے مرے قدموں سے واپس مڑ گیا۔ لالٹین اندرونی کمرے کی دیوار سے لٹکا کر وہ مجھے گھورنے لگا۔

میں نے پوچھا۔" گھر میں اور کون کون موجود ہے؟"

اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔" اکیلا ہوں۔"

میں نے پوچھا۔" کھانے کو کچھ موجود ہے؟ دو تین دن سے میں نے کچھ نہیں کھایا۔"

وہ خفیف لہجے میں بولا۔" روٹی اور سالن تو نہیں ہے، البتہ آٹا گوندا ہوا رکھا ہے۔"

"باورچی خانہ کہاں ہے؟"

"اسی کمرے میں کھانا پکاتا ہوں۔" اس نے کونے میں موجود چولھے کی جانب اشارہ کیا۔

"تو شروع ہو جاؤ۔" میں نے اسے آگ جلانے کا اشارہ کیا۔

ایک جانب پڑی لکڑیاں چولھے میں ترتیب سے جما کر اس نے کپڑے کے ایک ٹکڑے کو جلا کر لکڑیوں کے بیچ میں رکھ دیا۔ آگ کے تیز ہونے تک وہ توا چولھے پر رکھ کر گوندے ہوئے آٹے کا پیڑا بنانے لگا۔

"دوست میں آپ کو کبھی بھی تکلیف نہ دیتا مگر میں دو روز سے بھوکا ہوں، انڈین فوج کتوں کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہے۔ اور سچ کہوں تو میرا قصور صرف اتنا ہے کہ میں پاکستان آرمی کی ایک پوسٹ سے غلطی سے پھسل کر اس طرف آ گرا۔" اس کی ہمدردی سمیٹنے کے لیے میں نے اپنے متعلق تمام تفصیل اس کے سامنے بیان کر دی ۔وہ کوئی جواب دیے بغیر گرم توے پر روٹی ڈالنے لگا۔ گوندے ہوئے آٹے سے بہ مشکل دو روٹیاں ہی بن پائی تھیں ۔اس نے جیسے ہی پہلی روٹی توے سے اتاری میں گرم گرم روٹی کو جڑ گیا۔ سالن یوں بھی موجود نہیں تھا ۔اور نہ مجھ میں اتنا صبر رہ گیا تھا کہ سالن وغیرہ کے بننے کا انتظار کرتا۔ دوسری روٹی کے بننے تک میں پہلی روٹی معدے میں اتار چکا تھا۔ گرم گرم گندم کی روٹی نے اس وقت جو لطف دیا تھا وہ بیان سے باہر ہے۔

"یار! سیدھی بات ہے کہ آپ کو مزید آٹا گوندنا پڑے گا، کیوں کہ ان دو روٹیوں سے میری آنت بھی گیلی

نہیں ہوئی۔البتہ آٹا گوندنے سے پہلے چائے بنانا ضروری ہے۔‘‘
وہ بغیر کسی تکرار کے ایک برتن میں رکھے تازہ دودھ سے چائے بنانے لگا۔صبح کی چائے کے لیے رکھا گیا دودھ اس ضمن میں کام آیا تھا۔
’’آپ کا نام کیا ہے؟‘‘
’’مشتاق۔‘‘اس کے لہجے سے مجھے کوئی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ بیزار ہے، غصے میں ہے یا بالکل نارمل ہے۔اس نے پتیلی میں دودھ، پانی، پتی اور چینی اکٹھے ہی ڈال کر چولھے پر چڑھادی۔
’’مشتاق بھائی، کیا مجھے آپ کے کپڑوں کا کوئی پرانا جوڑا مل سکتا ہے۔‘‘ وہاں سے آگے مجھے دن کو بھی سفر کرنا پڑ سکتا تھا اور ایسی صورت میں ٹریک سوٹ کے بجائے کپڑوں کا ہونا ضروری تھا۔ٹریک سوٹ میں میں نمایاں لگتا، کیوں کہ وہ کوئی شہر نہیں تھا۔وہاں کے مقامی لوگ عموماً شلوار قمیص میں ملبوس نظر آتے اور میرے لیے بھی انھی کا حلیہ بنانا ضروری تھا۔
مشتاق نے حسب سابق خاموشی سے اٹھ کر ایک پرانے سے ٹرنک کا ڈھکن اٹھایا اور مٹیالے رنگ کے کپڑوں کا ایک جوڑا میرے جانب بڑھادیا۔
ٹریک سوٹ اتار کر میں نے کمرے کے ایک کونے میں لگے ہوئے لکڑی کے پھٹوں پر پھینکا البتہ ٹریک سوٹ کے نیچے پہنا ہوا گرم پاجامہ اور بنیان اتارنے کی ضرورت میں نے محسوس نہیں کی تھی۔فوجی جھولا بھی مجھے پھنسا سکتا تھا اس لیے میں نے اس میں رکھی کلاشن کوف کی تین اضافی میگزینیں نکال کر کوٹ کی جیبوں میں منتقل کر دیں۔اس اثناء میں چائے تیار ہوگئی تھی۔
میں گرم گرم چائے سے لطف اندوز ہونے لگا جبکہ وہ آٹا گوندنے لگا تھا۔دو روٹیاں کھانے کے بعد بھوک کی شدت میں کچھ کمی ہوئی تھی لیکن ابھی تک کھانے کی طلب اچھی خاصی محسوس ہو رہی تھی۔اس کے آٹا گوندنے تک میں چائے کی دو پیالیاں معدے میں انڈیل چکا تھا۔
اچانک ہی کتوں کے بھونکنے کی آواز تیز ہوگئی تھی۔یوں جیسے کوئی اجنبی آبادی میں داخل ہوا ہو۔یہ بھی ممکن تھا کہ کتے کسی جانور وغیرہ پر بھونک رہے ہوں۔لیکن جلد ہی دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے میرے

مؤخر الذکر اندازے کو جھٹلا دیا تھا۔

''پہنچ گئے ہیں کتے۔'' مشتاق کی نفرت بھری آواز بلند ہوئی۔ اب مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھے بہلانے کے لیے انڈین فوجیوں کو کوس رہا تھا یا سچ ہی میں وہ ان سے اتنی ہی نفرت کرتا تھا۔ البتہ زوردار دستک یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ انڈین فوجی ہی تھے۔

مجھے لگا میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔ وہاں سے بھاگ نکلنا خاصا دشوار تھا۔ کیوں کہ وہاں کوئی اکیلا فوجی تو ہونا نہیں تھا۔ پھر میں مشتاق پر بھی اعتماد کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔

میری سوچوں سے انجان اس نے فوراً ہی دیوار سے ٹنگی لالٹین اتاری اور کہنے لگا۔ ''ادھر۔'' اس نے کونے میں لگے لکڑی کے پھٹوں کے سامنے سے لٹکی چادر اٹھائی اور مجھے نیچے گھسنے کا اشارہ کیا۔

یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ انڈین فوجی ان پھٹوں کے نیچے نہ جھانکتے۔ مجھے متذبذب دیکھ کر وہ پر اعتماد لہجے میں بولا۔

''اعتبار کرو۔''

ایک دم خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے میں جھک کر ان پھٹوں کے نیچے گھس گیا۔ وہاں کافی کاٹھ کباڑ پڑا نظر آ رہا تھا۔

وہ تیز تیز بولا۔ ''کونے میں جو لکڑیاں پڑی ہیں انھیں ہٹانے پر ایک تختہ نظر آئے گا۔ اس کے نیچے گھس کر تختہ اپنے اوپر برابر کر لو۔''

دروازے پر ہونے والی دستک اور زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میرے پاس سوچنے کے لیے ایک لمحہ بھی موجود نہیں تھا۔ میں زمین پر ہاتھ ٹیک کر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا سرعت سے کونے میں پڑی لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف بڑھا لکڑیوں کے ڈھیر کو ذرا سا ہٹاتے ہی مجھے تختہ نظر آ گیا۔ تختے کو اوپر اٹھا کر میں فوراً ہی نیچے گھس گیا تھا۔ وہ گڑھا قریباً چار پانچ فٹ گہرا ہوگا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی اس نے تختہ بند کیا اور اس کے اوپر دوبارہ لکڑیاں بکھیر کر باہر نکل گیا۔ اب میں مکمل طور پر اس کے رحم و کرم پر تھا۔ میں لکڑی کے تختے سے کان لگا کر اپنی سماعتوں سے کچھ جاننے کی کوشش کرنے لگا۔

منٹ بھر کے وقفے کے ساتھ ہی بھاری بوٹوں کی آواز اندر داخل ہوتی ہوئی سنائی دی۔

''سچ سچ بتاؤ کوئی یہاں آیا تھا؟'' ایک کرخت آواز میری سماعتوں میں داخل ہوئی۔

''نن......نہیں صاحب، کوئی بھی نہیں آیا۔'' مشتاق نے گھگیائے ہوئے لہجے میں جواب دیا تھا۔

''یہ کیا ہے، رات کے تین بجے تم آٹا کیوں گوندرہے تھے اور یہ چائے کس کے لیے بنائی تھی؟'' یقیناً اسے چولھے میں دہکتے انگارے، تازہ گوندا ہوا آٹا اور چائے کی پتیلی نے چوکنا کر دیا تھا۔

''صص......صاحب روزہ رکھنے کے لیے آٹا گوندا ہے اور چائے بھی بنائی ہے۔'' اسے فوراً ہی ایک مناسب بہانہ سوجھ گیا تھا۔

''یہ روزوں کا مہینا تو نہیں ہے۔'' پوچھنے والے کے لہجے میں شکوک کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔

''نفلی روزے رکھ رہا ہوں صاحب۔'' اس مرتبہ مشتاق کے لہجے میں پہلے سے زیادہ اعتماد موجود تھا۔

''استاد روہیت!......یہ دیکھیں۔'' ایک نئی آواز ابھری تھی۔ نجانے اس نے روہیت کو کیا دکھایا تھا۔

اس آدمی بات ختم ہوتے ''چٹاخ۔'' کی زوردار آواز ابھری۔ یقیناً حوالدار روہیت نے مشتاق کے چہرے پر تھپٹر رسید کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کرخت لہجے میں گالی بکی...... ''کتے کے بچے یہ جھولا تمھارے پاس کہاں سے آیا۔ اور یہ ٹریک سوٹ کس کا ہے؟''

میرا دل ایک دم ڈوب گیا تھا۔ تیزی میں ہم سے درستی بھول گئی تھی۔ اگر وہ جھولا اور ٹریک سوٹ ان کے ہاتھ نہ لگے ہوتے تو ہمارے بچنے کی گنجائش موجود تھی، مگر اب وہ چھوڑنے والے نہیں تھے۔ مشتاق کی بھی بولتی بند ہو گئی تھی۔

''بولتے کیوں نہیں ہو ماں..........'' روہیت کے منہ سے گندی گندی گالیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا۔ ''کہاں چھپایا ہے بہن کے خصم کو جلدی بولو۔'' گالیاں بکنے کے ساتھ اس نے ہاتھ، پاؤں سے بھی مشتاق کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا تھا۔

''وہ کافی دیر ہوئی یہاں سے نکل گیا ہے۔'' مار کھاتے ہی مشتاق نے میرے وہاں آنے کی بات تو اگل دی لیکن اب بھی وہ مجھے حفاظت مہیا کر رہا تھا۔ میرے دل میں اس کے خلوص نے رقت بھر دی تھی۔ میں مجبوری سے

وہاں چھپ تو گیا تھا، مگر میرے دل میں یہ اندیشہ ضرور موجود تھا کہ وہ دھوکا دے گا۔ لیکن ایک مسلمان ہونے کے ناتے اس نے مجھے بچانے کی حتی الوسع کوشش کی تھی۔

''یہاں تلاشی لو، ہوسکتا ہے اس کی بہن کا............اب تک یہیں چھپا ہو۔'' روہیت اپنے آدمیوں کو بولا۔ انھوں نے فوراً ہی لکڑیوں کے بستر کے نیچے جھانکا کہ میرے چھپنے کے لیے سب سے مناسب جگہ وہی تھی۔ مگر مشتاق نے اس ضمن میں بہت اچھا بندوبست کر رکھا تھا۔ انھیں تمام کاٹھ کباڑ ہٹائے بغیر لکڑی کا تختہ نظر نہیں آ سکتا تھا، مگر انھوں نے صرف نیچے جھانکنے پر اکتفا کیا تھا۔ اور پھر وہ ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھ گئے، دروازے کو ٹھوکر مار کر کھولنے کی آواز میرے کانوں تک پہنچی تھی۔

''کچھ نہیں ہے سر۔'' ان مختصر سے کمروں کی تلاشی لیتے ہوئے انھیں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔

''سچ بتاؤ اس پاپی کا رخ کس جانب تھا۔'' روہیت ایک بار پھر مشتاق سے پوچھنے لگا۔

''اس بارے اس نے کوئی بات بھی نہیں کی صاحب، بس دروازہ کھٹکھٹا کر اس نے مجھے جگایا اور رائفل دکھا کر کھانا بنانے کو کہا۔ اور زبردستی کپڑوں کا جوڑا پہن کر یہاں سے نکل گیا۔ میں نے جو صبح کے لیے آٹا گیلا کیا تھا اس کی روٹیاں بنا کر اسے دی تھیں۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد اب صبح ناشتے کے لیے آٹا گوندھ رہا تھا۔'' مشتاق نے جھوٹ سچ ملا کر ایک کہانی بیان کر دی۔

روہیت نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''ہونہہ! تو پہلے یہ بات کیوں نہیں بتائی۔''

''میں ڈر گیا تھا صاحب!'' مشتاق گھگیایا۔

''ڈرنا تو تمھیں چاہیے۔'' روہت نے قہقہہ لگایا۔ ''بہرحال اب تم چھٹی کرو، ایک گھس بیٹھے کے سہولت کار کو میں زندہ نہیں چھوڑ سکتا۔''

''مم......ماف......'' اس سے زیادہ مشتاق نہیں بول پایا تھا۔ کلاشن کوف دو مرتبہ گرجی اور مشتاق کی پر اذیت چیخ نے میرے کانوں میں زہر انڈیلا۔ میرے حصے کی گولی اس کا مقدر بن گئی تھی۔ میرا دل ایک دم غم سے بھر گیا تھا۔

''اس کی لاش، یہ جھولا اور ٹریک سوٹ باہر لے جاؤ، کنٹرول کو بتا دیں گے کہ چونکہ اس خبیث کے ساتھ

رہنمائی کرنے والا ایک مقامی شخص موجود تھا اس وجہ سے وہ ہمیں پکڑائی نہیں دے رہا تھا۔باقی یہاں بسنے والے دوسرے لوگوں کو بھی اس کی لاش دیکھ کر عبرت حاصل ہوگی اور آئندہ کو کوئی کسی گھس بیٹھے کو پناہ دینے کی غلطی نہیں کرے گا۔اور شرما تم گھر کو آگ لگا دو۔“

اس کی موخّر الذکر بات سن کر میرے بدن میں چیونٹیاں رینگنے لگ گئی تھیں۔وہ گڑھا میرے لیے جہنم کا گڑھا بننے والا تھا۔

☆......☆......☆

وہ تمام گھروں کی تلاشی لینے میں لگے ہوئے تھے۔آبادی کے دوسرے ہی گھر سے میرے بارے اطلاع ملتے ہی روہیت نے اپنے باقی آدمیوں کو کال کر کے مشتاق کے گھر کے سامنے اکٹھا ہونے کا حکم دے دیا تھا۔اس کا ارادہ غالباً میرا تعاقب کرنے کا تھا۔اس کے ریڈیو سیٹ پر بات کرنے سے ظاہر یہی ہو رہا تھا کہ اس کے ہمرا کافی افراد موجود تھے۔

شرما نامی آدمی کے آگ لگانے تک وہ وہیں کھڑا رہا۔ان پہاڑی علاقوں میں بنے ہوئے گھروں میں لکڑی کا بے دریغ استعمال ہوتا ہے اور اب وہ لکڑی کا گھر میرے لیے چتا بننے والا تھا۔آگ میں جلنے سے بہتر تھا کہ میں گولی کھا کر جان دے دیتا۔یہ سوچ آتے ہی میں باہر نکلنے کے تیار ہو گیا۔میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ جیسے ہی وہ آگ لگا کر باہر نکلیں گے میں بھی اس چوہے دان سے باہر نکل جاؤں گا۔

جیب سے لائیٹر نکال کر میں نے اس گڑھے کا جائزہ لینے لگا۔وہ پانچ ضرب پانچ فٹ کی چوکور جگہ تھی۔غربی جانب لکڑی کا دروازہ بنا دیکھ کر میں چونک گیا تھا۔ایک دم میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا لائیٹر کی روشنی میں ایک تنگ راستہ دیکھ کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔یقیناً وہ چور راستہ تھا۔اور وہ راستہ یہ بھی ظاہر کر رہا تھا کہ مشتاق کا تعلق آزادی کی خاطر لڑنے والے مجاہدین کے کسی گروہ سے تھا۔چونکہ میری ایک دم آمد پر وہ شش پنج میں پڑ گیا تھا کہ آیا مجھ پر اعتبار کرے یا نہیں اسی وجہ سے اس نے میرے سامنے اپنی اصلیت ظاہر نہیں کی تھی۔البتہ انڈین فوجیوں کے پہنچ جانے کے بعد اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے کچھ بتا سکتا۔میں اس رستے پر آگے بڑھنے لگا۔چونکہ وہ راستہ نہایت تنگ تھا اس وجہ سے مجھے جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔وہ سرنگ پچاس ساٹھ گز سے

زیادہ طویل نہیں تھی۔اس کا اختتام ایک اور گڑھے پر ہوا۔اب وہاں سے باہر نکلنے کی صورت میں جانے کیسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔میں وہیں بیٹھ کر انڈین فوجیوں کے دفع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ان کے جانے کے بعد میں اطمینان سے باہر نکل سکتا تھا۔باقی مشتاق کے گھر کو آگ لگ جانے کے بعد وہ سرنگ یوں بھی ظاہر نہیں ہوسکتی تھی۔چھت کے ملبے نے گر کر یقیناً مشتاق کے گھر موجود گڑھے کو بھر دینا تھا۔

میں پاؤں پسارے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔خوراک کے پیٹ میں جاتے ہی مجھے غنودگی سی محسوس ہونے لگی تھی۔وہاں پر مجھے کوئی خاص خطرہ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا اس لیے میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔زمین دوز گڑھا کافی گرم بھی تھا۔مجھے جلد ہی نیند آ گئی تھی۔

آنکھ کھلنے پر میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ دوڑائی دن کے نو بج رہے تھے۔میں کافی دیر آرام کر چکا تھا۔میں نے اٹھ کر کلاشن کوف کندھے سے لٹکائی اور دونوں ہاتھوں کو گڑھے کی چھت پر پڑے لکڑی کے تختے پر ٹیک کر اسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھانے لگا۔میری کوشش تھی کہ کوئی آواز نہ نکلے۔وہ گڑھا اور اس پر پڑا لکڑی کا تختہ بالکل مشتاق کے گھر جیسا ہی تھا۔بہت زیادہ احتیاط کے باوجود تھوڑی بہت آواز پیدا ہوئی تھی کیوں کہ اس تختے پر بھی کاٹھ کباڑ پڑا ہوا تھا۔آہستہ آہستہ میں نے تختہ بالکل ہی اوپر اٹھا دیا اور پھر اچک کر باہر نکل آیا۔اس کے ساتھ ہی میں نے تختہ واپس بند کر دیا۔

میں اس وقت لکڑی کے پھٹوں سے بنے ہوئے کسی بستر کے نیچے ہی تھا۔اور کمرے میں چھائی خاموشی ظاہر کر رہی تھی کہ وہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔

میں بے آواز رینگتا ہوا بستر کے نیچے سے نکلا۔کمرہ واقعی خالی تھا۔مجھے صحن میں کافی لوگوں کی موجودی کا احساس ہوا۔عورتوں کا رونا،بچوں کا شور اور کچھ باتوں کی آوازیں میرے کانوں میں پڑیں۔دروازے کی درز سے آنکھ لگا کر میں نے صحن میں جھانکنے کی کوشش کی مگر اس کے سامنے ایک اور کمرہ موجود تھا جس کی وجہ سے میں صحن میں نظر نہیں دوڑا سکا تھا۔البتہ لگ یہی رہا تھا کہ جیسے کوئی میت والا گھر ہو اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ گھر کے مکینوں کا مشتاق سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔اس وقت وہاں سے باہر نکلنا مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔اور یہ مصیبت میرے ساتھ مشتاق کے احباب کی زندگیوں کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھی۔میں باہر نکلنے

کا ارادہ ترک کر کے وہیں کھڑا رہا۔ اچانک ہی رونے دھونے کی آوازیں تیز ہوئیں۔ یوں لگا جیسے جنازہ اٹھا کر باہر لے جایا جا رہا ہو۔ تھوڑی دیر تک عورتوں کے اونچی آواز میں رونے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں اور پھر آہستہ آہستہ وہ شور تھم گیا۔

مجھے دو تین گھنٹے انتظار کرنا پڑ گیا اور کسی نے بھی کمرے کا رخ نہیں کیا تھا۔ میں بستر پر بیٹھ کر کسی کے وہاں آنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر کسی نے باہر والے کمرے کا دروازہ کھولا، میں ایک دم چوکنا ہو کر اٹھا اور کمرے کے دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ آنے والا اسی طرف آ رہا تھا۔ دروازے کے بھڑے ہوئے دونوں پٹ وا ہوئے اور ایک عورت اندر داخل ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس کی نظر ایک دم مجھ پر پڑی تو اس کے منہ سے چیخ بھی نکل سکتی تھی اس لیے جیسے ہی وہ دو قدم آگے بڑھی میں نے فوراً دروازے کے عقب سے نکل کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ حیرت سے تڑپی، اس کے منہ سے ''اوں......اوں۔'' کی آواز برآمد ہوئی مگر میری گرفت کافی سخت تھی۔ ایک غیر عورت کو یوں اپنے ساتھ لپٹانے پر مجھے خفت تو محسوس ہو رہی تھی مگر میری مجبوری تھی۔ اسے دروازے کے سامنے سے ایک طرف کر کے میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں دوست ہوں، شور نہ کرنا۔ تمھیں چھوڑ رہا ہوں۔'' پتا نہیں میرے الفاظ اس کی سمجھ میں آئے تھے یا نہیں مگر اس نے مچلنا بند کر دیا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹایا وہ آنکھوں میں حیرانی بھرے میری طرف متوجہ ہوئی۔ وہ ایک جوان سال لڑکی تھی۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک مرد جب کسی لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے کہ وہ لڑکی اس کی بیٹی یا بہن جیسی ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی اشارہ ہے۔ اور الفاظ سے کئی گنا زیادہ موثّر ہے۔ اس کے چہرے پر ایک دم اطمینان پھیل گیا تھا۔

''میں مشتاق کا دوست ہوں۔'' میں نے رک رک فقرہ پورا کیا۔ نا معلوم وہ کون سی زبان بولتے تھے اور آیا اسے اردو اس کی سمجھ میں آتی بھی تھی کہ نہیں۔

اس نے سمجھ جانے والے انداز میں اوپر نیچے سر ہلایا اور اس کے ساتھ ہی انگلی سے بستر کی طرف اشارہ کیا

گویا پوچھ رہی تھی کہ میں وہیں سے برآمد ہوں۔

میں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔اپنے پیچھے دروازہ اس نے بند کر دیا تھا۔گو میرے دل میں تھوڑا بہت خدشہ موجود تھا کہ کہیں باہر جا کر وہ شور نہ مچا دے، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ میں اس پر اعتبار کرنے پر مجبور تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے کے باہر قدموں کی چاپ ابھری میں حفظ ما تقدم کے طور پر دوبارہ کواڑ کے پیچھے ہو گیا تھا۔اس مرتبہ وہ لڑکی ایک جواں سال آدمی ہمراہ نمودار ہوئی۔میں دروازے کے عقب سے نکل آیا۔آنے والے مجھ سے تر تپاک مصافحہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم آمنے سامنے بیٹھے تھے۔اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں جو کچھ بتایا اس کا لبِ لباب یہی تھا کہ وہ مشتاق کا بہنوئی ہے اور اس کے ساتھ موجود لڑکی مشتاق کی بہن تھی۔مشتاق کافی عرصے سے آزادی کے متوالوں کا ساتھی تھا۔اس نے شادی نہیں کی تھی۔گزشتہ رات ہندوؤں نے اس کے گھر کو آگ لگانے کے بعد گاؤں کے تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے اعلان کیا تھا کہ اس کے بعد بھی اگر کسی نے مجاہدین کو پناہ دینے یا ان کی مدد کرنے کی کوشش کی تو ان کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔حالانکہ یہی کچھ وہ پچھلی چھے سات دہائیوں سے کرتے آرہے ہیں مگر آزادی کے متوالوں کے دل میں جلتی جوت کو بجھانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ان ظالموں نے جاتے ہوئے اتنی مہربانی کی تھی کہ مشتاق کی لاش وہیں چھوڑ گئے تھے۔تھوڑی دیر پہلے ہی مشتاق کی تدفین ہوئی تھی۔

آج آزاد وطن کی پر بہار فضاؤں میں سانس لیتے ہوئے ہماری نوجوان نسل کو آزادی کی قدر نہیں ہے۔وہ یہ نہیں جانتے کہ آزادی کون سی نعمت ہے اور غلامی کس چڑیا کا نام ہے۔انھیں بالکل بھی معلوم نہیں کہ غلامی ایسا طوق ہے جو جس قوم کے گلے میں پڑا اسے ذلت کی گہرائیوں میں گرا دیا۔قوموں کا عروج اور ترقی آزادی کی مرہون منت ہوتا ہے۔وہی قومیں دنیا میں سر اٹھانے کے قابل ہوتی ہیں جو کسی کی غلام نہ ہوں۔غلام قومیں اپنے آقا کی دست نگر ہو جایا کرتیں ہیں، نہ ان کا مذہب محفوظ رہتا ہے، نہ تہذیب وثقافت۔آزادی ہی ایک قوم کی پہچان ہے اور آزادی ہی ایک قوم کا فخر۔آزادی رب کریم کی عطا کی ہوئی ایسی نعمت ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔آج اگر ہم آزاد و خود مختار ہیں تو یہ ہمارے ان اسلاف کا کارنامہ ہے، جنہوں نے اپنا حال ہمارے مستقبل

پر قربان کر دیا، اپنی خواہشات کو ہماری چاہتوں پر نچھاور کر دیا، اپنی خوشیوں کے بدلے دکھ درد سمیٹ کر ہمارا دامن خوشیوں سے بھر دیا۔ جنہوں نے سکون کے بدلے بے سکونی اور راحت کے بدلے تکلیف مول لے لی لیکن ہمارے لیے ایک آزاد وطن کا تحفہ، ایک علاحدہ ملک کی نعمت، اور خود مختاری کی سوغات چھوڑ گئے۔ اگر آج ہم سر اٹھا کر چل رہے ہیں تو یہ سر بلندی ان سروں کی مرہون منت ہے جو اپنے شانوں پر باقی نہ رہے اور ان عزائم کی عطا کردہ ہے جو وقت کی سب سے بڑی طاقت سے ٹکرا گئے۔ ان حوصلوں کی دین ہے جو پہاڑوں سے غم برداشت کر کے بھی اپنے مقصد سے نہ ہٹے۔

لیکن پاکستانی قوم کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس ملک خداداد کے معرض وجود میں آتے ہی یہ قوم مخلص حکمران سے محروم ہو گئی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے بعد کوئی ایسا لیڈر ہمارے حصے میں نہ آ پایا جو ذاتی مفاد کو بیچ میں لائے بغیر ملک و قوم کے لیے کچھ بہتر کرتا۔ حکمرانوں کے نام پر ہمیں تسلسل سے ایک مفاد پرست ٹولے سے واسطہ رہا جن کی نظریں حریص گِدھوں کی طرح ہمیشہ غریب عوام کی جیب پر رہیں۔ جن کے دماغوں کے گٹر میں ہمیشہ حرص و ہوس کی گندگی ابلتی رہی۔ ان کے پاپی پیٹوں کی طوالت سوئیٹزرلینڈ کے بینکوں تک جا پہنچی۔ جو خون پینے والی جونکوں کی طرح عوام کے نحیف و لاغر جسموں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ ایسی جونکیں جو خون پینے کے بعد گوشت کو بھی چاٹ جاتی ہیں۔ انھیں یہ احساس ہی نہیں کہ مستقبل قریب و بعید میں ہماری ترجیحات اور منصوبے کیا ہونے چاہئیں۔ ان کے بعد ہم عوام کا نمبر ہے کہ آج ہم زبانی کلامی نعرے بازیوں اور بلند بانگ دعووں سے دشمن کا مقابلہ کرنے کی کوشش میں لگے ہیں۔ ہم یہ بھول گئے ہیں کہ میدان عمل میں گفتار کے غازیوں کی نہیں کردار کے غازیوں کی ضرورت ہے۔ آزادی کی نعمت اور قدر ان کشمیری ماؤں بہنوں سے پوچھو جو آئے روز اپنے کسی پیارے پر بین کر رہی ہوتی ہیں۔ جن کی نہ عزتیں محفوظ ہیں اور نہ جان و مال۔ آج کشمیری جو آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں اللہ پاک کے فضل سے اگر یہ کامیاب ہو گئے تو شاید ان کی آنے والی نسلیں بھی ہماری طرح ہی اپنے آبا و اجداد کی کوششوں کو بھلا کر کشمیر کا وہی حال کر دیں جو ہم نے پاکستان کا کیا ہوا ہے۔ بہ ہر حال یہ لمبی داستان ہے۔ دردمند رو رو کر لوگوں کو اس جانب متوجہ کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے نزدیک یہ فقط لفاظی ہوتی ہے۔

مشتاق کے بہنوئی کا نام ایوب تھا۔اس کی بات ختم ہوتے ہی میں اسے اپنے بارے بتانے لگا۔اسی دوران مشتاق کی بہن طاہرہ کھانا لے آئی تھی ۔ایوب سے پتا چلا کہ وہ کھانا کسی قریبی رشتہ دار کے گھر سے آیا تھا۔مشتاق کی موت کا دکھ ہونے کے باوجود مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی ۔میں بے تکلف کھانے کو جڑ گیا۔کھانے کے بعد ایوب نے مجھے اسی کمرے میں آرام کا مشورہ دے کر کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا تھا۔رات کو جب تعزیت والے چلے گئے تھے ۔تبھی طاہرہ بہن میرے لیے کھانا لے آئی ۔ایوب کی وساطت سے میں نے اپنی ندامت اور افسوس اس لڑکی تک پہنچا دیا تھا جس کے سگے بھائی نے میرے لیے جان قربان کر دی تھی ۔مگر کشمیر کی بیٹی کا عزم اور حوصلہ بہت بلند تھا۔اس کے مقدس چہرے سے ہویدا مسکراہٹ نے مجھے بہت سکون دیا تھا۔اس نے ایوب کی وساطت سے کہا۔

”آپ بھی تو میرے بھائی ہیں اور کس نے کہا کہ مشتاق مر گیا ہے۔قرآن کہتا ہے انھیں مردہ نہ کہو تو میں کیسے اسے مردہ سمجھ لوں۔“

میں نے بے اختیار ہو کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔”ہاں میری بہادر بہن، میں تمھارا بھائی ہوں۔اور مجھے اپنی بہن پر فخر ہے۔“

ایوب نے رستے کے بارے میری تھوڑی بہت رہنمائی کر دی تھی ۔لیکن پہاڑی راستوں کی پہچان اتنی آسان نہیں ہوتی ۔ایک جیسے پہاڑ،ان سے نکلنے والے نالے، درختوں، جھاڑیوں کے جھنڈ، بہنے والے چشمے اور آبشاریں یہ تمام یکساں مناظر بغیر کسی نقشے کی موجودی کے راستوں کی پہچان کو مشکوک کر دیتے ہیں ۔ان سے اجازت لے کر میں محتاط انداز سے ان کے گھر سے نکلا ۔میری ذرا سی غفلت ان پر بھی کوئی مصیبت لا سکتی تھی ۔اس گھر سے تھوڑا دور ہوتے ہی میں نے اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔وہ وادی شرقاً غرباً پھیلی ہوئی تھی ۔جب شمال سے جنوب کی طرف اس کی چوڑائی تھی جو چار پانچ سو میٹر سے زیادہ نہیں تھی ۔میں نے آبادی کے بیچوں بیچ آگے بڑھنے کے بجائے چوڑائی میں وادی کو عبور کیا اور جنوب کی طرف موجود بلندی پر چڑھنے لگا۔

جہاں تک میں ایوب کے بتائے رستے پر چل سکتا تھا اسی رستے پر گام زن رہا۔جونھی اس کی بتائی ہوئی نشانیاں گڈمڈ ہوئیں میں نے زیادہ سوچنے میں وقت ضائع کیے بغیر اندازے سے ایک جانب قدم بڑھا دیے۔

گھپ اندھیرا جہاں میرے لیے مشکلات پیدا کر رہا تھا وہیں مجھے چھپاؤ بھی مہیا کر رہا تھا۔ دشمن کی پوسٹوں پر چمکنے والی روشنی مجھے دور ہی سے نظر آجاتی اور میں اپنا راستہ ذرا تبدیل کر دیتا۔ وہ رات میں بغیر کسی حادثے کے چلتا رہا۔ صبح کا ملگجا اجالہ پھیل گیا جب میں ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں جھاڑیوں اور درختوں کا وسیع جنگل موجود تھا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں گھس کر میں مچان بنانے لگا۔ طلوع آفتاب تک میں اس کام سے فارغ ہو گیا تھا۔ ایوب کے گھر سے چلتے وقت میں نے دو تین روٹیاں مرغی کے شوربے میں چپیڑ کر ساتھ رکھ لی تھیں۔ انھیں معدے میں اتار کر میں آرام کرنے لیٹ گیا۔ جھاڑیوں اور درختوں کا وہ جنگل کافی دور تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں مجھے تلاش کرنا اتنا بھی آسان نہیں تھا کہ مجھے کوئی خاص خطرہ ہوتا۔ میں بے فکر ہو کر لیٹ گیا۔

لیکن دشمن کو میرا زیادہ دیر آرام کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ باتوں کی تیز آواز سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں نے فوراً ہی کلاشن کوف ہاتھ میں تھام کر سیفٹی لیور نیچے کر دیا۔ آنے والوں کی تعداد تین تھی۔ ان کی باتوں سے پتا چلا کہ وہ اس جنگل کو گھیر کر تلاشی لے رہے ہیں۔ یہ بات میرے لیے کافی حیران کن تھی کیوں میرے تئیں انھیں میری تلاش یہاں سے کافی آگے کرنا چاہیے تھی۔

ان کے پاس موجود ریڈیو سیٹ سے مختلف پارٹیوں کی بات چیت کی آواز آرہی تھی۔ میں ان سے بالکل ہی تعرض نہ کرتا اور انھیں آگے بڑھ جانے دیتا اگر وہ اس باریکی سے تلاشی نہ لے رہے ہوتے۔ کیوں فائر کرنے کا مطلب اپنی موجودی کا راز فاش کرنا تھا۔ مگر انھیں جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف بڑھتا دیکھ کر میں نے ایک دم درمیان والے آدمی پر شست سادھ لی تھی۔ وہ اس وقت اپنے باقی دو ساتھیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش میں تھا ان کا اس جنگل کو چھاننا بالکل ہی بے فائدہ اور فضول ہے۔ میں ٹریگر دبانے ہی لگا تھا کہ اچانک ہی کچھ فاصلے پر تیز فائرنگ کی آواز گونجی۔ وہ تینوں ٹھٹک کر رکے اور پھر اس جانب بھاگ پڑے جدھر سے فائرنگ کی آواز آرہی تھی۔ ان کے وائرلیس سیٹ سے بھی کنٹرول کا استفسار سنائی دے رہا تھا جو وہ فائرنگ کرنے والوں سے کر رہا تھا۔ میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ مگر میرا یہ اطمینان زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکا تھا۔ جلد ہی وہ مجھے واپس آتے دکھائی دیے۔ ان کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز دور ہی سے میرے کانوں میں گونجنے لگی تھی میں ایک بار پھر ان کے استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔ ان کے قریب پہنچنے سے پہلے جنوب کی طرف سے

پانچ آدمی نمودار ہوئے۔ان کا رخ بھی میری جانب تھا۔درمیان میں موجود آدمی کے کندھوں پر مجھے دور ہی سے کراؤن چمکتے نظر آرہے تھے۔وہ کوئی آفیسر تھا۔ان تینوں نے بھی اپنے آفیسر کو دیکھ لیا تھا۔قریب پہنچ کر انھوں نے اکٹھے سیلوٹ کیا تھا۔

سیلوٹ کا جواب دیے بغیر آفیسر ان سے صورت حال کے بارے پوچھنے لگا وہ اتنی دور نہیں تھے کہ ان کی آواز میرے کانوں تک نہ پہنچتی۔آفیسر کے کندھوں پر سجے تین کراؤن اس کے کیپٹن ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔

''اس تمام علاقے کی ایک ایک جھاڑی کو چھان مارا ہے سر مگر یہاں کوئی موجود نہیں ہے۔''تینوں میں سے ایک آدمی نے نظر آنے والی تمام جھاڑیوں کی طرف ہاتھ گھما کر اپنی کارکردگی کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

''شاباش۔''کیپٹن نے تحسین آمیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''اب یوں کرو کہ جنوب کی طرف جا کر وہاں حوالدار مانس کو مل جاؤ،مزید گھومنے کی ضرورت نہیں ہے۔جنگل کافی گھنا ہے اور تیس پینتیس آدمیوں سے ہم تمام جنگل نہیں کھنگال سکتے۔امید یہی ہے کہ رات کو وہ اپنے ٹھکانے سے نکلنے کی کوشش ضرور کرے گا،اس وقت ہم اسے چھاپ لیں گے۔اس وقت چاروں طرف کے رستوں پر موجود رہ کر اس کے یہاں سے بھاگنے کو روکو۔''

''جی سر۔''تینوں نے اثبات میں سر ہلا کر سیلوٹ کیا اور جنوب کی طرف بڑھ گئے۔اسی وقت مشرقی جانب سے ایک برسٹ فائر ہوا۔

کیپٹن نے ساتھ کھڑے جوان کو کہا۔''پوچھو کیا ہوا ہے؟''

''ون الفا فار آل سٹیشن یہ فائر کس نے کیا ہے؟اوور......''

''حوالدار روہیت فار ون الفا،یہ فائر میری پارٹی کے جوان سے ہوا ہے۔ایک لومڑ تھا جھاڑیوں کے ہلنے پر شک کی بنا پر فائر کیا تھا۔اوور......''

کیپٹن نے ہاتھ بڑھا کر جوان سے ریڈیو سیٹ لیتے ہوئے پوچھا۔''روہیت تمھارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟اوور......''

''چار آدمی ہیں سر۔اوور......''

''ٹھیک ہے تم جنوب مشرقی جانب دھیان رکھو،کوئی جنگل سے باہر نہ نکلنے پائے۔اگلی پوسٹوں اور بٹالین

ہیڈ کوارٹر سے مزید نفری آ رہی ہے اس وقت تک ہم نے جنگل کو گھیرے میں لیے رکھنا ہے۔ کیپ لسننگ آؤٹ۔'' وائرلیس واپس جوان کی طرف بڑھا کر وہ مغرب کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے ہمراہ موجود چار آدمیوں نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے تھے۔

میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس جنگل پر اتنی توجہ کیوں دے رہے تھے۔ اور میرے وہاں چھپنے کا انھیں اتنا یقین کیوں تھا۔ شاید کسی نے مجھے وہاں گھستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ تو اس بات کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے میں سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا۔ اگر ان کی مزید نفری پہنچ جاتی تو میرا وہاں سے بچ کر نکلنا ممکن نہ رہتا۔ کیوں آج کی رات وہ جنگل کو گھیرے رکھتے اور آنے والے دن ایک ایک جھاڑی کو چھان کر مجھے ڈھونڈ نکالتے۔ چند لمحے سر کھپا کر میں نے اسی وقت حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا۔ دائیں بائیں کا جائزہ لے کر میں نیچے اترا، حوالدار روہیت کی پارٹی مشرقی جانب تعینات تھی اور اس سے تھوڑا حساب کتاب بھی رہتا تھا اس لیے میں نے مشرق ہی کا رخ کیا وہ جنگل مغرب کی جانب زیادہ پھیلا تھا اس لیے زیادہ تر پارٹیوں کا رخ اس جانب تھا۔

رائفل کو تیاری حالت میں پکڑ کر میں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا مشرق کی جانب بڑھنے لگا۔ مغرب کی جانب سے آتا ہوا چوڑا نالہ جنوب کی طرف مڑ گیا تھا۔ جھاڑیوں کے جھنڈ مغربی اور جنوبی نالے میں نہایت کثرت سے پھیلے تھے۔ مشرقی جانب ایک پہاڑی موجود تھی جو جنوب کی طرف آگے بڑھتی گئی تھی۔ شمال کی طرف بھی ایک نالہ موجود تھا جو جنوبی نالے میں شامل ہو رہا تھا۔ اس وقت جنوبی نالے میں سفر کرنا مشرق کی نسبت زیادہ آسان تھا لیکن مجھے مشتاق کی موت کا بدلہ لینے کی خواہش نے مشرق کی جانب گامزن رکھا۔

اصولاً تو روہیت پارٹی کو ذرا بلندی پر بیٹھنا چاہیے تھا کہ اسی صورت میں وہ اس جانب کی نگرانی کر سکتے تھے۔ میں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا کبھی بندر چال، کبھی چیتا چال اور کبھی زمین پر لیٹ کر رینگتا ہوا جنگل کے جنوب مشرقی کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ اسی اثناء میں میرے کانوں میں وائرلیس سیٹ کی کھڑکھڑاتی ہوئی آواز آنا شروع ہو گئی تھی۔ ایک گھنی جھاڑی کے نیچے لیٹ کر میں نے اس طرف نظر دوڑائی قریب کی ایک ڈھلان پر وہ پانچوں بیٹھے ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ ان میں سے ایک آدمی کھڑے ہو کر اطراف کا جائزہ لے رہا تھا جبکہ بقیہ

اطمینان سے ہتھیاروں کو گود میں رکھ کر پتھروں سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔انھیں اس لیے بھی کوئی خوف نہیں تھا کہ وہ شکاری تھے اور ایک اکیلے آدمیوں کے مقابلے میں ان کی تعداد تیس پینتیس افراد پر مشتمل تھی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اکیلا آدمی ان پر ہلا بول سکتا۔ ریڈیو سیٹ سے ابھرنے والی Transmission سے مجھے معلوم ہوا کہ مغربی جانب ان کی مدد کے لیے اگلی پوسٹوں سے کچھ مزید نفری پہنچ گئی تھی۔

''استاد روہیت، مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ وردھی اب تک یہیں چھپا ہوگا۔'' ایک آدمی نے خیال ظاہر کیا۔اس نے میرے مطلب کی بات پوچھی تھی میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''سچ کہوں تو میرا بھی یہی خیال ہے،اسی لیے میں تم لوگوں کے ساتھ کافی آگے نکل گیا تھا لیکن پھر حکم کی تعمیل میں واپس آنا پڑا۔اب میں کیپٹن اندراجیت کو تو یقین دلانے سے رہا۔''

''کیپٹن صاحب کو بھی جانے کیا سوجھی ہے۔'' پہرہ دینے والا ان کی گفتگو میں شامل ہوا۔

حوالدار روہیت بولا۔''یہ نائیک راہول سنگھ کی کرپا ہے۔اس نے کیپٹن صاحب کو بتایا ہے کہ اس نے صبح دم دشمن کو جنگل میں گھستے ہوئے بذات خود دیکھا ہے۔''

سنتری نے منھ بناتے ہوئے پوچھا۔''تو گولی کیوں نہیں ماری؟''

روہیت نے جواب دیا۔''کیوں کہ اس وقت دشمن کلاشن کوف کی رینج سے دور تھا اور وہ اس پر گولی چلا کر اسے چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا پس اس نے کیپٹن صاحب کو اطلاع دے دی۔''

''راہول نے لازماً کسی سور وغیرہ کو دیکھا ہوگا۔'' ایک اور آدمی نے خیال ظاہر کیا۔

روہیت نے منھ بگاڑ کر کہا۔''یہ مسلے بھی سور سے کم تو نہیں ہوتے۔'' ان کی گفتگو کا رخ میری جانب مڑ گیا تھا ۔وہ بس مجھے ہی کوستے رہے۔

ان کا فاصلہ بیس پچیس قدموں سے زیادہ نہیں تھا لیکن وہ ذرا ڈھلان پر تھے اس لیے میں بھاگ کر ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔میں ان سے نبٹنے کا ایسا طریقہ سوچنے لگا جس سے باقی لوگ اس طرف متوجہ نہ ہوتے۔ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں پیچھے مڑ کر جھنڈ کے درمیان میں پہنچا اور جس کپڑے میں ایوب نے مجھے روٹی باندھ کر دی تھی، چاقو کے ذریعے اس کی باریک باریک پٹیاں بنانے لگا۔تمام پٹیوں کو باندھ کر میں نے ایک لمبی رسی بنائی

اور پھر کلاشن کوف سے سلنگ نکال کراس رسی کے ساتھ باندھ دی۔اب تک بھی رسی اتنی لمبی نہیں تھی کہ میرا کام ہو سکتا۔میں مفلر کی بھی پٹیاں بنانے لگا۔پندرہ بیس میٹر لمبی رسی بنا کر میں رینگتا ہوا شمال کی طرف بڑھنے لگا۔رسی کی لمبائی کے بقدر دور جا کر میں نے رسی کا ایک سرا چھوٹی سے جھاڑی کے تنے سے باندھا اور واپس لوٹ آیا ۔ایسی جگہ پر لیٹ کر جہاں میں سنتری کو اپنی نگاہ میں رکھ سکتا تھا میں سنتری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی تکرار کا حصہ بنا ہوا تھا۔دس پندرہ منٹ بعد جا کر اسے اپنی ذمہ داری پورا کرنے کا خیال آیا اور اس نے چاروں طرف ایک سرسری نگاہ دوڑائی۔جوں ہی اس کی نظریں مطلوبہ جھاڑی کی طرف اٹھیں میں نے ایک دم رسی کھینچ لی۔اس نے فوراً ہی کندھے سے لٹکی کلاشن کوف اتار کر ہاتھ میں پکڑی ۔''جھاڑیوں میں حرکت ہو رہی ہے۔''اس نے پیچھے مڑے بغیر کہا۔

اگلے ہی لمحے اس نے فائر کھول دیا۔دو تین برسٹ فائر کر کے وہ بہ غور جھاڑی کو دیکھنے لگا۔ون الفا کی طرف سے فائرنگ کی وجہ پوچھی جا رہی تھی۔روہیت نے پہلے کی طرح جانور کا بتا کر انھیں ٹالا۔اور پھر جیسے ہی اس نے ریڈیو سیٹ ہاتھ سے رکھا میں نے فوراً ہی شست لے کر سنتری کے سر کا نشانہ سادھا اگلے چند سیکنڈ میں چار کے سر میں سوراخ کھل گئے تھے۔انھیں حرکت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔حوالدار روہیت کو میں نے جان بوجھ کر زندہ چھوڑا تھا۔جونھی اس نے کلاشن کوف سیدھی کرنا چاہی میں نے پانچویں گولی فائر کی جو اس کے دائیں کندھے میں لگی تھی۔

''اوغ۔'' کی آواز نکالتے ہوئے وہ پیچھے گرا اور پھر سیدھا ہوتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے گری ہوئی کلاشن کوف اٹھانے کی کوشش کی۔میری چلائی ہوئی اگلی گولی اس کے بائیں ہاتھ میں گھس گئی تھی۔وہ ایک مرتبہ پھر نیچے گرا۔میں جھاڑی کی آڑ سے نکل کر اس کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ریڈیو سیٹ پر ایک بار پھر فائرنگ کی وجہ پوچھی جا رہی تھی۔میں نے فوراً ریڈیو سیٹ اٹھا کر اپنا ایک پاؤں حوالدار روہیت کے منھ پر رکھا اور کہا۔

''سر!...... یہاں جھاڑیوں میں کافی سؤر موجود ہیں جو بار بار جھاڑیاں ہلا کر مشکوک کر دیتے ہیں۔ اوور......''میں نے کوشش کی تھی کہ میری آواز سنتری کی آواز جیسی ہو۔یوں بھی وائرلیس سیٹ پر آواز کافی تبدیل ہو جاتی ہے۔میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر اسے مجھ پر شک ہوا تو روہیت کی کنپٹی پر گن رکھ کر اس سے بات کرا کر

ان کا شک دور کروں گا۔مگر پوچھنے والے کو شک نہیں ہوا تھا۔وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے تمام کو کیپٹن صاحب کا حکم پاس کرنے لگا۔

”آل سٹیشن، کیپٹن صاحب نے حکم دیا ہے کہ اس کے بعد کسی نے فضول فائر کیا تو سزا کا حق دار ٹھہرے گا۔ کیپ لسننگ آؤٹ۔“

گہرا سانس لے کر میں نے ریڈیو سیٹ جیب میں ڈالا اور حوالدار روہیت کے سر کی طرف اکڑوں بیٹھ گیا۔

”تو حوالدار روہیت ،تم نے پرسوں رات ایک کمزور، نہتے شخص کو تشدد کا نشانہ بنا کر گولی مار دی تھی کیوں......؟“

وہ کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا کراہتا رہا۔

”تمھیں نرگ میں بھیجنے سے پہلے یہ بتا تا جاؤں کہ تم اور تمھارے ساتھی صرف اسی شخص کی وجہ سے ہلاک کیے گئے ہو۔بہ ہر حال میرے پاس مزید وقت نہیں ہے کہ تم سے گپ شپ کرسکوں۔“ یہ کہہ کر میں نے ایک ہاتھ اس کی ٹھوڑی اور دوسرا سر پر رکھ کر اپنے ہاتھوں کو مخالف سمت میں جھٹکا دیا۔اس کا بگڑا ہوا چہرہ مزید بھیانک ہو گیا۔دو تین سیکنڈ تڑپنے کے بعد اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا۔میں نے فوراً ایک موٹے آدمی کے جسم سے وردی اتاری اور اپنے کپڑوں کے اوپر ہی وہ وردی ڈال کر میں نے جلدی جلدی چند فالتو میگزینیں اٹھالیں۔اپنی کلاشن کوف وہیں پھینک کر میں نے حوالدار روہیت کی کلاشن اٹھائی اور ڈھلان پر چڑھنے لگا۔انڈین آرمی کی وردی کی وجہ سے کسی بھی دیکھنے والے کو مجھ پر شک نہیں ہوسکتا تھا۔وہ پہاڑی اتنی اونچی نہیں تھی۔بلندی پر پہنچ کر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔مگر کوئی میری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔دوسری جانب ڈھلان سے اترتے ہی میں نے وردی اتار دی کہ وہ میرے تیزی سے چلنے میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی۔البتہ وردی کو لپیٹ کر میں نے پاس رکھ لیا تھا کہ پھر کسی موقع پر کام دے جاتی۔مشرقی ڈھلان سے میں دوڑتے ہوئے نیچے اترا اور پھر نالہ عبور کر کے اگلی ڈھلان پر چڑھنے لگا۔اس سے اگلے نالے میں اتر کر میں مشرق کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں کافی دیر آرام کر چکا تھا اور میرا پیٹ بھی بھرا ہوا تھا اس لیے تازہ دم تھا۔سب سے بڑھ کر مشتاق کے

قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے پر ایک علیحدہ ہی سکون و اطمینان کا احساس ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی کی وجہ سے میری حرکت دور ہی سے دیکھی جا سکتی تھی اس لیے میں نالوں کی گہرائی، جھاڑیوں اور چٹانوں وغیرہ کی آڑ کو استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ میں دشمن کی بات چیت پر بھی کان دھرے ہوئے تھا۔ تمام پارٹیاں کنٹرول کو ہر گھنٹے بعد سب اچھا رپورٹ دے رہی تھیں۔ ایک بار روہیت پارٹی کی طرف سے رپورٹ نہ دیے جانے کو کنٹرول نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی کیوں کہ ایک ادھ بار کسی پارٹی سے رپورٹ رہ بھی جاتی ہے ۔مگر دوسرے گھنٹے کے اختتام پر بھی جب روہیت پارٹی کی آواز سنائی نہ دی تو کنٹرول بار بار انھیں پکارنے لگا ۔اس کے باوجود بھی جب ان کی طرف سے خاموشی چھائی رہی تو کنٹرول نے جنوب کی جانب موجود ایک پارٹی کو روہیت پارٹی کی طرف روانہ کیا تا کہ جا کر ان کی خیر خبر لے۔

بیس پچیس منٹ بعد ہی ریڈیو سیٹ سے ایک گھبرائی ہوئی آواز روہیت پارٹی کی ہلاکت کے بارے کنٹرول کو بتا رہی تھی۔ ایک دم ہی ہلچل مچ گئی تھی۔ کنٹرول فوراً ہی تمام پارٹیوں کو ہوشیار کرنے لگا۔ حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کہ تمام اس فریکونسی پر موجود تھے اور انھیں یہ بات اچھی طرح سنائی دے رہی تھی۔

انھیں میرے جانے کی سمت کا خاص تعین نہیں ہو رہا تھا۔ وہ صرف اتنا ہی اندازہ کر سکتے تھے کہ میں نے مشرقی جانب کی پہاڑی عبور کی ہے اس کے بعد میرا رخ کس جانب ہو گیا ہے اس متعلق وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ سہ پہر ڈھلنے لگی تھی میرا سفر جاری رہا۔ میں اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا چاہتا تھا۔

رات کا اندھیرا چھانے تک دشمن کی Transmission کی آواز کٹ کٹا کر غائب ہو گئی تھی۔ یقیناً میں ان سے زیادہ فاصلے پر آ چکا تھا ۔اور پھر نالوں کی گہرائیاں بھی ریڈیو سیٹ کے مواصلات (Communication) میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

میرا سفر تمام رات جاری رہا۔ دو چھوٹی چھوٹی آبادیاں بھی میں نے نظر انداز کی تھیں کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو میری وجہ سے مشتاق کی طرح جان سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ صبح ہوتے ہی میں ایک کھوہ میں چھپ کر لیٹ گیا تھا۔ میرا ارادہ شام کے وقت جنوب کا رخ کرنے کا تھا کیونکہ اب وقت آ گیا تھا کہ میں سرحد عبور کر لیتا۔ یقیناً میں کارگل کے پہاڑوں سے کافی دور نکل آیا تھا۔ اب میں جس علاقے میں تھا وہاں ایک تو سردی کی شدت پہلے

جیسی نہیں تھی دوسرا درخت اور جھاڑیاں وغیرہ بھی کثرت سے تھے۔

شام کا اندھیرا چھاتے ہی میں کھوہ سے باہر نکلا اور ستاروں کی مدد سے جنوب کی سمت کا تعین کر کے چل پڑا۔ ایک نالہ جنوب مشرق کی سمت جا رہا تھا۔ میں اسی میں چل پڑا۔ آگے بڑھتے ہوئے میری نگاہیں دائیں بائیں موجود دشمن کی پوسٹوں کا جائزہ لیتی رہیں۔ آگے جا کر وہ نالہ مکمل طور پر مشرق کی جانب مڑ گیا تھا۔ جنوب کی سمت جانے کے لیے مجھے دائیں جانب کی بلندی عبور کرنا پڑتی۔ پہاڑ کی اونچائی دیکھ کر میں نے ہمت ہار دی تھی۔ خواہ مخواہ توانائی ضائع کرنے کے بجائے میں اسی نالے میں چلتا رہا۔ یوں بھی میں کون سا نقشے کے مطابق چل رہا تھا کہ کوئی مسئلہ ہوتا۔

مختلف نالے اور چھوٹی بڑی ڈھلانوں کا سفر طے کرتے ہوئے میں ایک تنگ نالے سے برآمد ہوا، میرا رخ جنوب کی طرف تھا۔ سامنے ایک کھلا نالہ تھا۔ وہ وسیع نالہ چھوٹی سی وادی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ وہاں اچھی خاصی آبادی نظر آ رہی تھی۔ جس کا اندازہ مجھے گھروں میں جلنے والی لالٹین اور اسی قسم کی دوسری بتیوں سے ہوا ۔میں ایک کچی سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ آبادی شرقی جانب پھیلی تھی۔ آبادی کے تین چار سو میٹر جنوب مغرب کی طرف پھیلا ہوا جنگل نظر آ رہا تھا۔ صبح صادق ہونے میں گھنٹا، پون گھنٹا باقی تھا۔ میں نے آگے بڑھنے کے بجائے اسی جنگل میں دن گزارنا مناسب سمجھا۔ گو مجھے اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی مگر اپنے سابقہ تجربے کو یاد کر کے میں نے کسی گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا مناسب نہ سمجھا۔

سڑک عبور کر کے میں جنگل میں گھس گیا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد مجھے ایک چٹان کی آڑ میں جھاڑیوں کا ایسا جھنڈ مل گیا تھا جہاں میں دن گزارنے کے لیے مچان بنا سکتا۔ طلوع آفتاب سے پہلے میں مچان بنا کر لیٹ چکا تھا بھوک کی وجہ سے مجھے کوئی خاص نیند تو نہ آ سکی مگر جسم کو آرام مل گیا تھا۔ دوپہر تک تو میں لیٹا رہا لیکن اس کے بعد کسی چرواہے کو ملنے کے ارادے سے مچان سے باہر آ گیا تاکہ اس سے کھانے پینے کی کوئی چیز لے کر پیٹ پوجا کر سکوں۔ آبادی قریب ہی تھی یقیناً چرواہوں کی آمد وہاں یقینی تھی۔ مچان سے نکل کر میں قریبی ٹیکری پر چڑھا اور اچانک ہی میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ وہ جنگل، وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ یہ وہی جنگل تھا جہاں میں ایک بار پہلے بھی مچان بنا کر چھپ چکا تھا۔ بالکل وہی جنگل جس میں میری ملاقات کشمیری چرواہن رومانہ سے ہوئی

تھی۔ وہی رومانہ جو میری زندگی میں آنے والی تمام لڑکیوں سے خوب صورت تھی۔ جو میری خاطر اپنے شوہر سے طلاق لینے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ میری یادداشت میں اس سے ہونے والی آخری ملاقات کا منظر ابھرا......

''اجنبی!......اجنبی......میں مر جاؤں گی۔ یوں خفا ہو کر نہ جاؤ......لوٹ آنے کا وعدہ کر کے جاؤ۔ میں اس سے طلاق لے لوں گی۔'' اس نے مجھ سے لپٹنے کی کوشش کرتے ہوئے یہی کہا تھا اور میں اسے تھپڑ مار کر بھاگ پڑا تھا۔

''پتا نہیں وہ اب بھی وہاں آتی ہو گی یا نہیں۔ اسے اب بھی اپنے اجنبی سے پیار ہو گا یا ایک دو بچوں کی ماں بن گئی ہو گی۔'' میرے دماغ میں کئی سوال ابھرے۔ اس کے ساتھ ہی میرے دماغ نے مجھے اس جانب کا رخ کرنے سے منع کیا لیکن پھر میں قدموں کو روک نہیں پایا تھا۔ علاقے کی پہچان ہوتے ہی سارے رستے مجھے ازبر ہو گئے تھے۔ میں اسی جانب روانہ ہو گیا۔ کم از کم مجھے اس پر بھروسا تو تھا۔ اور وہ میرے لیے کھانا بھی لا سکتی تھی۔ یوں بھی پلوشہ کے بعد میری زندگی میں کسی کی گنجائش نہیں تھی لیکن اس کے باوجود میں اس طرف بڑھتا گیا۔

میں مچان سے میں تھوڑا دور ہی تھا کہ بکریاں اور بھیڑیں اس علاقے میں گھومتی نظر آنے لگیں۔ جلد ہی میں گھنی جھاڑیوں کے درمیان پڑی اس خالی جگہ پر پہنچ گیا تھا جہاں میں نے دو انڈین سپاہیوں کو رومانہ کی خاطر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ وہیں اس کے ہاتھ کی بنی لذیز چائے سے لطف اندوز ہوا تھا اور اسی جگہ جانے کتنی دیر مجھ سے لپٹ کر وہ اپنے ریشمی وجود کا احساس دلاتی رہی تھی۔

وہاں کوئی چادر لپیٹے سویا ہوا نظر آیا اس سے پہلے کہ میں سوئے ہوئے شخص کی جانب بڑھتا ایک جھاڑی کے پیچھے سے قریباً میرا ہم عمر جوان سامنے آیا۔ قدموں کی آہٹ سن کر میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ وہ بھی مجھے حیرانی سے گھور رہا تھا۔ لباس، حلیہ اور کندھوں سے لٹکی کلاشن کوف میری شخصیت کا تعین کر رہے تھے۔

سلام ڈالنے کے لیے میرے لب ہلنے ہی لگے تھے کہ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کا انداز دیکھ مجھے کافی حیرانی ہوئی تھی۔ قریب آ کر وہ سرگوشی میں بولا۔

''اسلام علیکم!''

''وعلیکم اسلام!'' میں نے بھی اسی کی طرح دبے لہجے میں کہا تھا۔

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اسی جھاڑی کی طرف بڑھ گیا جس کے پیچھے سے وہ برآمد ہوا تھا۔ دو پتھروں کے نیچے جلتی ہوئی آگ اور اس پر رکھا چائے کا کٹورا دیکھ کر میں اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا تھا۔ وہ کٹورا بھی مجھے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ وہی رومانہ والا کٹورا تھا یا شاید اسی کی طرح لگ رہا تھا۔

مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے وہ نادم لہجے میں بولا۔

''معذرت خواہ ہوں آپ کو اس لیے بولنے سے منع کیا تھا کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے۔'' سوئے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی آواز سرگوشی سے بلند نہیں تھی۔

''کون ہے وہ؟'' میرے سرگوشی بھرے لہجے میں گہرا اشتیاق شامل تھا۔

''ہے ایک بدنصیب۔'' اس کے لہجے میں گہرا دکھ در آیا تھا۔

''شاید آپ بتانا نہیں چاہتے۔'' نہ جانے کیوں مجھے اس کے بارے کرید لگی تھی۔

''چھوٹی بہن ہے میری۔'' اس مرتبہ اس نے سچ اگل دیا تھا۔ ''اور غالباً آپ کا تعلق کسی جہادی گروپ سے ہے۔''

''کچھ ایسا ہی سمجھو۔'' میں نے گول مول انداز میں کہا۔

''کھانا کھاؤ گے؟'' اس نے میری دل لگتی بات پوچھی۔

میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''دو دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔''

جھولے سے کھانے کی پوٹلی نکال کر اس نے میرے سامنے رکھ دی۔

میں نے بغیر کسی تکلف کے پوٹلی کھولی اور کھانے کو جڑ گیا۔ وہ دال کے بنے ہوئے پراٹھے تھے۔ میں نے رسمی لہجے میں پوچھا۔

''میرا، تمام پراٹھے چٹ کر جانا آپ کو برا تو نہیں لگے لگا۔''

وہ مسکرایا۔ ''اچھا لگے گا۔''

''آپ نے اپنی بہن کو بدنصیب کیوں کہا ہے؟'' میں جھجکتے ہوئے مستفسر ہوا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ سویا ہوا وجود رومانہ کا تھا۔ اور اس کی بدنصیبی میں کسی نہ کسی طرح میری ذات بھی ملوث ہو رہی تھی۔

”میرا نام سکندر ہے کیا آپ کا نام جان سکتا ہوں؟“ چائے کا کٹورا آگ سے اتار کر وہ سٹیل کے مگ میں چائے انڈیلنے لگا۔

”ابنِ حیدر۔“ میں نے اپنے نام کا آخری حصہ بتایا تھا۔

”تو حیدر بھائی بات یہ ہے کہ فضول اور بے فائدہ کہانی سن کر یقیناً آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ چھوڑیں اسے اپنی سنائیں، کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں جانے کا ارادہ ہے؟“

”اب تو میرا شوق اور بھی بڑھ گیا ہے۔ اس لیے پہلے میں آپ کی کہانی سنوں گا اور اس کے بعد اپنے بارے بتاؤں گا۔ یوں بھی میں نے شام ہی کو آگے جانا ہے اور اس میں ابھی کافی وقت پڑا ہے۔“

چند لمحے سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ تفصیل بتانے لگا۔ ”سچ کہوں تو حیدر بھائی، ہمیں خود معلوم نہیں اس بے چاری کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ قریباً دو سال ہونے کو ہیں۔ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مزدوری کرنے شہر گیا ہوا تھا، انھی دنوں اس بدنصیب کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا۔ اس دن گھر پہنچی تو بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔ اس کے پاس ایک سفری تھیلا بھی موجود تھا جس میں زنانہ لباس، شال اور سوئیٹر وغیرہ کے ساتھ پستول اور مردانہ لباس بھی موجود تھا۔ گھر والوں کے پوچھنے پر اس نے کچھ بھی نہ بتایا بس یہی کہتی رہی کہ۔ ”وہ چلا گیا ہے اجنبی چلا گیا ہے۔“ وہ تھیلا اس نے آج تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اور اس کے بعد اس کی حالت نہ سنبھل سکی۔ اس کا شوہر بھی ہمارے ساتھ محنت مزدوری کرنے شہر گیا ہوا تھا۔ ساس نے اس کی حالت کے پیش نظر اسے میکے بجھوا دیا۔ اس پہلے بھی وہ اپنی اور ساس کے گھر کی بکریاں اکٹھے ہی چرانے کے لیے لایا کرتی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ابو جان نے اسے گھر سے باہر جانے سے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ مجبوراً ابو جان کو اس کے ساتھ ہی آنا پڑا۔ وہ جھاڑی دیکھ رہے ہو۔“ اس نے مچان والی جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔

”وہاں ایسی جگہ بنی ہوئی جیسے کسی نے وہاں رات گزاری ہو۔ یہ آتے ہی بے تابی سے اسی جھاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اور پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ ہماری واپسی تک یہ ابو جان کے ساتھ آتی رہی اور اس کی یہی روز مرہ ہوتی کہ صبح سویرے آتے ہی اس جھاڑی میں بنی ہوئی جگہ کو دیکھتی اور اسے خالی پا کر اسی جگہ بیٹھ جاتی جہاں اب

سوئی ہوئی ہے۔اس کے شوہر نے واپس آ کر اسے گھر لے جانے کی بہت کوشش کی مگر اس نے انکار کر دیا۔اور صاف لفظوں میں اس سے طلاق مانگ لی۔اسفند یار ہمارا چچازاد بھائی ہے،لیکن کب تک انتظار کرتا۔پانچ چھے ماہ بعد اس نے مجبور ہو کر اسے طلاق دے دی۔اس سے پہلے ہم نے اسے شہر جا کر ڈاکٹر کو بھی دکھایا،حکیموں سے بھی دوائی لی،پیروں اور عاملوں سے بھی رابطہ کیا تعویز وغیرہ لیے دم کروایا مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔بس خاموش رہتی ہے،کسی سے کوئی بات نہیں کرتی۔اور بلاناغہ یہاں ہمارے ساتھ آتی ہے۔نماز روزے کی بہت زیادہ پابندی کرتی ہے،تہجد بھی پڑھتی ہے۔اور لمبی لمبی دعائیں مانگتی ہے۔اب تو گاؤں کی کئی عورتیں اپنے بیمار بچوں کو اس کے پاس لا کر دم وغیرہ کروانے لگی ہیں۔یہ بے چاری ساری ساری رات جاگ کر گزار دیتی ہے۔البتہ یہاں آ کر اسے بہت سکون ملتا ہے۔صبح دم ایک بار آ کر جھاڑی میں بنی مچان کو دیکھ کر یہ یہیں بیٹھی رہتی ہے۔یا چادر تان کر سو جاتی ہے اور جونہی آنکھ کھلتی ہے سب سے پہلے جا کر مچان کو دیکھتی۔پیر بابا کہہ رہے تھے کہ اس پر بہت طاقت ور جن کا سایا ہے اور انھوں نے جن کو دور کرنے کے ایک دو چلے کاٹے بھی ہیں مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔چونکہ اس میں یہی بات غیر صحت مندانہ ہے کہ یہاں بلاناغہ آتی ہے،رات رات بھر سوتی نہیں اور کسی سے بات چیت نہیں کرتی۔اس کے علاوہ کوئی ایسی بات نہیں کہ ہمیں زیادہ پریشانی ہوتی۔پیر صاحب نے بھی ہمیں منع کر دیا ہے کہ اسے یہاں آنے سے نہ روکا جائے۔ایک دو سیانے یہ کہتے ہیں کہ اسے کسی مجاہد وغیرہ سے محبت ہو گئی ہے۔مگر اس نے خود کبھی ایسی بات نہیں کی۔بس کبھی کبھی۔''اجنبی کب آؤ گے۔'' کے چند الفاظ اس کے ہونٹوں سے ادا ہوتے ہیں۔اس وجہ سے ہمیں بھی یہی لگتا ہے کہ وہ سیانے سچ کہتے ہیں اسے کسی انجان شخص سے محبت ہو گئی ہے اور یہ اسی کا انتظار کر رہی ہے۔نجانے اس کا انتظار کتنا طویل ہے۔'' سکندر کی آواز بھرا گئی تھی۔

میرے دل کی بھی عجیب حالت ہو گئی تھی۔رومانہ کی کہانی عجیب موڑ پر آ گئی تھی۔کیا میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کے پسِ پردہ رومانہ کی دعائیں تھیں۔کیا میری جان حیات پلوشہ کی موت اسی وجہ سے ہوئی کہ میری زندگی میں رومانہ واپس آ سکے،میرا جینیفر جیسی لڑکی ہر آفر کو ٹھکرا دینا،گلگارے جیسی ثابت قدم لڑکی کا کسی دوسرے سے شادی کر لینا،حالانکہ وہ مجھے بھی بہت اچھی لگتی تھی۔پھر میرا پوسٹ سے پھسل کر انڈیا کی جانب نیچے گرنا اور اتنی جدوجہد کے بعد ایک دم وہاں پہنچ جانا۔یوں جیسے کوئی ان دیکھی طاقت مجھے وہاں کھینچ کر لے آئی ہو۔کیا یہ

سب رومانہ کی محبت کے دم قدم سے ہوا تھا۔

”پریشان ہو گئے نا؟“ مجھے خاموش پا کر سکندر پوچھنے لگا۔

”ویسے آپ لوگوں نے کسی جوان کو اس مچان والی جگہ پر بٹھا کر اس کا جائزہ لینا تھا کہ یہ کیا کرتی ہے۔“

”صحیح کہہ رہے ہو، مگر ایسا کوئی خیال ہمارے ذہن میں نہیں آسکا تھا۔“

”اچھا یہ کس وقت جاگتی ہے۔“ کھانا کھانے کے بعد میں نے چائے بھی پی لی تھی۔

”کبھی کبھی شام تک سوئی رہتی ہے اور کبھی گھنٹے ادھ گھنٹے بعد ہی جاگ جاتی ہے۔“

”اچھا یوں کرو، میں مچان میں داخل ہوتا ہوں آپ ذرا اسے جگائیں، دیکھیں تو کیا کرتی ہے۔“ بہ ظاہر میں نے عام لہجے میں ایک تجویز بتائی مگر در حقیقت میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس کی حالت کا ذمہ دار میں تھا۔ اور اسے اس کے محبوب سے مزید جدا رکھنا بالکل بھی جائز نہیں تھا۔ کسی پیارے کے بچھڑنے پر دل کی کیا حالت ہوتی ہے یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ پلوشہ کی جدائی نے مجھ پر جو ظلم ڈھایا تھا یقیناً ویسی ہی حالت رومانہ کی بھی تھی۔ بلکہ میں تو چند ماہ میں سنبھل گیا تھا اور زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا رومانہ کی محبت مجھ سے بھی کئی گنا بڑھی ہوئی تھی کہ وہ آج بھی اسی جگہ موجود تھی جہاں اس کا محبوب بچھڑا تھا۔

سکندر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”شاید ایسا کرنا مناسب نہ ہو۔ نجانے کیا ردعمل ظاہر کرے۔“

”یہ ضروری ہے۔“ اس سے مزید بحث کیے بغیر میں مچان کی طرف بڑھ گیا۔ سکندر چند لمحے تو وہیں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر متذبذب حالت میں اٹھ کر سوئی ہوئی بہن کی طرف بڑھ گیا۔ سر کے قریب بیٹھ کر اس نے روما کے سر پر ہاتھ رکھا۔

وہ فوراً ہی اٹھ بیٹھی تھی۔ ایک نظر بھائی پر ڈال کر اس نے مچان کی طرف دیکھا اور اسی طرف آنے لگی۔ اس کا بالکل وہی حلیہ تھا جو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ گہرے سبز اور سرخ رنگ کی ٹخنوں تک آتی کھلی قمیص، سر کے بالوں پر مخصوص انداز میں باندھی ہوئی چادر جو نیند کی حالت میں بھی اس کے سر سے علاحدہ نہیں ہو سکی تھی۔ نجانے مجھے دیکھ کر وہ کیا ردعمل ظاہر کرتی میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ چار پانچ قدم دور تھی جب میں نے مچان سے باہر نکلنے کے لیے پر تولے۔ٹہنیوں میں حرکت ہوتی دیکھ کر وہ ایک دم رک گئی تھی۔ جونہی میں سیدھا ہوا اس نے ایک لمحہ اپنی آنکھوں کو مل کر دیکھا اگلے ہی لمحے......"میرے اجنبی۔" کہتے ہوئے وہ مقناطیس کی طرح مجھ سے آچمٹی تھی۔"میں جانتی تھی آپ لوٹیں گے، مجھے اپنے رب پر پورا بھروسا تھا کہ میری دعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی، میں اپنے اجنبی کا انتظار کر رہی تھی، کرتی رہتی......کرتی رہتی یہاں تک کہ موت آجاتی............"اس کے منھ سے بے ربط باتیں نکل رہی تھیں۔میرے کندھے پر سر ٹیکے وہ اپنی مدھر آواز میں بولتی رہی۔میری نظریں اس کے بھائی سکندر کی طرف اٹھیں۔اس نے رومانہ کو میرے ساتھ لپٹتے دیکھ کر اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

میں نے اس کے کان میں آہستہ سے کہا۔"روما!......تمھارا بھائی بھی یہیں موجود ہے۔"

ایک دم اس کی گفتگو میں ٹھہراؤ آیا اور وہ مجھ سے علیحدہ ہوگئی۔کافی کمزور ہوگئی تھی۔سرخ وسفید چہرے پر ہلکی سی پیلاہٹ بھی نظر آرہی تھی۔

"ابو جان کو ملیں گے نا۔"ایک قدم پیچھے ہٹ کر وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ملتجی ہوئی۔

میرے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔"ہاں، اسے لیے تو اتنی دور سے گھسیٹ کر یہاں لایا گیا ہوں۔"

اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہوگیا تھا۔"آئیں آپ کو بھیا سے ملاتی ہوں۔"وہ سکندر کی طرف بڑھ گئی۔وہ ایک بار پھر آگ کے قریب جا بیٹھا تھا۔

میرے قریب پہنچتے ہی وہ دھیمے لہجے میں مستفسر ہوا۔"تو وہ آپ تھے۔"

"ہاں میں تھا۔"میں نے اس کے ساتھ ہی زمین پر نشست سنبھال لی تھی۔رومانہ بھی بھائی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی لیکن اس کی ساحرانہ آنکھیں مجھ پر گڑی تھیں۔نہ جانے ان آنکھوں میں کتنی چاہتیں، کتنا خلوص، کتنی عقیدتیں اور کتنی وارفتگی چھپی تھی۔

"آپ نے گویا مرد کی بے وفائی کی داستانوں کو حقیقت کر دکھایا۔"اس کے لہجے میں طنز کے بجائے دکھ کی آمیزش تھی۔

میں نے کہا۔ ''میری کہانی سنے بغیر آپ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں۔''

''سنائیں، سورج کے غروب ہونے میں تو اب بھی کافی دیر ہے۔''

''ایک شادی شدہ لڑکی کے ساتھ میں کیا تعلق رکھتا۔''

''یہ آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا۔''

''میں لاعلم تھا، اسی جگہ روما سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اسے دو انڈین فوجیوں کے چنگل سے رہائی دلائی اور انجانے میں محبت کر بیٹھا۔'' رومانہ کے بجائے میں نے جرم محبت اپنے ذمہ لے لیا تھا کہ اصل بات بتانے میں اس کی سبکی تھی۔ ''اس وقت میں کسی مشن پر جا رہا تھا اس لیے میں نے اسے اپنے دل کی بات نہ بتائی ۔واپسی پر میں اس کے لیے کپڑوں وغیرہ کا تحفہ لایا تھا۔ جونھی میں نے اس کے والد سے ملنے کی بات کی اس نے اپنے شادی شدہ ہونے کی بات بتا دی۔ بس حواس باختہ ہو کر میں بھاگ پڑا۔ آج پھر ایک مشن سے واپسی ہو رہی تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ادھر کا رخ کر لیا۔ میں اس بات سے بالکل انجان تھا کہ ایک بھولی بھالی لڑکی نے میرے بھاگ جانے کو دل پر لے لیا تھا۔ اگر مجھے پتا ہوتا تو بہت پہلے لوٹ آیا ہوتا۔''

اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اب کیا ارادہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کے والد صاحب کو مل کر جھولی پھیلاؤں گا۔''

رومانہ کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ سکندر نے ایک نظر بہن کے چہرے پر ڈالی اور پھر پوچھنے لگا۔

''کیا آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی۔''

میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''کی تھی، مگر وہ ساتھ نہ نبھا سکی۔ اس کے مرنے کے بعد ہی تو اس طرف کا رخ کر پایا ہوں۔''

''آپ کا تعلق مجاہدین کے کس گروپ سے ہے۔'' اس کی پوچھ گچھ جاری رہی۔

میں نے کہا۔ ''میرا تعلق پاک آرمی سے ہے۔''

پہلی بار مجھے سکندر کے چہرے پر خوشی کی جھلک نظر آئی تھی۔ ''یہ سچ ہے؟'' اس نے تصدیق چاہنے والے انداز میں پوچھا۔

''ہاں۔''میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا میں بکریوں کو اکٹھا کرلوں۔''اس نے کھڑے ہو کر لاٹھی سنبھالی۔اب نا معلوم وہ سچ مچ بکریاں اکٹھا کرنا چاہتا تھا یا ہمیں تنہائی میں بات چیت کا موقع دینا چاہتا تھا۔

اس کے جھاڑیوں کے پیچھے اوجھل ہوتے ہی رومانہ کے مسکراتے لبوں سے شکوہ پھسلا۔''اتنی دیر لگا دی، میں تو اب مایوس ہو چکی تھی۔''

''اب بھی آیا تو نہیں ہوں بھیجا گیا ہوں۔''

''کیا مطلب۔''وہ حیران رہ گئی تھی۔

''تم کہہ رہی تھیں نا کہ تمھیں اپنے ربّ پر پورا بھروسا ہے۔بس سمجھ لو کہ یہ اسی یقین کا کرشمہ ہے جو میں یہاں موجود ہوں۔''

''صاف صاف بتائیں نا جھوٹے اجنبی۔''اس کے ہونٹوں پر ملکوتی تبسم پھیل گیا تھا۔میری واپسی کے ساتھ ہی اس کی شوخی،شرارت اور ہنسی لوٹ آئی تھی۔

میں نے تفصیل بتلاتے ہوئے کہا۔''میں ہفتہ ایک پہلے کارگل کے محاذ پر دشمن سے برسر پیکار تھا۔ہماری پوسٹ پر دشمن کی گن کا گولہ لگا جس کی وجہ سے میں پھسل کر اس جانب آگرا۔اور اس کے بعد مسلسل دشمن سے جان بچا کر بھاگتا رہا۔مجھے معلوم نہیں تھا میرا رخ کس طرف۔آج صبح سویرے یہاں پہنچا۔اور جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں مچان بنا کر سو گیا۔دوپہر کو آنکھ کھلی۔دو دنوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔بھوک سے بے تاب ہو کر مچان سے باہر نکلا تو علاقے کو پہچان لیا۔بس فوراً ہی اس طرف دوڑا چلا آیا کہ شاید تم سے ملاقات ہو جائے اور ایک بار پھر تم مجھے کھانا کھلا دو۔یہاں تمھارے بھائی سے ملاقات ہوئی۔اس نے تمھارے بارے تفصیل بتلائی اور باقی کی کہانی تمھیں معلوم ہے۔''

اس نے قریب کھسکتے ہوئے میرا ہاتھ اپنے ملائم ہاتھوں میں تھاما۔''ابو جان سے ملیں گے نا؟''اس نے دوبارہ وہی بات پوچھی جس کا جواب میں اسے اور اس کے بھائی کو علیحدہ علیحدہ دے چکا تھا۔

میں ہنسا۔''اعتبار نہیں ہے۔''

”جھوٹے پر کون اعتبار کرے۔“اس کی گنگناتی ہنسی ابھری۔

”جھوٹا میں ہوں یا تم۔“

وہ ناز سے بولی۔”آپ ہیں جھوٹے اجنبی۔“

”پتا ہے مجھے تمھارا نام بھی یاد ہے۔“

”بتاؤ ذرا۔“

”روما......“

اس نے ناز بھرے لہجے میں پوچھا۔”آپ صرف روما کے ہیں نا۔“

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے میں نے کہا۔”ہاں، اب صرف تمھارا ہوں۔“

”کیا مطلب ہے اس بات کا۔“وہ حیران رہ گئی تھی۔

”یہاں سے جانے کے بعد مجھے ایک ایسی لڑکی ملی تھی جس جیسی اللہ پاک نے دوسری نہیں بنائی۔اس نے مجھے محبت دی، میرا خیال رکھا اور پھر نہایت مختصر وقت کے لیے میری زندگی میں اجالے بکھیر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بہت دور چلی گئی۔“

”اگر آپ کی بیوی زندہ ہوتی تب بھی میں نے آپ ہی سے شادی کرنا تھی۔“

”مجھ سے شادی کرنے بعد گھر والوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔“میں نے اس کی توجہ اصل حقیقت کی طرف مبذول کی۔

”جانتی ہوں۔“میرا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے وہ پرعزم لہجے میں بولی۔”یوں بھی لڑکی شادی کے بعد گھر والوں کے لیے پرائی ہو جاتی ہے۔“

ہم غروب آفتاب تک باتیں کرتے رہے۔اس دوران اس نے ایک بکری کا دودھ نکال کر میرے لیے چائے بھی بنائی تھی۔اس کا بکری کو دوہنا ایک خوش کن نظارا ہی تھا اور اب وہ میری بیوی بننے والی تھی۔میں نے اس دلفریب نظارے سے آنکھیں نہیں چرائی تھیں۔

”یہ ایک دم پرانے والی رومی بن گئی ہے۔“اسے بکری کے ساتھ مصروف دیکھ کر اس کا بھائی کہے بنا نہیں رہ

پایا تھا۔ ملگجا اندھیرا چھاتے ہی ہم وہاں سے چل پڑے تھے۔ آبادی میں داخل ہوتے ہوتے اچھا خاصا اندھیرا چھا گیا تھا۔

گھر میں روما کا باپ شفیق، ماں ریحانہ اور بڑا بھائی انوار موجود تھے۔ تینوں نے حیرانی سے مجھے دیکھا تھا۔ مجھ سے بھی زیادہ حیرانی انھیں رومانہ پر ہو رہی تھی جو خوشی سے کھلی پڑ رہی تھی۔

سکندر نے مجھے ایک کمرے میں لے جا کر بٹھایا۔ رومانہ بھی دوسری چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔

سکندر جونہی باہر نکلا میں نے رومانہ کو کہا۔ ”بے وقوف، میرے ساتھ اکیلے بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔“

اس کے چہرے پر نامعلوم خوف کی جھلک نظر آئی اور اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپ پھر کہیں چلے جائیں گے۔“

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر کہیں جانا ہوتا تو آتا کیوں۔“

وہ بھول پن سے بولی۔ ”ٹھیک ہے میں دروازے پر بیٹھ جاتی ہوں، وہیں سے آپ پر نظر رکھوں گی۔“

میں بے بسی سے بولا۔ ”میں قیدی بنا کر تو نہیں لایا گیا یار۔“

”اجنبی، مجھے تنگ نہ کریں۔ میں بہت ڈری ہوئی ہوں سمجھے آپ۔“ اس نے کھل کر اپنے ڈر کا اظہار کر دیا تھا۔

میں نے اسے جذباتی طور پر ورغلانا چاہا۔ ”مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔“

اس نے ذومعنی جواب دیا۔ ”آپ پر اعتبار تو پہلے بھی تھا۔“

”مطلب تم نے میرا ڈراما ضرور بنانا ہے۔“

اس نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ چاہتے ہیں کہ میں بے چین اور خوفزدہ رہوں۔“

میں نے بے بسی سے سر تھام لیا تھا۔

اس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میرے گھر والوں سے شرمانے کی ضرورت نہیں، وہ میرے کسی کام میں دخیل نہیں ہوتے۔“

”تم بغیر نکاح کے ایک غیر مرد کے ساتھ اکیلے کمرے میں بیٹھی ہو اور تمھارے گھر والوں کو اعتراض نہیں ہو گا

۔‘‘میں نے ذرا سخت لہجے میں اسے ڈانٹا۔

وہ ترکی بہ ترکی بولی۔’’آپ مجھ سے شادی کرنے والے ہیں، غیر مرد کیسے ہوگئے۔‘‘

میں گہرا سانس لے کر خاموش ہوگیا۔سکندر میرے لیے کھانا لے آیا تھا۔

’’رومی، جاؤ کھانا کھالو، تم نے دن کو بھی نہیں کھایا تھا۔‘‘سکندر میرے سامنے کھانے کے برتن رکھتے ہوئے بہن کو مخاطب ہوا۔

’’مجھے بھوک نہیں ہے۔‘‘وہ وہاں سے ہلنے پر آمادہ نہیں تھی۔

’’اچھی امی جان بلا رہی ہیں ان کی بات سن لو۔‘‘یقیناً سکندر اسے وہاں سے بھیجنا چاہتا تھا۔

’’جو کچھ کہنا ہے یہیں آ کر کہہ دیں۔‘‘اس نے صاف الفاظ میں اپنے ارادے کا بتا دیا۔

’’رومی، اب بدتمیزی بھی شروع کر دی۔‘‘سکندر نے اسے ڈانٹا۔

ایک دم اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی ابھری اور اس نے سر جھکا لیا۔مگر اٹھنے کی کوشش اس نے پھر بھی نہیں کی تھی۔

’’اس میں رونے کی کیا بات ہے۔‘‘اس کے آنسو دیکھ کر سکندر پریشان ہوگیا تھا۔

’’کہیں نہیں جاؤں گی، میں یہیں اجنبی کے ساتھ ہی بیٹھوں گی۔میں جانتی ہوں آپ انھیں بھگا دیں گے۔‘‘ اس نے کھل کر اپنے ڈر کا اظہار کیا۔

اسی وقت اس کا باپ اور بڑا بھائی انوار بھی وہیں آ کر بیٹھ گئے تھے۔

’’رومی بیٹا، جاؤ کھانا کھالو۔‘‘اس کا والد یقیناً وہاں ہونے والی بات چیت سے بے خبر تھا۔

’’اسے چھوڑیں ابو جان، آپ ذرا میری بات سنیں۔‘‘سکندر نے باپ کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔اور اس کے والد سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ ہو لیے۔میں خود کو خاصا ہونّق محسوس کر رہا تھا۔رومانہ کی بے وقوفی نے مجھے خجالت میں مبتلا کر دیا تھا۔صورت حال سے بے خبر انوار مجھ سے حال احوال پوچھنے لگا۔میرے کھانا کھاتے ہی اس نے برتن اٹھائے اور باہر نکل گیا۔سکندر اور شفیق اندر داخل ہوئے۔ان کے چہروں سے مترشح پریشانی میری نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔وہ لڑکی والے تھے، لڑکی بھی ایسی جس کا ذہنی توازن ان کی نگاہوں میں ٹھیک نہیں تھا

۔میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا اس لیے بغیر وقت ضائع کیے میں شفیق صاحب کو مخاطب ہوا۔

”شفیق چچا ایک عرض کرنا تھی۔“

”کہو بیٹا۔“ وہ میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

”اصولاً یہ بات میرے والدین کو کرنا چاہیے تھی، مگر معذرت خواہ ہوں کہ وہ پاکستان میں ہیں اور اگر راستے میں انڈین فوج کا کڑا پہرہ نہ ہوتا یقیناً میں انھیں ہی زحمت دیتا۔ مگر اب بہ حالت مجبوری مجھے خود ہی یہ بات کرنا پڑ رہی ہے اس لیے میری جسارت کو نظر انداز کر دینا آپ کا بڑا پن ہوگا۔ میرا تعلق پاکستان آرمی سے ہے اور میرا نام ذیشان حیدر ہے۔ میں آپ کی بیٹی رومانہ سے شادی کا خواہش مند ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اسے خوش وخرم رکھوں گا۔“

شفیق صاحب نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”آپ کے ہمراہ رومی کو وداع کرنے مطلب یہی ہے کہ ہم نے اپنی بیٹی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ اگر میں اپنی بیٹی کے احساسات سے ناواقف ہوتا تو یقیناً میرا جواب ناں میں ہوتا۔ اس سے یہ مراد بھی نہ لینا کہ میں پاک آرمی کے کسی جوان کو رشتہ دینے پر انکاری ہوں اصل مسئلہ رومی کی جدائی کا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی خوشی کے سامنے اس کی جدائی کے دکھ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے میری طرف سے ہاں سمجھو بیٹا۔“

رومانہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ باپ کے نزدیک جا کر ان سے لپٹ گئی۔ شفیق اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ”جانتا ہوں بیٹی!“

امام مسجد رومانہ کا سگا ماموں تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد سکندر انھیں بلا لایا تھا۔

نکاح کا خطبہ پڑھ کر انھوں نے شفیق صاحب سے حق مہر کے بارے دریافت کیا۔

وہ سادگی سے بولے۔ ”حق مہر شرعی ہوگا۔“

میں مخل ہوتے ہوئے بولا۔ ”چچا جان، شریعت تو کوئی حق مہر مقرر نہیں کرتی۔“

مولوی صاحب بولے۔ ”بچہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تو ایسا ہے پچاس ہزار ٹھیک رہے گا۔“ یہ کہتے ہوئے انھوں نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔شفیق صاحب اور اس کے دونوں بیٹوں کے چہروں پر خفت ظاہر ہوئی، مگر میری اگلا فقرہ سن کر ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔”کم از کم پانچ لاکھ اور اگر چچا جان یا روما چاہے تو اس سے زیادہ بھی بتا سکتے ہیں۔“

”بیٹا یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں۔“شفیق چچا نے بہ ظاہر ہلکا سا اعتراض کیا۔

”مولوی صاحب نکاح شروع کریں۔ چچا جان مروت میں ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ روما جیسی لڑکی کا یہ حق مہر بہت کم ہے۔“

مولوی صاحب سر ہلاتے ہوئے ایجاب وقبول کرانے لگے۔ رومانہ بہ ذات خود اس محفل میں موجود تھی۔ میری منت کے باوجود وہ وہاں سے ہٹنے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔مولوی صاحب کے رخصت ہو جانے کے بعد میں اسے مخاطب ہوا۔

”اب تو کوئی خطرہ نہیں رہا یقیناً تمھیں دوسرے کمرے میں جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

رومانہ کے کچھ کہنے سے پہلے شفیق صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔”اب اسے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہم باری باری ہم دونوں کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا اور کمرے سے نکل گئے۔وہ رات رومانہ کے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر آئی تھی۔اپنے اجنبی کے ساتھ جانے وہ کیا کیا باتیں کرتی رہی۔گزشتہ دو سال کی جدائی کی کسر وہ ایک رات ہی سے پورا کرنا چاہتی تھی۔میں بھی اس کی ہر خواہش کو تسلیم کرتا گیا۔نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میری لائی ہوئی چوڑیاں، کپڑے اور سوئیٹر وغیرہ اس کے پاس ویسے ہی محفوظ پڑے تھے۔گلاک نائینٹین پستول بھی ویسے کا ویسا ہی رکھا ہوا تھا۔میری خواہش پر اس نے میرے لائے ہوئے کپڑے پہن لیے تھے۔ان کپڑوں کو دو سال بعد وہ مقام نصیب ہوا تھا جس کے وہ حق دار تھے۔

شفیق صاحب نے درخواست کی تھی کہ میں اور رومانہ ایک ہفتہ ان کے ساتھ گزاریں۔ہفتے کے بجائے میں نے پورا مہینا وہاں رہنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔کیوں میں چاہتا تھا کہ انڈین فوجی میری تلاش سے بالکل ہی مایوس ہو جائیں تب رومانہ کے ساتھ سرحد عبور کروں۔وہ مہینا میں نے قریباً ایک ہی کمرے میں بند رہ کر گزارا تھا۔اور اس دوران روما بھی خال ہی باہر نکلتی تھی۔وہ اپنی خلوص بھری محبتوں اور چاہتوں کے ساتھ مجھ پر یوں ٹوٹ

کر بسی کہ میری کئی حسرتوں کو تعبیر کی شکل دے دی تھی۔اس کی محبت میں ایک قسم کی عقیدت شامل تھی۔شوہر اور بیوی کا رشتہ دنیا کے ہر رشتے سے زیادہ قریبی رشتہ ہے۔قران پاک میں اللہ پاک نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔جس طرح انسان پہنے ہوئے کپڑوں سے کچھ پوشیدہ نہیں رکھ سکتا اسی طرح میاں بیوی کا ایک دوسرے سے نہ تو کچھ راز میں ہوتا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔وہ مجھے اب بھی میرے اجنبی کہہ کر بلاتی ۔یہ میرے ساتھ عجیب معاملہ تھا کہ چاہنے والے مجھے مختلف ناموں سے مخاطب کرتے۔ماہین اور پھوپھو جان مجھے شانی کہتی تھیں،جینیفر ذی کہہ کر بلاتی،روما اجنبی کہتی تھی،سردار راجا کہہ کر مخاطب کرتا اور میری جانِ حیات پلوشے مجھے راجو کہتی تھی۔

مہینے گزرتے پتا ہی نہیں چلا تھا۔ایک شام کو میں اور روما جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔اس کے بھائیوں نے سرحد تک ہمارے ساتھ جانا چاہا مگر میں نے سختی سے منع کر دیا تھا۔اس رستے پر میں دو بار سفر کر چکا تھا اور ایک سنائپر جس رستے پر ایک بار بھی سفر کر لے وہ راستے کے تمام خوبیوں خامیوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ایک جذباتی مکالمے کے بعد روما باری باری تمام گھر والوں سے گلے مل کر وداع ہوئی میں نے انھیں اپنا فون نمبر دے دیا تھا تا کہ جب بھی ان کا دل چاہے وہ شہر جا کر روما سے بات کر کے اس کی خیریت وغیرہ معلوم کر سکیں۔اس کے ساتھ میں نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ جب بھی ممکن ہوا قانونی طریقے سے سرحد پار آ کر روما کی گھر والوں سے ملاقات ضرور کراؤں گا۔

واپسی کے سفر میں میں نے بہت زیادہ احتیاط برتی تھی کیوں کہ میرے ساتھ بیوی بھی تھی۔اس کی موجودی میں یقیناً میں دشمن کا مقابلہ نہ کر پاتا۔لیکن کشمیر اور کارگل کی سرحد ایسی ہے جس سے دونوں اطراف کی افواج مکمل طور پر بند نہیں کر سکتی۔سارے نالوں اور پہاڑیوں پر آرمی کی تعیناتی ناممکن ہے۔البتہ کسی جاسوس وغیرہ کی آمد کی پیشگی اطلاع پر مختلف نالوں میں ناکے وغیرہ لگا کر آنے والے کو گرفتار کیا جا سکتا ہے۔میری وہاں آمد پرانی ہو گئی تھی اس لیے حالات ایک بار پھر معمول پر تھے۔پوری رات ہم آرام سے سفر کرتے رہے۔روما ایک کشمیری چرواہن تھی جس کی ساری زندگی انھی پہاڑوں پر گزری تھی۔پہاڑی رستوں پر چلنے کے معاملے میں وہ مجھ سے کچھ بہتر ہی تھی۔پلوشے بھی پہاڑیوں پر لومڑ کی سی تیزی سے حرکت کیا کرتی تھی۔روما کی بے تحاشا محبت پا کر بھی

وہ دشمن جان بھولنے میں نہیں آ رہی تھی ۔ کیوں حقیقت یہی تھی کہ انسان زندگی میں سچی محبت ایک بار ہی کرتا ہے اور وہ میں نے پلوشے سے کی تھی ۔ روما مجھے پیاری تھی ، میں اس کا خیال رکھتا تھا۔اس کی باتوں کو مانتا تھا اسے کسی قسم کی تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر وہ پلوشے کی جگہ نہیں لے سکتی تھی ۔ پلوشہ کی مکمل کہانی میں روما کو سنا چکا تھا۔اور اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فقط اتنا کہا تھا۔

''میرے اجنبی کاش وہ زندہ ہوتی ، یقیناً میں اسے اپنی چھوٹی بہن جیسی محبت دیتی ۔'' حالانکہ وہ پگلی یہ نہیں جانتی تھی کہ پلوشے کی زندگی کی صورت میں وہ کبھی بھی میری زندگی میں شامل نہ ہو سکتی ۔لیکن ایسا کہہ کر میں اسے اذیت نہیں دینا چاہتا تھا۔وہ میری محبت میں اپنے سارے رشتوں کو چھوڑ کر اپنے پیارے وطن کو چھوڑ کر میرے ساتھ جا رہی تھی ، میں اس کی جتنی قدر ، جتنی عزت اور جتنا احترام کرتا کم تھا۔

پوری رات سفر کرنے کے بعد ہم نے طلوع آفتاب سے کچھ پہلے چھپنے کی ایک جگہ تلاش کر لی تھی ۔گھر سے چلتے وقت روما نے راستے کے لیے پراٹھے بنا کر ساتھ رکھ لیے تھے ۔کھانا کھا کر میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اسے سونے کا کہہ کر خود بیٹھا رہا۔اپنی بیوی کو آرام پہنچانا ایک مرد کی ذمہ داری ہوتی ہے اور میں اپنی ذمہ داری سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا۔

دوپہر کو اٹھ کر اس نے زبردستی مجھے سلا دیا تھا۔شام کو ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا اور رات کے دو اڑھائی بجے کے قریب ہم پاکستان اور انڈیا کی سرحد کے درمیان موجود چند گھروں کی آبادی کے پاس پہنچ گئے تھے ۔دیکھا جاتا تو وہ گھر بہت غلط جگہ پر بنے تھے کہ دونوں افواج کے فائرنگ کے تبادلے سے انھیں بھی نقصان پہنچ سکتا تھا لیکن وہ لوگ اپنے گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے ۔

اکتوبر کا مہینا شروع ہو گیا تھا۔سردی کی شدت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔اور اب برف باری کسی بھی وقت متوقع تھی ۔کارگل کی پہاڑیوں پر تو یقیناً اس مہینے میں اچھی خاصی برف پڑ چکی ہوتی ہے ۔البتہ اس جانب برف باری اکتوبر نومبر میں جا کر شروع ہوتی ہے ۔نالے میں پانی پہلے کی نسبت تھوڑا زیادہ نظر آ رہا تھا۔میں نے اپنے جوتے اتار کر نالہ عبور کرنا مناسب سمجھا کیوں گیلے جوتوں کے ساتھ آگے سفر کرنا پاؤں کو خراب کر دیتا۔البتہ روما کو میں نے بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔

”جھوٹے اجنبی، آپ میرا اتنا زیادہ خیال کیوں کرتے ہیں۔“ میرے کندھے پر سر رکھتے ہوئے اس نے خوشی سے سرشار لہجے میں پوچھا۔

میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ”کیوں کہ تم ہو ہی اس قابل کہ تمھارا بہت زیادہ خیال رکھا جائے۔“

”جھوٹا۔“ وہ ناز سے مسکرا دی تھی۔ چاند طلوع ہو چکا تھا اور اس کی مدہم روشنی میں ہم آگے بڑھنے لگے۔ بارودی سرنگی قطعے کے قریب جا کر میں نے ٹارچ کی روشنی پاک آرمی کے جوان کی طرف پھینکی کہ وہاں سے آگے ہم اس کی نظروں میں آئے بغیر نہیں جا سکتے تھے۔ حالانکہ مجھے وہاں سے گزرنے کا راستہ معلوم تھا۔

”کون؟“ ٹارچ کی روشنی پر سنتری چوکنا ہو گیا تھا۔

میں نے فوراً جواب دیا۔ ”دوست ہوں۔“

اس نے فوراً ہی مجھے خبردار کیا۔ ”آگے نہ بڑھنا، تم بارودی سرنگوں کے قریب کھڑے ہو۔“

”تو آ کر ہمیں لے جاؤ۔“ رستہ معلوم ہونے کے باوجود میں نے خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا کہ دو سال میں وہاں تبدیلی ہونا بھی ممکن تھا۔

اگلے تین چار منٹ میں سنتری اور اس کے ساتھ موجود گارڈ کمانڈر وہاں پہنچ گئے تھے۔ میرے ساتھ ایک خاتون دیکھ کر ان کے تنے ہوئے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اپنا نام نمبر اور یونٹ وغیرہ بتا کر میں شناخت کرائی اور سنتری کی رہنمائی میں ہم نے بارودی سرنگی قطعہ عبور کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں پوسٹ کمانڈر کے سامنے بیٹھے تھے۔ پچھلی بار جب میں نے سرحد عبور کی تھی اس وقت وہاں ایک اور یونٹ تعینات تھی جو اپنا عرصہ پورا کر کے کہیں اور جا چکی تھی۔ البتہ میری یونٹ سے رابطہ کر کے انھوں نے میری شناخت کو یقینی بنا لیا تھا۔ میرے کمانڈنگ آفیسر نے فوراً ہی مجھ سے بات کرنے کی خواہش کی تھی کیوں کہ ان کے تئیں تو میں مر چکا تھا۔ مجھ سے بات کر کے اس نے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

پوسٹ کمانڈر نے فوراً ہی اپنا رہائشی بینکر ہمارے حوالے کیا اور خود باہر نکل گیا۔ میں روما کے ساتھ آرام کرنے لیٹ گیا۔ دن چڑھے اٹھ کر ہم نے ناشتا کیا اور اس یونٹ کے بٹالین ہیڈ کوارٹر کی جانب بڑھ گئے جو وہاں سے چھ کلومیٹر دور تھا۔ وہاں سے ہمیں چھتر دو تک گاڑی مل گئی تھی۔ کلاشن کوف میں نے اسی یونٹ میں جمع کرا دی

تھی البتہ اور یونٹ کمانڈر نے فوراً ہی مجھے ایک لیٹر بنا کر دے دیا تھا کہ میں ایک نے ایک عدد کلاشن کوف مع پانچ فالتو میگزینوں کے وہاں جمع کرائی ہے۔ پاک آرمی میں ہتھیاروں کے بارے اتنی احتیاط برتی جاتی ہے کہ ہتھیار کو غلط استعمال کرنا تو چھوڑیں اس بارے سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ چھتر دو سے ہم سول ویگن میں باغ پہنچے اور وہاں راولپنڈی کی بس میں بیٹھ گئے۔ شام آٹھ بجے کے قریب ہم پیرودھائی پہنچ گئے تھے۔ میں نے فوراً ہی صوبیدار راؤ تصور صاحب کا نمبر ملا کر انھیں راولپنڈی آمد کا بتا کر ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ میرے ساتھ میری بیوی موجود ہے اور میں گھر جا رہا ہوں۔

میرے زندہ رہنے کی خبر تمام یونٹ میں پھیل چکی تھی۔ بلکہ اس بارے وہ میرے گھر والوں کو بھی مطلع کر چکے تھے جہاں میرا غائبانہ نماز جنازہ بھی ادا ہو چکا تھا۔

تصور صاحب نے مجھے خیریت سے لوٹنے کی مبارک باد دی، اپنے صوبیدار میجر بننے کی خوش خبری سنائی اور یقیناً دلایا کہ وہ میری زیادہ سے زیادہ چھٹی کرانے کی کوشش کریں گے۔

اے ٹی ایم مشین سے پیسے نکلوا کر میں نے تلہ گنگ تک ٹیکسی کروائی اور ابو جان کو کال کر کے اپنی آمد کا بتانے لگا۔ ابو جان میری آواز سن کر خوشی سے بات نہیں کر پا رہے تھے۔ یقیناً جو بوڑھا باپ اپنے جوان بیٹے کا جنازہ پڑھ چکا ہو اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی موت کی خبر جھوٹی تھی تو اس نے خوشی سے بے قابو تو ہونا ہے۔ گھر کے سامنے ٹیکسی کے رکتے ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ ابو جان نے فوراً ہی مجھے اپنی پر شفقت آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ اس وقت ہماری بیٹھک مرد رشتہ داروں سے اور گھر زنانہ رشتہ داروں سے بھرا ہوا تھا۔ ابو جان کے بعد پھوپھو جان اور امی جان نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ چونکہ وہاں کافی مرد موجود تھے اس لیے میں نے امی جان کو کہا۔

''اپنی بہو کو اندر لے جائیں میں باقیوں سے مل لوں۔''

میری بات پر اس نے حیرانی بھری نگاہ میرے ساتھ کھڑی رومانہ پر ڈالی اور فوراً ہی انھیں اپنے ساتھ لپٹا کر اندر لے گئیں۔ میں بیٹھک میں گھس گیا تھا۔ چند لمحوں میں میری شادی کی خبر بھی تمام تک پہنچ گئی تھی۔ تمام سے مل کر شادی اور نئی زندگی کی مبارک باد سمیٹ کر میں ابو جان کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو تمام عورتوں نے رومانہ کو

گھیرا ہوا تھا۔ پھوپھو جان اور امی جان کی خوشی دیدنی تھی۔عدیل بھی ابھی تک جاگ رہا تھا۔میں نے فوراً ہی اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔اور پھر مجھے عورتوں کے جھرمٹ میں ماہین بھی نظر آئی۔وہ مجھے ہی گھور رہی تھی۔میری نظر پڑتے ہی اس نے اپنا رخ موڑ لیا تھا۔یہ اس کی ہی ہمت تھی کہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرنے کے بعد بھی اس نے میرے گھر آنے کی جرّات کر لی تھی۔چونکہ میں نے اسے پہلے ہی دن سے معاف کر دیا تھا اس لیے اسے نظر انداز کر کے رشتہ دار خواتین کے مبارک باد کا جواب دیتا رہا۔تمام عورتیں رومانہ کے حسن سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔رات گئے جا کر وہ بھیڑ ختم ہوئی۔میں نے پلوشہ والے کمرے کے بجائے اس کے ساتھ والے کمرے میں رومانہ کو رکھا تھا۔کیوں کہ اس کمرے میں میری پلوشہ کی خوشبو رچی بسی تھی۔وہ سیج ابھی تک ویسے ہی قائم تھی اس کے کپڑے اور زیور ویسے ہی پڑے تھے جیسے وہ چھوڑ گئی تھی اور میں انھیں ہمیشہ اسی حالت میں رکھنا چاہتا تھا۔

اگلے دن ابو جان نے بہت بڑی ضیافت کا بندوبست کیا تھا اور پورے گاؤں کھانے پر مدعو تھا۔میری یونٹ کے کافی جوان بھی مجھے ملنے پہنچ گئے تھے۔تصور صاحب نے آتے ہی مجھے دو ماہ کی چھٹی کی خوش خبری سنا دی تھی۔الیاس بھی خصوصی طور پر مجھے ملنے آیا۔میرے گلے لگتے ہی وہ رو پڑا تھا۔میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اسے تسلی دی۔اسی کی زبانی معلوم ہوا کہ پوسٹ پر خیریت سے ذخیرہ اندوزی ہو گئی تھی۔البتہ پوسٹ پر موجود جوان اور یونٹ کا کمانڈنگ آفیسر میرے لیے بہت پریشان تھے۔

رومانہ نے گھر والوں کے ساتھ گھلنے ملنے میں بالکل ہی دیر نہیں لگائی تھی۔ہمارے پہنچ جانے کے اگلے ہی روز اس کے بھائی سکندر کی کال آئی تھی۔ہمارے خیریت سے پہنچ جانے کا سن کر وہ بہت خوش ہوا تھا۔رومانہ کافی دیر بھائی کے ساتھ مصروف گفتگو رہی تھی۔

مبارک باد کا یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا تھا۔اور پھر آہستہ آہستہ حالات معمول کے مطابق ہو گئے تھے۔میری چھٹی کا مہینہ گزر گیا تھا۔اس وقت میں اپنے دوست اویس کی بیٹھک میں بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا جب ابو جان نے کال کر کے کسی مہمان کی آمد کی بابت بتایا۔اویس سے اجازت لے کر میں گھر کی جانب بڑھ گیا۔بیٹھک میں قابل خان محسود کو دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت کا احساس ہوا تھا۔اسے پرتپاک انداز میں معانقہ کر کے میں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔گفتگو کی ابتداء میں ہی اس نے گلے شکوے سے کی تھی۔اس کے تئیں اور تو چھوڑو میں

نے پلوشہ کی قبر پر جانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

میں پر اذیت لہجے میں بولا۔ ''سردار قابل خان، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، لیکن جس کے ریشمی بدن پر مٹی کا ذرہ لگنا مجھے گوارا نہیں تھا اسے منوں مٹی تلے دبا کیسے دیکھتا۔ اور پھر اس نے خود بھی تو ہمارے پاس دفن ہونا گوارا نہ کیا اور اپنے بہن کے پہلو کو اپنے لیے پسند کیا۔''

اس نے منھ بنایا۔ ''یہ بہانے بازی ہی ہے۔''

اس مرتبہ میں اس کی بات کا جواب دیے بغیر خاموش رہا تھا۔

مجھے خاموش پا کر وہ کہنے لگا۔ ''اچھا میں ایک خاص سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔''

''حکم کرو بھائی۔''

''خوشحال بھائی کی بیٹی اور میرے بیٹے کی شادی ہے اور آپ کا آنا نہایت ہی ضروری ہے۔'' خوش حال اس کا ماموں زاد بھائی تھا۔ لیکن دونوں میں بلا کی محبت تھی۔

میں خوش دلی سے بولا۔ ''بڑی خوشی کی بات ہے یار، میری طرف سے پیشگی مبارک باد قبول کرلو۔''

وہ فوراً بولا۔ ''خیر مبارک، لیکن میں نے کوئی اور درخواست بھی کی ہے۔''

''قابل بھائی، آپ تو جانتے ہیں، ہم فوجیوں کی چھٹی نہایت ہی مختصر ہوتی ہے اور خوشی کی ایسی محافل میں شرکت کرنا عموماً ممکن نہیں رہتا۔ فی الحال تو نہیں البتہ میں جلد ہی آپ کی طرف آنے کی کوشش کروں گا۔''

''ہونہہ!...... جان چھڑا رہے ہو۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں قابل بھائی، لیکن سچ کہوں تو کچھ ایسی مصروفیات درپیش ہیں کہ حقیقت میں میرا آنا مشکل ہوگا۔'' میں سچ ہی میں جان چھڑا رہا تھا۔ کیوں اس علاقے میں جا کر دشمن جاں کی یادوں نے مجھے اور زیادہ اذیت پہنچانی تھی۔ قابل خان کی بیٹھک میں میں نے پلوشے کے ساتھ بہت قیمتی لمحات بسر کیے تھے۔ میں ان لمحات کو یاد کرنے سے کتراتا تھا۔ یقیناً وہاں جا کر اس کی یادوں نے اودھم مچا دینا تھا۔

''تو کیا میں اتنی دور سے یہاں جھک مارنے آیا ہوں، یا میرا آپ پر کوئی حق ہی نہیں ہے۔'' قابل خان نے اپنے جذبات کے اظہار میں ذرا بھر نرمی نہیں برتی تھی۔

''میں نے ایسا کب کہا ہے یار۔'' اسے غصے میں دیکھ کر میں نے مفاہمتی لہجہ اپنالیا تھا۔
''محترم، وشلام گاؤں کے لوگوں نے آپ کے لیے جان کی قربانی بھی دی ہوئی ہے۔کیا اتنی جلدی بھول گیا ہے کہ آپ کے لیے ہمارے پورے گاؤں نے علام خیل جیسے بڑے قبیلے سے ٹکر لی تھی۔'' وہ اتنا غصے میں تھا کہ اس نے احسان جتلانے میں بھی شرم محسوس نہیں کیا تھا۔
''یار آپ تو ناراض ہی ہوگئے ہیں۔'' میں پریشان ہوگیا تھا۔
''ہاں میں ناراض ہوں۔اور معافی چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنا سمجھ کر یہاں آ گیا تھا۔یقیناً آپ کا اور ہمارا تعلق بس پلوشہ کی زندگی تک تھا، خدا حافظ۔'' وہ فوراً ہی کھڑا ہوگیا تھا۔اس کی جذباتی دھونس کے سامنے میں نے فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے تھے۔اس کا بازو تھامتے ہوئے میں لجاجت سے بولا۔
''قابل بھائی، ایسا تو خیر نہیں چلے گا۔یہاں سے خفا ہو کر تو میں آپ کو نہیں جانے دے سکتا۔اور جہاں تک شادی کا تعلق ہے تو میں کیا میرا باپ بھی اس شادی میں شرکت کرے گا۔''
''باپ کو زحمت نہ دیں صرف آپ کی ضرورت ہے۔خوشحال بھائی کی بھی یہی تمنا تھی، نشانہ بازی کا بھی مقابلہ رکھا ہے شاید آپ حصہ لینا چاہیں بس دو دن ہمیں دے دینا تیسرے دن واپس آجانا۔'' میرا مفاہمتی لہجہ سنتے ہی اس نے ناراضی ختم کر دی تھی۔
''کب آنا ہوگا۔''
''اسی جمعہ اور ہفتے کو اتوار کو آپ واپس آجانا۔''
وہ سوموار کا دن تھا۔میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''میں جمعرات کی صبح یہاں سے نکلوں گا۔''
قابل خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔''شکریہ تو خیر نہیں بولوں گا کہ کوئی احسان نہیں کر رہے ہو ہمارا آپ پر پورا پورا حق ہے۔''
''صحیح کہا۔'' میں بھی مسکرا دیا تھا۔وہ رات میرے پاس گزار کر قابل خان اگلی صبح واپس لوٹ گیا تھا۔
جانے سے ایک دن پہلے میں نے رومانہ کو بھی تیار ہونے کا کہہ دیا تھا، مگر ابو جان، پھوپھو اور امی جان نے صاف انکار کر دیا تھا۔وہ رومانہ کو کسی صورت وزیرستان جانے کی اجازت دینے پر تیار نہیں تھے۔میں نے بھی

انھیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بدھ کے دن میں سہ پہر کو گھر سے نکلا راولپنڈی جا کر میں نے دلھا دلھن کے لیے تھوڑی سی خریداری کی اور وہاں سے رات کو ڈیرہ اسماعیل خان کی گاڑی پکڑ کر صبح دم ڈیرہ اسماعیل خان پہنچ گیا۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں میں صرف ناشتا کرنے رکا اور پھر وانہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وانہ سے وشلام کی ویگن بھی آسانی سے مل گئی تھی۔ میں جمعرات کی شام کو وشلام پہنچ گیا تھا۔ خوشحال خان اور قابل خان مجھے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ شادی کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اسی بیٹھک میں قیام کرنا پڑ گیا تھا جہاں کبھی میں پلوشے کے ساتھ اپنی زندگی کے خوب صورت ترین دن گزارے تھے۔ اب تک بیٹھک کے اس کمرے سے پلوشے کے وجود کی خوشبو آ رہی تھی۔ جمعے کے دن نشانہ بازی کے بہت بڑا مقابلے کا انقاد ہوا تھا ۔قابل خان کے بہت زیادہ زور دینے کے باوجود میں نے اس مقابلے میں حصہ نہیں لیا۔ جیتنے والے نے پانچ گولیاں فائر کر کے تین سو میٹر کے فاصلے پر موجود ایک چھوٹے سے شیشے کا نشانہ بنایا تھا۔ وہاں موجود وشلام گاؤں کے قریباً تمام لوگ مجھ سے واقف تھے۔ مقابلہ ختم ہونے کے بعد کافی لوگوں کے اصرار پر میں نے کلاشن کوف تھام لی تھی۔ صرف ایک گولی چلا کر میں نے اسی فاصلے پر موجود شیشے کو نشانہ بنا لیا تھا۔ لوگوں نے زوردار نعرے سے مجھے سراہا تھا۔ ہفتے کی رات کو خصوصی پروگرام تھا۔ قابل خان نے پشتو کے دو مشہور گلوکاروں کو بلایا ہوا تھا۔

عشاء کے بعد رباب کے تار اور طبلے کی دھمک سے وشلام گاؤں کے در و دیوار جھوم اٹھے تھے۔ گاؤں سے باہر انھوں نے پہاڑی کے دامن میں سٹیج بنایا تھا جہاں یہ محفل سجی تھی۔ نجانے کیوں پشتو ساز اور دھن سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے پلوشہ کا خوب صورت وجود تھرکتا ہوا نظر آنے لگتا۔

”راجو، میں اپنی شادی میں ناچوں گی۔“ اس کی مدھر آواز میرے کانوں میں گونجی اور میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ اس نے کتنی حسرت سے کہا تھا......

”راجو، پتا نہیں کب وہ دن آئے گا جب آپ تھکے ہارے باہر سے آئیں گے اور میں آپ کے سامنے کھانا رکھوں گی۔ جو آپ کو پسند نہیں آئے گا آپ مجھے ڈانٹیں گے اور میں رونے لگ جاؤں گی اور آپ کھانا پینا بھول کر مجھے منانے لگ جائیں گے اور دیر تک مناتے رہیں گے۔ دیر تک..........“

''ہاں دیر تک مناتا رہوں گا دیر تک......بس ایک بار واپس لوٹ آؤ......'' میرے دل میں ایسی حسرت اٹھی جس کا پورا ہونا یقیناً ناممکن تھا، مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ پاک کے لیے کوئی چیز ناممکن نہیں ہے۔

''معجزے صرف انبیاء پاک کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں راجے میاں۔'' میں نے خود کو جھڑکا اور اپنی توجہ گانے والے کی طرف متوجہ کر لی جو اپنی خوب صورت آواز میں ......

''مانا جانان غوغتو تو روسنڑوں تا گلونہ پہ سر لیا

(محبوب نے اپنے کالے بالوں کے لیے مجھ سے پھول مانگے ہیں ہیں اے بہار)

چرتہ خوز مونگ کلی تہ ہم راپے خا او کا۔

(کبھی تو ہمارے گاؤں میں بھی چکر لگا لو)''

گا رہا تھا۔ میری پلوشہ کے بال بھی تو اب بڑے ہو گئے ہوتے، کیا وہ بھی بالوں میں لگانے کے لیے پھول مانگنے کی ضد کرتی تو کیا میں بھی یونہی موسم بہار کی منتیں کر رہا ہوتا۔ ایک دم میرے لیے وہاں بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ میں نے ساتھ بیٹھے قابل خان کو کہا۔

''یار میرے سر میں درد ہے اگر اجازت ہو تو تھوڑا آرام کرنا چاہوں گا۔''

''یہ بھلا کیا بات ہوئی۔'' وہ خفا ہونے لگا۔

میں نے فوراً کہا۔ ''معذرت خواہ ہوں، طبیعت ٹھیک نہیں ہے نا۔''

وہ مصر ہوا۔ ''تھوڑی دیر تو بیٹھو، ایک خاص آئیٹم سن کر چلے جانا۔''

''نہیں میں شکریہ، میرے سر میں بہت درد ہے۔'' میں کھڑا ہو گیا۔

''اچھا وہ خاص آئیٹم میں ابھی چلوا دیتا ہوں آپ بس دو منٹ انتظار کریں۔'' وہ اٹھ کر سٹیج کی طرف بڑھا مگر میں اس کی ناراضی کو نظر انداز کرتا ہوا قناتوں کی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی دور آتے ہی میرے کانوں میں قابل خان محسود کی آواز آنے لگی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ میرا دماغ الجھا ہوا تھا۔ اعلا کوالٹی کا ساؤنڈ سسٹم ہوتے ہوئے بھی میری سمجھ میں اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ وہ غالباً وہ کسی مہمان گانے بجانے والی کے بارے کوئی اعلان کر رہا تھا۔ اور پھر اس وقت میں بیٹھک میں داخل ہو رہا تھا جب میری سماعتوں میں ایک

عورت کی درد بھری آواز گونجی۔

دا ہجران تورے تیارے دی خدایا خیر

(ہجر کے کالے اندھیرے چھا گئے ہیں اللہ خیر)

ٹول غمونہ راپسے دی خدایا خیر

(تمام غم میرے ہی پیچھے پڑے ہیں اللہ خیر)

میرا دل اتنے زور سے دھڑکا گویا اچھل کر حلق میں آ جائے گا۔ کیا سماعتیں مجھے دھوکا دے رہی تھیں۔ یا قدرت میرے ساتھ کوئی مذاق کرنے پر تلی تھی۔ میری ٹانگوں نے جسم کا بوجھ اٹھانے سے گویا معذوری ظاہر کر دی تھی۔ میں نے بیٹھک کے دروازے کا پٹ تھام لیا۔ میرا پورا جسم ہی گوش بن گیا تھا۔

چرتہ لاڑ شمہ فریاد او کما چا تہ

(کہاں جاؤں اور کس کو فریاد کروں)

بالکل اسی کی آواز تھی......

دا امید ڈیوے مہ مڑے دی خدایا خیر

(کہ میری امید کے دیے ہی بجھ چکے ہیں اللہ خیر)

اس آواز کو میں کیسے بھلا سکتا تھا۔ جی ہاں وہ پلوشہ ہی کی آواز تھی۔ اپنی غیر ہوتی حالت کو سنبھال کر میں پیچھے مڑ کر بھاگ پڑا۔

☆......☆......☆

دو تین قدم لیتے ہی ٹھوکر لگی اور میں منھ کے بل گر گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ سازندے ساز بجا رہے ہیں یا نہیں، رباب کے تاروں کو چھیڑا جا رہا ہے یا نہیں، طبلچی اور گھڑا بجانے والوں کے ہاتھ رکے ہوئے ہیں یا مصروف ہیں میرے کانوں میں تو بس اس کی درد سے لبریز آواز گونج رہی تھی۔

دا شپہ نہ صبا کیگی خدایا لا پس اوگدے گی غمونہ دی اوزہ یم

(اس رات کی صبح نہیں ہو رہی یا اللہ یہ اور بھی لمبی ہوتی جا رہی ہے اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

پہ لپو لپو او خکے مہِ پہ مخ باندے بہیگی غمونہ دے اوزہ یم

(چہرے پر لگا تار آنسو بہہ رہے ہیں اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

اس کے الفاظ صرف معنوی طور پر درد انگیز نہیں تھے اس کی آواز سے ظاہر ہونے والی اذیت بھی دل کو محسوس ہو رہی تھی۔ میں زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھا اور پھر دوڑ پڑا۔ پہلے والی چوٹ مجھے بھول چکی تھی۔ بلکہ اس وقت میرے دماغ میں کچھ تھا تو وہ پلوشہ کی آواز کے متعلق تھا۔ کیا کسی کی آواز اس قدر مماثل ہو سکتی تھی......؟

غمونہ دی غمونہ، دا ہجران تورے تیارے دی، عجبہَ زندگی دا

(غم ہی غم اور ہجر کے کالے اندھیرے ہیں، عجیب زندگی ہے)

زہ تل خاورے پہ سریم در پہ دریم اند یخنے دی، عجبہَ زندگی دا

(ہمیشہ سر میں خاک سجائے در بہ در پریشانیاں سمیٹتی ہوں عجیب زندگی ہے)

پہ خپو کے مہِ بیڑی دی، منزلونہ لرے کیگی غمونہ دی اوزہ یم

(پاؤں میں بیڑیاں ہیں، منزلیں دور ہوتی جا رہی ہیں اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

پہ لپو لپو او خکے مہِ پہ مخ باندے بہیگی غمونہ دی اوزہ یم

(چہرے پر لگا تار آنسو بہہ رہے ہیں اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

''وہ زندہ تھی تو کیسے؟......اسے چھپنے کی کیا ضرورت آن پڑی، اور جب خود مرضی سے چھپی تو اتنے درد بھرے انداز سے گانے کا کیا جواز......؟'' اس کے الفاظ کو سنتا ہوا میں آگے بڑھتا گیا۔

زندی یما داوخت او دا حالاتو پہ زندانِ کے یوازے پہ جڑا

(وقت اور حالات کے ہاتھوں قیدی بنا تنہا آہ بکا میں مصروف ہوں)

خبرونہ یم پاتے دا اللہ پہ دے جہان کے یوازے پہ جڑا

(دنیا میں بات کرنے کے بھی قابل نہیں رہا تنہا آہ و بکا میں مصروف ہوں)

ہڈوکی مہ اچیگی بدن غوخے ویلے کیگی، غمونہ دے اوزہ یم

(ہڈیاں خشک ہو رہی ہیں، بدن کا گوشت گل سڑ رہا ہے اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

دا لیو لپوا و خکے مہ پہ مخ باندے بہ ہیگی غمونہ دے اوزہ یم

(چہرے پر لگاتار آنسو بہہ رہے ہیں اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

کیا اسی وجہ سے قابل خان مجھ پر شادی میں شرکت پر زور دے رہا تھا، یہاں تک کہ وہ احسان جتلانے کی گھٹیا اور غیر اخلاقی حرکت سے بھی باز نہیں آیا تھا۔اور ابھی میرے محفل سے اٹھنے پر بھی اس نے میرے خصوصی آئیٹم کو سننے پر کتنا زور دیا تھا۔یقیناً وہ چاہتا تھا کہ مجھ تک پلوشہ کا درد پہنچ جائے......اس کا درد و غم آواز کی صورت میں فضاؤں کا سینہ چیر کر مجھے بے حال کرتا جا رہا تھا......میں پنڈال میں داخل ہوا۔ارد گرد کے علاقے سے بھی کافی لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے میں آگے بڑھنے لگا۔اس کی درد بھری آواز گونج رہی تھی۔

دا کورا مسافر یم داہر چہ یم داخبرو، زمہ پہ حال خندیگی

(موت کے سفر پر رواں مسافر اور ہر بندے کی باتوں کا نشانہ ہوں تمام مجھ پر ہنستے ہیں)

قیمت مہ کلہ شتا داتڑ مواخکو مسافرو، زمہ پہ حال خندیگی

(میرے بہتے اشک جو بے قیمت ہیں اور فقط ہنسی کا باعث بنتے ہیں)

پہ او چوشونڈو گورامہ یاران رانہ بے لیگی غمونہ دے اوزہ یم

(خشک لبوں سے یاروں کو جدا ہوتے دیکھ رہا ہوں، اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

پہ لپو لپوا و خکے مہ پہ مخ باندے بہیگی غمونہ دے اوزہ یم

(چہرے پر لگاتار آنسو بہہ رہے ہیں اور میرے ساتھ فقط غم ہیں)

اس کی آواز بند ہو گئی تھی، لوگوں نے تالیاں بجا کر اور نعرے بلند کر کے اس کے درد کو سراہنے لگے۔اس کی نوحہ خوانی اور بین سے لطف اندوز ہونے والے اس آواز کے پیچھے چھپی اذیت کو محسوس نہیں کر سکے تھے۔یا اگر کی بھی تھی تو اسے کسی گلوگار کے کمال سے تشبیہ دے دی تھی۔

لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا میں آگے نکلا۔گلوکاروں کے بیٹھنے کے لیے زمین سے چار پانچ فٹ بلند سٹیج بنایا گیا تھا۔سٹیج کے سامنے دائیں بائیں چارپائیاں پڑی تھیں جن پر مختلف قبیلوں کے سردار، ملک وغیرہ براجمان تھے۔

سامنے کی طرف بھی چارپائیوں کی دو قطاریں بچھی تھیں اور اس کے بعد عام لوگ، جس کو جدھر جگہ ملی تھی کی بنیاد پر چاروں طرف موجود تھے۔ میں چونکہ خصوصی مہمان تھا اس لیے پہلے سامنے کی چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ البتہ ایک بار اٹھ کر جانے کے بعد مجھے آگے جانے کے لیے کافی زور لگانا پڑا تھا۔

وہ مجھے سٹیج پر نظر نہیں آرہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر ایک پردہ لگا ہوا نظر آیا وہ اسی کے پیچھے موجود تھی۔ لوگ اس سے ایک اور گانے کی فرمائش کر رہے تھے اور میں تمام سے بے نیاز سٹیج کی طرف بڑھتا گیا چارپائیوں کی قطار سے گزر کر خالی جگہ پر پہنچتے ہی میں بھاگ کر سٹیج تک جا پہنچا۔ سٹیج پر موجود گلوکار اور سازندوں نے شاید مجھے گیت سنگیت کا ایسا شیدائی سمجھا تھا جو دو تین بول سن کر گلوکاروں کی طرف بھاگ پڑتے ہیں۔ شاید لوگ بھی کچھ ایسا ہی سمجھ رہے ہوں، مگر اس وقت مجھے کسی کی بھی پروا نہیں تھی۔ میں اپنے حواس میں تھا ہی کہاں کہ کوئی سدھ بدھ ہوتی۔

جونہی میں سٹیج پر چڑھا دائیں بائیں کھڑے انتظامیہ کے آدمیوں نے میرے قریب آنا چاہا۔ سب سے پہلے قریب پہنچنے والے کی چھاتی پر میری زوردار لات پڑی اور اس کے ساتھ ہی میں نے کوٹ کی جیب سے گلاک نکال کر لہراتے ہوئے دھاڑا......

''اگر کوئی قریب آیا تو جان سے جائے گا......'' یہ کہتے ہی میں پردے کے پیچھے گھستا چلا گیا۔ باہر شور مچ گیا تھا۔ پتا نہیں لوگ کیا کہہ رہے تھے۔ کوئی چیخ چیخ کر لوگوں کو سب اچھا ہے کی تسلی دے رہا تھا۔ میں تو پردے کے پیچھے موجود وجود کی طرف متوجہ تھا۔ سو فیصد وہی تھی۔ میری پلوشہ، میری جانِ حیات مگر پہلے سے بہت بدلی ہوئی۔ وہ پہلے والی پلوشہ لگ ہی نہیں رہی تھی۔ صرف ایک چیز جو اس کے جسم پر پہلے سے بہتر نظر آرہی تھی وہ اس کے بال تھے جو اب کندھوں سے نیچے تک جھول رہے تھے، مگر ان ریشمی بالوں کی بھی بری حالت تھی، الجھے ہوئے، روکھے اور بے رونق شاید ان میں کئی ہفتوں سے کنگھی نہیں کی گئی تھی۔ اس کے سرخ و سفید قندھاری اناروں کے مشابہ گال پچک کر اندر کو دھنس گئے تھے۔ موٹی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا گداز جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آرہا تھا۔ مجموعی طور پر اس نے ایسا حلیہ بنایا ہوا تھا جیسا بھیک مانگنے والی عورتوں کا ہوتا ہے۔ یقیناً اسے نہائے ہوئے بھی کئی ہفتے گزر گئے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹ کپکپائے اور اس نے جلدی سے اپنی اوڑھنی چہرے پر لپیٹ لی۔ایک ادھیڑ عمر عورت نے اس کی پیٹھ کے پیچھے بیٹھ کر اسے سہارا دیا ہوا تھا۔ویران آنکھوں میں نمودار ہونے والے پانی کو وہ روک تو نہیں سکی تھی، البتہ چھپانے کے لیے اس نے چہرہ نیچے جھکا لیا تھا۔

''بھائی صاحب!......آپ...........'' کسی مرد نے مجھے واپس لے جانے کے لیے بازو سے پکڑنا چاہا تھا۔ میں ایک دم گھوما، اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میرا بھرپور مکہ اس کی کنپٹی پر لگا، وہ اچھل کر نیچے گرا اور ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔اس کے ساتھ ہی میں دھاڑا......

''کہا نا اگر کوئی قریب آیا تو جان سے جائے گا۔''

''ذیشان بھائی!......بات تو سنیں۔'' قابل خان اندر داخل ہوا۔

''بکواس بند کرو قابل خان!......اور دور ہو جاؤ میری نظروں سے، میں تمھارا منحوس چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا۔'' پلوشہ کی موت کی جھوٹی خبر اسی نے تو ہم تک پہنچائی تھی......ہمیں حقیقت سے بے خبر رکھنے والا وہی تو تھا......

''میری بات تو سن لو......'' اس نے مجھے منانے کی کوشش کی۔

''نہیں سننا تمھاری کوئی گھٹیا بات۔'' یہ کہتے ہی میں نے گھٹنوں کے بل پلوشہ کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پستول جیب میں ڈالا اور اس کے بازوؤں سے تھام لیا۔اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

''میری طرف دیکھو۔'' نہ جانے اس وقت میری آواز، کن کیفیات کا مجموعہ بن گئی تھی، غصہ، درد، پریشانی، پشیمانی، اذیت، حیرانی......پتا نہیں اور بھی کون کون سے احساس میرے لہجے میں شامل تھے۔

''م......مم......میں آپ کو نہیں جانتی۔'' کوئل سی آواز میں وہ منمنا کر رہ گئی تھی۔

''صحیح کہا۔'' میں بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔''اگر جانتی ہوتیں تو یقیناً یوں نہ کرتیں۔''

''مم......میں...........'' اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی، میں نے دھاڑتے ہوئے قطع کلامی کر کے کہا۔

''خاموش، تمھاری بکواس نہیں سننا چاہتا، چلو میرے ساتھ۔''

وہ جھرجھری لیتے ہوئے کانپی اور اس کے ساتھ ہی اس نے دائیں بائیں پڑی دو بیساکھیاں پکڑ لیں۔میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔''کیا وہ معذور ہو گئی تھی؟'' یقیناً یہی بات تھی ورنہ اسے چھپنے کی ضرورت ہی کیوں پیش

آتی۔اس سے پہلے کہ وہ بیساکھیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کرتی، میں نے دونوں بیساکھیاں اس کے ہاتھ سے چھین کر دور پھینک دیں۔اگلے ہی لمحے وہ میرے مضبوط بازوؤں میں تھی۔وہ پہلے بھی مجھے پھول کی طرح لگا کرتی تھی، اس وقت تو اس کے جسم پر گوشت کا نام ونشان ہی نہیں تھا۔نرا ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ہوئی تھی۔اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی ناگوار بو بھی مجھے مشک وعنبر سے زیادہ بھینی بھینی لگ رہی تھی۔اس کی ہڈیوں کی سختی ریشم و کم خواب سے بھی ملائم محسوس ہو رہی تھی۔رومانہ جیسی پرکشش لڑکی کی بے تحاشا محبت بھی میرے دل سے اس کی چاہت دور نہیں کر سکی تھی۔وہ آج بھی پہلے دن کی طرح میرے دل کے سنگھاسن پر براجمان تھی، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی محبوب ہو گئی تھی۔

اسے سینے سے لپٹائے میں نے پنڈال کے عقبی رستے کی طرف قدم بڑھا دیے۔قابل خان وہیں کھڑا پشیمان نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔باقی لوگوں کو اس نے آرام سے بیٹھنے کا مشورہ دے دیا تھا۔میں پنڈال سے باہر نکلا میرا رخ بیٹھک کی جانب تھا۔اپنے نحیف بازو میرے گلے میں ڈال کر وہ میرے کندھے پر سر ٹیکے آنسو بہا رہی تھی۔میں خاموشی سے چلتا رہا۔

ساؤنڈ سسٹم پر خوشحال خان کی آواز ابھری وہ لوگوں کو آرام سے بیٹھنے کا مشورہ دے کر محفل جاری رہنے کا پیغام سنا رہا تھا۔میں بس پلوشہ کے وجود کو محسوس کرتا ہوا بیٹھک کی طرف بڑھتا رہا۔وہاں بیٹھک میں چند اور مہمانوں کا بھی بسیرا تھا۔لیکن اندر داخل ہوتے ہی میں نے بیرونی دروازہ کنڈی کر دیا تھا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ہماری تنہائی میں مخل ہو۔ان مہمانوں کو قابل خان اور خوشحال خان خود ہی سنبھال لیتے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے بڑے آرام سے پلوشہ کو ایک چارپائی پر لٹایا۔اس کا جسم اب تک ہولے ہولے لرز رہا تھا۔میری چھاتی اس کے آنسوؤں سے گیلی ہو گئی تھی۔جانے وہ خوشی کے آنسو تھے یا اپنے معذوری پر دکھ کے اظہار کے لیے بہائے گئے تھے۔

اس کے سر کی جانب بیٹھتے ہوئے میں نے اس کا سر اپنے زانو پر منتقل کیا اور صدیوں کی پیاسی نگاہوں کو اس کی دید سے سیراب کرنے لگا۔اس کی آنکھیں بند تھیں۔اور وہ بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔

میں نے اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں تھی، بس اسے محسوس کرتا رہا۔میں اس وقت کی کیفیات کو بیان

کرنے سے یقیناً قاصر ہوں۔اس وقت خوش تھا،اس سے سخت خفا تھا، پریشان تھا،اس کی معذوری کو دیکھ کر دکھی تھا یا شاید میرے دماغ میں ان سب سے ہٹ کر کچھ چل رہا تھا۔

بہت سی دیر گزر گئی پھر اس کی کراہتی ہوئی آواز مجھے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔''راجو! مجھے معاف کر دو، میں مجبور تھی۔''

''کبھی نہیں، زندگی بھر معاف نہیں کروں گا۔تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ معافی طلب بھی کر سکو۔'' پتا نہیں میرے لہجے سے غصہ جھلک رہا تھا یا سخت ناراضی......

وہ کراہی۔''راجو، اب میں آپ کے کسی کام نہیں آسکتی تھی، نرا بوجھ ہی تو تھی ایسا بوجھ بہت جلد تھکا دیا کرتا ہے۔''

''بکواس بند کرو۔میں نے تمھیں جسمانی تسکین کے لیے نہیں اپنایا تھا۔نہ شوہر بیوی کا رشتہ فقط جسمانی تعلقات تک محدود ہوتا ہے۔کیا میرے ساتھ حادثہ پیش آجاتا تو میں تمھارے لیے بوجھ کی حیثیت اختیار کر لیتا۔کیا تمھارا بوجھ قابل خان کو نہ تھکاتا؟......یا وہ مجھ سے زیادہ تمھیں چاہتا ہے۔اتنا بے گانہ پن، اتنی بے حسی......جانتی ہو مجھ پر کیا بیتی، کس طرح میں اپنی موت کا خواہاں رہا۔امی جان اور عدیل کی کیا حالت ہے۔ساری زندگی تم نے ان کا خیال رکھا تو کیا اب وہ بھی تمھارا خیال نہ رکھتے۔چلو میں تو بے حس، بے غیرت اور بے وفا ٹھہرا۔مجھ پر تمھیں اعتبار نہیں تھا اپنی ماں پر بھی اعتبار نہ کیا۔''

اس مرتبہ کوئی جواب دیے بغیر وہ آنسو بہانے لگی۔مجھ سے اس کے آنسو برداشت نہ ہوئے اگلے ہی لمحے میں اس کی پلکوں پر جھک گیا تھا۔

''تم اپنے راجو کے پاس ہو گڑیا، رونا کس بات کا......دیکھو اس شب تاریک کی سحر ہو گئی ہے۔میں آ گیا ہوں نا اب تمھیں آنسو بہانے کی ضرورت نہیں ہے۔پگلی میں ساری زندگی تمھارا خیال رکھ سکتا ہوں۔تمھارا بوجھ ہے ہی کتنا کہ مجھے اٹھانے میں تکلیف ہو گی۔پھول کا وزن تو نہیں ہوتا، خوشبو کب کسی پر گراں گزرتی ہے موسم بہار سے بھی بھلا آدمی تنگ پڑ سکتا ہے، آنکھیں بھی کبھی سرمے کے بوجھ سے تھکی ہیں، خوشیوں نے کبھی کسی کی زندگی اجیرن کی ہے، شبِ وصل کی طوالت بھی کسی کو محسوس ہو سکتی ہے، بتاؤ میری جان بتاؤ۔کیا تمھیں میری

محبت میں شبہ تھا یا میرے خلوص میں کوئی کمی نظر آئی تھی۔''
کوئی جواب دیے بغیر اس نے اپنی باہیں میرے گلے میں حمائل کیں اور جھجکتے ہوئے اپنے لرزتے لب میری پیشانی پر ٹیک دیے۔ان لبوں کی حلاوت میری روح تک میں سرائیت کر گئی تھی۔کوئی بات کیے بغیر وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتی رہی۔
نہ جانے کس وقت گانے بجانے کی محفل اختتام پذیر ہوئی پھر دروازے پر دستک ہونے لگی اور ہوتی رہی مگر میں وہیں بیٹھا رہا۔دستک دینے والے تھک کر لوٹ گئے تھے۔صبح تک اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر میں بیٹھا رہا اور اذان کی آواز سن کر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔نماز کے بعد ایک بار پھر دستک کی آواز سنائی دی میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا وہ قابل خان تھا۔
''قابل خان، میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتا۔''
دروازے پر کھڑے اس نے لجاجت سے کہا'' ذیشان بھائی، میری صرف ایک بات سن لیں۔''
اسے کوئی جواب دیے بغیر میں خاموشی سے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔میری خاموشی سے شہ پا کر وہ گویا ہوا۔
''یہ اس کا اپنا فیصلہ تھا، اس نے مجھ سے قسم لی تھی کہ اگر میں نے اس کے بارے کسی سے بات کی تو وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔میں نے اسے اپنی بہن کہا تھا اور چھوٹی بہن کی بات کو میں کیسے رد کرتا۔البتہ آپ تک تو میں نے بات پہنچا دی ہے نا۔الفاظ میں نہ سہی مگر جو طریقہ بھی اپنایا ہے آپ تک اس کی خبر پہنچ گئی ہے نا۔اب بھی ناراض ہو گے تو زیادتی کا ارتکاب کرو گے۔''
''زنانہ کپڑوں کا ایک صاف جوڑا لے آؤ۔ناشتا ہم تھوڑی دیر بعد کریں گے۔''اس مرتبہ میں نے نارمل لہجے میں کہا۔اس کی بات غلط نہیں تھی۔سارا قصور پلوشہ ہی کا تھا وہ تو بس اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوا تھا۔
میرا نارمل لہجہ سنتے ہی وہ خوشی سے بولا۔''شکریہ ذیشان بھائی۔میں بس ابھی کپڑے لاتا ہوں۔''میں اس کے انتظار میں وہیں دروازے پر ٹھہر گیا۔اس کے گھر کی دیوار بیٹھک سے ملی ہوئی تھی۔دو تین منٹ بعد وہ کپڑوں کا ایک نیا جوڑا لے کر آ گیا۔اس کے ہاتھ سے کپڑے لے کر میں نے دروازہ کنڈی کیا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ خاموش لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں میں بھر کر چارپائی سے اٹھا لیا۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا کہ میں اسے کہاں لے جا رہا ہوں۔ وہ پہلے والی پلوشہ لگ ہی نہیں رہی تھی۔

غسل خانے میں جا کر میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے نہلایا۔ گرم پانی کا ڈرم رکھا ہوا تھا۔ میں نے صابن کی پوری ٹکیہ ہی اس کے جسم پر رگڑ رگڑ کر ختم کر دی تھی۔ وہ محجوب اور شرمائی شرمائی سی خاموشی سے مفعول بنی رہی۔ نہلا کر میں اسے بڑے تولیے میں لپیٹ کر کمرے میں لے آیا نئے کپڑے پہنا کر میں نے اسے دو تین تکیوں سے ٹیک لگا کر بٹھایا اور اس کے بالوں میں خوب تیل چپیڑ کر کنگھی کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر مجھے بے پایاں سکون پھیلا نظر آ رہا تھا۔ کنگھی کرتے ہوئے میں ہولے ہولے گنگنانے لگا......

لٹ الجھی سلجھا جا رے بالم، میں نہ لگاؤں گی ہاتھ رے......

وہ بے ساختہ متبسم ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔

”ہنس کیوں رہی ہو؟“ اس کی ناک کی پھننگ کو میں نے ہولے سے مروڑا۔

”یہ لٹ تو جلد ہی کٹنے والی ہے۔“

”تم ہاتھ لگا کر تو دیکھو......“ کنگھی کر کے میں نے کوشش کی کہ اس کے بالوں کا جوڑا باندھ سکوں مگر مجھے طریقہ نہیں آتا تھا۔ وہ کھلکھلا دی تھی۔ اس کی ہنسی دیکھ کر مجھے لگا جیسے ہر جانب بہار نے ڈیرے ڈال لیے ہوں۔

”اسی لیے تو کہتی ہوں کہ نہ بال ہوں گے اور نہ آپ کو اتنی تگ و دو کرنا پڑے گی۔“

میں اطمینان سے بولا۔ ”تمھاری زلفیں سنوارنے کے لیے کوئی ملازمہ رکھ لوں گا۔“

”ایک بات مانیں گے۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھی۔

میں شرارتی لہجے میں بولا۔ ”اس قابل تو نہیں ہو کہ تمھاری کوئی بات مانی جائے لیکن سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے امید بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ دوسری شادی کر لیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اطمینان بھرے انداز میں سر ہلا دیا تھا۔

”میں مذاق نہیں کر رہی۔“

میں نے ایک دم دھما کا کیا۔’’میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔‘‘

’’کیا......‘‘اس کے چہرے پر حیرانی ابھری۔’’کب، کس سے؟‘‘

’’اسی سے جو تمھیں بالکل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔‘‘

’’اس کے لیے دوبارہ کشمیر کی سرحد عبور کر لی۔‘‘وہ ایک لمحے میں رومانہ تک پہنچ گئی تھی۔ مجھے اس کے لہجے میں دکھ کی جھلک نظر آئی تھی۔

’’نہیں۔‘‘میں نے نفی میں سر ہلایا۔’’مجھے لگتا ہے مجھے زبردستی ہی وہاں بھیجا گیا اور اس کا میری زندگی میں آنا قدرت نے طے کر دیا تھا۔‘‘

اس مرتبہ وہ خاموش رہی تھی۔ دو تین لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد میں اپنے آخری مشن کی تفصیلات اس کے سامنے بیان کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی ......آخر میں میں کہہ رہا تھا۔’’پلوشے کیا تمھیں نہیں لگتا کہ مجھے اس تک زبردستی بھیجا گیا تھا۔ تمھاری موت کا ڈراما، جینیفر کے بار بار شادی کی آفر کرنے پر بھی میرا انکار کر دینا، یوں انڈیا کی جانب میرا اپھسل کر گرنا اور پھر بغیر کسی ارادے کے وہاں پہنچنا۔ اور اب دیکھو جیسے ہی اس سے شادی ہوئی تم بھی مجھے واپس مل گئی ہو۔ کیا یہ تمام باتیں ظاہر نہیں کرتیں کہ اس شادی میں میری مرضی سے زیادہ قدرت کی منشا شامل تھی۔‘‘

’’راجو، صفائیاں کیوں رہے ہیں میری جان۔ مجھے بالکل بھی برا نہیں لگا۔‘‘اس نے بے اختیار ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ دوراز ے پر دستک ہوئی اور میں اس کے ہاتھ کو لبوں سے لگا کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ قابل خان ناشتا لیے کھڑا تھا۔ میں نے ایک طرف ہو کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ خاموشی سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ناشتے کے برتن میز پر رکھ کر اس نے پلوشہ کے سر پر ہاتھ رکھا جو قابل خان کو دیکھتے ہی سر پر دوپٹا ٹھیک کرنے لگ گئی تھی۔

’’میری بہن کتنی پیاری لگ رہی ہے۔‘‘ قابل خان شفقت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔’’بھیا آپ نے میری ساتھ گہری چال چلی ہے۔‘‘

’’نہیں کوئی چال بھی نہیں چلی۔‘‘قابل خان صاف مکر گیا تھا۔’’تم نے خود کہا تھا کہ ذیشان کا ذکر تمھارے

سامنے نہ کروں اور نہ تمھارے بارے ذیشان کو کچھ بتاؤں۔ پوچھ لو کیا اسے تمھارے بارے اطلاع دی ہے۔"

"مجھ پر بار بار زور کیوں دے رہے تھے کہ ان گلوکاروں کی موجودی میں میں گانا سناؤں۔ یہاں تک کہ سکینہ کو بھی آپ نے مجھ پر دھونس جمانے کا کہا۔" سکینہ قابل خان کی بیٹی کا نام تھا جو قریباً پلوشے کی ہم عمر ہی تھی۔

قابل خان نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔"وہ تو تمھاری زبان سے یہ گیت سن کر مجھے بہت اچھا لگا تھا، میں نے کہا دوسرے لوگ بھی سن لیں کہ میری بہن کتنا اچھا گاتی ہے۔اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ذیشان بھائی آپ کی آواز کو پہچان لے گا۔"

"اچھا مذاق ہے۔" پلوشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔لیکن اس کی آواز سے خفگی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

"تم پاگل ہو، یقین کرو اگر میں ایسا نہ کرتا تو شاید تم چند ماہ ہی مزید گزار پاتیں اس کے بعد سچ مچ سپوگمائے کے پہلو میں قبر کھودنا پڑ جاتی۔" یہ کہتے ہی اس نے ایک بار پھر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔کہ......"ذیشان بھائی، کھانے پینے کی طرف یہ بالکل ہی توجہ نہیں دیتی ہے۔"

"فکر نہ کرو دوست ۔"اطمینان بھرے انداز میں کہتے ہوئے میں نے برتن اٹھا کر چارپائی پر رکھے اور خود اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔وہ خاموشی سے میرے ہاتھ سے ناشتہ کرنے لگی۔

"امی جان کیسی ہیں؟"وہ ناشتے کے بعد پوچھنے لگی۔

"بڑے افسوس کی بات کہ اب وہ تمھاری امی نہیں رہیں۔"

"کک......کیا ہوا؟" میری بات کا اس نے کوئی دوسرا مطلب لیا تھا۔

میں اطمینان سے بولا۔"مطلب یہ کہ اب وہ میری امی بن گئی ہیں۔"

اس نے منھ بنایا۔"تو ساس ماں کی جگہ ہی ہوتیں ہیں۔"

"نہیں جی سچ والی امی جان بن گئی ہیں۔انھوں نے ابو جان سے شادی کر لی ہے۔"میں نے دھماکا کیا۔

"م......مگر کیا ایسا ہو سکتا ہے۔"اس کی حیرانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔

"بالکل ہو سکتا ہے،مولوی صاحب سے مشورے کے بعد ہی یہ بابرکت کام سرانجام پایا ہے۔"

پلوشہ کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔"کتنی بڑی خوش خبری سنائی ہے راجو۔"

میں نے حماقت کا ارتکاب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم ہوتیں تو ضرور اس شادی میں رقص کرتیں ہیں نا......''

اس کے ہونٹوں سے تیز سسکی برآمد ہوئی اور اس نے سر جھکا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے نکلنے والوں آنسوؤں نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ میں تڑپ کر آگے بڑھا اگلے ہی لمحے وہ میری آغوش میں تھی۔

''تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ بھروسا رکھو میری جان میں تمھارا علاج کراؤں گا۔ تم ایک بار پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ویسی ہی بن جاؤ گی۔''

''یہ ممکن نہیں ہے راجو......ڈاکٹروں کی طرف سے صاف جواب سن کر ہی میں نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔ جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ اب مجھے ساری زندگی وہیل چیئر یا بیساکھیوں کے سہارے زندگی گزارنا پڑے گی تبھی میں نے قابل بھائی کو کہا تھا کہ میری موت کی خبر آپ تک پہنچا دے۔''

''پشاور کے ڈاکٹروں کی بات حرف آخر نہیں ہو سکتی چندا، طب کی دنیا میں آئے روز کئی معجزات رونما ہوتے ہیں۔ مجھے اپنے رب پر پورا بھروسا ہے کہ میری گڑیا بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔'' میں اسے آغوش میں بھر کر تسلیاں دیتا رہا۔ پھر اس کا ذہن بٹانے کے لیے میں اس کی کہانی سننے لگا۔ اس نے بھی کم و بیش وہی باتیں بتائیں جو اس سے پہلے مجھے سردار بتا چکا تھا۔ بس اتنا اضافہ کیا کہ جب اسے ہسپتال لے جایا گیا تو ڈاکٹروں نے اس کے باقی زخموں کا تو علاج کر دیا تھا لیکن ریڑھ کی ہڈی پر لگنے والی چوٹ کے بارے وہ تشویش میں مبتلا تھے۔ اور جب تمام ٹیسٹ وغیرہ کر لیے تو انھوں نے صاف جواب دے دیا تھا کہ پلوشہ کا ٹھیک ہونا ممکن نہیں تھا۔ وہ آپریشن کر کے اس کی ٹانگوں میں ہونے والی ہلکی سی حرکت کو بالکل ختم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ دوائیوں کے استعمال سے اس کی کمر کی تکلیف آہستہ آہستہ کم ہو جائے گی مگر وہ چل نہیں سکے گی۔ اس کے کمر سے نیچے کا حصہ بے کار ہو گیا تھا۔ ٹانگوں میں بس ذرا سا احساس بیدار تھا کہ جس کی وجہ سے وہ بہ مشکل زمین پر ٹانگیں لگا کر دو بیساکھیوں کی مدد سے تھوڑی بہت حرکت کر لیتی تھی۔ قابل خان نے اس کی فطرتی ضروریات کی بجا آوری میں مدد دینے کے لیے ایک عورت ملازمہ رکھ چھوڑی تھی۔ اس کا ارادہ یہی تھا کہ کبھی میرے سامنے نہیں جائے گی۔ اور عدیل کے بڑا ہونے کا انتظار کرے گی جونہی وہ کسی قابل ہوا اسے وزیرستان میں بلا کر اسی کے پاس منتقل ہو جائے گی۔

وہ بہ مشکل اپنی کہانی سنا کر فارغ ہوئی تھی کہ خوشحال خان وہاں پہنچ گیا۔اس نے بھی قابل خان سے ملتی جلتی بات کر کے معذرت طلب کی تھی۔

مزید کسی گلے شکوے کے بجائے میں نے اپنا مطمح نظر بیان کیا۔''اچھا مجھے گھر تک جانے کے لیے کوئی کار وغیرہ کرائے پر مل جائے گی؟''

خوش حال خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''ٹانک تک قابل خان آپ کو اپنی کار میں چھوڑ آئے گا آگے جانے کے لیے وہاں سے کرایہ کی کار کا بندوبست کرنا پڑے گا کیوں کہ ہماری گاڑیوں کے کاغذات وغیرہ نہیں ہوتے۔''

''میں ابھی جانا چاہوں گا۔''مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو پا رہا تھا۔

خوش حال خان سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔تھوڑی دیر بعد ہم قابل خان کی کار میں وانہ کا رخ کر رہے تھے ۔وانہ تک ہمیں شام ہو گئی تھی وہاں سے ٹانک تک پہنچتے ہوئے رات کے بارہ بج چکے تھے۔میں عقبی نشست پر پلوشہ کا سر اپنی گود میں لیے بیٹھا تھا۔اسے آرام پہنچانے کی غرض سے اس کی کمر کے نیچے میں نے نرم وملائم کورین کمبل بچھا دیا تھا۔

ٹانک سے تلہ گنگ کے لیے میں نے خصوصی کار کرائے پر لی اور قابل خان کو الوداع کہہ کر ہم چل پڑے۔دوپہر دس بجے کے قریب ہم گھر کے سامنے اتر رہے تھے۔ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے میں نے کمبل میں لپیٹ کر اس کے ہلکے پھلکے وجود کو اٹھایا اور گھر میں داخل ہو گیا۔دسمبر کی آمد ہو چکی تھی ابو جان صحن میں چارپائی ڈال کر دھوپ سینک رہے تھے۔امی جان اور پھوپھو دوسری چارپائی پر بیٹھی تھیں۔امی جان اب اچھی خاصی پنجابی بول لیتی تھیں۔روما بغیر چھت کے کھلے باورچی خانے میں گھسی چائے وغیرہ بنا رہی تھی۔مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر تمام میری جانب متوجہ ہو گئے تھے۔انھوں نے میرے بازوؤں میں موجود پلوشہ کے وجود کو حیرانی سے دیکھا تھا۔پلوشہ نے میری چھاتی میں سر چھپایا ہوا تھا۔

قریب پہنچتے ہی میں نے کہا۔''امی جان جگہ دیں۔''

پھوپھو جان اور امی جان نے فوراً ہی چارپائی خالی کر دی تھی۔میں نے جھک کر آہستگی سے پلوشہ کو چارپائی

پرلٹایا اس کا چہرہ نظر آتے ہی امی جان کے منھ سے زوردار چیخ نکلی۔

''میری پلوشے۔'' وہ بے ساختہ اس سے لپٹ گئی تھی۔ روما بھی حیران ہو کر باورچی خانے سے نکل آئی تھی۔ وہ جذباتی ملاپ کافی دیر جاری رہا۔ پلوشہ کو دیکھ کر بھی مجھے روما کے چہرے پر پریشانی کے بجائے خوشی ہی نظر آئی تھی۔ بلاشک وشبہ وہ نہایت ہی مخلص لڑکی تھی۔ اسی اثناء میں عدیل بھی آدھی چھٹی پر گھر پہنچ گیا تھا۔ اپنی باجی کو دیکھ کر وہ خوشی سے باؤلہ ہو گیا تھا۔ ہمارے گھرانے کو ایک بار پھر بہت بڑی خوشی ملی تھی۔

ظہر کی اذان سن کر ہمیں وقت کا گزرنے احساس ہوا۔ میں اور ابو جان مسجد کی طرف بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

سہ پہر کو صحن میں سایہ اترتے ہی میں نے پلوشہ کو گود میں اٹھایا اور اسی کمرے لے جا کر سلا دیا جو جانے کب سے اپنے مکین کے لیے چشم بہ راہ تھا۔

سیج کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر رونے لگی تھی۔

''پاگل نہیں بنتے گڑیا۔'' میں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا۔

روما نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما۔ اور پر خلوص لہجے میں بولی۔ ''میری چھوٹی سی بہن بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

رات کو وہ مصر ہوئی کہ میں روما کے ساتھ جا کر سو جاؤں۔

میں اطمینان سے بولا۔ ''ایک دن تمھارے ساتھ اور ایک دن اس کے ساتھ۔''

وہ کراہی۔ ''میں آپ کے کس کام کی۔''

''گڑیا، بکواس کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں۔'' اسے ڈانٹ کر میں اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ رات بھر میں اس سے باتیں کرتا رہا تھا۔ صبح سویرے میں یونٹ جانے کے ارادے سے گھر سے نکل آیا تھا۔ سردار اور باقی دوستوں کو مل کر میں نے پلوشہ کی زندگی کی خبر دی تمام حیران رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر ان سے گپ شپ کر کے میں نے پلوشہ کی سک رپورٹ (فوجی کی فیملی وغیرہ کے علاج کے لیے بننے والا سرکاری فارم) بنوائی اور واپسی کی راہ لی۔

رات کو میں روما کے ساتھ تھا۔ مگر گھنٹا بھر میرے ساتھ گزار کر وہ پلوشہ کے کمرے میں گھس گئی اور بقیہ رات

اس کے ساتھ گزاری۔ایک دن میں وہ پلوشہ کے بہت قریب آگئی تھی۔ پلوشہ ذرا چڑچڑی اور خفا خفا لگتی تھی۔مگر روما بغیر ناک بھوں چڑھائے زبردستی اس کی خدمت میں لگی رہی۔اب پلوشہ کو سنبھالنے والے کئی موجود تھے۔ قابل خان اس کے ساتھ جتنا بھی مخلص ہوتا اس کی ایسی خدمت نہیں کروا سکتا تھا۔اس کی سگی ماں جو اس پر جان چھڑکتی تھی، پھوپھو جان جسے اس نے پہلے ہی دن سے اپنی ساحرانہ شخصیت کے زیر اثر کر لیا تھا، مخلص رومانہ جو اس کی زندگی کی خبر پا کر اتنا ہی خوش نظر آرہی تھی جیسے پلوشہ اس کی سگی بہن ہی تو ہو اور پھر میں خود کہ میرے لیے وہ سانس جتنا ہی اہم تھی۔

اگلے دن میں نے اویس سے اس کی کار مانگی کیوں کہ اب مجھے پلوشہ کے ساتھ بار بار ہسپتال جانا پڑتا۔ پلوشہ کے ساتھ امی جان اور پھوپھو بھی چل پڑی تھیں۔روما نے بھی ساتھ چلنے کی خواہش کی مگر میں نے اسے منع کر دیا کہ گھر میں بھی کسی کی موجودی تو ضروری تھی۔ایم ایچ راولپنڈی علاج کی جدید سہولیات سے مزین ہسپتال ہے۔اگلے ایک دو ہفتے پلوشے کے مختلف ٹیسٹ ہوئے۔مجھے کافی امید تھی لیکن جب ڈاکٹروں نے تمام رپوٹیں دیکھیں تو نفی میں سر ہلا کر ناکامی کا اظہار کر دیا۔میرے دل میں جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی۔کیا اب میں اپنی پلوشے کو کبھی چلتے ہوئے نہ دیکھ پاتا، کیا اب وہ ہمیشہ محتاجی کی زندگی گزارتی رہتی، کیا چارپائی اس کا نصیب بن گئی تھی۔

میرے چہرے پر چھائی مایوسی دیکھ کر اس نے سر جھکایا اور اس کی پیاری آنکھوں سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگے۔میرا دل جیسے غم سے بھر گیا تھا۔گھر جا کر میں نے اسے کمرے میں لٹایا، لیکن میرے پاس اسے تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ موجود نہیں تھا۔روما ساتھ بیٹھ کر اس کی دل جوئی میں لگ گئی تھی۔

میں دل گرفتہ سا گھر سے نکل آیا۔اویس کے پاس جا کر میں اسے اپنا دکھ سنانے لگا۔میں اپنی پلوشے کی حالت پر رو رہا تھا۔باتوں باتوں میں وہ کہنے لگا۔

”یار، ویسے ضروری تو نہیں کہ پاکستان میں علاج نہ ہو سکے تو باہر کے ڈاکٹر بھی ناکام ہو جائیں۔“

اس کی بات سن کر ایک دم میرے دماغ میں جینیفر کی صورت ابھری اگلے ہی لمحے میں موبائل فون نکال کر اس کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے گویا امریکہ میں صبح سات بجے کا وقت ہونا تھا۔

دوسری تیسری گھنٹی پر جینی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔”ذی، اتنا سویرے کیوں کال کی۔“

میں نے سب سے پہلے اس کے کانوں میں خوش خبری انڈیلی۔ ”جینی، جانتی ہو پلوشہ زندہ ہے۔“

”کیا، کیسے، سچ، مبارک ہو۔“ اس کی آواز سے غنودگی غائب ہو گئی تھی۔

”ہاں جینی، مگر اس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے میں اس کی ریڑھ کی ہڈی میں گہری چوٹ لگی ہے اب وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتی ہے۔ یہاں پاکستان میں ڈاکٹروں نے اس کے علاج سے جواب دے دیا ہے۔“

اس نے مخلصانہ مشورہ دینے میں ایک لمحہ نہیں لگایا تھا۔ ”ذی، اسے امریکہ لے آؤ، مجھے امید ہے وہ ٹھیک ہو جائے گی، بلکہ ایسا کرو تم فوراً ہی اس کی رپورٹس کی تصاویر بنا کر مجھے ”وٹس اپ“ کر دو میں یہاں ماہرین سے مشورہ کرتی ہوں۔“

میں بس دس منٹ میں تمام رپورٹوں کی تصاویر بھیج دیتا ہوں۔“ پرجوش انداز میں کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کیا اور گھر کی طرف بھاگ پڑا۔ اویس مجھ سے پوچھتا رہ گیا تھا کہ میں نے انگریزی میں کیا ”گٹ مٹ“ کی ہے مگر میرے پاس اس کے سوال کا جواب دینے کا وقت نہیں تھا۔ گھر جاتے ہی میں نے موبائل فون کے کیمرے سے تمام رپورٹس کی تصاویر بنائیں اور جینی کو بھیج دیں۔ اب مجھے اس کے جواب کا انتظار تھا۔

☆......☆......☆

دو دنوں بعد ہی جینی نے کال کر کے بتا دیا کہ ڈاکٹر سو فیصد تو نہیں البتہ کافی پرامید ہیں۔ باقی حتمی فیصلہ وہ ایکسرے رپوٹس اور مریض سے مل کر کریں گے۔ میں نے فوراً ہی امریکہ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ پہلے مرحلے میں تو میں نے یونٹ جا کر کمانڈنگ آفیسر سے مل کر ساری صورت حال ان کے سامنے رکھ دی۔ پہلے والے کمانڈنگ آفیسر ملک عرفان صاحب چلے گئے تھے۔ ان کی جگہ سیکنڈ ان کمانڈ وسیم صاحب نئے کمانڈنگ آفیسر بنے تھے۔ میرا مسئلہ سنتے ہی انھوں نے میری دو ماہ اور چھٹی کر دی تھی اور اس کے ساتھ ہی انھوں کہہ دیا کہ اگر مزید بھی ضرورت ہوئی تو وہ مجھے چھٹی ضرور دیں گے۔ پاک آرمی میں ویسے تو زیادہ سے زیادہ اکٹھی چھٹی دو ماہ کی مل سکتی ہے، البتہ کسی خصوصی معاملے میں چھ مہینے اور سال تک بھی کمانڈنگ آفیسر اپنے جوان کو چھٹی پر رکھ سکتا ہے۔ پلوشہ کا پاسپورٹ بنانے سے پہلے شناختی کارڈ بنانے کا مرحلہ تھا۔ وہ مشکل سے ابھی اٹھارہ سال کی

ہوئی تھی۔اس ضمن میں میجر اورنگ زیب صاحب اور وسیم صاحب نے میری بڑی مدد کی تھی۔میں نے دونوں بیویوں کے شناختی کارڈ بنوا لیے تھے۔میجر اورنگ زیب نے ہنستے ہوئے کہا تھا......

''یار، تمھیں شادی کرنے کے لیے پاکستان میں کوئی لڑکی نہ ملی۔''

اس کی بات واقعی حقیقت تھی کیوں کہ روما کا تعلق مقبوضہ کشمیر سے تھا، پلوشے وزیرستان کی تھی، گلگارے کا تعلق افغانستان سے تھا تو جینیفر امریکن تھی۔

میں مزاحیہ انداز میں بولا۔''سر!......ایک شادی گاؤں سے بھی کی تھی جس کی وجہ سے اب تک سر جھکا ہوا ہے۔''

انھوں نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔''غلطی اس کی تھی، تمھارا سر کیوں جھکا ہوا ہے۔''

میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔''سر!...... ہمارے ہاں عورت کی بے راہ روی مرد کے کھاتے میں جاتی ہے۔''

''جانے دو یار گزری باتوں کو، اس کے بدلے اللہ پاک نے تمھیں دو بیویاں دے دی ہیں۔یقین مانو ہم تو ترستے ہی رہے ہیں دوسری شادی کے لیے۔''

میں نے موبائل فون جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔''میرا خیال ہے تہمینہ باجی کو کال کرنا پڑے گی۔''

''یہ دیکھ رہے ہو۔''انھوں نے دونوں ہاتھ جوڑے۔''آفیسر میں آپ کے لیے ہوں یار۔''اور میں مسکراتا ہوا ان کے آفس سے باہر آ گیا۔

میری ان ساری کارروائیوں سے پلوشے ناواقف نہیں تھی۔غیر متوقع طور پر وہ پرسکون ہو گئی تھی۔روما اور اس کی خوب بن رہی تھی۔روما کے خلوص کے سامنے اس ہٹ دھرم نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ایک دن میں پلوشہ کے کمرے میں داخل ہوا تو اسے روما سے کشمیری زبان میں بات کرتے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔مختلف زبانوں کو سیکھنے کی اس میں خاص صلاحیت موجود تھی۔

''جب روما اردو میں بات کر سکتی ہے تو کشمیری سیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔''میں پلوشہ کو چھیڑے بنا نہیں رہ پایا تھا۔

وہ اطمینان سے بولی۔ ”تاکہ آپ کی موجودی میں ہم خفیہ باتیں کرسکیں۔“

”اچھا مجھ سے بھی کچھ چھپاتی ہو۔“ اس کی ناک کی پھننگ کو پکڑ کر میں نے آہستہ سے مروڑا۔

وہ جھٹ بولی۔ ”جی ہاں، بہت ساری باتیں۔“

”گندی بچی۔“ میں اس کے ماتھے پر جھک گیا۔ یوں بھی تمام گھر والے بشمول اس کے چھوٹے بھائی عدیل کے ہر وقت اس کی دل جوئی میں لگے رہے تھے۔ حقیقی معنوں میں وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اس ضمن میں روما تو حد ہی عبور کر جاتی تھی۔ شاید سگی بہن بھی پلوشے کے اتنے نخرے برداشت نہ کرتی جو روما کرتی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ سوکنیں ہیں۔ اور ایسا روما کے خلوص کی وجہ سے ممکن ہو پایا تھا۔ ورنہ پہلے دنوں میں پلوشہ اس سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ میں ایک دن پلوشہ کے ساتھ ہوتا اور دوسرے دن روما کے ساتھ۔ اور اپنی باری پر روما میرے ساتھ گھنٹا ڈیڑھ بتا کر پلوشہ کے کمرے میں گھس جاتی۔ اس کے بعد رات بھر وہ گپیں ہانکتیں یا سگی بہنوں کی طرح اکٹھے سو جاتی تھیں۔

ایک رات میں نے روما کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”جانتی ہو اگر مجھے پتا ہوتا کہ تمھارا دل تمھارے چہرے سے بھی زیادہ خوب صورت ہے تو پہلی ہی بار تمھیں شوہر سے طلاق دلوا کر ساتھ لے آیا ہوتا۔“

وہ ناز سے بولی۔ ”جھوٹے اجنبی، جھوٹ بولنا کب چھوڑیں گے۔“

میں مسکرایا۔ ”اچھا اب بھی اجنبی ہوں۔“

وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ”ہمیشہ رہیں گے۔“

میں نے اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر چھیڑا۔ ”جب یہ آجائے گا تب بھی۔“

وہ مجھے چڑاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں...... بھول گیا ہے جب میں نے پہلی بار نام پوچھا تھا تو جناب نے کیا فرمایا تھا کہ آپ مجھے اجنبی کہہ سکتی ہو۔ اب وہی اجنبی کہوں گی۔“

”اگر میں معذرت کروں تو......؟“

”یہ معذرت وغیرہ اپنے پاس رہنے دیں۔ اور میں خفگی سے نہیں کہتی ایسا کہنا مجھے اچھا لگتا ہے ہمیشہ اجنبی کے نام ہی سے آپ کو سوچا ہے۔“ قریب ہو کر اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ اور میں آہستہ آہستہ اس کی

ریشمی زلفوں میں ہاتھ پھیرتا رہا۔

☆......☆......☆

شناختی کارڈ کے بعد میں نے پلوشے کا پاسپورٹ بنوایا اور امریکن ایمبسی میں ویزے کی درخواست دے دی۔ جینی نے اپنے تعلقات بروے کار لاتے ہوئے دو تین دن کے اندر ہم دونوں کا ویزا لگوا دیا تھا۔ یوں بھی ہم علاج کے سلسلے میں امریکہ جا رہے تھے جس کی وجہ سے کوئی خاص رکاوٹ سامنے نہیں آئی تھی۔ ایک دن ہم دونوں ہوائی جہاز میں بیٹھ رہے تھے۔ طویل پرواز کے بعد ہم نیویارک ائیرپورٹ پر اترے جینی اپنے شوہر کے ہمراہ ہماری منتظر تھی۔ شوہر کی موجودی کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے گلے سے لگ کر بے باکی سے میرے دونوں گالوں کو چوما اور پھر پلوشہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''میری بے بی کیسی ہے۔'' اس نے وہیل چیئر پر بیٹھی پلوشہ کا چہرہ ہاتھوں میں بھر کر ماتھے پر بوسا دیا۔

پلوشہ معصومیت سے بولی۔ ''ساری رپوٹیں تو راجو نے بھیج دی تھیں۔ اب تک ویسی ہی ہوں۔'' اور جینی کھل کھلا کر ہنس دی۔

اس کے شوہر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ اس نے ایک سیاہ فام سے شادی کی تھی۔ اس کا نام پال کلفٹن تھا۔ میرے ساتھ معانقہ کرتے ہوئے اس نے سرگوشی کی۔

''ذیشان برادر، شکریہ کہ تم نے جینی جیسی حسینہ کو میرے لیے چھوڑ دیا۔'' وہ امریکی تھا اور ان کی تہذیب میں ایسی کوئی بھی رقیبانہ جلن موجود نہیں ہے۔ اپنی بیوی کا مجھ سے لپٹنا اور میرے بوسے لینا اس کے لیے عام روزمرہ تھی۔ اسے یہ شرم نہیں تھی کہ میں اس کی بیوی کا پرانا محبوب تھا بلکہ وہ اس بات پر خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ میں نے اتنی خوب صورت لڑکی کو اس کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

اس کی بے تکلفی کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی ویسا ہی انداز اپنایا تھا۔ ''ویسے اتنے وسیع ملک میں جینی کو تم ہی ملے ہو۔''

''ہا......ہا......ہا۔'' اس نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔ ''جینی کہتی ہے کہ میری شکل تم سے ملتی جلتی ہے۔''

''جینی۔'' میں جینیفر کی طرف مڑا۔ ''اگر اس کی موخّر الذکر بات درست ہے تو یہ بات ہماری دوستی کو ہمیشہ

کے لیے ختم کر سکتی ہے۔''

پال نے ایک اور قہقہہ لگایا۔جینی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔''نہیں شکل کی بات تو میں نے نہیں کی تھی، میں نے کہا تھا کہ پال تمھاری طرح جھوٹ بولتا ہے۔اور اس کا ثبوت یہ ابھی جھوٹ بول کر دے چکا ہے۔''

میں ترکی بہ ترکی بولا۔''جھوٹا ہونا برداشت کر لوں گا۔مگر یہ شکل کی مماثلت والی بات بالکل بھی قابل قبول نہیں ہے۔''

وہاں سے ہم ان کی رہائش گاہ میں پہنچے۔ہماری آمد کا سنتے ہی جینی نے اپنے فرج وغیرہ میں چکن، گائے اور بکرے وغیرہ کا گوشت بھروا لیا تھا۔

پال واقعی ہی اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔اگلی صبح سے ہماری ڈاکٹروں کے پاس آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔میرے استاد کرنل جیمس میتھونی بھی افغان کے محاذ سے انھی دنوں لوٹے تھے۔جیمس صاحب اور جینیفر نے ہر ہر قدم پر میری مدد کی تھی۔ان کے تعلقات میرے بہت کام آئے تھے۔ اس معاملے میں پال بھی پیچھے نہیں رہا تھا۔نیویارک میں رہائش کا مسئلہ یوں بھی جینی کی وجہ سے حل ہو گیا تھا۔جہاں میرے دس روپے خرچ ہوتے وہاں ان لوگوں کی وجہ سے پانچ ہی سے کام نبٹ گیا تھا۔پیسوں کی میرے پاس کمی نہیں تھی۔ایک لاکھ ڈالر تو امریکنوں کے دیے ہوئے میرے اکاؤنٹ میں موجود تھے۔پلوشہ کے علاج کے لیے تو میں اپنی تمام جائیداد بھی بیچ سکتا تھا۔اپنی جان گروی رکھ کر بھی اس کا علاج کروا سکتا تھا۔

ابتدائی رپورٹس دیکھتے ہی ڈاکٹروں نے مجھے امید دلا دی تھی۔اور امریکہ پہنچتے ہوئے ہمیں مہینہ ہونے والا تھا جب پلوشے کی کمر کا آپریشن ہوا۔وہ آپریشن ڈاکٹروں کے ایک پینل نے کیا تھا۔اس میں آرتھوپیڈک، نیرو سرجن، ایل ایس سپائن وغیرہ کے ماہر موجود تھے۔طب کے متعلق میں نہ تو اتنی ٹیکنیکل باتیں میں جانتا ہوں اور نہ ان کے درج نہ کرنے سے کہانی پر کوئی اثر پڑے گا۔بلکہ الٹا یہ باتیں قارئین کی اکثریت کو بور کر دیں گی۔اس لیے میں علاج کی تفصیل سے پہلو تہی کروں گا۔

آپریشن کے متعلق میں نے گھر بات کر کے بھی بتا دیا تھا۔تمام مصروفِ دعا ہو گئے تھے۔نہ جانے کیوں مجھے روما کی دعاؤں پر سب سے زیادہ بھروسا تھا۔اسے میں نے خصوصی طور پر دعا مانگنے کی تاکید کی تھی۔

آپریشن کافی دیر جاری رہا تھا۔اس دوران میں مسلسل ہی آپریشن تھیٹر کے سامنے ٹہلتا رہا۔جینی اور پال بھی میرے ساتھ ہی موجود تھے۔مجھے معلوم تھا کہ جینی نے واپس نہیں جانا تھا۔اس وجہ سے اس کے بجائے میں نے پال کو کہا۔

''میرا خیال ہے آپ کو گھر جا کر آرام کرنا چاہیے۔''

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''پاگل تو نہیں ہوں جو تمھیں جینی کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر چلا جاؤں۔''وہ ماحول وغیرہ دیکھے بغیر ہر وقت ایسے ہی مذاق کرتا رہتا تھا۔

''کیا مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔''

وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔''ہے،مگر جینی پر نہیں ہے۔''

جینی تپتے ہوئے بولی۔''اگر تم اگلے ایک منٹ میں غائب نہ ہوئے تو میں سچ میں ذی کے ساتھ کسی کمرے میں بند ہو جاؤں گی۔''

پال فوراً ہی کان دباتے ہوئے وہاں سے بھاگ پڑا۔جینی مسکراتے ہوئے زیرلب بولی۔''گدھا۔''مجھے بھی ہنسی آگئی تھی۔

اور پھر اللہ کے فضل وکرم اور تمام کی دعاؤں سے پلوشے کا کامیاب آپریشن ہو گیا۔ڈاکٹر نے پلوشہ کو پندرہ دن تو مکمل طور پر بیڈ پر لیٹنے کا حکم دیا تھا۔اس دوران اس کی دواؤں اور دوسری ضروریات کا میں نے ہر لمحہ خیال رکھا تھا۔کبھی کبھی وہ میرا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا کر اس پر اپنے یاقوتی لب رکھ کر رو پڑتی۔اور میں اسے بہلانے لگ جاتا۔

پندرہ دن بعد ڈاکٹر کی ہدایات پر پلوشے نے ڈرتے ڈرتے بیڈ سے اٹھنے کی کوشش کی اور پھر میرا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔اس لمحے اس کے چہرے پر مجھے ویسی ہی خوشی نظر آئی تھی جب مجھ سے نکاح کرتے وقت اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔اور پھر آہستہ آہستہ دو تین قدم لے کر اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال کر رونا شروع کر دیا۔

اس کا سر سہلاتے ہوئے میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔''کہا تھا نا میری گڑیا اللہ پاک کے حکم سے ٹھیک

ہو جائے گی۔'' ڈاکٹر نے مجھ سے مصافحہ کر کے مبارک باد دی۔ میرے بعد جینی نے پلوشہ کو گلے سے لگا کر بہت سا پیار کیا تھا۔

پلوشہ نے فوراً ہی گھر کا نمبر ملا کر تمام کو یہ خوش خبری سنائی تھی۔ مجھ سب سے زیادہ حیرانی اس بات پر ہوئی تھی کہ اس کی کال امی جان نے وصول کی تھی اور انھیں یہ خبر بتانے کے بجائے اس نے سب سے پہلے رومانہ سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اور سب سے پہلے روماہی کو یہ خوش خبری سنائی تھی۔

رات کو میرے بازو پر سر رکھ کر وہ ہولے سے بولی۔ ''راجو جانتے ہوئے آپریشن سے پہلے میں نے کیا دعا مانگی تھی۔''

''بتاؤ ذرا۔'' میں نے دلچسپی ظاہر کی۔

''میں نے کہا یا اللہ پاک، اگر میں ٹھیک ہو گئی تو رومی باجی کو ہمیشہ سپو گمائے جتنا پیار کروں گی۔ اور دیکھ لو اللہ پاک نے میری دعا قبول کر لی۔'' رومانہ کو صرف میں روما کہتا تھا۔ باقی تمام اسے رومی کہہ کر بلاتے تھے۔

''تو اسی لیے سب سے پہلے اسی کو یہ خوش خبری سنائی۔''

''ہونہہ!......'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو اب کیا ارادہ ہے۔''

وہ پر عزم لہجے میں بولی۔ ''ان کی ہر بات مانوں گی، جو کہیں گی عمل کروں گی۔''

☆......☆......☆

اگلے تین ماہ بھی ہم امریکہ ہی میں رہے تھے۔ کیوں کہ آپریشن کے بعد بھی کئی مراحل بقایا تھے۔ اور پھر ایک دن ڈاکٹروں نے ہمیں واپسی کی اجازت دے دی تھی۔ پلوشے اب بڑی حد تک ٹھیک ٹھاک تھی۔ اب اسے کسی کے بھی سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے سال بھر کے لیے اسے وزن اٹھانے، بھاگنے دوڑنے اور مشقت والے کاموں سے منع کیا تھا۔ ان کے مطابق اگلے چند ماہ میں پلوشہ نے بالکل تندرست ہو جانا تھا۔ اور اس کے بعد اسے کسی پرہیز کی ضرورت نہیں تھی۔

رات کے کھانے پر جینی مجھے اداس نظر آئی۔

’’میں نے خلوص دل سے میاں بیوی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کا وہ احسان بھلائے جانے کے قابل نہیں ہے۔‘‘

پال سنجیدگی سے بولا۔’’اگر میرا ذرا سا بھی احسان سمجھتے ہو تو اس کا بدلہ چکاتے ہوئے جانا۔‘‘

’’کیسے؟‘‘ ہر وقت مذاق کرنے والے پال کا سنجیدہ لہجہ مجھے کافی عجیب لگا تھا۔

’’ایک تو جینی کو کہہ دو کہ اپنے موبائل فون کی سکرین پر تمھاری تصویر ہٹا کر میری تصویر لگا دے۔ دوسرا مجھے ایک بے بی چاہیے جبکہ محترمہ نے پانچ سال بعد کی تاریخ دے رکھی ہے، تیسرا یہ دوستوں کی محفل میں تمھاری تعریف نہیں کرے گی، چوتھا نوکری چھوڑ کر میری کمپنی جوائن کرے گی اور آخری اس کے بعد مجھے طلاق دینے کی دھمکی بالکل نہیں دے گی۔‘‘ اس نے سنجیدہ لہجے میں پھلجڑیاں چھوڑیں۔ پلوشے کے منہ سے قہقہے ابل پڑے تھے ۔جبکہ جینی پال کو غصے سے گھورنے لگی۔

’’یہ دیکھو۔‘‘ جینی نے اپنا موبائل فون میری جانب بڑھایا۔ جس پر پال کی مسکراتی ہوئی تصویر نظر آ رہی تھی۔

میں نے موبائل فون کی سکرین پال کی جانب سیدھی کی۔’’یہ کیا ہے برادر۔‘‘

وہ فوراً بولا۔’’یقیناً اس نے ابھی لگائی ہے۔‘‘

میں نے کہا۔’’چلیں ایک بات تو پوری ہوگئی ہے نا۔‘‘

’’ہاں مگر یہ نہ ہو، کہ ادھر تم لوگ جہاز میں بیٹھو اور ادھر میری تصویر بھاپ کی طرف اس سکرین سے اڑ جائے۔‘‘

میں جینی کو مخاطب ہوا۔’’جی!......نوکری والی بات تو تم ضرور مانو گی۔‘‘

جینی نے منہ بنایا۔’’میں کرنل بننے والی ہوں۔‘‘

پال فوراً بولا۔’’جتنی تنخواہ آرمی سے لیتی ہو اس سے دگنی دوں گا۔‘‘ پال خود بہت بڑے بزنس کا مالک تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھے گھر میں اکثر خود کام کرتا نظر آتا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ غیر متوقع طور پر جینی نے حامی بھر لی تھی۔

’’ہرّا......‘‘ پال نے نعرہ بلند کیا۔

میں نے کہا۔ ’’میرا خیال ہے کافی ہو گیا۔‘‘

پال جلدی سے بولا۔ ’’بے بی والی بات۔‘‘

اسے کڑے تیوروں سے گھورتے ہوئے جینی مجھے مخاطب ہوئی۔ ’’ویسے تمھارے مذہب میں ایک مرد چار شادیاں کر سکتا ہے اور تم نے صرف دو کی ہیں۔‘‘ یہ کہتے ہی وہ پلوشے کو بولی۔ ’’کیا خیال ہے پیلا وشہ، مجھے برداشت کر لو گی۔‘‘

پلوشہ مسکرائی۔ ’’اب تو مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔‘‘

پال فوراً ہی پلوشہ کو مخاطب ہوا۔ ’’دیکھو چھوٹی لڑکی، کالا ہو یا گورا بھائی، بھائی ہوتا ہے۔‘‘

جینی اچانک ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔ ’’اچھا ساری شرطیں منظور ہیں، اگر ذی اور پیلا وشہ ہمارے ساتھ ایک ہفتہ اور گزار لیں۔‘‘

ایک دم مجھے محسوس ہو گیا کہ وہ تمام منصوبہ انھوں نے ہمیں چند روز روکنے کے لیے بنایا تھا اور پال یہ جانتے ہوئے بھی کہ جینی مجھ سے محبت کرتی ہے اس منصوبے میں بیوی کا حامی بن گیا تھا۔

میں نے پلوشہ کی جانب دیکھا اسے گھر جانے کی بہت جلدی تھی۔ مگر جینی کی خواہش کو نہیں ٹھکرا سکی تھی۔ منھ بسورتے ہوئے بولی۔ ’’آپ نے مجھے امریکہ تو گھمایا ہی نہیں ہے۔‘‘

’’پیلا وشہ زندہ باد۔‘‘ جینی نے اسے بے ساختہ بانہوں میں بھر لیا تھا۔ اگلا ہفتہ بھی ہم نے ان مخلص میاں بیوی کے ساتھ گزارا۔ ہمارے واپسی کے ٹکٹ بھی انھوں نے کرائے تھے۔ اور پھر ایک دن ہم تحائف سے لدے پھدے گھر واپس لوٹے۔ پلوشہ کو اپنے پاؤں پر چلتے دیکھ کر تمام کے چہرے خوشی سے گلنار ہو گئے تھے۔

واپس آ کر میں نے چند دن گھر گزارنا ضروری سمجھے تھے کیونکہ روما مجھے خوش خبری سنانے والی تھی۔ انھی دنوں گلگارے کی کال بھی مجھے موصول ہوئی۔ پلوشہ کے بارے جان کر وہ خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ اسے اللہ پاک نے اپنی رحمت سے نوازا تھا جس کا نام اس نے پلوشہ رکھا تھا۔ میں پلوشہ کو اس کی کہانی سنا چکا تھا۔ پلوشہ سے کال پر بات کر کے گلگارے نے فوراً ہی اسے گھر آنے کی دعوت دے دی تھی۔ مجبوراً مجھے اگلی چھٹی پر گلگارے کے گھر جانے کا وعدہ کرنا پڑا۔ امریکہ سے واپسی کے ایک ہفتے بعد مجھے اللہ پاک نے بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ جس کا نام

پلوشہ نے عبداللہ رکھا تھا۔اس کی ماں سے زیادہ پلوشہ خوش تھی۔وہ صرف دودھ پینے کے لیے ہی ماں کے پاس جاتا ورنہ ہروقت پلوشہ نے اسے اٹھایا ہوتا۔پلوشہ کے رخساروں کی سرخی لوٹ آئی تھی۔اس کا شاداب جسم پہلے سے بھی صحت مند ہو گیا تھا۔اور لمبے بال تو گویا......

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے

اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

کے مصداق سب پر اپنا جادو چلاتے رہتے تھے۔اسے اب تک بالوں کی مینڈھیاں بنانا نہیں آتی تھیں۔یہ کام روما ہی کو کرنا پڑتا۔وہ اس کے بالوں میں کنگھی کر کے پراندہ باندھ دیتی۔ایک دن میں نے پلوشہ کے سامنے ہی روما کو کہا کہ......

''تم نوکر تو نہیں ہو کہ ہر وقت اس کی خدمت میں لگی رہتی ہو۔اب یہ بچی نہیں رہی اسے خود ہی اپنے بال بنانے چاہئیں۔''

پلوشے بے پروائی سے بولی۔''تو کیا،میں سر پر استرا پھروالوں گی۔''

روما اسے ساتھ لپٹاتے ہوئے بولی۔''میری گڑیا کو ضرورت ہی کیا ہے اپنے کام کرنے کی۔اس کی روما باجی موجود ہے نا۔''رومانہ کو تمام رومی کہتے تھے صرف میں اسے روما کہتا تھا اور وہ بھی میری نقل میں خود کو روما ہی کہا کرتی۔

''سن لیا۔''پلوشے نے زبان نکال کر مجھے چڑایا اور میں کان دبا کر خاموش ہو گیا۔

سردار اور مریم بھابی (لی زونا) بھی عبداللہ کی پیدائش پر میرے گھر آئے تھے۔مریم ابھی اچھی خاصی اردو اور پشتو سیکھ گئی تھی۔میرے پوچھنے پر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

''ذیشن بھائی،پشتو اور اردو اس لیے سیکھنا پڑی کہ سردار کی انگریزی اب بھی ویسی ہی ہے۔''

سردار کے بیٹا سلطان خان نے اماں،ابا کہنا سیکھ لیا تھا۔وہ مریم سے بہت زیادہ مانوس تھا۔بلکہ ایسے جیسے وہ اس کی سگی ماں ہی تو ہو۔

اسی رات روما میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔''ایک بات مانیں گے۔''

''پہلے کبھی ناں کی ہے۔''

وہ لجاجت سے بولی۔''ایک کار خرید لونا۔''

''سچ سچ بتاؤ یہ تمھیں کس نے کہا ہے۔''میں نے نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

وہ صاف گوئی سے بولی۔''پلوشے کہہ رہی تھی۔''

''تو وہ خود کہے نا۔''

''اسے شرم آ رہی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ پہلے ہی اس کے علاج پر اتنا خرچہ آیا ہے، کار کا سن کر آپ خفا نہ ہو جائیں۔''

''اور اس کی روما باجی نے کہا ہوگا، کہ وہ فکر نہ کرے روما اسے کار خرید کر ضرور دے گی۔''

''ہاں کہا ہے تو......''وہ ایک دم بگڑ گئی تھی۔

میں فوراً ہار مانتا ہوا بولا۔''ٹھیک ہے یار، لڑتی کیوں ہو۔''

''اگر آپ نہیں لے کر دیں گے تو میں ابو جان سے بات کر لوں گی۔''وہ دونوں میرے والد کو ابو جان ہی کہتی تھیں۔

میں نے کہا۔''کہا تو ہے کہ لے دوں گا۔''

''جھوٹا اجنبی۔''منھ بناتے ہوئے اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔

دوسرے دن میں نے اکیلے میں پلوشے کے کان سے پکڑا۔''روما کی کچھ ہوتی سوتی، مجھے کیوں نہیں کہا کار کے بارے۔''

وہ شرارتی لہجے میں بولی۔''آپ کو کہا تو تھا، بھول گیا ہے شاید۔''

''بھولا تو نہیں تھا بس موقع ہی نہیں مل سکا۔''

''بس بس رہنے دیں۔''اس نے منہ بنایا۔

''کیا مجھ پر اعتبار نہیں رہا۔''

''اپنی جان سے بھی بڑھ کر اعتبار ہے۔''وہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔

’جانتی ہوں اس دنیا میں مجھ سے بڑھ کر آپ کو کوئی عزیز نہیں ہے۔لیکن میں چاہتی ہوں رومی باجی کو اس گھر میں مجھ سے زیادہ اہمیت ملے۔وہ جتنی اچھی ہیں، جتنی مخلص ہیں اگر کبھی ان کے دل ذرا سا بھی ملول آ گیا تو میں خود کو معاف نہیں کر پاؤں گی۔اسی لیے انھیں کہا کہ آپ سے بات کریں۔ورنہ راجو اور میری کوئی بات ٹال جائے یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔‘‘

میں نے اسے چڑایا۔’’بڑا پیار کرتی ہو اپنی رومی باجی سے۔‘‘

’’وہ ہیں ہی اس قابل کہ اسے چاہا جائے۔دیکھتے نہیں وہ امی جان سے زیادہ میرا خیال رکھتی ہیں۔انھیں دیکھ کر لگتا ہے سپوگمائے باجی اب تک زندہ ہیں۔‘‘

’’اچھا کل میں واپس جا رہا ہوں۔‘‘سب سے پہلے میں اسے ہی یہ خبر دے رہا تھا۔

وہ لجاجت سے بولی۔’’آپ نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔یہیں پر کوئی کاروبار وغیرہ شروع کر دیں۔‘‘

’’جانتی ہو میری تربیت پر پاک آرمی نے کتنا خرچا کیا ہے۔اور پھر اگر سارے مرد ہی وطن کی حفاظت کو چھوڑ کر اپنی پیاری پیاری بیویوں کی آغوش میں لیٹ جائیں تو ایک دن ان کی بیویاں ہندوؤں کے بچے پیدا کر رہی ہوں گی۔‘‘

وہ نادم لہجے میں بولی۔’’میرا یہ مطلب نہیں تھا راجو، میں تو بس آپ سے دور رہنے کا سوچ کر گھبرا رہی ہوں۔‘‘

میں فلسفیانہ لہجے میں بولا۔’’یہ گھبراہٹ، وطن کے ہر رکھوالے کی ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی قسمت میں شامل ہے۔‘‘

’’اچھا ایک دن اور ٹھہر جائیں۔‘‘اس ہٹ دھرم نے آسان سی شرط پیش کی جو میں نے مان لی تھی۔

اگلے دن میں روما اور پلوشے کو ساتھ لے کر ایک شوروم میں پہنچا اور ان کی پسند کی کار خرید لی۔شہر سے واپس آتے ہوئے میں اولیس کی کار میں تھا جب کہ وہ دونوں نئی کار میں لوٹی تھیں۔جسے پلوشے ڈرائیو کر رہی تھی۔ایک بار پلوشے نے کہا تھا کہ وہ اپنی کار چلانا چاہتی ہے اور آج اس کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔

عبداللہ کی پیدائش کے ایک ہفتے بعد میں کئی خوش خبریوں کے ساتھ یونٹ واپس لوٹا تھا۔تصور صاحب،

استادفیاض، الیاس، شہزادوغیرہ نے مجھے محبت سے خوش آمدید کہا تھا۔ سردار ابھی تک چھٹی پر تھا۔

☆......☆......☆

یونٹ میں ہفتہ بھر گزارنے کے بعد ایک دن کمانڈنگ آفیسر نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا۔

"ذیشان، کیسے ہو؟" مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ میرا حال پوچھنے لگے۔

میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا۔ "بالکل ٹھیک ہوں سر۔"

اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ "کچھ عہدہ داران کہہ رہے ہیں طویل چھٹی نے تمھاری صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا ہے۔"

میں اعتماد سے بولا۔ "آپ کل ٹیسٹ لے کر جانچ لیں سر۔"

"آج سردار خان کی بھی چھٹی سے واپسی ہے۔" مجھے لگا وہ موضوع تبدیل کر رہے ہیں۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی سر۔"

وہ معنی خیز لہجے میں بولے۔ "یقیناً، تم اپنے ساتھ اسی کو لے جانا چاہو گے۔"

"میں سمجھا نہیں سر۔" میں نے حیرانی ظاہر کی۔

انھوں نے اطمینان بھرے انداز میں وضاحت کی۔ "سنا ہے افغان بارڈر پر باڑ لگانے والی یونٹوں کو دہشت گردوں کے سنائپرز کا بہت خطرہ ہے۔ خاص کر انڈین سنائپرز دہشت گردوں کا ہراول بنے ہوئے ہیں۔"

میرے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور میرے دائیں کندھے میں کھجلی ہونے لگی۔ یقیناً رینج ماسٹر کے بٹ کا جانا پہچانا لمس میرے کندھے کو یاد کر رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ پوچھا۔ "کب جانا ہوگا سر؟"

وسیم صاحب بولے۔ "پرسوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کل کا دن ہم رستے میں گزارنا پسند کریں گے۔"

وسیم صاحب نے قہقہہ لگایا۔ "اس کا مطلب ہے عہدادران کے اندیشے غلط ہیں۔"

ان کی مسکراہٹ کو اجازت پر محمول جانتے ہوئے میں نے کہا۔ "شکریہ سر۔"

ہم نے کافی آرام کر لیا تھا اور مادرِ وطن ہمیں دوبارہ اپنی خدمت کے لیے بلا رہی تھی۔ یقیناً اس مٹی کا ہم پر

بہت زیادہ قرض ہے اور جب تک میری جان میں خون کا ایک قطرہ باقی ہے میں اس فرض سے آنکھیں نہیں چرا سکتا۔ بہ قول شاعر......

خون دل دے کے نکھاریں گے رخ برگ گلاب
ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے

اور......

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا
تیرے بیٹے ترے جانباز چلے آتے ہیں

آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ کہانی کبھی ختم نہیں ہوتی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ شاید پھر کبھی آپ لوگوں کے سامنے اس کے بعد کے واقعات سنانے کا موقع ملے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زندگی موقع نہ دے۔ لیکن میرے آپ کے ختم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ موت تو اٹل حقیقت ہے۔ البتہ اس ارض وطن کو قیامت کی صبح تک یونھی قائم و دائم رہنا ہے۔ اور یہ تبھی ممکن ہو گا جب ہم میں مادر وطن پر قربان ہونے کا جذبہ اور حوصلہ موجود رہے گا۔

...... ختم شد ......